زمانہ

مرتبہ:۔ دیانراین نگم، بی۔اے،

نمبر ۱	جولائی سنہ ۱۹۳۱ء	جلد ۵۷

فہرست مضامین

تصاویر سترھویں صدی کی ایرانی مصوری کا نمونہ۔ عہد مغلیہ کی ہندوستانی مصوری کا نمونہ
ہزہائی نس نواب صاحب بھوپال مسٹر وجے راگھوآچاریہ۔

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت سالانہ ۵

قیمت فی پرچہ ۸

قیمت ممالک غیر سے سالانہ ۶ ششماہی ۴ ہندوستان کے لئے ششماہی ۳

صرف پانچ آنے

میں

دو انمول ہیرے

(۱) حسن کی چنگاری (۲) بندے ماترم

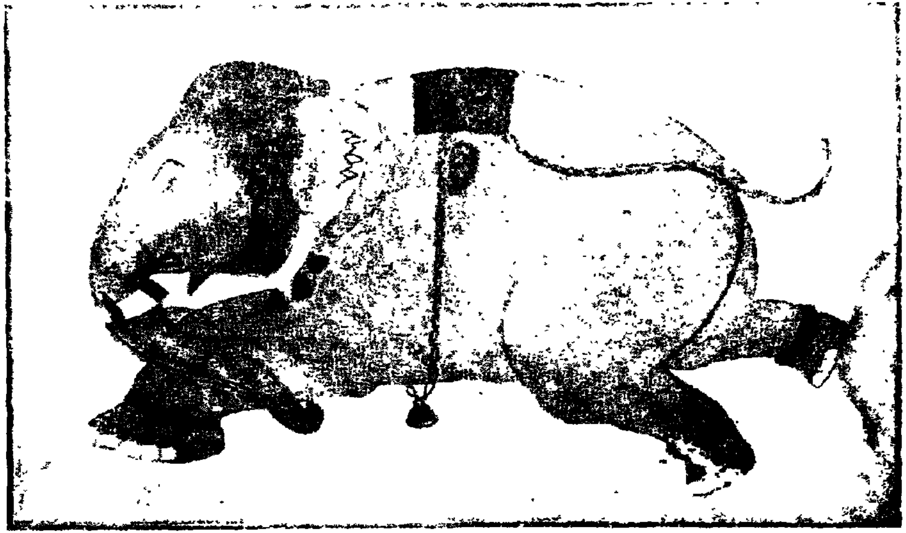
"حسن کی چنگاری" انڈین شیکسپیئر آغا حشر کاشمیری، ممتاز الشعراء برق دہلوی بی اے اور جگیشور ناتھ ورما بیتاب بی۔ اے کے جگر پاروں کا اچھوتا اور نایاب مجموعہ ہے۔ سرورق پر ایک نہایت حسین تصویر ہے، اور نہایت نفیس کاغذ پر بڑی خوبصورتی اور صفائی کے ساتھ چھاپی گئی ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اُردو زبان میں آج تک ایسی لاثانی، سستی اور دیدہ زیب کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اس قدر خوبیوں کے باوجود قیمت صرف ۳ ر معہ محصول ڈاک۔

(۲) بندے ماترم

بنکم چندر چٹرجی، ڈاکٹر ٹیگور، شری اروندو گھوش، للت گپتا، اور سروجنی وغیرہ وغیرہ کے حب وطن سے پر ترانوں اور تحریروں کا بے نظیر مجموعہ ہے جسے خاص اہتمام اور بڑی نفاست سے اُردو، ہندی، انگریزی اور بنگالی زبانوں میں ایک ساتھ عمدہ کاغذ پر چھاپا گیا ہے۔ قیمت ہر خاص و عام کے استفادہ کے لئے صرف ۲ ر رکھی گئی ہے۔

(نوٹ) قوم و زبان کی خدمت کے خیال سے دونوں کتابیں ۵ ر کے ٹکٹ موصول ہوتے پر روانہ کی جاتی ہیں۔ آج ہی منگا لیجیے۔

منیجر آکاش بانی آفس بریلی



فیلخانہ سے بھاگا ہوا ہاتھی
عہد مغلیہ (سترھویں صدی) کی مصوری کا نمونہ



زمانہ

جلد ۵۸ — جولائی ۱۹۳۲ء — نمبر ۱

مغل مصوری

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما، بی اے ... بی ...)

اس میں شک نہیں کہ فن مصوری ایرانیوں کے قدم بہ قدم اقطاع ہند میں داخل ہوئی لیکن
... یہ دعویٰ بھی قطعاً حق بجانب ہے کہ ایرانیوں نے قدیم بودھ مصوروں ہی کی
... کی تحصیل کی۔ اسٹین اور میکاک کی تحقیق و تدقیق سے (جس کا ذکر پیشتر کیا جا چکا ہے)
... بوسیدہ و مدفون مصوری جو حال ہی میں تجسس بسیار کے بعد برآمد ہوئی ہے ازمنہ
وسطیٰ کی ہندی مصوری کے ہم رنگ ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ یا تو ہندی مصور ختن جا کر آباد ہوئے
اور ... مخصوص رنگ میں داد فن دینے لگے یا خود اہل ختن ان کی زیر ہدایت ان کے نقش قدم پر
... ہوئے۔ پھر زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کی روشِ کہنہ میں نمایاں تغیر و تبدل ہوتا گیا حتیٰ کہ مصوری
... نئے خیال نکالے جن کی بدولت وہ اپنے ہم جنسوں میں اجنبی سمجھی جانے لگی۔
... نے اس لب ولہجہ میں ... سے متذکرہ دعوے کی تائید و تقویت ہوتی ہے
... کا اعتراف کیا ہے۔ مشہور عرب عالم ... ہندیوں کو رموز
... میں خاص ملکہ ہے .... جاحظ کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ اس عہد میں عربوں
... ایک مصوری ایک عجیب و غریب شے تھی جس سے انھیں خوش دلی ... تھا

ملاحظہ کیجئے زمانہ بابت ... ۱۹۳۱ء

ایک اور عرب ابن ندیم نے بھی گوتم بدھ کی ایک تصویر کا مختصر الفاظ میں جامع خاکہ اتارا ہے اس کے علاوہ مشہور مورخ البیرونی کی تحریروں سے بھی واضح ہے کہ صدہا خوبصورت اصنام و تصاویر بدھ مذہب کی تبلیغ و تلقین کے لئے عرب و ایران وغیرہ ممالک میں بھیجے گئے۔ یقیناً انھیں نظر فریب محرکات نے ایرانیوں کی حصول فن کی آتش اشتیاق کو مشتعل کیا ممکن ہو کہ اسی واقعہ نے اسلام کو مصوری کے خلاف برانگیختہ کیا ہو کیونکہ مصوری بودھ مت کی تبلیغ کا بہت بڑا آلہ کار تھی مگر تعجب ہے کہ مصوری جس مبدء فیض سے نکلی تھی، برسوں چمنستان ایران کی معنبر فضا میں گلچینی کرنے کے بعد اپنا دامن زریں عجیب النوع غنچوں اور گلہائے رنگا رنگ سے بھرے ہوئے پھر وہیں واپس آئی اور اپنے آبائی وطن میں معراج کمال کو پہنچی۔

مغل اسکول کے حاصل عمل کی کثیر تعداد صاحب مقدور افراد و خواتین کے چہروں پر مشتمل ہے لیکن مذہبی تقریبوں، تاریخی کارناموں، سیر و شکار، راج دربار، پیدائش عالم و غیر تاریخی مروج قصص رزم و بزم، نباتات و حیوانات اور مناظر فطرت غرضکہ کوئی ایسا موضوع نہیں جس کا فقدان ہو۔ اگر کوئی کمی ہے تو صرف یہ کہ روز مرہ زندگی کی جھلک پردہ تصویر میں کہیں نظر نہیں آتی۔

کسی فن کے متعلق متضاد نظریے ہونا بالکل قدرتی امر ہے، چنانچہ مصوری بھی اس عالمگیر کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے، ہر نظریہ میں عام مذاق کے مطابق وقتاً فوقتاً تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں، مغل مصوری کا اجتماع ضدین اس حقیقت کا شاہد ہے۔ جان رسکن نے مصوری کی جانچ کا معیار ان پانچ باتوں پر قائم کیا ہے:-

۱۔ مصوری کا منتہائے نظر بھی انسانی جد و جہد کے مختلف شعبہ جات کی کشاکشوں کی طرح تلاش و تشہیر حق کے سوا کچھ نہیں۔

۲۔ ہر فنی کوشش کو حقیقت کی آئینہ داری کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے رسمی پابندیوں سے معرا اور فطرت کے لافانی و استوار رنگ میں سرتا پا غرق ہونا بہت ضروری ہے

۳۔ فنی ماثل اپنے خالق کے کردار و اخلاق کے حامل و مفسر ہوتے ہیں اور اس حیثیت سے تاریخی اہمیت کے بھی مالک ہوتے ہیں

۴۔ فن کا مقصد حقیقی چند اہل ذوق طبائع کی مسرت کا سامان فراہم کرنا نہیں بلکہ ضروریات زندگی کی تکمیل ہے۔ تصویر کو جلا دینا دشوار ہے، لیکن حیات بشری کو روشن کرنا دشوار تر ہے۔

۵۔ مصور کی عظمت و برتری کا صرف اس ایک بات پر مدار ہے کہ وہ کس حد تک حسن فطرت کو عریاں کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ (ماسٹر پینٹرز)

حسن اتفاق سے مغل اسکول ان اوصاف سے بدرجۂ اتم متصف ہے۔ رسکن کی باریک بین نگاہیں جن کی متلاشی ہیں اور ان خصوصیات پر بھی قادر ہے جو ایسے لوگوں کے معیار کی منظور نظر تھیں جنھیں رسکن سے اختلاف ہے۔ مغرب، اٹلی کے چابکدست مصوروں کا اسلئے مداح ہے کہ ان کے یہاں حقیقت و تخیل کا اس حسن و خوبی کے ساتھ اشتراک و اتصال ہوا ہے جسے دیکھ کر روح وجد میں آجاتی ہے۔ پس اگر مغل اسکول میں روزمرہ زندگی کے مناظر کا فقدان ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ سادہ و صحیح تصویر چاہے کتنی ہی واقعیت و حقیقت کی کاشف کیوں نہ ہو، ہرگز جاذب نگاہ نہیں ہوسکتی۔ اور تاثر کمال کا انحصار صرف دلفریبی و نظر نوازی پر ہے۔ ڈچ مصور وان بیرز (Van Beers) کا آرٹ اسی لئے مقبول نہیں کہ وہ حقیقت و زیست کا ایسا خشک تجربہ پیش نظر کرتا ہے جہاں رنگینی تخیل کا کچھ عمل دخل نہیں۔ اسلام کی مذہبی قیود نے مغل مصوروں کو بھی اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ خانگی بود و باش و طرز زندگی کو کسی پہلو سے بھی بے نقاب کریں۔

دنیا کے تمام دیگر مذاہب سے زیادہ اجتماعی ہونے کے باوجود بھی اسلام کو یہ سکت نہ ہوئی کہ صفحۂ قرطاس پر اپنا رنگ جمالیتا، مزاج عاشقانہ اور دخت رز کی ناز برداریوں نے جہانگیر کو مذہب کی پابندیوں سے ایک حد تک بے نیاز کر دیا تھا۔ (حالانکہ وہ بھی اسلام سے منحرف نہ ہوا) شاید یہی وجہ ہے کہ خال خال ایسی مثالیں ملجاتی ہیں جنھیں مذہب کی بو باس ہو۔

مغل اسکول کے ابتدائی گلدنامے ایک خاص انداز لئے ہوئے ہیں۔ اسی سے انھیں ایرانی مصوروں کی قلمکاری کا رہین سمجھا جاتا ہے۔ بعض نیاضِ فن ان کثیر التعداد معجزات دستِ قلم کو تیموری مصوری اسکول کے کسی ایک یا دوسرے رخ کا مظہر خیال کرتے ہیں۔ چونکہ تیموری اسکول سرزمین ایران میں پندرھویں تا غایتہ سولھویں صدی تک قائم رہا۔ اس لئے ان آثار سلف کو بلا تکلف اس عہد سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ہندی ایرانی تصویریں ہر پہلو سے مزید عمومیت و کثیر رسوم ہیں۔ ان کی یہ خصوصیت وضع اشکال و صور کے مواقع پر خوب گل کھلاتی ہے۔ قدرتی مناظر کی "بیک گراؤنڈ" کی تفاصیل جو گل بوٹوں پر مشتمل ہیں، مصور کی زبردست قوت ممیزہ اور تحیر خیز ادراک فن کی چشم دید شاہد ہیں۔ یہاں مصور اپنے زور قلم کا ایسا نادر نمونہ پیش کرتا ہے جس کی نظیر نہیں ہوسکتی۔ یہ بات صرف مغل اور دیگر متعلقہ اسکولوں ہی کو حاصل ہے۔ رنگ آمیزی کے جادو اثر کمالات نے ابتدائی کارگذاریوں کو ۔ مرکی مخلوق سے بہت بلند و بالا کر دیا ہے۔ ہر منظر میں گلابی آسمانی اور سنہرے رنگوں سے خالص شرقی رنگ میں اس حسن

و پاکیزگی کے ساتھ گلکاری کی گئی ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی، پھر نفاست اور سبکدستی کا کمال یہ ہے کہ کہیں نیلا رنگ آفتاب کی تجلیوں میں مستغرق نیلگوں آسمان کی ہمسری کر رہا ہے تو کہیں تقاطر امطار سے دُھلی ہوئی دور افتادہ پہاڑیوں کے پر نور رخسار سے رنگ روپ مستعار لے رہا ہے۔

تصویروں کی تراش اور ان کی بناوٹ میں نہایت باریکی سے کام لیا گیا ہے۔ مغل مصوّر اپنے رنگین کارناموں کو تصنع کے زیورات سے مرصع کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا، اور اُن کی جدول اس درجہ مختصر کر دیتا ہے کہ اس اختصار ہی میں بلا کی جدت و دلکشی نظر آتی ہے، کرداروں کے کاغذی پیرہن پر بڑی صفائی سے جا بجا سنہرا کام کیا گیا ہے۔ مہ جمالوں کا زرتار آنچل ان کے حسن کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ کبھی کبھی ساری "بیک گراؤنڈ" کو زریں کر کے تصویر کی قیمت دوبالا کر دی جاتی ہے۔

بسا اوقات انواع و اقسام کی چلمنوں سے حسن کی جھلک اس قدر رنگین ہو جاتی ہے کہ ہوسِ دید کی دست درازیاں ایک لمحہ کے لئے بھی سطح تصویر سے آنکھ اُٹھانے کی اجازت نہیں دیتیں۔ متذکرہ اوصاف ہندی ایرانی آرٹ سے مختص ہیں۔ گو مغل اسکول کی بنیاد اسی ارتباط باہمی کی مرہون ہے لیکن اس اشتراک عمل و انداز کو مغل مصوری سے تعبیر کرنا ایک ناقابل تلافی غلطی ہے۔

مغل اسکول پر راجپوتوں کی شمولیت اور ہند کا ماحول کچھ اس طرح اثر پذیر ہوا کہ رخ تصویر سے ایرانی رنگ یکلخت محو و معدوم ہو گیا۔ اب مصور برملا حقیقت و جذبات نگاری کی بقدر ہمت داد دینے کے لئے مطلقاً آزاد تھا۔ اس نئے اسلوب و انداز نے مصوری کی دنیا کو نہایت وسیع کر دیا اور اس کی رگ و پے میں بسرعت ہندوستانیت سرایت کرتی گئی۔ صرف تصویر کی جدول کچھ کچھ اجنبیت کا رنگ لئے رہی۔ انہی چند نکات کو پیش نظر رکھ کر ہم بقیہ ہندی مصوری سے مغل اسکول کا امتیاز کر سکتے ہیں۔

ہندی و ایرانی مصوری اور مغل اسکول کی خورد شبیہوں (Mini tures) میں قابل ذکر اختلاف ہے۔ آخر الذکر مماثل کی سطح عکسی ہے جسے چابکدست مصور نے [illegible] سے ابھارا ہے۔ مناظر کے انتخاب میں ماحول کے اثرات پیش پیش ہیں۔ ابتداءً سطح [illegible] استعمال شاذ و نادر ہی ہوا ہے۔ لیکن تبدیل اسلوب کے ساتھ ساتھ یہ فقدان بھی کافور [illegible] اور اس طرح ایرانی قلم کی شگوفہ کاریوں اور مغل اسکول کے کرشموں میں زمین و آسمان کا تفاوت ہو گیا [illegible]

سطح کے اُبھار سے محض نابلد ہی ہیں وہ اسکول کی یادگاریں مظہر ہیں کہ سطح کے ابھار کی تفرقہ اندازیوں نے مصور کی تکمیل ذوق کے لئے ایک نیا باب کھولدیا ہے مغل آرٹ "بیک گراؤنڈ" کی ساخت و تعمیر کیلئے خودرو بیل بوٹوں کے تعاون کا دست نگر ہے اور ایرانیوں کی طرح مصنوعی آرائش و زیبائش کو قبول نہیں کرتا۔

فضائے بسیط کی حقیقی و قدرتی مصوری اور دوری و فاصلہ کے نمایاں کرنے میں مغل اسکول کو جس قدر کامیابی ہوئی ہے وہ ایرانیوں کے یہاں قطعاً مفقود ہے۔ مغل مصور پیمانہ کی کمی و بیشی میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اور اس کمال سے داد فن دیتے تھے کہ پیمانہ کے اختصار کے باوجود بھی اصل و نقل کی شان میں کہیں بال بھر بھی فرق نہ آنے پاتا تھا۔

محاذ جنگ کا ایک حیرت نیز منظر، جو اب بھی کلکتہ کے عالی شان عجائب گھر کی زینت ہے۔ مغل مصور کے رنگین اثر قلم کا نادر نمونہ ہے۔ اس سیراکن تصویر کا ماحصل یہ ہے کہ سواروں کی ایک جماعت ترچھی ہوکر سامنے کے میدان کو طے کر رہی ہے۔ منظر ہذا مغل اسکول کی ستذکرہ خصوصیت کا آئینہ ہی نہیں بلکہ مصور کے کرداروں کی اجتماعی نمایندگی کے ادراک و شعور کی بھی غیر ملفوظ زبان میں شہادت دیتا ہے۔ پیمانہ کی معرکۃ الآرا تخفیف اور محیر العقول اجتماع کو پہلو بہ پہلو نمایاں کرنے میں مغل مصور پالواوکسیلو (Paolo Uccello) سے گوئے سبقت لے گیا ہے مگر اس اطالوی مصور کو صرف اس لئے شہرت و وقعت حاصل ہے کہ وہ مغرب میں پیدا ہوا، اور اس نے پندرھویں صدی میں مصوری کے اس پہلو کو پہلے پہل مغربی دنیا سے روشناس کرایا، جبکہ مغل مصور نے صرف اپنے متقدمین کی روش کہنہ کے تتبع سے استفادہ حاصل کیا۔

فطرت کی گلکاریوں نے مغل اسکول کی توجہ خاص طور پر جذب کی ہے، بابر گل و بلبل کا جس قدر دالہ و شیدا تھا "توزک جہانگیری" بتا رہی ہے کہ جہانگیر اس سے کہیں زیادہ حسن فطرت کا دلدادہ تھا۔ یہی باعث ہے کہ مغل مصور کو حسینۂ فطرت کی رعنائیوں میں ناقابل تسخیر کشش نظر آتی ہے۔

جہانگیر نے اپنے دربار کے بعض مصوروں کو خاص طور پر نادر و نایاب چرند و پرند کی تصویریں اتارنے کے لئے معین کردیا تھا۔ اس کی فرمائشوں کی تکمیل میں مغل مصور نے جادونگاری سے کام لیا ہے۔ کلکتہ کے عجائب خانہ میں ایک فیل مرغ کی تصویر محفوظ ہے، یہ اُس سلک گہر کا دُر شاہوار ہے جسے مغل مصوری کا بہترین زیور تصور کیا جاتا ہے۔ تصویر کی کشید اور بسط و تفصیل کے نمایاں کرنے میں مصور نے اس غضب کی چابکدستی دکھائی ہے کہ تصویر منہ سے بولنے اُٹھتی ہے۔ بز سیاہ اور "فلورکین" (Florican) کی دو اور تصویریں ہیں جو بہر طور اپنے خالق کے حسن عمل کی ضمانت ہیں، ان تصویروں کی زملیت میں

خوشنما و شگفتہ جدول سے اور بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ درحقیقت شوخ و خوش رنگ جدول ہی خود فن کا ایک نادر و نایاب نمونہ ہے جو مغلوں کے یہاں عام ہے۔

قیاس کیا جاتا ہے کہ ان نظر فریب حواشی کی ابتدا جو رنگین بیل بوٹوں پر مشتمل ہیں جہانگیر کے عہد سے ہوئی۔ شاہجہاں نے تاج محل اور دیگر عجوبۂ روزگار تعمیرات کی زیبائش میں اس شعبۂ فن کو انتہائے کمال تک پہنچا دیا ہے۔ کہسار و مرغزار کے پھول، انواع و اقسام کے پرند اور رنگ برنگ تتلیاں، سب مل جل کر جدولوں کی تراش میں طرفہ دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔ اس سے زیادہ شوخ و حسین نمونۂ فن کا وہم و گمان میں بھی آنا محال ہے۔

سیر و شکار کے مناظر کو پردۂ تصویر میں نمایاں کرنا مغل مصوّر کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ جہانگیر جب کبھی شکارگاہ میں جلوہ افروز ہوتا، چابکدست مصوّر اس کے ہمرکاب ہوتے اور اس کے کارناموں کو رنگ و روغن سے چمکا کر داد شجاعت دیتے تھے۔ جہانگیر شیر کے شکار کا بہت شایق تھا۔ مغل مصوری کے ہر مرقع میں ایسی متعدد تصویریں ملتی ہیں جو اس حقیقت کو بے نقاب کرتی ہیں۔ اس نادر مجموعہ کی ایک تصویر نہایت حیرت انگیز منظر پیش نظر کرتی ہے۔ شیر خوفزدہ ہاتھی کی پشت پر سوار ہے جیسے بادشاہ اپنی خالی بندوق سے روکے ہوئے ہے۔ متوحش مہاوت بادشاہ کو خطرہ میں چھوڑ کر ہودہ سے کود پڑا ہے اب ناظر کو یہ معلوم کرنے کے لئے ایک خاص قسم کی بےچینی محسوس ہوتی ہے کہ شیر کے چنگل سے کس طرح بادشاہ کی مخلصی ہوئی؟ مگر ذکی الفہم مصور نے یہ مشکل بھی اس طرح آسان کر دی ہے کہ ایک مسلح سوار کو شیر کے تعاقب میں جھپٹتے ہوئے نمایاں کر دیا ہے۔ سوار نے موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے غیر معمولی تیزی سے گھوڑا چھوڑ دیا ہے، چہرہ پر جوش و وفاداری کا رنگ غالب ہے، ایک ہاتھ میں راس ہے دوسرے سے بار بار نیزہ تول رہا ہے، غرض ایک لطیف کنایہ سے مصور نے ساری داستان مکمل کر دی ہے۔ پھر سونے پر سہاگا یہ کہ بزدل مہاوت کی کرتوت کو اس پہلو سے واضح کیا ہے کہ تصویر میں جان پڑ جانے کے علاوہ تفریح و تفنن کا سامان بھی فراہم ہوگیا ہے، جس سے دیکھنے والے کی دماغی بےچینی سکون و مسرت سے بدل جاتی ہے۔

جنگل کے مناظر میں محسوسات کی معجز نمائی قابل دید شے ہے، دور و دراز پہاڑیاں اور قرب و جوار کی پناہ گاہیں جن میں درند و چرند اپنی اپنی جگہ مکین نمایاں کئے گئے ہیں، اس حسن و خوبی کے مالک ہیں کہ جس کا جواب نہیں۔ یہ تمام فنی کارنامے صورت و سیرت دونوں میں یکتا ہیں، اور مغل مصوّر کے غیر معمولی ادراک و حیرت انگیز معلومات کے ضامن ہیں۔

تاڑ کے فلک بوس درخت، ارغوانی پھولوں سے لدے ہوئے کیلے کے نرم و نازک پودے سنہرے اور چکنے پیڑوں کی ہموار قطار، آم کی نوشگفتہ سرخ و گلابی کونپلیں اور چمنستان و کہسار کے دوسرے درختوں اور جھاڑیوں سے مغل مصور نے اپنے دلکش کارناموں کی جزئیات کو اس انداز خود نمائی سے آراستہ و نمایاں کیا ہے کہ جسکی نظیر نہیں ہو سکتی۔

مغل مصوری کو باعتبار قلم متعدد اسکولوں میں منقسم کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر اسکول جداگانہ خصوصیات کا حامل ہے۔ مگر ان تمام امتیازات خصوصی میں اصطلاحی تفاوت سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ دہلی قلم قبولیت عام کی گراں بہا خلعت سے سرفراز ہے، اور قدامت کے اعتبار سے بھی خاص اہمیت کا مالک ہے۔ جہاں تک فنی کمالات کا تعلق ہے، دہلی قلم کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ تکمیل و اختصار کے ساتھ صفائی و پاکیزگی کی بے پناہ سحر آفرینیوں سے بھی ہمدوش ہے۔

جے پور قلم کی شہرت کی تیز گامی کا مدار اس کی شباب رونمائی پر ہے۔ "موڈل" کی تعمیر ہلکے اور عکسی رنگوں سے سطح کا ابھار جے پور قلم ہی کی پرکار جنبشوں کا رہین ہے۔ حالانکہ راجپوت مصوری کا مولد و ماویٰ بھی یہی جے پور ہے۔ تاہم اس ارتباط و اختلاط کے باوجود بھی مغلوں اور راجپوتوں کے مابین بہت فرق نمایاں ہے۔

لکھنؤ قلم، دہلی قلم کی نقل ہے، اور اصل و نقل میں جتنی تفریق بھی ممکن ہے وہ سب لکھنؤ قلم کا سرمایہ ہے۔ باعتبار فن لکھنؤ، دہلی سے بہت پیچھے ہے۔ گو اس میں چند ایسی خصوصیات بھی ہیں جو دہلی میں نظر نہیں آتیں۔ اور وہ کثافت جو دہلی قلم کے ہمرکاب تھی لکھنؤ پہنچتے پہنچتے ایک بڑی حد تک دور ہو گئی ہے۔ مغل مصوری کی رنگینی و نظر نوازی آبی رنگوں کی آب و تاب کی شرمندۂ احسان ہے۔ "بیک گراؤنڈ" میں مجموعی طور پر سفید رنگ کا استعمال ہوا ہے۔

دکن قلم کا اجمالی تذکرہ پیشتر کیا جا چکا ہے اس پر مستزاد یہ کہ یہاں پیمانہ کی کمی بیشی سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ اس قلم کی گلکاریوں میں جا بجا سنہرا کام کیا گیا ہے یہی باعث ہے کہ دہلی اسکول کی شاخ ہوتے ہوئے بھی نظر فریبی میں متذکرہ اسکول دہلی قلم سے بہت بڑھا چڑھا ہوا ہے۔

مغل مصوری نے انیسویں صدی کے اوائل میں بنگال کی زرخیز سرزمین میں گامزن ہو کر نیا گل کھلایا جو پٹنہ قلم کے نام سے مشہور ہے۔ اس اسکول کے مصوروں کا تمام تر زور قلم ڈرائنگ کی خوبیوں کو دوبالا کرنے میں صرف ہوا ہے۔ رنگ آمیزی کے میدان میں پٹنہ قلم کی ساری کوششیں

ناقص رہیں۔ اس کمی کے باوجود بھی جو حشر تک اسکول ہذا کی دامنگیر رہے گی ابھی چند ایسے نشانات باقی ہیں جو برملا بتا رہے ہیں کہ پٹنہ اسکول کا دہلی سے کچھ نہ کچھ علاقہ ضرور ہے۔

کشمیر قلم کی ابتدا فردوس عالم کشمیر کی زنگار وادی کے شگفتہ و متبسم زعفران زار ہی سے ہوئی۔ بعد ازاں لاہور، امرتسر اور صوبہ پنجاب کے دیگر اقطاع کے کاشمیری مصوروں نے اسے اپنے دامن نظر میں جگہ دی اور اس کا انتساب اپنے اسماء گرامی سے منظور کر کے اس طفل نوخیز کو دنیائے فن کا منظور نظر بنا دیا۔

ایرانی قلم مزید تعریف و تعارف کا محتاج نہیں، اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

غیر ملکی صنعت کا ایک اور اسکول بھی مغل مصوری سے متعلق ہے، جو رومی قلم کے نام سے مشہور ہے۔ وہ تمام کارنامے جو مغرب اور عیسائیت کے زیر اثر صفحۂ قرطاس پر وقتاً فوقتاً جلوہ نما ہوئے رومی قلم کا نتیجۂ عمل شمار کئے جاتے ہیں۔ سلطنت مغلیہ کی بربادی کے ایام میں ادھر میں جس قدر تصویریں بنائی گئیں وہ سب اسی رومی قلم کا تبرک ہیں۔ مغل مصوری سے اُن کا صرف اتنا تعلق ہے کہ مغل مصور اپنے مربی کے ایما یا حصول زر کی تمنا سے گاہ گاہ اس نئے انداز میں اپنا زور قلم دکھاتے رہے۔

تعلیم کیا ہے

کائنات سے باخبر ہونے کی حالت کا نام علم ہے اور اس سے بے خبر ہونے کی حالت کا نام جہالت۔ علم کے لغوی معنی ہیں جاننا اور سمجھنا۔ اس سے نکلے تعلّم و تعلیم۔ تعلّم یعنی سیکھنا اور سمجھنا، و تعلیم یعنی سکھانا اور سمجھانا۔

اب عام محاورہ میں علم کو تنگ معنی میں استعمال کرتے ہیں یعنی اس کو محض کتاب میں لکھی ہوئی باتوں تک محدود کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگ اب کتب بینی ہی کو علم سمجھنے لگے ہیں، مگر نہیں علم ذہنی مطالعہ کا نام ہے۔ کتابیں مطالعہ سے اخذ کئے ہوئے سبق اور دریافت کی ہوئی باتیں نتیجہ خیز شکل میں مرتب ہو کر آتی ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھا کر نئی نئی معلومات اور نئی نئی باتوں سے تجربہ کے ذخیرہ میں اضافہ کریں۔ انہیں باتوں کو سکھانا اور سمجھانا تعلیم ہے۔ (ماخوذ)

امن عالم اور ہندوستان

(از مسٹر منوہر لال طالب بی۔اے (آنرز) ایل۔ایل۔بی۔)

شاید بعض حضرات اس مضمون کا سرنامہ دیکھ کر چونک اٹھیں گے کہ امن عالم اور ہندوستان! بھلا غریب ہندوستان جس کو دنیا میں کوئی پوچھتا بھی نہیں اس کا امن عالم سے کیا واسطہ؟ جو خود گھر کی حفاظت نہیں کرسکتا اُسے دنیا بھر کی امن گستری سے کیا کام؟ دراصل یہ حیرت و استعجاب بیجا نہیں۔

ابھی امریکہ کا وسیع براعظم پردۂ خفا میں تھا، یورپ کی تہذیب ارتقار کی ابتدائی منازل طے کر رہی تھی، دنیا آج کل سے کہیں زیادہ محدود تھی۔ مختلف ممالک میں سلسلۂ آمد و رفت و نامہ و پیام قریب قریب مفقود تھا۔ ہندوستان اس وقت اپنی شاہانہ شان و شوکت سے صنعتی میدان میں پیش پیش تھا اس کی بیش قیمت و نادر الوجود مصنوعات یورپین حسینوں کے دلوں کو مسخر کر چکی تھیں اور اس وقت کی محدود دنیا ہندوستان کے صنعتی کمال کی مداح اور یہاں کے صناعوں کی ثناخواں تھی۔ یورپین لوگ ہندوستان کو طلسم خانۂ مشرق سمجھتے تھے ہر ایک ملک اسی کوشش میں تھا کہ وہ ہندوستان سے تجارتی تعلقات قائم کرے۔ یہ خیال رہے کہ اس وقت ہندوستان اور یورپ کی تجارت خشکی کے راستہ سے ہوتی تھی اور یہ راستہ نہ صرف لمبا اور دشوار ہی تھا بلکہ مختلف حکومتوں کے مقبوضات سے گذرنے کے باعث ناقص بھی تھا۔ بحری راستہ کی تلاش یورپ کے بلند حوصلہ سیاحوں کو بے چین کئے ہوئے تھی آخر کولمبس نے ہندوستان ہی کی تلاش میں امریکہ کا براعظم دریافت کیا، امریکہ دریافت ہوگیا مگر ہندوستان کے بحری راستہ کی تلاش و جستجو ختم نہ ہوئی۔ کیپ آف گڈ ہوپ والا راستہ جو افریقہ کے مغرب اور جنوب سے ہوکر آتا تھا بہت لمبا تھا۔

سترھویں صدی عیسوی میں یورپ کی مختلف قومیں ہندوستان کی نفع بخش تجارت سے بہرہ اندوز ہونے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ ولندیزی، پرتگالی، فرانسیسی اور انگریز تاجروں نے اس ملک میں آکر تجارتی مرکز قائم کئے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ تجارت اور محض تجارت ہی کی غرض سے

یہاں آئے اور ایک عرصہ تک تجارت ہی ان کا منتہائے مقصود رہی مگر اس "فردوس بریں" کی زرخیزی یہاں کے باشندوں کی سادہ لوحی اور ان قوموں کی فطری حرص و آز نے انھیں حریفوں سے برسر پیکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ کے بعد بالآخر اس میدان میں فرانس اور برطانیہ ہی دو بڑے حریف رہ گئے۔

یہ وہ وقت تھا جبکہ شاہان مغلیہ کا اقتدار چراغ سحری ہو چکا تھا، ان کی طاقت قریب الاختتام تھی۔ ایسا ہی وقت قوموں کے بننے کے لئے موزوں ہوتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ عہد مغلیہ کے نزع کے وقت اگر حریص یورپین لوگ ہندوستان کے معاملات میں مداخلت نہ کرتے تو کیا ظہور میں آتا۔ اس موضوع پر خامہ فرسائی فضول ہے۔ بہرکیف انگلستان اور فرانس نے اس سرزمین پر اپنے قدم جمانے کے لئے سبھی کچھ روا سمجھا، بھولے مشرقی نوابوں اور فرمانرواؤں کو دام تزویر میں پھنسانا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ جہاں کہیں بھی گدی نشینی یا تخت و تاج کا معاملہ اٹھتا یہ خدائی فوجدار ایک نہ ایک کے طرفدار بن کر اپنے دلوں کا غبار نکالنے کا بہانہ ڈھونڈھ لیتے تھے۔ عرصہ دراز تک فرانس و انگلینڈ میں لڑائیاں ہوتی رہیں، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس جنگ و جدل کی تہ میں ہندوستان کے علاوہ اور کوئی چیز نہ تھی۔ ان لڑائیوں کی تفصیل یہاں بیکار ہے۔ کیونکہ اس تمام جنگ و جدل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا۔

۱۷۵۷ء سے ۱۷۶۱ء تک وزیراعظم پٹ اکبر برطانیہ میں برسراقتدار تھا اس کی پالیسی سے بخوبی ثابت ہے کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی تمام لڑائیاں ہندوستان اور کنیڈا کی خاطر لڑی گئی تھیں۔ پٹ نے فریڈرک (والی پروشیا) کو مالی امداد محض اس لئے دی کہ وہ فرانس کی افواج کو یورپ ہی میں مصروف کار رکھے تاکہ برطانیہ ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرنے کی اسکیم اطمینان اور کامیابی سے چلا سکے، یہ چال کارگر ثابت ہوگئی اور ۱۷۶۱ء-۱۷۶۲ء کی بحری اور بری لڑائیاں فرانس کے لئے تباہ کن ثابت ہوئیں، آخر کار میدان برطانیہ ہی کے ہاتھ رہا۔

آج کون نہیں جانتا کہ ہندوستان پر قبضہ کرنے سے پہلے برطانیہ کیا تھا، اقوام دنیا میں اسے کوئی غیر معمولی وقعت حاصل نہ تھی، اس وقت بھی ہندوستان ہی تاج برطانیہ کا سب سے گرانقدر ہیرا [illegible] یہ بات تمام دنیا کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی اور وہ اس "سونے کی چڑیا" پر قبضہ جمانے والوں کو حسد کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور فرانس کے مشہور جرنیل نپولین بوناپارٹ کے نام سے کون واقف نہیں [illegible] مشرقی مہم کا محرک کونسا جذبہ تھا؟ وہ مصر پر اس لئے حملہ آور ہوا کہ مصر کی فتح ہند کی [illegible]

ہندوستان میں ٹیپو سلطان نے نپولین کی امداد کا وعدہ کیا تھا اور وہ یہاں ایک وسیع مشرقی سلطنت کی بنیاد رکھنے کا آرزومند تھا۔

مصر کو جاتے ہوئے نپولین نے جزیرہ مالٹا کو فتح کیا، بعدہٗ اس پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ اس جزیرہ کی وجہ سے روس اور برطانیہ میں پہلے بھی لڑائی ہو چکی تھی، صلحنامہ ایمنز کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ جزیرہ مالٹا اس کے اصلی مالکوں کو واپس کر دیا جائیگا، مگر برطانیہ نے اس وعدہ کو پورا نہ کیا اور فرانس و انگلینڈ میں ایک بار پھر جنگ چھڑ گئی۔ جزیرہ مالٹا ہندوستان سے بحیرہ روم والے رستے پر فوجی حیثیت سے ایک نہایت اہم مقام ہے۔ برطانیہ ہندوستان اور ہندوستان کے اس راستہ کو کسی طرح اپنی گرفت سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

فرانس پے درپے پسپا ہو کر آخرکار بیٹھ گیا۔ مگر فرانس کی طرف سے خطرہ دور ہوتے ہی روس کا ہوا سامنے آگیا، یہ کون کہہ سکتا ہے کہ روس واقعی ہندوستان کو نظر بد سے دیکھتا تھا یا نہیں۔ مگر اتنا ضرور معلوم ہے کہ اس کی مشرقی حکمت عملی نے برطانیہ کو کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ برطانوی مدبروں کی رائے میں ہندوستان کے بحری راستہ کی حفاظت کے لئے بحیرہ قلزم پر بخلاف روس کے بجائے ماتحت ترکی کا قبضہ بہتر تھا، اس لئے انگلستان کے لئے مشرق قریب کے جھگڑوں میں الجھنا ناگزیر ہوگیا، تقریباً سو برس تک یہ جھگڑے ہوتے رہے۔ جنمیں خونریزیاں بھی ہوئیں، آخر میدان برطانیہ کے ہاتھ رہا۔ اسی سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جبرالٹر پر قبضہ کرنے اور اُسے فوجی مقام بنانے کا مقصد بھی اس کا ہندوستان کی کلید ہونا ہے۔

یہ بحری راستے کا جھگڑا تھا، کیونکہ ہندوستان پر دو ہی راستوں سے حملہ ہو سکتا ہے، ایک بحری راستہ اور دوسرا بری۔ شمال مغربی دروں سے بارہا حملہ آور ہندوستان میں داخل ہوئے ہیں، برطانیہ کو اس راستہ کی بھی فکر تھی۔ دوست محمد خاں امیر کابل کا اگر کوئی قصور تھا تو یہ کہ اس نے روس کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کر لئے تھے، اسی قصور پر پہلی جنگ افغان ہوئی۔ چار سال تک کشت و خون جاری رہا، مگر فریقین میں سے کسی کو کوئی فائدہ نہ پہونچا اور جو حالت اس جنگ سے پہلے تھی وہی قائم رہی۔

جنگ کریمیا بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی، جو نقصان جان، مال اس لڑائی میں ہوا اُس کا بیان طوالت کا باعث ہوگا، اس کا خاتمہ برلن کانفرنس میں ہوا اور برطانی وزیر اعظم نے علی الاعلان کہا کہ وہ معاملات زیر بحث کے متعلق کسی خفیہ عہد نامہ کا پابند نہیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ درپردہ ٹرکی سے یہ عہد نامہ ہو چکا تھا کہ وہ اپنے مشرقی مقبوضات کی اقامت کے معاوضہ میں سائپرس برطانیہ کے حوالہ کر دیگا۔

سائپرس ہندوستان کے بحری راستہ میں ایک مستحکم مقام ہے۔

۱۸۶۹ء میں نہر سویز کے افتتاح سے اس راستہ کی وقعت اور بھی بڑھ گئی۔ مصر کے معاملات میں برطانیہ کے متواتر مداخلت کی بھی یہی وجہ ہے، اسی لئے برطانیہ نے نہر سویز میں خدیو مصر کے حصے خرید لئے، جنگ سوڈان اور جنگ مصر کی وجہ بھی یہی تھی کہ برطانیہ نہر سویز کو جو ہندوستان کا دروازہ ہے اپنے قبضۂ اقتدار میں رکھنا چاہتا ہے۔

پہلی جنگ کی طرح دوسری جنگ افغان کی وجہ بھی یہی تھی، اس پر پندرہ کروڑ پونڈ خرچ آیا مگر یہ تمام بار تقریباً غریب ہندوستان ہی کے سر پر پڑا۔

روس کے خطرہ کا تدارک بھی ضروری تھا اسلئے ۱۹۰۵ء میں تبت اور روس کے درمیان رابطۂ اتحاد کی مخالفت میں لارڈ کرزن نے ایک مسلح مشن تبت کو روانہ کیا جس کا اثر نہایت خاطرخواہ رہا بہرحال روس کا ہوّا اس وقت تک کسی نہ کسی شکل میں برطانیہ کو پریشان کئے ہوئے ہے۔

روسی خطرہ تو موجود ہی تھا کہ جرمنی نے بھی راتوں کی نیند حرام کرنا شروع کردی۔ ۱۸۳۵ء سے جرمن افسروں نے ترکی فوج کی تربیت وتنظیم میں دلچسپی لینا شروع کیا اور انیسویں صدی کے اختتام پر شاہ روم کی حکومت پر جرمن رسوخ کا غلبہ نظر آنے لگا۔ ۱۸۹۸ء میں قیصر ولیم دوم نے سیریا کی سیاحت کی اور اپنے تئیں مسلمانان عالم کا مربّی اور محافظ بتایا۔ یہ پالیسی جو مشرق قریب میں جرمن رسوخ کے فروغ کی ضامن تھی برطانیہ کو خار کی طرح کھٹکنے لگی۔ جرمنی نے بغداد تک ریلوے لائن جاری کرنے کا فیصلہ کیا لیکن برطانیہ نے امداد نہ دی، بالآخر یہ لائن ترکی کی امداد سے بن گئی مگر برطانیہ اور جرمنی کی کشمکش بڑھتی ہی گئی، اور دراصل یورپ کی جنگ عظیم کی بنیاد اسی وقت سے قائم ہو گئی تھی۔

جرمنی اور انگلینڈ کے درمیان یہ خلیج مغائرت دن بدن بڑھتی ہی گئی۔ اسکی وجہ ہندوستان اور محض ہندوستان تھا۔ آج بین الاقوامی سیاسیات سے سطحی طور پر بھی جو لوگ واقف ہیں وہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ جنگ یورپ کی اصلی وجہ ہندوستان پر برطانی قبضہ کے سوا اور کچھ نہ تھی۔

اس مختصر سے مضمون میں اُن تمام لڑائیوں کا ذکر کرنا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ہندوستان کے لئے لڑی گئیں ناممکن ہے، البتہ ہم نے مندرجہ بالا سطور میں "مشتے نمونہ از خروارے" پیش کرنے کی جو کوشش کی ہے اُس سے اس بات میں شک کرنے کی گنجائش نہیں رہی ہے کہ پچھلے ڈھائی سو سال میں ہندوستان امن عالم کا بدترین دشمن ثابت ہوا ہے، اسی کی ہستی اس تمام کشت وخون کی ذمہ دار ہے۔ ہاں یہی ہندوستان جو بین الاقوامی سیاسیات میں مرجاں مرنج کی پالیسی کا معترف اور قائل ہے امن عالم میں بے لطفی

پیدا کرنے کا باعث ثابت ہوا ہے۔

اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہندوستان پر ایک سات ہزار میل سے آئی ہوئی قوم کا فوجی قبضہ ہو۔ مٹھی بھر اہل انگلستان اس وسیع ملک پر جس کی زمین سونا اگلتی ہے اپنی حکمت عملی اور لیاقت سے قابض ہو گئے ہیں۔ اخلاقی نقطۂ نگاہ سے برطانیہ کو ہندوستان کو اپنے قبضۂ اقتدار میں رکھنے کا کوئی حق نہیں اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ ہندوستان کو بزور شمشیر تسخیر کیا گیا ہے تو بھی اخلاقی نقطۂ خیال سے یہ کسی طرح مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تمام قومیں دیکھتی ہیں کہ ہندوستان نے برطانیہ کے رسوخ و اقتدار کو دنیا کے بین الاقوامی حلقے میں کس قدر بلند کر دیا ہے، پھر وہ بھی کیوں نہ زور بازو اور فوجی طاقت سے دوسرے ایشیائی و افریقی ممالک میں اپنا اقتدار جمانے کی کوشش کریں۔ اس طرح ہر ایک ملک آتش حسد سے جلکر اپنی فوجی طاقت میں حتی الوسع اضافہ کرنے کا کوشاں ہے اسی نے اضافہ اسلحہ کی انتہا کے بعد اب مجبوراً تخفیف اسلحہ کی تحریک شروع ہوئی ہے۔

جب مقتدر اقوام عالم نے دیکھا کہ برطانیہ اپنی موقعہ شناسی، معاملہ فہمی اور قومی اتفاق و اتحاد سے ہندوستان پر کسی کی دال گلنے نہیں دیتا ہے تو ہر ایک نے چین میں اپنی ہستی قائم کی۔ خاص حقوق حاصل کرکے ہندوستان کی طرح ایک دوسری مشرقی سلطنت کی بنیاد رکھنی چاہی۔ اس عہد و پیمان نے دنیا کے امن کو کس قدر نقصان پہونچایا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، البتہ یہ ظاہر ہے کہ ماضی قریب میں ہندوستان کی محکومیت اور بے بسی نے امن عالم کی جان ناتواں پر بہت مہلک ضربات لگائے ہیں۔

آج دنیا نہایت سرگرمی سے "امن" کی تلاش میں سرگرداں ہے، لوگ جنگ و جدل اور کشت و خون کی زندگی سے متنفر ہو چکے ہیں، وہ ہر وقت "فوجی تیاری" کی زندگی سے اکتا گئے ہیں اور اب دنیا کو امن و آشتی کا گہوارہ بنانے کے خواہاں ہیں، اسی لئے "تخفیف اسلحہ کی کمیٹیاں" اور دنیا میں امن قائم رکھنے کی انجمنیں بنائی جا رہی ہیں، ان کی کارروائیوں اور قراردادوں کی نشر و اشاعت بڑے ثواب کا کام تصور ہوتا ہے۔ یہ خیال کرو جنگ کے سب سے بڑے سبب سے لاعلم نہیں درست ہے۔ وہ کبھی اس ہندوستان سے جس نے جنگ یورپ میں برطانیہ کو ایک ارب پونڈ کی امداد دی غافل نہیں ہو سکتے نہ وہ اس کے سپاہیوں کی شجاعت اور قربانی کی اسپرٹ سے بے خبر ہیں وہ واقف ہیں جو اتحادیوں کے حق میں اس قدر مفید ثابت ہوئی۔ غرض دنیا اس امر سے بخوبی آگاہ ہے کہ ہندوستان کی غلامی امن عالم کی راہ میں سدِ سکندری کا کام دے رہی ہے اور اگر اس ملک کی غلامی رفع ہو جائے تو اسکی وجہ سے دنیا کے امن و امان کو بڑی تقویت پہونچیگی۔

یہاں پر شاید اس امر پر روشنی ڈالنا بے سود نہ ہوگا کہ قیام امن کی آواز زیادہ تر وہی اقوام اٹھاتی ہیں جو اس وقت غریبوں کے حقوق دبائے بیٹھی ہیں۔ ان کے پنجے میں گرفتار قومیں رہائی کے لئے جد وجہد کر رہی ہیں۔ اہل دنیا ایک نئے دَور سے گذر رہے ہیں، زبردست پروپیگنڈے کی پردہ پوشیوں کے باوجود آج دنیا کو مظلوموں کی ناگفتہ بہ حالت سے بے خبر رکھنا مشکل ہو رہا ہے اور احساس حقوق کا تدارک اور جائز مطالبات کا رد کرنا دشوار سے دشوار تر ہو رہا ہے۔ اس لئے غاصب اقوام اس کوشش میں ہیں کہ "امن عالم" کے نام پر بے بس محکوم قوموں کے گلے گھونٹ دیں، ان کے پیدائشی حقوق ہمیشہ کے لئے غصب کر دیئے جائیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، اور غیر جانبدار قوموں کو معاہدوں کی کڑی زنجیروں سے ایسا جکڑ دیا جائے کہ وہ اپنی دلی ہمدردی کے باوجود مظلوموں کے حق میں زبان نہ کھول سکیں۔ یہ حال دیکھ کر بے اختیار اُس ڈاکو کی مثال یاد آتی ہے جو شہر کے متمول شرفاء کو لوٹ کر دنیا کو شریفانہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کیا کرتا تھا، واقعی اس کا فائدہ اسی میں تھا کہ تمام دنیا نیکی کی زندگی بسر کرے۔ غصب کردہ حقوق کی واپسی ہمیشہ مشکل ہوتی ہے، مگر تر نوالے حکمت عملی ہی سے ہضم ہو سکتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے داعیانِ امن عالم کی تصریحات اسی جذبہ پر مبنی ہیں، لیکن اس میں کلام نہیں کہ دنیا کا امن ہندوستان کی آزادی سے وابستہ ہے، اور جب تک اس پر کسی قوم کا بھی فوجی قبضہ رہے گا دنیا میں امن کا خیال واہمہ ہوگا۔

اس مضمون میں ہم نے ارادتاً اس بے نظیر کشمکش پر اظہار خیالات سے احتراز کیا ہے جس میں حال ہی میں ہندوستان کی آبادی کا بہت کثیر حصہ شامل رہ چکا ہے اور جس نے دنیا کی آنکھیں کھول دی ہیں، کیونکہ "امن عالم" سے اس کا دُور کا تعلق ہے۔ لیکن ہندوستان کی اس بے مثال انقلاب انگیز جدوجہد نے دنیا کی توجہ اس کی طرف مبذول کرا لی ہے اور اس کا اثر اس وقت تمام دنیا پر نظر آتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مستقبل قریب یا بعید میں ہندوستان اور "امن عالم" کا کیا تعلق ہوگا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا دارومدار ہندوستان کی غلامی یا آزادی پر ہے

مگر کیا امن عالم کے مدعیان آزادی ہند کے بھی علمبردار ہیں؟

رباعیات باباطاہر عریاں

(از مولوی حامد حسن قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ)

فارسی شاعری کے آغاز کے متعلق مختلف روایات مشہور ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ حکومت صفاریہ کے بانی یعقوب بن لیث کا بچہ ایک دن اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ گولیاں کھیل رہا تھا، ایک گولی جو سوراخ سے دور جا پڑی تھی ڈھلک کر آہستہ آہستہ سوراخ کی طرف جانے لگی، لڑکا بے اختیار چلا اٹھا

غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گو

یعقوب کو خبر ہوئی تو وہ اس مصرع کو سنکر بہت خوش ہوا اور ماہران فن سے اس کا وزن دریافت کیا، اور اس پر تین مصرع چسپاں کرنے کی فرمایش کی، چار مصرع پورے ہوگئے تو دوبیتی اسکا نام رکھا جو بعد کو رباعی مشہور ہوا۔ یہ واقعہ ۲۶۵ھ کا ہے۔

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو رباعی کو اولین نظم فارسی ہونے کا فخر حاصل ہے، بہر حال رباعی کے ان امتیازات میں کوئی شک نہیں کہ:-

(۱) رباعی چھوٹی سے چھوٹی مستقل نظم ہے، اگرچہ قطعہ بھی دوبیت کا ہوتا ہے مگر لازمی طور پر نہیں، دس بیں شعر کا بھی ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے۔

(۲) رباعی اپنے مخصوص وزن کے سبب سے تمام اصناف شاعری سے ممتاز ہے، غزل یا قصیدے کے دو قطعہ بند شعروں پر رباعی کا دھوکا نہیں ہوسکتا بلکہ قطعہ کا ہوسکتا ہے۔

(۳) رباعی چونکہ مختصر سی نظم ہوتی ہے اس لئے اس کے چار مصرعوں کی ترتیب میں خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ کوئی نادر خیال یا لطیف نکتہ رباعی میں بیان کیا جاتا ہے اس طرح کہ پہلا شعر اس کے مناسب کہا جاتا ہے اور دوسرے شعر میں وہ خیال یا نکتہ اس ترتیب سے بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا نادر و لطیف حصہ چوتھے مصرع میں ہوتا ہے اور تیسرا مصرع سامع کے ذہن کو اسکی طرف

متوجہ و مشتاق کردیتا ہے، مگر رباعی میں یہ حسن ترتیب نہیں ہے، تو صرف چار مصرع ماہران فن کے نزدیک رباعی کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ مولوی سید مہدی حسن صاحب ناصری ایم۔ اے اپنی کتاب مخزن الفوائد میں اسی رائے کی تائید میں صائب کا یہ شعر پیش کرتے ہیں:۔

از رباعی بیت آخری زند ناخن بہ دل   خط پشت لب بچشم ما ز ابرو خوشتر است

نیز کسی شاعر کی یہ رباعی نقل کرتے ہیں:۔

اے اختر فیض را نغیرت مطلع   طبع تو سروساں سخن را مجمع

از بسکہ رباعی توانت او بلند   ہر مصرع او بود چہارم مصرع

اسی خیال کو پیش نظر رکھکر خاکسار راقم نے یہ نعتیہ رباعی کہی ہے۔

دنیا میں رسول اور بھی لاکھ سہی   زیبا ہے مگر حضور کو تاج شہی

ہے خاتمۂ حسن عناصر اُن پر   ہیں مصرع آخر اس رباعی کے وہی

(۴) رباعی کو ایک یہ شرف بھی حاصل ہے کہ مضامین تصوف سب سے پہلے رباعی ہی کے ذریعہ سے ادا کئے گئے اور حضرت مولانا سلطان ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ نے اسکی ابتدا کی، ان کی رباعیوں میں مضامین تصوف دیکھکر بعد کے شعرا نے غزل، قصیدے اور مثنوی میں بھی تصوف کو داخل کیا۔ جب تک تصوف شاعری میں شامل نہ ہوا تھا فارسی شاعری سوز و گداز اور درد و اثر سے خالی تھی، تو گویا رباعی کا فارسی شاعری پر یہ احسان ہے، کہ اس نے فارسی شاعری کو زیادہ دلکش و موثر بنا دیا۔

رباعی پر تقریباً تمام اساتذۂ قدیم و جدید نے طبع آزمائی کی ہے، لیکن حضرت بوسعید ابوالخیر اور حکیم عمر خیام صنف رباعی کے مشاہیر گزرے ہیں کہ اُنھوں نے اپنے اظہار کمال کے لئے رباعی کو مخصوص کر لیا ہے۔ اور اس تنگنائے سخن میں وہ جولانیاں دکھائی ہیں کہ عقل حیران ہے۔ ان ناموران رباعی کے ساتھ تیسرا نام باباطاہر ہمدانی کا لیا جاسکتا ہے۔ جو زمانے کے لحاظ سے تیسرے نہیں بلکہ دوسرے ہیں، حضرت ابوسعید نے ۴۴۰ھ میں انتقال کیا اور باباطاہر نے ۴۱۰ھ میں، یہ دونوں بزرگ ہمعصر تھے۔

باباطاہر کی رباعیاں رباعی کے مخصوص وزن (بحر ہزج اخرب) میں نہیں ہیں بلکہ ہزج مسدس محذوف (مفاعیلن مفاعیلن فعولن) میں ہیں اس لئے اصطلاح رباعی سے خارج چاہیئے۔ لیکن رباعی کی اور تمام خصوصیات ان میں موجود ہیں۔ قوافی بھی قاعدہ رباعی کے مطابق

یعنی پہلے دوسرے اور چوتھے مصرع میں قافیے ہیں، اس لئے قطعہ کی بھی صورت نہیں رہی۔ تو اب ان کو کیا نام دیا جائے۔ رائے عام نے بجائے قطعہ کے ان کو رباعی ہی کہا۔ ایران میں اسی نام سے مشہور ہیں۔

اِن رباعیوں کی زبان بھی عام فہم و متعارف فارسی نہیں ہے۔ محققین کی رائیں اسکے متعلق مختلف ہیں۔ قرین قیاس یہ ہے کہ ایران کے کسی صوبہ (غالباً صوبہ رے) کی دیہاتی یا قدیم زبان ہے، چنانچہ آتشکدہ آذر کی یہی رائے ہے۔ لکھتا ہے:۔

"عریاں اسمش بابا طاہر دیوانہ ایست از ہمدان، فرزانہ ایست ہمہ دان، احوالش در کتب مذکور و اخلاقش بین المعرفہ مشہور، عاشقے شیدا و سوزش بجاں از اشعارش ہویدا۔ بزبانِ راجی بوزن خاص دو بیتی بسیار گفتہ کہ اکثر از آنہا امتیاز کلی دارد۔"

راجی کی جیم رے کا بدل ہے یعنی رازی (صوبہ رے کی زبان) بعض کی رائے ہے کہ یہ رباعیاں ایران کی قدیم زبان میں ہیں۔ لیکن "قدیم زبان" کہنے سے اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔ رباعیات کی زبان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قصبات و دیہات کے غیر تربیت یافتہ لوگ الفاظ و تلفظ میں جس قسم کا تغیر اپنے لب و لہجہ اور آسانی کے مطابق کر لیتے ہیں، اسی نوع کا تغیر ان رباعیوں میں بھی ہے۔ جس طرح ہندوستان کے دیہاتی بولتے ہیں، ہمرے سنگ (ہمارے ساتھ) بھور بھئی (صبح ہوگئی) کرت نا ہیں (کرتے نہیں ہیں) وغیرہ۔ اسی طرح بابا طاہر نے اپنے ملک کے دیہاتیوں کی بولی میں کہا ہے دیرم (دارم)، سوجہ (سوزد)، نمونہ (نماند) دونو (داند) وغیرہ۔

کرمان کے ایک عالم نے پروفیسر براؤن کے استفسار کے جواب میں ان رباعیات کی زبان کے متعلق لکھا ہے کہ یہ شیراز و اصفہان کی لری زبان ہے جو پہلوی کی ایک صورت ہے۔ بہت سے شعرا مثلاً سعدی، ابو اسحاق، حافظ، خواجو کرمانی نے بھی اس زبان میں اشعار کہے ہیں۔

بابا طاہر کا ذکر بعض تذکروں میں نظر آتا ہے، مثلاً آتشکدہ آذر، ریاض العارفین، مجمع الفصحا لیکن سوانح حیات سے سب خاموش ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ بتاتے ہیں کہ ہمدان کا رہنے والا تھا مجذوب تھا، برہنہ رہتا تھا، اس لئے عریاں کہلاتا ہے، شیوخ و صوفیائے کرام میں اس کا شمار تھا۔ فردوسی کا ہمعصر تھا، ۴۱۰ھ میں وفات پائی۔

مستشرقین مغرب نے جو داد تحقیق دی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بابا طاہر فرقہ نصیری سے تھا جو حضرت علی کو خدا مانتے ہیں۔ قبیلہ لرون سے تعلق رکھتا تھا اس لئے لری کہلاتا ہے۔

ہیرن الین نے بابا طاہر کی رباعیات کا مترجم ایڈیشن شائع کیا ہے، اس کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ بابا طاہر لکڑہارے کا بیٹا تھا، مدرسہ میں پڑھتا تھا لیکن ذہن اچھا نہ تھا، استاد کی تقریر سمجھ میں نہ آتی تھی، ایک دن ہم جماعت لڑکوں سے کہا کہ تم سبق کو کس طرح سمجھ لیتے ہو ہماری تو سمجھ میں آتا نہیں، لڑکے ہنسنے لگے، ایک بولا کہ ہم تو رات کو تالاب میں غوطہ لگا آتے ہیں اور چالیس مرتبہ سر کو دھوتے ہیں۔ طاہر کو اس مذاق کا یقین آگیا، رات کو تالاب پر پہونچا اور وہی عمل کیا، اسی وقت ایک شعلہ پیدا ہوا، اور طاہر کے منہ میں داخل ہوگیا، صبح کو جو مدرسہ میں آیا تو ذہن روشن تھا، اور دماغ حکمت و فلسفہ کا گنجینہ، سب اس قلب ماہیت سے متحیر ہوگئے۔ اس کے بعد سے بابا طاہر کے جسم میں اس قدر گرمی پیدا ہوگئی کہ کوئی شخص اس کے پاس نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اب بابا طاہر میں جذب کی کیفیت پیدا ہوگئی اور برہنہ پھرنے لگا۔

میں نے رباعیات ابوسعید ابوالخیر کے دیباچہ میں بابا طاہر کے متعلق یہ رباعی لکھی تھی:-

ہم عصر ابوسعید بابا طاہر مجذوب ہے لیکن ہے عجب کاشف سر
حیران ہیں دیکھ کر کلام اہل نظر کیں خاتر عقل نے بھی عقلیں فاتر

واقعہ یہ ہے کہ بابا طاہر کا کلام سادگی و سلاست کے ساتھ نہایت دلکش و موثر اسلوب بیان کا حامل ہے۔ معمولی بات کہتا ہے لیکن کہیں طرز ادا سے کہیں خوبی تمثیل سے ایک ندرت اور جدت پیدا کر دیتا ہے۔ اکثر رباعیوں سے شیفتگی و وارفتگی مترشح ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کے شوق میں نہیں کہتا بلکہ دل کے جوش سے کہتا ہے، اور واردات بیان کرتا ہے۔ اس لئے اصول قافیہ کی پروا نہیں کرتا، ایک قافیہ دو جگہ لے آتا ہے۔ تقریباً تمام رباعیات غیر متعارف دہقانی یا قدیم زبان میں ہیں۔ لیکن ایک دو رباعیاں عام و معروف زبان میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً:-

اگر دردم یکے بودے چہ بودے دگر غم اندکے بودے چہ بودے
ببالینم حبیبم یا طبیبم ازیں دو گر یکے بودے چہ بودے

بعض رباعیاں ایسی ہیں کہ قدیم الفاظ کی جگہ جدید رکھ دیے جائیں تو معمولی زبان کی رباعیاں بن جائیں گی، مثلاً:-

نگارینا دل و جانم تہ داری ہمہ پیدا و پنہانم تہ داری
ندونم مو کہ این درد از کہ دیرم ہمی دونم کہ درمانم تہ داری

اس کو اس طرح پڑھ سکتے ہیں:-

نگاریا دل وجانم تو داری　　ہمہ پیدا و پنہانم تو داری
ندانم من کہ این درواز کہ دارم　　ہمی دانم کہ درمانم تو داری

میں نے چند رباعیوں کا ترجمہ اُردو رباعیوں میں کیا ہے۔ باباطاہر کی رباعیاں رباعی کے وزن میں نہیں ہیں مگر میں نے ترجمہ میں رباعی کی بحر قائم رکھی ہے۔ ان کے درج کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ باباطاہر کی لغات کا حل لکھدوں تاکہ ناظرین کو اصل رباعیات کے سمجھنے میں آسانی ہوجائے۔

نسوچہ	نسوزد	ازن	کنند
بسوجونم	بسوزانم	پا ئے نہ بے	پائے نیست
نبسوجم	بسوزم	تہ	ترا
غمینہ (ہ)	غمین است (است)	درنشی	دور نشود
مو	من	بیتہ	بے تو
دیرم	دارم	وینم	بینم
ریزہ	ریزد	گیٹرہ۔ ویٹرہ	پریشاں
نمونہ	نماند	بے	بود۔ باشد
نموین	نمایند	زمو بستون	زمن بستاند
خیٹرہ	خیزد	کنہ	کند
مو آں دیرم	من آں دار (درخت) ہستم	وینن	بینند
دینہ	بیند	نشینن	نشینند
گردہ	گردد	بشم	بشوم

اب چند رباعیاں مع ترجمہ ملاحظہ ہوں:-

رباعیات باباطاہر　　ترجمہ از حامد حسن قادری

دلت اے سنگدل[1] بر ما نسوچہ　　حالت یہ مری تجھے[1] ترس آتا کیا
عجب نبود اگر خارا نسوچہ　　پتھر ہے تو پھر جلے گا دل تیرا کیا
بسوجم تا بسوجونم دلت را　　جلتا ہوں کہ تیرے دل میں بھی آگ لگے
در آتش چوب ترتنہا نسوچہ　　ظاہر ہے جلے گی چوب ترتنہا کیا

(۲)

دلم از درد تو دائم غمینہ
بالین خشتم و بستر زمینہ
ہمین جرمم کہ موتہ دوست دیرم
نہ ہر کت دوست دارد حالش اینہ

(۲)

دائم ترے درد سے ہوں رنجور و حزیں
تکیہ مرا خشت اور بستر ہے زمیں
یہ جرم سہی کہ میں ترا عاشق ہوں
لیکن سب عاشقوں کا یہ حال نہیں

(۳)

ز دل نقش جمالت در نشی یار
خیال خط و خالت [illegible] نشی یار
مژہ سازم بگرد دیدہ پرچین
کہ خون ریژد خیالت در نشی یار

(۳)

دل سے نہیں مٹتی تری تصویر جمال
ہٹتا نہیں اک دم کو خیال خط و خال
پلکوں سے یہ روک ہے کہ بہ خون [illegible]
ایسا نہ ہو آنکھوں سے نکل جائے جمال

(۴)

بورہ یک دم دلم خرم نمونہ
اگر روی تو وینم غم نمونہ
اگر دردم قسمت [illegible] نوین
ولی بی درد در عالم نمونہ

(۴)

دل [illegible] ترے بغیر [illegible]
جب دیکھوں تجھے [illegible]
کر دیں [illegible] درد [illegible]
بے [illegible] کوئی [illegible]

(۵)

دلی دیرم ز عشقت گیژ و ویژہ
مژہ [illegible] زنم [illegible] سیلابہ خیژہ
[illegible] عاشق [illegible] ال چوب
[illegible] سوجہ [illegible] خونابہ [illegible]

(۵)

[illegible]

(۶)

دلی نازک بسان شیشہ ام بی
اگر آہی کشم اندیشہ ام بی
سرشکم گر بوہ خونین عجب نیست
موآن دیرم کہ در خون ریشہ ام بی

[illegible]
[illegible]
[illegible] خونیں [illegible]
[illegible] خون میں [illegible]

(۷)

زشور انگیزی چرخ فلک بے
کہ دائم چشم زخمم پر نمک بے
دما دم درد آہم تا سماوات
دلم نالان و اشکم تا سمک بے

(۷)

مجھ پر ستم و جور فلک رہتے ہیں
دائم مرے زخم پر نمک رہتے ہیں
یا آہ رسا تا بہ سما رہتی ہے
با اشک رواں تا بہ سمک رہتے ہیں

(۸)

خداوندا بسی زارم ازیں دل
شو و روزاں در آزارم ازیں دل
زبس نالیدم از نالیدنم [illegible]
ہمو بستوں کہ بیزارم ازیں دل

(۸)

اس دل کے سبب سے خستہ و زار ہوں میں
آزار میں دن رات گرفتار ہوں میں
نالاں رہوں اس نالہ و فغاں سے اپنے
ایسے کوئی دل [illegible] دل سے بیزار ہوں میں

(۹)

زدست دیدہ و دل ہر دو فریاد
کہ ہر چہ دیدہ بیند دل کند یاد
بسازم خنجری نیشش ز پولاد
زنم بر دیدہ تا دل گردد آزاد

(۹)

دل دیدہ دو دیدہ سے یارب فریاد
دیکھے جو نظر آ کے دل کرے پھر کیوں یاد
فولاد کی نوک کا بناؤں خنجر
اور بھونک دوں آنکھ میں کہ دل ہو آزاد

(۱۰)

خرم آناں کہ ہر زماں تہ وینن
سخن واتہ کرن واتہ نشینن
[illegible]
[illegible]

(۱۰)

خوش ہیں وہ جنھیں دیدار میسر ہے ترا
باتیں کریں پاس بیٹھیں تو گویا
[illegible] ترا جو میری قسمت میں نہ
[illegible] بیٹھے ہیں تجھے [illegible]

زندگی کا سہارا

(از ٹھاکر جے۔آر۔اے صاحب، جرنلسٹ)

زندگی کی کرشمہ سازیاں

"زندگی" ایک ایسا لفظ ہے جس کو ہم روزمرہ سیکڑوں مرتبہ بولتے ہیں، مگر اس کے حقیقی مفہوم سے شاید بہت کم لوگ واقف ہونگے۔ لہذا سائنس کی جدید تحقیقات کے مطابق زندگی کی حقیقت پر غور کرنا خالی از لطف نہ ہوگا۔

زندگی عالمگیر ہے، اس کی کیفیتیں گوناگوں اور اس کی کرشمہ سازیاں بے بیان ہیں، اگر اوپر نگاہ اُٹھائیے تو سینکڑوں پرندے اڑتے پھرتے اور ایک دوسرے کا تعاقب کرتے نظر آتے ہیں ہزاروں کیڑے مکوڑے بھنبھناتے دکھائی دیتے ہیں، کرہ ہوا میں ایسے ننھے ننھے جاندار بھی پائے جاتے ہیں جو خوردبین کی مدد کے بغیر نظر نہیں آتے۔ گذشتہ چوتھائی صدی کی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خشکی اور تری کا ہر ایک حصہ نباتات اور حیوانات کا ملجا و ماویٰ ہے۔ خشکی کی کیفیت یہ ہے کہ خواہ ہمالیہ کی دائمی برف سے ملبوس چوٹیاں ہوں یا قطبین کے یخ بستہ خطے، لق و دق صحرا اور جھلستے ہوئے ریگستان ہوں یا سرسبز مسطح میدان اور شاداب وادیاں۔ ہر قسم کے پودے جھومتے اور انواع و اقسام کے حیوانات کلیلیں کرتے نظر آتے ہیں۔ تری پر نگاہ ڈالئے تو خواہ تالاب ہو یا چشمہ، یا جھیل یا سمندر، ہر جگہ طرح طرح کی روئیدگی اور ہر قسم کے جاندار تیرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ماہروں کی تحقیقات سے سرد سے سرد مقاموں اور کھولتے ہوئے چشموں کے اندر بھی جاندار دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ تماشا گاہ عالم میں زندگی نے کیسی عجیب و غریب صورتیں اختیار کی ہیں۔ جدھر دیکھئے اسی کا ظہور نظر آتا ہے، روئے زمین کے تینوں طبقات اسی کی کرامات سے آباد و شاد نظر آتے ہیں۔ سطح زمین ہی پر کیا موقوف ہے، شکم زمین بھی ہزاروں قسم کے جانداروں کی پناہ گاہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے نیز بڑے بڑے جانور بھی اس کے اندرونی طبقات میں پناہ گزین پائے جاتے ہیں۔ ماہران بیالوجی کی رائے ہے کہ روئے زمین پر تین لاکھ کے قریب ریڑھ دار اور بے ریڑھ کے جانور پائے جاتے ہیں، علاوہ ازیں دس لاکھ قسم کے نہایت لطیف اور ننھے ننھے جاندار بھی شمار کئے گئے ہیں۔ عالم نباتات میں پانچ لاکھ قسم کے پودے، درخت، بیلیں، اور ادنیٰ قسم کی

ہوئیدگی اندازہ کی گئی ہے۔گویا انواع حیوانی اور نباتی اٹھارہ لاکھ کے قریب ہیں۔جن کے ذرے ذرے میں زندگی کی کرشمہ سازیاں ہویدا ہیں۔ مگر زندگی کی اور عجیب صورتیں بھی ہیں۔ مخدرات کا اثر جاندار وں پر کیسا عجیب وغریب ہوتا ہے۔حس نابود ہوجاتی ہے۔ڈاکٹر ایتھر پیش کرتا ہے مگر حس کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ جان باقی رہتی ہے مگر اُس کی حرکات معطل ہوجاتی ہیں۔نشہ آور ادویات کے اثر سے گھنٹوں تک انسان بے خبر پڑا سوتا رہتا ہے۔عمل تنفس جس پر زندگی کا انحصار ہے قائم رہتا ہے، مگر عقلی، اخلاقی اور طبعی قوتیں مسلوب ہوجاتی ہیں۔سختی اور سکتہ طاری ہوجاتا ہے۔جن ملکوں میں مہینوں تک برف پڑتی رہتی ہے وہاں پر جانور مہینوں تک نیم مردہ رہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں مینڈک زمین کے اندر چھپے رہتے ہیں۔ان کی حالت پر "تعطل حیات" (Suspended Animation) کا مخصوص محاورہ عائد ہوتا ہے۔ایسے جانور بھی پائے گئے ہیں جو بظاہر مردہ معلوم ہوتے ہیں، گویا انسان کی طرح موت کا بہانہ کرتے ہیں یہ مصنوعی مُردے کہلاتے ہیں۔بعض جانوروں کا دل سینہ سے نکالکر دکھایا گیا ہے کہ کئی دن تک اس کی حرکت قائم رہتی ہے۔ بعض جانوروں کا سر قلم کردیا جاتا ہے مگر اُن کا جسم حرکت کرتا رہتا ہے اور وہ بغیر سر کے سہارے چلتے پھرتے رہتے ہیں۔بعض ایسے ننھے ننھے کیڑے ہوتے ہیں کہ جب کاٹکر اُن کے ٹکڑے کردیے جاتے ہیں، تو تھوڑی دیر بعد ہر ایک ٹکڑا جداگانہ مکمل جاندار کی صورت میں نمایاں ہوجاتا ہے۔اس سے عیاں ہوتا ہے کہ مظاہر زندگی کیسے تعجب انگیز اور عجیب وغریب ہیں۔ ارباب سائنس ان کی تشریح کرنے سے عاجز ہیں۔

جان کی ابتدا کا پیچیدہ مسئلہ

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کی ابتدا کیسے ہوئی تھی؟ اس عجب طرح معنی سوال کے مختلف جوابات دیئے جاتے ہیں۔اہل مذہب اور مقلدان روایات کا یہ عقیدہ ہے کہ قادر علی الاطلاق کی حکمت و قدرت سے جاندار اور دیگر تمام موجودات ظہور میں آئی ہیں اور اس کے ذریعہ سے وہ قائم اور برقرار ہیں۔ حکما اور اہل فلسفہ کا یہ خیال ہے کہ کسی زمانہ میں زندگی کا آغاز ضرور ہوا تھا لیکن جب ہم زمانۂ حال کے ماہران سائنس کے مفروضات اور قیاسات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ان میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ جس ہیولا سے کرۂ ارض بنا تھا، اس کے اندر جراثیم زندگی موجود تھے دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ جراثیم زندگی عالم بالا میں اڑتے پھرتے ہیں، وہ شہاب ثاقب یا سورج کی کرنوں کے وسیلہ سے کرۂ زمین پر نازل ہوئے جن سے بیشمار جاندار اور نباتات معرض وجود میں آئے ہیں۔تیسرا فریق یہ کہتا ہے کہ کرۂ ارض میں جو مرکبات اور مواد تھے انھیں کے امتزاج کیمیائی سے سیانوجن اور اس کے مرکبات ظہور میں آئے جن سے جوہر حیات پیدا ہوا تھا۔پچھلی صدی کے ماہروں کا یہ خیال تھا کہ جاندار ابتدائی ذی جان ہستیوں سے پیدا ہوئے تھے۔مگر موجودہ زمانہ کے ماہروں کا یہ مسئلہ اور مقبول عام خیال ہے

گی عملِ ارتقا سے بے جان مادہ سے پیدا ہوئی تھی، پروفیسر آرتھر جے ٹامسن راوی ہیں کہ دو ہزار سے یہی خیال مروج چلا آتا ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ مسئلہ ارتقا کی ابتدا کے ساتھ ہی یہ خیال بھی پیدا تھا، اس کی مقبولیت کے پہلو بہ پہلو اسے بھی قبولیت عامہ نصیب ہوتی رہی۔ اور اب یہ سائنس دانوں کا مقبول عام نظریہ ہے۔

بڑے بڑے ماہروں کا یہ بیان ہے کہ کرۂ ارض دو ارب سال پہلے مادۂ آفتاب سے علیحدہ ہو کر خود گردش کرنے لگا۔ شروع میں یہ آتشین سحاب تھا اس وجہ سے جانداروں کی بود و باش کے قابل نہ تھا وہاں نہ تو پانی تھا نہ کرۂ ہوا جو ان کی ہستی کے واسطے ضروری ہے۔ لیکن ایک ارب برس ہوئے کہ ارتقا سے کرۂ ارض ٹھنڈا اور ٹھوس ہو گیا اور ایسے طبعی حالات رونما ہوئے کہ جاندار زندہ رہ سکتے تھے نتیجہ ابتدائی جاندار جو خلیہ کے مشابہ تھے پانی سے برآمد ہوئے۔ ماہروں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ زندگی کا اولین مسکن پانی تھا۔ پروفیسر اے۔ ایچ۔ ریچ ممتاز ماہر بیالوجی کا یہ بیان ہے کہ ابتدائی سمندر میں ننھے ننھے جراثیم از را طاسے تھے جو بعد میں نباتات کے پیدا ہونے کے موجب ہوئے۔ پروفیسر آرتھر ٹامسن کہتے ہیں کہ یہ ابتدائی جاندار گول گول ذرے تھے جن کے استحالہ اور ارتقا سے کروڑوں برسوں کے بعد نباتات اور حیوانات کی مختلف قسمیں ظہور میں آئی ہیں۔ پروفیسر اسٹوارٹ اور ٹیٹ نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "عالمِ غیر مرئی" (The Unseen Universe) میں اپنے زمانہ کے ماہران بیالوجی کے مسلّمہ نظریہ کا یوں اظہار کیا تھا: "جب سالمات اولیں کے اختلاط و ترکیب سے کیمیائی مواد ظہور میں آ گئے اور کرۂ ارض ٹھوس و سرد ہو گئی تو ابتدائی جاندار ظہور میں آئے، جو موجودہ جانداروں سے کلیتاً مختلف تھے، ان کی طبعی ساخت ہر قسم کی پیچیدگی اور ترکیب سے بیگانہ تھی۔ مگر بیشمار قرنوں کے بعد مختلف قسم کے اعضاء رکھنے والے جانور رونما ہوئے، جو بتدریج ترقی کرتے کرتے مختلف قسم کی صورتوں میں نمایاں ہو گئے، ان کی شکل و صورت ہر قرن میں بدلتی رہی۔ اسی طرح بیشمار صدیوں کے بعد ان ہی جانوروں کے طبقہ سے انسان ظہور پذیر ہوا۔ جو عقل و ہوش سے آراستہ ہے اور اپنے ماحول کے ظہورات پر نگاہ غائر ڈالنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر وہ اپنا مقابلہ حیوانات سے کرے، تو وہ کئی باتیں اپنے آپ جانوروں میں مشترکہ پائے گا۔" اس بیان سے عیاں ہے کہ ماہران موصوف مسئلۂ ارتقا کے حامی ہیں۔ مسٹر ڈبلیو پروفیسٹ اپنی مستند تصنیف "آفرینشِ مادّہ" (Creation of Matter) میں اسی مسئلہ کی نسبت بصراحت یوں لکھتے ہیں کہ "مسئلۂ ارتقا کے مقلّد یہ بھی مانتے ہیں کہ کرۂ ارض کی تاریخ میں ایک دور ایسا بھی تھا جب کہ اس کی سطح ہر قسم کی روئیدگی اور جانداروں کی ہستی سے ناآشنا تھی عمل کیمیائی اور سالمات کے کشش

باہمی سے پروٹوپلازم ظہور میں آیا۔ جو جوہر زندگی اور سرچشمۂ حیات ہے۔ قدرتی عمل کی تحریک سے یہ جاندار مادہ بڑھتا رہا، پھر اس کے اندر عمل تفریق شروع ہوا۔ آخرکار "امیبا" ایسے لطیف و نازک جاندار پیدا ہوئے ان کے اندر جداگانہ عمل حیات شروع ہوا۔ کچھ عرصہ بعد اس کے اندر قلب اور خلیات نمودار ہوئے، جو انواع و اقسام کے تغیرات سے متاثر ہوتے رہے۔ ان کا شمار بھی بڑھتا چلا گیا، بعد میں ان کی وساطت سے اور جاندار نمایاں ہوئے۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا جانداروں کی ساخت جسمانی پیچیدہ ہوتی چلی گئی، ان کے اجسام کے حصے اور اعضا نیز ساخت پیچیدگی اختیار کرتی گئی۔ انواع حیوانی کے شمار کے تناسب سے کشاکش زیست بھی بڑھتی رہی، اس معرکے میں کمزور اور زیردست نابود ہوتے رہے لیکن زورآور اور قوی الجثہ گوئے سبقت لیجاتے اور میدان ترقی میں آگے بڑھتے رہے۔ کروڑوں برس اسی طرح گزر گئے جس کے دوران میں جانداروں کی ظاہری و باطنی ہیئت میں اہم تغیر واقع ہوگیا۔ اعضا اور خلیات کلیتاً بدل گئیں رفتہ رفتہ بیشمار قرنوں کے بعد یہ جانور ظہور میں آئے جو روئے زمین پر موجود ہیں۔ اس مختصر بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ شروع میں روئے زمین پر جاندار کس طرح ظہور پذیر ہوئے تھے اور کس طرح بیشمار قرنوں کے دوران میں ان کا استحالہ ہوتا رہا جس سے ان کی طبعی ساخت میں عظیم انقلاب واقع ہوا، اور پھر کروڑوں برسوں کے تغیرات سے دوچار ہونے کے بعد اپنے ارتقا طبعی کے اس مرحلہ پر نمودار ہوئے ہیں۔

مبدء حیات | یہاں پر غالباً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "مبدء حیات کیا ہے؟ زندگی کی اصلیت اور اس کا سہارا کیا ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ سرچشمۂ زیست اور مستقر حیات پروٹوپلازم ہے۔ جسے جوہر حیات اور جانداروں کا فطری ہیولا قرار دیا گیا ہے۔ ہر قسم کے نباتات اور موجودات ذی روح اسی کے اشارے سے ظہور پذیر ہوتے اور برقرار رہتے ہیں۔ ابتدائے عالم میں یہی جاندار مادہ تھا جس سے جاندار رونما ہوئے، اب بھی یہی مادہ ہے جو پودوں اور جانوروں کی ہستی کا منبع و مدار حیات ہے۔ اس کی نسبت برطانیہ کے مشہور ماہر پروفیسر ای۔ ڈبلیو۔ میک برائڈ (فیلو رائل سوسائٹی لنڈن) اپنی ایک تازہ مستند تصنیف میں یوں لکھتے ہیں کہ "پودوں اور جانداروں کے اجسام میں جتنے عمل طبعی ہوتے ہیں، ان کا محرک اولی پروٹوپلازم ہے۔ جو ہر قسم کے تغیرات کا مرجع ہے۔ نشوونما کی تحریک ان ہی سے بہم پہونچتی ہے، صفرا، دودھ، لعاب دہن اور عروق معدہ اسی کے اشارے سے ظہور میں آتے ہیں۔ جوہر حیات مبدء نمو ہے، اسی کی بدولت غذا الخ و بدن بنتی اور قوت مہیا کرتی ہے، اسی کی کرامت سے جانداروں کے اندر ذرہ ہائے حیات پیدا ہوتے ہیں، جن کی وساطت سے نئے جاندار عالم ظہور میں آتے ہیں۔" اس سے ظاہر ہے کہ جانوروں اور پودوں کی ہستی ناپائدار کا انحصار پروٹوپلازم پر ہے

کہ زندگی عملِ ارتقاء سے بے جان مادہ سے پیدا ہوئی تھی، پروفیسر آرتھر جے ٹامسن راوی ہیں کہ دو ہزار برس سے یہی خیال مروج چلا آتا ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ مسئلہ ارتقا کی ابتدا کے ساتھ ہی یہ خیال بھی پیدا ہوا تھا، اس کی مقبولیت کے پہلو بہ پہلو اسے بھی قبولیت عامہ نصیب ہوتی رہی۔ اور اب یہ سائنس دانوں کا مقبول عام نظریہ ہے۔

بڑے بڑے ماہروں کا یہ بیان ہے کہ کرۂ ارض دو ارب سال پہلے مادۂ آفتاب سے علیحدہ ہو کر بطور خود گردش کرنے لگا۔ شروع میں یہ آتشین سحاب تھا اس وجہ سے جانداروں کی بود و باش کے قابل نہ تھا وہاں نہ تو پانی تھا نہ کرۂ ہوا جو ان کی ہستی کے واسطے ضروری ہے۔ لیکن ایک ارب برس ہوئے کہ عمل ارتقا سے کرۂ ارض ٹھنڈا اور ٹھوس ہو گیا اور ایسے طبعی حالات رونما ہوئے کہ جاندار زندہ رہ سکتے تھے چنانچہ ابتدائی جاندار جو خلیہ کے مشابہ تھے پانی سے برآمد ہوئے۔ ماہروں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ زندگی کا اولین مسکن پانی تھا۔ پروفیسر اے۔ ایچ۔ چرچ ممتاز ماہر حیاتیات کا یہ بیان ہے کہ ابتدائی سمندر میں ایسے ننھے ننھے جراثیم از قسم اسے تھے جو بعد میں نباتات کے پیدا ہونے کے موجب ہوئے۔ پروفیسر آرتھر جے۔ ٹامسن کہتے ہیں کہ یہ ابتدائی جاندار گول گول ذرے تھے جن کے استحالہ اور ارتقا سے کروڑوں برسوں کے بعد نباتات اور حیوانات کی مختلف قسمیں ظہور میں آئی ہیں۔ پروفیسر اسٹوارٹ اور ٹیٹ نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "عالمِ غیر مرئی" (The Unseen Universe) میں اپنے زمانہ کے ماہران بیالوجی کے مسلمہ نظریہ کا یوں اظہار کیا تھا۔ "جب سالمات اولیں کے اختلاط و ترکیب سے کیمیائی مواد ظہور میں آ گئے اور کرۂ ارض ٹھوس و سرد ہو گئی تو ابتدائی جاندار ظہور میں آئے، جو موجودہ جانداروں سے کلیتاً مختلف تھے، ان کی طبعی ساخت ہر قسم کی پیچیدگی اور ترکیب سے بیگانہ تھی۔ مگر بیشمار قرنوں کے بعد مختلف قسم کے اعضاء رکھنے والے جانور رونما ہوئے، جو بتدریج ترقی کرتے کرتے مختلف قسم کی صورتوں میں نمایاں ہو گئے، ان کی شکل و صورت ہر قرن میں بدلتی رہی۔ اسی طرح بیشمار صدیوں کے بعد ان ہی جانوروں کے طبقہ سے انسان ظہور پذیر ہوا۔ جو عقل و ہوش سے آراستہ ہے اور اپنے ماحول کے ظہورات پر نگاہ غائر ڈالنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر وہ اپنا مقابلہ حیوانات سے کرے، تو وہ کئی باتیں اپنے آپ میں جانوروں میں مشترکہ پائے گا۔" اس بیان سے عیاں ہے کہ ماہران موصوف مسئلۂ ارتقا کے حامی ہیں۔ مسٹر ڈبلیو پروونیٹ اپنی مستند تصنیف "آفرینشِ مادّہ" (Creation of Matter) میں اسی مسئلہ کی نسبت بصراحت یوں لکھتے ہیں کہ "مسئلۂ ارتقا کے معتقد یہ بھی مانتے ہیں کہ کرۂ ارض کی تاریخ میں ایک دور ایسا بھی تھا جب کہ اس کی سطح ہر قسم کی روئیدگی اور جانداروں کی ہستی سے ناآشنا تھی عمل کیمیائی اور سالمات کے کشش

باہمی سے پروٹوپلازم ظہور میں آیا جو جوہر زندگی اور سرچشمۂ حیات ہے۔ قدرتی عمل کی تحریک سے یہ جاندار مادّہ بڑھتا رہا، پھر اس کے اندر عمل تفریق شروع ہوا۔ آخر کار "امیبا" ایسے لطیف و نازک جاندار پیدا ہوئے ان کے اندر جداگانہ عمل حیات شروع ہوا، کچھ عرصہ بعد اس کے اندر قلب اور خلیات نمودار ہوئے، جو انواع و اقسام کے تغیرات سے متاثر ہوتے رہے۔ ان کا شمار بھی بڑھتا چلا گیا، بعد میں ان کی وساطت سے اور جاندار نمایاں ہوئے۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا جانداروں کی ساخت جسمانی پیچیدہ ہوتی چلی گئی، ان کے اجسام کے حصے اور اعضا نیز ساخت پیچیدگی اختیار کرتی گئی۔ انواع حیوانی کے شمار کے تناسب سے کشاکش زیست بھی بڑھتی رہی۔ اس معرکے میں کمزور اور زیردست نابود ہوتے رہے لیکن زورآور اور قوی الجثہ گوئے سبقت لیجاتے اور میدان ترقی میں آگے بڑھتے رہے۔ کروڑوں برس اسی طرح گزر گئے جس کے دوران میں جانداروں کی ظاہری و باطنی ہیئت میں اہم تغیر واقع ہو گیا۔ اعضا اور خلیات کلیتاً بدل گئیں رفتہ رفتہ بیشمار قرنوں کے بعد یہ جانور ظہور میں آئے جو روئے زمین پر موجود ہیں۔ اس مختصر بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ شروع میں روئے زمین پر جاندار کس طرح ظہور پذیر ہوئے تھے اور کس طرح بیشمار قرنوں کے دوران میں ان کا استحالہ ہوتا رہا جس سے ان کی طبعی ساخت میں عظیم انقلاب واقع ہوا، اور پھر کروڑوں برسوں کے تغیرات سے دوچار ہونے کے بعد اپنے ارتقاء طبعی کے اس مرحلہ پر نمودار ہوئے ہیں۔

مبدء حیات یہاں پر غالباً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "مبدء حیات کیا ہے۔ زندگی کی اصلیت اور اس کا سہارا کیا ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ سرچشمۂ زیست اور مستقر حیات پروٹوپلازم ہے، جسے جوہر حیات اور جانداروں کا فطری ہیولا قرار دیا گیا ہے۔ ہر قسم کے نباتات اور موجودات ذی روح اسی کے اشارے سے ظہور پذیر ہوتے اور برقرار رہتے ہیں۔ ابتدائے عالم میں یہی جاندار مادہ تھا جس سے جاندار رونما ہوئے، اب بھی یہی مادہ ہے جو پودوں اور جانوروں کی ہستی کا منبع و مدار حیات ہے۔ اس کی نسبت برطانیہ کے مشہور ماہر پروفیسر ای۔ ڈبلیو۔ میک برائڈ (فیلو رائل سوسائٹی لندن) اپنی ایک تازہ مستند تصنیف میں یوں لکھتے ہیں کہ "پودوں اور جانداروں کے اجسام میں جتنے عمل طبعی ہوتے ہیں، ان کا محرک اولی پروٹوپلازم ہے، جو ہر قسم کے تغیرات کا مرجع ہے۔ نشوونما کی تحریک ان ہی سے ہم پہونچتی ہے۔ صفرا، دودھ، لعاب دہن اور عروق معدہ اسی کے اشارے سے ظہور میں آتے ہیں۔ جوہر حیات مبدء نمو ہے، اسی کی بدولت غذا جزو بدن بنتی اور قوت مہیا کرتی ہے، اسی کی کرامت سے جانداروں کے اندر ذرہ ہائے حیات پیدا ہوتے ہیں جن کی وساطت سے نئے جاندار عالم ظہور میں آتے ہیں۔" اس سے ظاہر ہے کہ جانوروں اور پودوں کی ہستی پائیدار کا انحصار پروٹوپلازم پر ہے

اور یہی زندگی کا سہارا ہے۔ ڈاکٹر آر۔ سی تیکفی مسائل سائنس پر وضاحت سے اظہار رائے کرنے میں قابل رشک شہرت رکھتے ہیں۔ آپ اپنی ایک تازہ اور مستند کتاب میں جوہر حیات کی بابت یوں لکھتے ہیں:

"ہر قسم کے افعال حیاتی کا محرک اولین پروٹو پلازم ہے، جو گوندکی قسم کا لیس دار مرکب جوہر ہوتا ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی کاربن، ہیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن، فاسفورس اور پانی ہیں یہی وہ خاک کی چٹکی ہے جس سے جاندار (خواہ پودے ہوں یا رینگنے والے جانور) یعنی تارہ ماہی اور انسان پیدا ہوتا ہے۔ پروٹو پلازم کے اندر جو چیزیں پائی جاتی ہیں وہ نایاب نہیں ہیں، بلکہ ایسی عام ہیں کہ ان سے ہر فرد بشر آشنا ہے۔ کاربن پنسل کے مصالح اور ہیرے اور اسی قسم کی دیگر چیزوں میں پایا جاتا ہے۔ آکسیجن اور نائٹروجن کرۂ ہوا میں پائی جاتی ہیں۔ ہیڈروجن پانی کے اجزائے ترکیبی میں آکسیجن کے ساتھ مخلوط پائی جاتی ہے۔ گندھک اور فاسفورس آتش فشاں پہاڑوں سے برآمد ہوتے ہیں۔ قصہ کوتاہ دیسلائی کے مصالح میں وہ تمام اجزا پائے جاتے ہیں جو زندگی کے قیام اور بقا کے لئے بہت ضروری ہیں۔

خلیۂ حیات کی نسبت تازہ خیالات

شہرۂ آفاق پروفیسر ٹامسن ہکسلے نے اپنے زمانۂ عروج میں ایک موقع پر یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ پروٹو پلازم زندگی کا مادۂ طبعی ہے۔ پروفیسر سر آرتھر جے۔ ٹامسن ارباب سائنس میں یکتائے زمانہ شمار ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ایک مستند تصنیف میں یوں لکھتے ہیں کہ کیمیات کے ماہروں کی نگاہ میں فطری مدار حیات کاربن کے مرکبات ہیں جو مواد غاذیہ کہلاتے ہیں۔ ان کی ترکیب کیمیائی ان نہایت پیچیدہ مرکبات میں شمار ہوتی ہے جن کا نشر و تجزیہ نہایت دشوار کام ہے۔ جانداروں کے اجسام میں وہی عناصر پائے جاتے ہیں جو ان کے آس پاس کی اشیاء کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ لیکن مرکبات ذی اعضا کی ساخت بجید پیچیدہ ہے۔ مواد غاذیہ کے اجزائے ترکیبی کاربن، ہیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن اور گندھک ہیں۔ لیکن جانداروں کے اجسام کے اندر ایسے پیچیدہ مرکبات پائے جاتے ہیں کہ کسی خاص چیز کو پروٹو پلازم اور مادۂ ذی جان قرار دینا قریب قریب محال ہے۔ آخر میں ایک اور نامی ماہر بیالوجی پروفیسر ڈونین (فیلو رائل سوسائٹی) کا قول ناطق نقل کرنا ضروری ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ خلیۂ ذی حیات کے اندر جاندار مادہ ہوتا ہے جسے پروٹو پلازم کہتے ہیں۔ مگر اس کی ماہیت سے ارباب سائنس ناآشنا ہیں۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں کیمیائی مواد ہوتا ہے جو مواد غاذیہ کہلاتا ہے۔ پروٹو پلازم کے جوہر طبعی میں کلورائڈ۔ پانی، بائی کاربونیٹ، سوڈیم، پوٹاسیم اور کیلسیم کے فاسفیٹ ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں اور چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ رقیق لعابدار مادہ ہوتا ہے جس کی ماہیت ہنوز عیاں نہیں ہوئی ہے۔ ان مشاہیر ماہروں کی آراء سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ زندگی کا سہارا اور مصدرِ جاں پروٹوپلازم ہے۔ نباتات اور حیوانات اسی کے گوناگوں مظاہر ہیں۔ یعنی ہر قسم کے موجودات ذی جان کا ملجاو ماویٰ اور مادۂ طبعی جوہرِ ذی حیات ہے۔ گو جوہزاروں سے کروڑوں برسوں کے ارتقا اور استحالہ کی بدولت انواع نباتی و حیوانی عالمِ وجود میں آئی ہیں مگر اسی ذرۂ حیات کے وسیلہ سے چند مہینوں کے عرصہ میں بن مانس اور دیگر حیوانات نیز انسان معرضِ ہستی میں آتے ہیں۔ عملِ ارتقا سے جسے شروع میں کروڑوں سال کی مدت درکار ہوئی تھی اب آٹھ دس مہینے کے قلیل عرصہ میں جنین تمام منزلیں طے کر کے عالمِ ظاہر میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ امریکہ کا نامی ماہر ایم۔ شیلے راوی ہے کہ "انسان کا بیضۂ حیات ایک کروڑ پونے سرسٹھ لاکھ تغیرات قبول کرنے کی طبعی صلاحیت رکھتا ہے۔ جب مرد و عورت کے بیضۂ حیات باربردار ہو جاتے ہیں تو وہ بے شمار صورتیں قبول کرتے ہیں جس کا اندازہ (۲۸ پدم، ۴۴ کھرب، ۳۰، ۷ ارب ۹۰ کروڑ) کیا گیا ہے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ نو مہینے کے قلیل عرصہ میں جنین کتنی بیشمار صورتیں بدلتا ہے جو اس کے کروڑوں برسوں کے استحالہ کی یاد دلاتی ہیں۔ بن مانسوں اور دوسرے دودھ دینے والے جانوروں کی بھی یہی کیفیت ہے۔

کرۂ ارض کی پیچیدہ اور مطوّل داستان میں ایک نہایت شاندار اور معرکۃ الآرا سانحہ پروٹوپلازم (مادۂ ذی حیات) کا ظہور پذیر ہونا ہے۔ اور یہ واقعہ واقعی سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ اس سے پہلے کرۂ زمین سنسان اور اُجاڑ تھا، ہر طرف شہر خموشاں کی سی خاموشی اور وحشت انگیز سکوت طاری تھا۔ لیکن جوہرِ ذی حیات کے نمودار ہوتے ہی اس کی کایا پلٹ گئی، خاموشی کافور ہو گئی، ذی جان ہستیوں کے رونما ہوتے ہی نئے باب کی ابتدا ہوئی عملِ ارتقا سے انواع و اقسام کے موجودات ذی حیات معرضِ ہستی میں آنے سے ننھے ننھے جانداروں کی بھنبھناہٹ، پرندوں کے چہچہے، جانوروں کی کلیلیں اور چہل پہل سے زمین کی رونق اور شوکت ہزاروں درجے بڑھ گئی۔ اس سے ثابت ہے کہ یہ انقلابِ عظیم پروٹوپلازم کے طفیل سے ظہور میں آیا تھا۔ گو یہ نہایت بے مقدار اور ناچیز شے ہے مگر اس کی ہستی کے اندر کیسے عظیم تغیرات مضمر تھے، اس کے ذرّے کی بدولت کیسے عجیب و غریب تغیرات ظہور میں آئے جو کرۂ ارض کی تاریخ ماضی کے مختلف دوروں کے مبدء سمجھے جاتے ہیں۔ اب بھی عالمِ ظاہر کے بڑے بڑے واقعات اسی کے اشارے سے رونما ہوتے ہیں۔ انواع نباتی اور حیوانی اپنی ہستی، نمو اور بقا کے لئے اسی ناچیز ذرہ کے مرہونِ منت ہیں۔ یہ مبدءِ زیست اور مدارِ حیات ہے۔ موجودات ذی روح

اسی کے سہارے قائم ہیں۔ ان کی ہستی ناپائدار اسی کی احسان مند ہے۔ پروٹوپلازم جان۔ زندگی۔ روح اور حیات کا مترادف ہے۔

سالمۂ حیات اور مرکبات مادہ

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ جوہر حیات اولین کاربن۔ ہیڈروجن۔ آکسیجن۔ نائٹروجن، فاسفورس اور پانی کا مرکب معجون ہے۔ اس کے گول گول ذرّے سالمات اور کیمیائی مرکبات سے بدرجہا حیرت انگیز ہیں۔ مفردات کا شمار اسّی کے قریب ہے۔ ان کے حجم اور وزن کا بخوبی اندازہ کیا گیا ہے۔ ان کی شکل وصورت بھی ظاہر ہو گئی ہے، لیکن کیمیائی مرکبات بے شمار ہیں، جن کے اجزائے ترکیبی کا کمال صحت سے پتہ لگایا گیا ہے۔ سالمات کو صانعِ ازلی نے ایسا بنایا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اچھی طرح پیوست ہو جاتے ہیں اس پر حیرت ہوتی ہے اور ہم اُس کی حکمت کو سراہتے ہیں، ان کے خواص اور نیز ساخت پر عقل چکراتی ہے۔ لیکن پروٹوپلازم کے اجزائے ترکیبی کی ماہیت سالمات اور اُن کے مرکبات سے سینکڑوں درجے حیرت انگیز ہے۔ مگر کیمیائی مرکبات اور جوہر ذی حیات میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ ہستی کے پیمانہ میں اس جوہر کا رتبہ نہایت بلند ہے۔ کیونکہ اس کے اندر موجوداتِ ذی جان کا ہیولا مضمر ہے۔ یہ ذرہ لطیف ہے۔ مگر عالم نباتات میں بڑ، پیپل اور دیودار اور اقلیمِ حیوانات میں ہاتھی۔ شیر ببر اور عقاب وغیرہ اسی بے مقدار ذرۂ حیات سے وجود حاصل کرتے ہیں۔

جوہر حیات کے اجزائے ترکیبی کا کرشمہ

پروٹوپلازم کاربن، ہیڈروجن، آکسیجن اور نائٹروجن کا مرکب ہے۔ لیکن مفردات کے سالمات میں زندگی کی علامات نہیں پائی جاتیں۔ اور نہ ان مرکبات میں جن کے ساتھ کاربن، ہیڈروجن، آکسیجن اور نائٹروجن مخلوطاً پائی جاتی ہے جان کا کوئی بین نشان نظر آتا ہے، فقط جوہر ذی حیات ہی کے اندر علاماتِ زندگی پائی جاتی ہیں، جو ان چار چیزوں کا مجموعہ ہے، اگر ان چاروں میں سے کوئی جزو کم ہوتا یا ان کے ابتدائی خواص میں کوئی کوتاہی ہوتی تو "جان" ظہور میں نہ آتی، جرمنی کے دہریہ ماہر سائنس ہیگل کا بیان ہے کہ کاربن کے اندر وہ قوت ہے جس سے ذرۂ ذی حیات نیز موجودات بے جان اور ذی روح ظہور میں آتی ہیں۔ اس کی رائے میں کاربن کے اندر وہ عجیب وغریب خواص مضمر تھے جس سے تمام ہستیاں تحریک وتقویت اور تغیر وتبدل قبول کرتی ہیں۔ یعنی ہیگل کے نزدیک کاربن منبع حیات اور خدا کا حریف ہے۔ لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ کاربن بجائے خود سرچشمۂ حیات نہیں ہو سکتا جب تک ہیڈروجن، آکسیجن اور نائٹروجن کا کاربن کے ساتھ ارتباط واختلاط نہ ہو۔ مادۂ ذی حیات وجود پذیر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان تینوں کے اندر وہی

خواص پائے جاتے ہیں جن سے کاربن بہرہ ور ہے۔ جب یہ دیگر مفردات کے ساتھ ملتا ہے تو عالم وجود ذی روح کے عجائبات ظہور میں آتے ہیں۔ کاربن کلیتاً بیدست وپا اور محتاج بالغیر ہے، اسی طرح باقی تینوں اجزا بھی فرداً فرداً ایک دوسرے کے حاجتمند ہیں، وہ بطور خود مبدء مادہ ذی حیات نہیں ہو سکتے بلکہ ان سب کے اجتماع اور اتحاد سے طرح طرح کے پودے اور حیوانات عالم وجود میں آتے ہیں۔ سوِیڈن کے نہایت بلند پایہ ماہر کیمیات برزلیس اور جرمنی کے شہرہ آفاق استاد کیمیا نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ انسان پانی۔ ہیڈروجن۔ کاربن، آکسیجن، فاسفورس۔ لوہے اور نمک وغیرہ اجزا کا مجموعہ مرکب ہے اور یہ تمام چیزیں پروٹوپلازم کے مرکبات کے اندر پائی جاتی ہیں۔

مادہ ذی حیات کی ترکیب کا امکان

اب ہم اس نازک سوال سے دوچار ہوتے ہیں کہ کیا مادہ ذی حیات ترکیب کیمیائی سے پیدا ہو سکتا ہے؟ اس سوال پر مختصر بحث ضروری ہے۔ ہنری راسکو اپنے زمانہ کے ماہران کیمیا میں بہت ممتاز سمجھے جاتے تھے، آپ کا قول قابل غور ہے کہ "ہم گول مول ذرے جن سے ابتدائی جاندار صور میں آئے تھے بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اور تجربات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم اس قسم کا مادہ ذی حیات ترکیب کیمیائی سے پیدا نہیں کر سکتے۔ سائنس میں جتنی ترقی ہو چکی ہے اس سے ثابت ہے کہ بغیر دوسرے جراثیم کے ہم کوئی جاندار پیدا نہیں کر سکتے۔" اس زمانہ میں ماہروں کا یہ خیال تھا کہ جاندار جانداروں ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ تیس پچیس برس ہوئے کہ برطانیہ کے مشہور ماہر بٹلر برک نے ایسا مرکب تیار کرنے کا دعویٰ کیا تھا جس سے لطیف جاندار پیدا ہوتے ہیں، اس نے ریڈیم کے سالٹ (کھار) سے کام لیا تھا، اور کئی ماہروں نے بھی اسی قسم کا دعویٰ کیا تھا جس کی بنا پر سنہ ۱۹۱۲ء میں برطانیہ کے نہایت مشہور ماہر فزیالوجی سر ایڈورڈ شافر نے ترکیب کیمیائی سے جاندار پیدا ہونے کی پیشین گوئی بڑے وثوق سے کی تھی جس پر مہذب دنیا کے علمی رسالوں اور اخباروں میں بڑی بحث وتمحیص ہوتی رہی۔ بڑے بڑے ماہروں نے اس میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا، انھوں نے اتفاق رائے سے یہ قرار دیا تھا کہ ترکیب کیمیائی سے مادہ ذی حیات پیدا کرنا ناممکنات سے ہے۔ مگر ہکسلے اور اس کے معاصرین کا یہ گمان تھا کہ اگر پروٹین جس کی مشہور مثال انڈے کی سفیدی ہے ترکیب کیمیائی سے پیدا ہو جائے تو جانداروں کا ہیولا پیدا کرنے میں کامیابی کی اُمید ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد ماہروں کی کوششوں سے مواد شکریہ وغاذیہ کیمیائی طریقہ سے پیدا کر لئے گئے، جس سے جانداروں کا ہیولا پیدا کرنے میں بڑی آسانی ہو گئی ہے۔ جرمنی کا نامی ماہر امِل فشر نائٹروجن کے مرکبات تیار کرنے میں معروف ہے جس سے پروٹین کے پیچیدہ سالمات ظہور میں آتے ہیں۔ اس کا یہ بھی گمان ہے کہ کیمیائی

ترکیب سے ایسا مادہ تیار ہوسکتا ہے جس سے ذرۂ ذی حیات مرکب ہوتا ہے، اس ذرہ میں آپ سے آپ جانداروں کا ہیولا پیدا کرنے کی جبلی صلاحیت ہوتی ہے۔ لورپول یونیورسٹی کے مشہور ماہر پروفیسر بی مور عرصہ تک راز حیات کی چھان بین کرتے رہے۔ آپ نے برسوں کی دماغ سوزیوں کے بعد یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ اگر کسی بلائے بے درماں سے تمام جاندار اور نیز انسان نابود ہو جائیں تو لاکھوں برسوں کے بعد اسی قسم کی ذی عقل ہستیاں اور دیگر حیوانات ان اسباب طبعی سے دوبارہ ظہور پذیر ہو جائیں گے جن کے اثر خاص سے کرۂ ارض کے دور اول میں معرض وجود میں آئے تھے۔ آپ کی رائے میں وہ اسباب طبعی اب بھی ہیں جن کی بدولت ابتدائی جانداروں کا ہیولا ظہور میں آیا تھا۔ لنڈن یونیورسٹی کے نامی ماہر پروفیسر ہل بھی برسوں سے راز حیات کی ماہیت کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ آپ نے یہ خیال وثوق سے ظاہر کیا ہے کہ خلیۂ ذی حیات کا ڈھانچا بگڑتا رہتا ہے جس کی روک تھام اسی صورت میں ممکن ہے کہ آکسیجن دوسری چیزوں کے ساتھ ربط رکھے۔ اگر مواد شکریہ اور آکسیجن بہم نہ پہونچے تو اسکی حرکت یک قلم معطل ہو جاتی ہے اور خلیہ مرگ مفاجات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آپ کی تحقیقات سے حیات وممات کے طبعی اختلافات پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ آپ کی دیرینہ تحقیقات کی بنا پر پروفیسر ڈوینن نے ۱۹۲۰ء میں یہ امید ظاہر کی تھی کہ ترکیب کیمیائی سے مادہ ذی حیات پیدا ہوسکتا ہے۔

بجلی کے وسیلے سے مادۂ ذی حیات پیدا کرنے کی کامیابی

نومبر ۱۹۳۰ء کو شکاگو کے مشہور اخبار ٹریبون نے اس قسم کا بیان شائع کیا تھا کہ امریکہ کے نامی ماہر ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو کرائل نے عرصہ کی تحقیقات کے بعد برقی قوت کے ذریعہ سے ایسا مادۂ ذی حیات پیدا کر لیا ہے، جس سے ایک خلیہ والے جاندار پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی اجمالی کیفیت یہ ہے کہ محقق مذکور نے تازہ مرے ہوئے جاندار کا مغز نکالا اور اُسے برقی طاقت سے بھسم کر دیا، پھر اس سے کھار نکالے اور دیگر اجزائے ترکیبی بھی علیحدہ کر لئے جس میں مواد غاذیہ اور دیگر مرکبات ملائے اور برقی طاقت سے آمیزش کی جس سے آخر کار ذرۂ حیات پیدا ہو گیا ہر قسم کی بندش بندی کی گئی تاکہ جراثیم مرکبات اور کانچ کی نالی کے اندر نہ گھسنے پائیں۔ ڈاکٹر کرائل کے تجربہ سے قوت برقی بالکل نرالی ثابت ہوتی ہے جس سے ماہر ناآشنا ہیں۔ اس مختصر بحث سے زندگی کے سہارے کی نوعیت آشکار رہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ ماہر اسے ترکیب کیمیائی سے پیدا کرنے کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔

ملاپ

(از مسٹر بھگوت سروپ)

"کیا ایسی آنکھیں پھیر لوگے، ایسے بے مروت ہو جاؤگے، میری بات بالکل نہ مانوگے؟ تم تو بڑی محبت جتاتے تھے۔ اچھا میری بات نہ مانو، اس بچے کا تو خیال کرو، غریب میں بھی تمہیں کو دیکھ کر جیتا ہے، بلک بلک کر روئے گا، اور اسکا گلاب سا چہرہ کمھلا جائیگا۔ کون اس کی پرورش کرے گا، دیکھو تم کو دیکھکر ہنس دیتا ہے، اس کو ہنستے دیکھکر ہم بھی اپنا دکھ درد بھول جاتے ہیں، جب تمہاری یاد کرکے یہ تڑپے گا تو کیا کہہ کر کوئی اسے چپ کرے گا۔"

"بس کرو۔ اب چلتے، تت میرا جی نہ دکھاؤ، تمہاری محبت ہی کی وجہ سے سات برس تک تمام مصیبتیں جھیلیں، بار بار نکل بھاگنے کی کوشش کی اور دو دو کوس تک چلا بھی گیا لیکن تمہاری صورت کا خیال اور سریندر کی محبت مجکو ہمیشہ واپس لے آئی۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آج تک سبھی لوگ طعنہ دیتے تھے لیکن پتا جی نے ابھی تک اپنی زبان سے ایک حرف بھی نہ نکالا تھا۔ لیکن آج تو انھوں نے بھی سبھی کچھ کہہ ڈالا۔ ملو تو مجھ سے ویسے ہی جلتا تھا، کہنے لگا سسرال میں بیٹھے روٹیاں کھاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اب اس مرتبہ نندو دادا نے بھی ہاں میں ہاں ملادی، بس پھر کیا تھا تمہارے بھائی، چچا غرض سارا کنبہ ایک ہوگیا۔ پیاری رکمن تم مجکو جان سے زیادہ پیاری ہو، سریندر میری آنکھوں کا تارا ہے میں اس کو دیکھکر جیتا ہوں، اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے ایک قطرہ کی بھی گنجائش نہیں رہی اب تو یہی ٹھان لی ہے کہ جب تک کچھ کما نہ لوں اس گاؤں میں منہ نہ دکھاؤنگا۔"

"میری زندگی کس طرح بسر ہوگی۔"

"اری باؤلی! سوچ تو سہی، سارا گاؤں نام دھرتا ہے۔ کاہل نکھٹو کہتا ہے۔ یہ طعنے سنتے سنتے کان پک گئے، اب پردیس جاکر محنت کرونگا جب چار پیسے پاس ہونگے تو پھر سبھی خاطر کرنے لگیں گے۔ گاؤں والے بھی عزت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔"

"اچھا یہ تو بتاؤ، ہمیں کیسے دھیرج ہوگا، رات کو سریندر جاگے گا تو کس کے پاس جائیگا۔ مجھ سے روٹھ کر تمہیں پکارے گا تو کون اس کا دل بہلائے گا، کون اس کو گود میں لیکر گھمانے لے جائیگا، ذرا دیکھو تو اس وقت کیسی سکھ کی نیند سو رہا ہے، سوتے میں بھی اس کو ہنسی آ رہی ہے۔ اُسے کیا خبر ہے کہ یہ رونے کا وقت ہے، باپ ہوکر ایسی بیدردی تمہیں مناسب نہیں، میں چیتھڑے لپیٹ کر بسر کروں گی، بھوکی رہونگی پر تمہاری جدائی نہ سہونگی۔"

"پیاری کامنی، اب مجھے موہ کے جال میں نہ پھانس، انھیں پھندوں میں پھنس کر بہت دوسروں کی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ہاں اتنا یاد رکھنا کہ ملو سے بچی رہنا اور سریندر کو اپنے ہی پاس رکھنا، اب ہم جاتے ہیں ایشور تمہیں خوش رکھے۔"

رکمنی نے لپک کر دامن پکڑ لیا "میرے کنتھ، ذرا تو ٹھہر و اور مجھے تھوڑا سا بکھ (زہر) دیتے جاؤ، میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہونگی۔"

اندر کا دل دہل اُٹھا، وہ رُکا اور رکمنی کی طرف دیکھ کر ذرا دیر کے لئے کچھ سوچنے لگا، پھر زور سے جھٹکا دیکر دامن چھڑانے کی کوشش کی، اس کشمکش میں رکمنی گر پڑی مگر سریندر جاگ اُٹھا۔

"بابو - بابو، کہاں جاتے ہو، مجکو بھی لے چلو۔"

"نردھن باپ کو لیکر کیا کرے گا" یہ آواز ہوا میں گونجی - بچہ رو رہا تھا، رکمنی سسکیاں لے رہی تھی، اندھیری رات تھی، گاؤں کے کچے جھونپڑوں کی آڑ میں تھوڑی دور تک ایک سایہ سا دکھلائی دیا، تھوڑی دیر بعد یہ بھی غائب ہوگیا

رکمنی کی شادی موضع رکن پور کے زمیندار سرجو سنگھ کے لڑکے اندر سنگھ سے ہوئی تھی، سرجو سنگھ فضول خرچ اور بے پرواہ آدمی تھا، فضول مصارف کی بدولت اس نے اپنی تمام جائداد اپنی زندگی ہی میں تباہ و برباد کردی تھی، البتہ کچھ موروثی کاشتکاری باقی رہ گئی تھی جو اندر سنگھ کی نابالغی کے زمانہ میں زمیندار نے ہضم کرلی۔ رکمنی بچپن ہی میں یتیم ہوگئی تھی، چچا نے پرورش کرکے بڑا کیا تھا، انہیں نے اس کا بیاہ اور گونا وغیرہ کیا۔ رندھیر سنگھ کے پاس موضع کندری میں دو بسوہ کی زمینداری اور سوا سو بیگہ کی موروثی کاشت تھی، گاؤں میں وہی خوشحال تھا اور سب لوگ اُسکو مانتے تھے دب اُٹتے یہ معلوم ہوا کہ اندر سنگھ کے پاس کوئی ذریعہ بسر اوقات کا نہیں رہا تو اُس نے داماد و بھتیجی



مسٹر وجے راگھو آنند راؤ

صدر ہندو مہا سبھا



ہز ہائی نیس نواب صاحب بھوپال

چانسلر چیمبر آف پرنسیز

(ادوال والیان ریاست ہند)

دونوں کو بلوا لیا۔ سچی محبت ہو یا دنیا کا دکھاوا یہ تو ایشور ہی جان سکتا ہے۔ بہر حال چند روز تک داماد اور بیٹی کی خوب خوب خاطر تواضع ہوئی، پھر معمولی برتاؤ ہونے لگا۔ سال دو سال کے بعد پہلے پہلے تو بھی بھی طعن و تشنیع۔ اس کے بعد درشت کلامی تک نوبت پہونچ گئی۔ چچا کے دل میں تو کچھ بھی گنجایش تھی۔ پھر سے بھائی اور دیگر عزیز و اقارب رکمنی کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اندر سنگھ اب چوبیس پچیس سال کا نوجوان تھا۔ شکیل، وجیہ، تندرست و توانا۔ لیکن کاشتکاری کے کام میں اُس کا جی نہ لگتا تھا اور دوسرے کاموں میں اگر وہ ہاتھ لگاتا تو گھر والوں کو ناگوار گذرتا اور وہ کہنے لگتے کہ "ٹھاکر صاحب سسرال کیا آگئے مالک بن بیٹھے۔ جانتے ہیں اپنا تو سب کھو چکے اب اس گھر پہ نگاہ ہے۔"

غرض اندر سنگھ سب سمجھتے ہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے پردیس جا کر تلاش معاش کا ارادہ کیا مگر حسین بیوی کی محبت نے اب تک اُسے باہر نہ نکلنے دیا۔ بچہ بھی چار پانچ برس کا ہو گیا تھا۔ دیہاتی زندگی اور صاف ہوا اور عمدہ دودھ دہی کی بدولت بچہ بھی خوبصورت و تندرست تھا۔ گاؤں بھر کی عورتیں اس کو پیار کرتی تھیں۔ رکمنی اُسے نظر بد سے بچانے کو ۔ ۔ ۔ ۔ ہر وقت ماتھے پر کاجل کا ٹیکہ لگائے رکھتی تھی۔ ملو، سندر سنگھ سے دو چار برس بڑا تھا، ذات کا اہیر تھا لیکن گاؤں میں اس کی بھی کچھ زمینداری تھی، لین دین بھی کرتا تھا۔ رکمنی کو لڑکپن ہی سے للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھتا تھا جس کا حال رکمنی نے اندر سنگھ سے کہدیا تھا۔ رندھیر سنگھ کے رعب سے ملو کی یہ ہمت تو کبھی نہ ہو سکی کہ کبھی کچھ شرارت کر سکتا البتہ خفیہ طور پہ جال بچھا رکھا تھا لیکن اب تک اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تھی۔

اندر سنگھ کی شادی کو سات برس ہو گئے تھے۔ بچہ بھی پانچ برس کا تھا، رونا، مچلنا، ضد کرنا، اُس کو خوب آ گیا تھا۔ آٹھویں دن پینٹھ لگتی، مٹھائی والے، کھلونے والے آتے، پاس پڑوس کے بچے ماں باپ سے پیسہ لا کر سودا خرید لے جاتے اور سرنیدر کو دکھا دکھا کر کھاتے۔ سرنیدر کبھی ماں کا آنچل پکڑ کر ضد کرتا کبھی باپ کی گردن میں باہیں ڈال کر روتا، پیسے مانگتا مگر اندر سنگھ سرد آہ بھر کر رہ جاتا۔ پینٹھ کے دن سرنیدر کی ضد رکمنی کی بے بسی اور خود اس کی مجبوری۔ یہ سب باتیں اندر سنگھ کے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتی تھیں۔

آج سب کے ساتھ چچا سسر نے بھی کسر اٹھا نہ رکھی۔ کہنے لگے کہ "تم جوان ہو، طاقتور ہو، پھر ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیکار بیٹھے شرم اور ذلت کی زندگی کیوں بسر کرتے ہو، کتے بھی اپنا پیٹ پال لیتے ہیں

مگر تم ان سے بھی بدتر ہو" اندر سنگھ ان باتوں کو سنکر تمام دن کڑھتا رہا۔ آخر کار آدھی رات کو اُس نے بیوی کو جگا کر ساری داستان سنائی اور اپنا ارادہ بتلایا، رکمنی بے تاب ہوگئی، روکنا چاہا لیکن اندر سنگھ نے قسم کھائی تھی کہ چاہے جو کچھ ہو اب وہ ذلت کی زندگی بسر نہ کریگا۔ بچہ و بیوی دونوں سے زبردستی رخصت ہو کر چل دیا۔

"پادری صاحب! میں کہہ رہا ہوں کہ بچہ خوبصورت اور تندرست ہے، گورا چٹا ہے، پانچ برس کی عمر ہے، میری شرط صرف یہ ہے کہ میرا نام نہ ہو"

"ملو تم اس سے اطمینان رکھو کسی کو خبر نہ ہوگی۔ تم یہ کہہ رہے تھے کہ اس کا باپ گھر سے نکل گیا ہے"

"ہاں صاحب دو مہینہ سے اس کا پتہ نہیں ہے۔ بس اس کی ماں ہے۔ اس کے سوا اور گھر میں کوئی اس کا خیال کرنیوالا نہیں ہے"

"اگر بچہ ایسا ہی ہوگا تو تم کو انعام دیا جائیگا"

"آپ خود ہی شام تک دیکھ لیں گے"

پادری صاحب نے کہا "اچھا، میرا نائب احسان مسیح برگد کے نیچے ملیگا، کھلونے اور مٹھائی اس کے پاس ہونگے، بس تم اُس کو بڑے کنوے تک لے آنا"

"بہت اچھا" کہکر ملو پادری صاحب سے رخصت ہوا۔

دیہات میں جہاں پینٹھ یا ہاٹ لگتی ہے، دوپہر ہی سے لوگ جمع ہونے لگتے ہیں، آس پاس کے آدمی خرید و فروخت کے لئے اکٹھا ہو جاتے ہیں، سہ پہر تک بازار لگ جاتا ہے میلہ کا سا ہجوم ہو جاتا ہے۔ ایک طرف سبزی ترکاری بکتی ہے۔ دوسری طرف اناج کی منڈی سی لگ جاتی ہے، کہیں ہلدی، مرچ، مسالہ کی دوکانیں ہوتی ہیں، کہیں گاڑھا، دھوتی، انگوچھے بیچنے والے بزاز دکھلائی دیتے ہیں، کہیں بساطی سیندور، بندے، آئینہ اور صابن کی ٹکیاں بیچتے ہیں۔ برتن مرمت کرنے والے ٹھٹھیرے۔ لوہار، بڑھئی بھی آس پاس سے آجاتے ہیں۔ غرض خوب چہل پہل رہتی ہے۔ گاؤں کے لڑکے مٹھائی اور کھلونے والوں کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ جن کو گھر سے پیسہ مل جاتا ہے چاٹ اُڑاتے ہیں، خوش گپیاں کرتے ہیں، نادار مفلس صورت تکتے رہ جاتے ہیں۔ سریندر ایک طرف کھیل رہا تھا، ملو نے اس کو اکیلا پاکر کہا:-

"بیٹا! مٹی کا بیل لوگے وہ سامنے بک رہا ہے۔"

"میرے پاس پیسہ نہیں ہے۔"

"لو یہ پیسے لو، وہ برگد تلے کھلونے والا بیٹھا ہے، اس سے لے آؤ۔"

سریندر نے پیسے لے لئے اور خوشی خوشی دوکان پر پہنچ گیا۔ دوکاندار نے کہا "میرے پاس یہ ایک ٹوٹا ہوا بیل رہ گیا ہے، لو تم مٹھائی کھالو، میرے ساتھ چلو، تم کو بہت اچھا بیل دونگا، اور دو لڈو بھی دونگا۔"

لڈو اور بیل کی لالچ میں سریندر احسان مسیح کے پیچھے ہولیا۔ شام ہونے لگی، جن لوگوں کے سودے بک چکے تھے انھوں نے جلدی جلدی اپنی ضروریات خریدیں۔ کپاس بیچکر مسالہ آٹا۔ دال خریدا، باجرہ اور جوار کے بدلہ مٹی کے برتن لئے۔ کوئی اپنی ٹوٹی پھوٹی تھالی اور ٹوٹے ہوئے کٹوروں کی مرمت کرانے لگا۔

دکانیں اٹھنے لگیں، سب لوگ اپنا اپنا سامان اکٹھا کرکے بوریہ اور چٹائی سنگوانے لگے۔ رات ہونے سے پہلے ہی کندری کی خام سڑک اور چاروں طرف کی پگڈنڈیوں پر مرد عورت قطار در قطار جاتے دکھلائی دینے لگے۔ کسی کے بغل میں گٹھری، کسی کے سر پر ٹوکری، کوئی بیل یا گھوڑے پر اسباب لادے لیجا رہا تھا، غرض خوب شور و غل مچ رہا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا، رات ہو رہی ہے میں دوکان بڑھاتا ہوں لینا ہے تو لے لو نہیں تو گھر جاؤ۔ غرضیکہ کہیں تکرار کہیں خریدے ہوئے سودے کی گرانی پر افسوس، گاؤں کا چوکیدار . . ہر دوکاندار سے اپنا حق الخدمت وصول کر رہا تھا۔ اندھیرا ہونے لگا، بچھڑ جانے والوں کے پاؤں جلدی جلدی اٹھنے لگے، جہاں ابھی بھیڑ لگ رہی تھی وہاں اب سناٹا ہو گیا۔ ادھر ادھر بکھرے ہوئے ناج کے دانے، ترکاریوں کے کچلے ہوئے پتے، جانوروں، مویشیوں کے بول براز کی بدبو رونق بازار کی یادگار باقی رہ گئی۔

"چاچا وہ نہیں آیا گاؤں بھر میں ڈھونڈھ آئی۔"

رندھیر سنگھ نے کہا "بالک ہی تو ہے، کہیں کھیلتا ہوگا، کسی کے گھر چلا گیا ہوگا، تیرا تو یہی حال ہے، ذرا نظر سے اوجھل ہوا اور تو گھبرا گئی۔"

دو گھنٹہ بعد چچی نے پھر رندھیر سنگھ سے کہا "ماں کی آتما نہیں مانتی وہ رو رہی ہے ذرا دیکھو تو کسی کے گھر جاکے سو تو نہیں گیا ہے۔"

گھر گھر کے دروازہ کھٹکھٹائے گئے اور سارا گاؤں دیکھ ڈالا گیا مگر بچہ نہیں ملا۔ صبح ہوئی گاؤں کا کونا کونا چھان ڈالا گیا، کھیت، کھلیان، باڑہ سب ہی دیکھ لیا۔ آخر کار تھانہ میں رپٹ لکھائی گئی، داروغہ، سپاہی، چوکیدار سبھی آ گئے، اور تحقیقات شروع ہوئی۔ قرب میں کنجر ٹھہرے ہوئے تھے، بلائے گئے، مار پیٹ، گالی گلوچ کی گئی۔ دوپہر کو تھانہ والوں کی حلوہ پوری دودھ دہی سے دعوت ہوئی۔ سہ پہر کو تالاب اور کنوؤں میں تلاش کی گئی۔ شام کو نذرانہ لیکر داروغہ جی تو چلے گئے لیکن سریندر کا کہیں پتہ نہ چلا۔

گاؤں کے ایک کاشتکار نے کہا کہ میں نے اس کو سر شام ملو سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ یہ سنکر ملو نے غصہ سے کہا:۔

"میں کیا اُس کو کھا گیا، اور لڑکے بھی کھڑے تھے وہ بھی کھڑا تھا، میں تہ بازاری وصول کر رہا تھا جب میں نے بھی دیکھا تھا مگر یہ تو دوپہر سے بھی پہلے کی بات ہے، اس کے بعد میں نے اُس کو نہیں دیکھا۔"

دو چار روز تک گاؤں میں اس واقعہ کا بڑا چرچا رہا " بھلا اب وہ کہاں ملے گا، ارے جو لوگ بالکوں کو باہر نکالیں گے اُن کا یہی حال ہوگا۔ سرکار بچوں کو پکڑ کر مریچ کے ملک لے جاتی ہے۔" دوسرا بولا " یہ سب جھوٹ ہے، یہ ملک بھی تو سرکار کا ہے، اُس کو کیا غرض جو ایک ملک کو اُجاڑ کر دوسرے کو بسائے۔ اصل بات یہ ہے کہ ڈائنیں بچوں کو لیجا کر اُن کا کلیجہ چبا کھاتی ہیں۔ منا مہاراج ان سب کے خلاف تھے، اُن کی رائے میں یہ کام کسی جادوگر کا تھا جو بچوں کو لکڑی سنگھا دیتے ہیں جس سے بچہ بے خبر اُن کے پیچھے پیچھے ہو لیتا ہے۔ اور گھر لیجا کر وہ اُسے طوطا، مینا، بندر، کتا، بلی بنا ڈالتے ہیں، پھر اُن سے طرح طرح کے تماشے کرا کر روزی کماتے ہیں۔ انھوں نے کہا "میں نے اپنی آنکھ سے طوطے کو کھوٹے کھرے پیسے پرکھتے، بندر کو چکی چلاتے دیکھا ہے۔ بھلا یہ کام جانوروں کے بس کا ہے۔ البتہ ایسا جادو تو بچوں ہی پر چلتا ہے، میں تو اسی لئے اپنے بچوں کو گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتا۔"

بہر حال کچھ ہو، ڈائن لے گئی ہو یا جادوگر، رکمنی کے ویران دل کا چراغ آرزو گل ہوگیا، سالہا سال ہوگئے، برس گذر گئے، کسی نے اُس کو ہنستے یا مسکراتے نہیں دیکھا۔ البتہ ملو نے تھوڑے ہی عرصہ میں زمینداری بڑھالی، پختہ مکان تعمیر کرالیا، گھوڑا خرید لیا، اُس پر سوار ہوکر بانکی ترچھی پگڑی باندھ کر دھیر سنگھ کے مکان سے گذرتا۔ بار بار اپنی ناجائز خواہشات کا پیغام رکمنی کے

پاس بھیجا، دولت اور ثروت کا لالچ دلایا۔ دھمکیاں بھی دیں۔ جب کسی طرح کامیابی نہیں ہوئی تو اُس کی کینہ پرطبیعت در پے آزار ہو گئی۔ گاؤں میں پردہ کا رواج نہ ہونے پر بھی رکمنی گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی۔

بہرحال زمانہ گذر گیا۔ رکمنی کے شباب کا آفتاب اپنے نصف النہار سے گذر رہا تھا۔ سرخ سپید چہرہ پر زردی آنے لگی، پھول سے گال کملانے لگے۔ کندن بدن میں نرمی پیدا ہو گئی، اپنے شوہر کی مفارقت میں وہ ادھیڑ عمر ہی میں بوڑھی سی معلوم ہونے لگی۔

ایک روز رندھیر سنگھ سے کسی کام کو کہنے باہر آئی تھی منو نے اس کو دیکھا۔ اس کی نگاہ میں اب بھی وہ حسین ہی تھی۔ بہرحال اُس کی طرف دیکھ کر وہ مسکرایا، رکمنی نے غم اور غصہ سے اس پر حقارت آمیز نگاہ ڈالی اور مکان میں چلی گئی۔ منو کے لئے یہ ایک ورنگست تھی جس کی چوٹ عرصہ تک تازہ رہی۔

(۳)

"حوالدار اندر سنگھ! افسوس تم جیسا بہادر اور کارگذار سپاہی ابتک تعرگمنامی میں پڑا رہا جنرل میکنزی صاحب نے فی الحال تم کو جمعدار کر دیا ہے۔ لیکن حکم یہ ہے کہ خیبر کے قلعہ اور چترال کے میدان میں خبر رسانی کے کام میں تم کو کامیابی ہوئی تو بہت جلد صوبیدار بنا دیئے جاؤ گے۔"

سپاہی نے شکر گذاری میں سر جھکا دیا۔

"کیا تم میجر سانڈرس تک یہ چٹھی لے جا سکتے ہو، راستہ دشوار گذار اور دشمنوں سے بھرا ہوا ہے، بولو ہمت ہے؟"

اندر سنگھ نے کہا "حضور عالی، مجھے جان کی پرواہ نہیں ہے، سپاہی کا دھرم کیا ہے جس کا نمک کھائے اس پر ضرورت کے وقت اپنی جان قربان کر دے، ایک مرتبہ نہیں ہزار مرتبہ تعمیل کرونگا۔"

"بہادر اندر سنگھ، شاباش تم سے ایسی ہی امید ہے، مجھکو تعجب ہے کہ دو روز میں ایسے دشوار گذار مقام سے تم کیونکر چلے آئے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایک ہفتہ میں تم صوبہ دار بنا دیئے جاؤ گے۔"

اندر سنگھ کو کامیابی پر کامیابی ہو رہی تھی، جس مہم پر جاتا کامیاب ہوتا۔ اُسے تعجب تو یہ تھا

کہ دس برس تک وہ معمولی سپاہی بنا رہا۔ نائک کے درجہ سے آگے قدم نہ بڑھا، اب بھگوان کی کرپا ہوئی تو دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ سرحدی لڑائی جاری تھی۔ آفریدی جم کر تو لڑتے نہیں تھے۔ ادھر اُدھر چھاپہ مارتے تھے، کبھی کبھی شبخون بھی مارتے تھے۔ سرحدی مواضعات لوٹ لیتے، ان کی جولانگاہ پہاڑی قلعے، کوہستانی دروں کی سرنگیں، دشوار گذار پتھریلی چٹانوں کی گھاٹیاں تھیں۔ سرکار عرصہ تک اس کا کچھ تدارک نہ کر سکی۔

خبر رسانی کے سلسلہ میں اندر سنگھ کو ان خطرناک راستوں کا بہت تجربہ ہو گیا تھا۔ لڑائی سے قبل فوج میں کچھ زیادہ کام تو تھا نہیں اس لئے اس نے اردو انگریزی میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی، اپنی فہم و ذکاوت سے اُس نے مہتر چترال کے قلعہ کا نقشہ اس خوبی سے تیار کر کے میجر میکفرسن کے سامنے پیش کیا کہ وہ عش عش کرنے لگا۔ اسی نقشہ سے اس خاص جرگہ کا قلعہ فتح ہوا جس کے صلہ میں اندر سنگھ صوبہ دار میجر بنا دیا گیا۔

امن کے زمانہ میں فوج کے سپاہی آرام کرتے ہیں۔ معمولی قواعد پریڈ کے سوا چین ہی چین رہتا ہے۔ لڑائی کے دنوں میں ساری کسر نکل جاتی ہے۔ جان تو ہتھیلی پر رہتی ہے آرام آسائش کو بھی خیرباد کہنا پڑتا ہے۔ کئی کئی روز متواتر سونا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اندر سنگھ کو چار پانچ دن برابر جاگنا پڑا۔ راستہ میں کئی گھوڑے اُسے بدلنے پڑے۔ شاید فوج میں سب سے مشکل کام خبر رسانی کا ہے۔

کمانڈنگ افسر کرنیل میکفرسن منتظر ہی تھا کہ اندر سنگھ گھوڑے پر آتا ہوا دکھلائی دیا، دوسرا گھوڑا تیار کھڑا تھا۔ ابھی اس کا لایا ہوا خط پڑھا بھی نہیں گیا تھا کہ کرنیل نے کہا "اندر سنگھ تم ضرور تھک گئے ہو گے۔ اور تم کو آرام کی ضرورت ہو گی، لیکن مجبوری ہے کہ ایک بہت ہی ضروری پیغام بھیجنا ہے، کیا تم فوراً ہی قلعہ کرمتاخ تک جا سکو گے۔"

"بسر و چشم"

"اچھا تو یہ خط لو اور کرنیل اسپیئر سے اس کا جواب لے آؤ۔"

"سپاہی نے ہاتھ بڑھا کر خط لیا، اور جیب میں رکھا، گھوڑے کی راسیں درست ... نکال کر سلامی دینی چاہی، مگر بازو نہ کھل سکا، باقاعدہ سلام نہ کر سکا۔

"خط واپس کرو، اندر سنگھ تم نے غلطی کی۔"

اندر سنگھ کا سر خجالت سے جھک گیا، اس نے خط واپس کر دیا۔

افسر نے دوبارہ تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

"صوبہ دار میجر اندر سنگھ یہ پیغام قلعہ کرمتاج کو لے جاؤ"

سپاہی کا ہاتھ کانپ رہا تھا، اس کے بدن میں رعشہ تھا، خط گرتے گرتے بچ گیا، بمشکل جیب میں ڈالا، چہرہ پر شکن تھی، تلوار نیام سے باہر ہوئی ... سے اونچی اٹھی تو بھی سلام بیقاعدہ تھا۔

"اندر سنگھ تم عہدہ پاکر اپنی حیثیت بھول گئے، خط واپس کر دو، اس توہین پر تمہارا کورٹ مارشل ہوگا"

"حضور پہلا قصور ہے، معاف فرمایئے"

لفافہ کی واپسی کا سبق دہرایا گیا۔

"اندر سنگھ ہوشیاری سے ... ."

"بہت اچھا"

خط جیب میں تھا، تلوار نیام سے باہر نکلی، پھرتی سے سر سے اونچی اٹھی۔ باقاعدہ نیام میں داخل ہوئی۔ اندر سنگھ کے ... سے پھڑپھڑاہٹ کی آواز نکلی ... سوار ہو کر روانہ ہوگیا۔ جہاں ... کھڑا تھا خون کی بوندیں پڑی تھیں، گھوڑا سرپٹ جا رہا تھا۔

... سب کچھ دیکھ لیا تھا، وہ مبہوت ہوگیا، اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ دو منٹ تک بول ہی نہ سکا، یکایک چلایا "روکو۔ روکو۔ میں حکم دیتا ہوں روکو، آہ وہ بہت دور نکل گیا۔ ... واپسی کا سگنل دکھلاؤ، مجھ سے غلطی ہوگئی"

"سب بے فائدہ ہے، وہ دور چلا گیا"

"نہیں نہیں، ہمارا گھوڑا لاؤ، بگل ہم کو دیدو"

ایک ہاتھ میں راس، دوسرے میں بگل منہ سے لگا ہوا، کرنیل میکفرسن عربی پر سوار ... جا رہا تھا۔

... نے بگل سنا، پیچھے پھر کر دیکھا، حکم عدولی نہ کرسکا، گھوڑا روک لیا۔ ... دیکھا کہ صوبہ دار میجر کی نصف وردی سرخ تھی۔

... میں حکم دیتا ہوں"

"... بات کی فکر نہ کریں، میں کل تک واپس آجاؤنگا"

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہمارے پیچھے چلے آؤ۔"

"لیکن حضور.........."

"ورنہ کورٹ مارشل........"

"جنگی ہسپتال میں اندر سنگھ کو پلنگ پر لٹایا گیا، اس کا بازو کھولا گیا، چار انچ سے زیادہ گہرا زخم تھا، اس سے بدبو آرہی تھی، کیڑے پڑ گئے تھے۔

افسر نے پوچھا" یہ زخم کہاں لگا۔ مجھکو خبر کیوں نہیں کی۔"

"اول تو مجھکو موقعہ ہی نہیں ملا، دوسرے یہ بات ہی کیا ہے۔"

"اچھا یہ ہوا کیا؟"

"میں ایک ہفتہ ہوا گل خاں کے قلعہ سے کہ بتاخ جارہا تھا، میرا دستہ میرے ہمراہ تھا، ایک آفریدی سردار نے اپنے خیمہ کے سامنے دروازہ پر کئی سکھ سپاہیوں کے کٹے ہوئے سر کیشوں سے باندھ کر ٹانگ رکھے تھے۔ اس نظارہ سے مجکو بڑا صدمہ ہوا، میں نے خیمہ لوٹ لیا، اس میں ہزارہا کا سامان ونقد دستیاب ہوا۔ میں نے دیکھا کہ خیمہ سے دو فرلانگ پچھم کی طرف منہ کیئے ایک خندق میں بیس پچیس آفریدی لیٹے ہوئے ہیں اور بندوق لئے مورچہ کی حفاظت کر رہے تھے۔ میں اُن پر اچانک ٹوٹ پڑا اور سب کو قتل کردیا۔ ایک پٹھان لیٹا رہا۔ میں سمجھا مرگیا ہے، جب تلاشی لیتے اُس کے پاس آیا تو اُس نے اپنا چھرا میری بغل میں چبھو دیا۔ میرا زخم وردی سے دبا رہا، مجکو اس وقت سے ابتک گھوڑے پر سے اُترنے کی بھی نوبت نہیں آئی ہے، ہاں وہ مال غنیمت میرے خیمہ میں آگیا ہوگا، منگوا لیجئے گا۔ بہت قیمتی ہے۔ میں آج ڈیوٹی پر حاضر ہو جاؤنگا۔"

ڈاکٹر نے کہا" ناممکن، تمہارا زخم خراب ہوگیا ہے، کم ازکم ایک ماہ تک تم نہیں جاسکتے۔"

انگریزی فوج پریڈ کے میدان میں موجود تھی، کرنیل میکفرسن اپنے سہارے سے اندر سنگھ کو میدان میں لایا۔ کمانڈر انچیف بہادر نے گوروں کی طرف مخاطب ہوکر کہا" انگریز سپاہیو، کوچ کے وقت تمہاری جو حالت ہوتی ہے، مجھکو اُس کا خوب تجربہ ہے، اعلیٰ راشن اور عمدہ شراب تم میں بہادری کا وہ جوہر پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہے جو ان دیسی سپاہیوں میں سوکھی روٹی اور سادہ پانی سے پیدا ہوتا ہے۔ بہادر اندر سنگھ آفریدی سردار کے خیمہ کا مال غنیمت تم کو انعام میں دیا جاتا ہے خطاب اور کمیشن بھی تمہاری خدمات کے صلہ میں تمکو عطا ہوگا۔"

ایک ماہ بعد اندر سنگھ اچھا ہوگیا، اب وہ سردار بہادر کیپٹن اندر سنگھ تھا۔

(۴)

کیا اندر سنگھ فوجی اعزاز اور ثروت پاکر بیوی بچہ کو بھول گیا؟ اگر یہ نہیں تو پھر کیا ہوا جو برس گذر جانے کے بعد بھی نہ تو اُس نے کوئی خط بھیجا اور نہ اُنکی کوئی خبر لی۔

اُس کے دل میں رکمنی کی تصویر اس طرح نقش ہو گئی تھی کہ زمانہ اور مفارقت کا اثر اُس کو مٹا نہ سکا۔ عالم افکار میں وہ اسی موہنی صورت کا دھیان لگائے رہتا تھا۔ اب اُسے اپنا افلاس اور مصیبت کا زمانہ بھی رکمنی کی محبت اور خدمت کی وجہ سے اس کی زندگی کا سنہری زمانہ معلوم ہوتا تھا۔ سریندر کی میٹھی میٹھی باتیں، مٹھائی اور کھلونے کے لئے ضد اس کا طفلانہ انداز سے ٹھٹھکنا مچلنا یاد آ آ کر پریشان کر دیا کرتا تھا

عرصۂ دراز تک تو اس کا موقع ہی نہ تھا کہ وہ سرخرو ہو کر اپنے گاؤں واپس جائے، معمولی سپاہی کی طرح وہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ لیکن جب روز افزوں ترقی کا وقت آیا اور دولت اُسکی کنیز اقبال اس کا غلام بن گیا تھا تو واپسیِ وطن کا خیال اُس کی نیند حرام کئے ہوئے تھا۔ ادھر سرحد پر امن ہوا اُدھر اُس نے دو سال کی رخصت کی درخواست دیدی۔ کچھ عرصہ کے بعد رخصت منظور ہو گئی۔ ہاں اب وہ کنندرئی جائیگا، راستہ میں دلی میں دو روز ٹھہر کر عمدہ ساڑیاں، بیش قیمت زیورات سچے موتیوں کی مالا خریدے گا۔ اُس کی بیوی گاؤں بھر میں سب سے زیادہ حسین ہے اب وہ سب سے زیادہ مالدار بھی ہوگی، سریندر روپے پیسے کنکریوں کی طرح پھینکے گا۔ ہاں اب وہ چودہ سال کا ہو گیا ہوگا، وہ اس کے لئے فوجی وردی بنوائیگا۔ گھوڑے کی سواری سکھلائے گا کیا کسی کپتان کو اس کے سسرال والے اور دیگر عزیز و اقارب حقارت کی نگاہ سے دیکھنے کی جرأت کر سکیں گے؟ اب سبھی لوگ اُس کی خوشامد کرینگے، جب وہ اپنی فوجی وردی، تمغوں، ولیر گھوڑے اور متعدد ملازم کے ساتھ گاؤں میں جائیگا تو اُس کو کوئی پہچان بھی نہ سکے گا۔ آہا، پیاری رکمنی یہ سنکر کیسی خوش ہوگی کہ بنک میں میرے ہزاروں روپے جمع ہیں، کئی سو کی تنخواہ ہے اور پورے رسالہ کا افسر ہوں۔ غریبی میں بھی اس کو مجھ پر فخر تھا اب اُس کے غرور کی کیا انتہا ہوگی۔ افلاس میں بھی اُسکی صورت کیسی پیاری تھی زر و زیور پا کر تو وہ حسن کی ملکہ ہی بن جائیگی۔

"اندر سنگھ!"

افسر کی آواز سُنکر خیالات کا شیرازہ منتشر ہو گیا، وہ چونک پڑا۔ افسر نے کہا "میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے تھے، لیکن افسوس میں تمہارے خواب کو پریشان کرنے آیا ہوں۔

"فرمائیے"

"ہماری امیدوں پر پانی پھر گیا، سب کی رخصتیں نامنظور ہوگئیں"

اندر سنگھ ہکا بکا کپتان صاحب کا منہ تکنے لگا۔

"کپتان! سنو جرمنی سے اعلان جنگ ہوگیا ہے۔ انگریزی فوجیں فرانس پہونچ چکی ہیں، بلجیئم کی پہلی لڑائی ہی میں ہمارا نقصان عظیم ہوا۔ اس وقت جرمنی کا ستارہ عروج پر ہے، اب ہم کو بھی جلد ہی جانا پڑے گا۔"

"مگر گوروں کے مقابلہ میں ہم کالی آدمی تو نہ لڑائے جائیں گے۔"

"مجبوری میں سب کچھ روا ہے۔"

"افسوس نو برس صبر کیا جب گاؤں میں منہ دکھلانے کے قابل ہوا تو فلک کج رفتار نے اس طرح تمام امیدوں کا خون کردیا۔ خیر مرضیِ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔"

شبہ غلط نہ تھا، رسالہ نمبر ۳۶ راجپوت کو جلد سے جلد یورپ روانہ ہونے کا حکم ملا۔ اب بھی کرنل میکفرسن ہی اس کا کمانڈر ہے۔ چھ ماہ نہیں ہوئے تھے کہ اندر سنگھ کا رسالہ بلجیم کے سرحدی مورچوں پر تھا۔

ہندی سرحدی لڑائیوں سے یہ جنگ بالکل مختلف تھی، وہاں سب سے زیادہ بہادری کی ضرورت تھی اور یہاں عقل اور سائنس کی، دشمن تو کہیں نظر نہ آتا تھا البتہ گولے چلتے تھے اور پرے کے پرے غائب ہو جاتے تھے، کبھی آسمان سے ہوائی جہاز گولے برساتے تھے، کبھی زہریلی گیس چھا جاتی، غرض ہر طرف قیامت برپا تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موت کا فرشتہ انسانی زندگی کو دنیا سے نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس ہنگامۂ محشر میں ابتک قدرت نے صرف رسالہ نمبر ۳۶ کو ہی عزرائیل کی دست برد سے محفوظ رکھا تھا۔

اندر سنگھ کو اس ملک کا تجربہ نہ تھا۔ راجپوتی جوش میں ایک روز رات کے وقت جب وہ ڈیوٹی پر نہ تھا، سرحد سے کچھ آگے چلا گیا۔ مشرق کی طرف روشنی دیکھکر وہ لیٹ گیا اور پیٹ کے بل آگے کی طرف کھسکتا ہوا چلا گیا، اُس نے دشمنوں کے کچھ آدمیوں کو ایک مقام پر گڑھا کھودتے اور پھر اُسے پُر کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنے کیمپ میں لوٹ آیا، کیمپ کیا تھا خندقوں کی قطاریں تھیں۔ صبح کو جنرل میکفرسن نے سامنے کا وسیع میدان خالی دیکھکر اس پر قبضہ کرنے اور جدید خندق کھودنے کا حکم دیا۔ قبل اس کے کہ سپاہ آگے بڑھے اندر سنگھ نے حکم مذکور کی مخالفت کی اور جنرل میکفرسن سے درخواست کی کہ پہلے اس مقام پر کسی ہوائی جہاز کے ذریعہ بم گرائے جائیں۔ میکفرسن اسکی اجابت

دائے اور بہادری دونوں کا قائل تھا، چنانچہ اُس نے یہ مشورہ مان لیا، پہلے ہی گولہ کے گرنے سے زمین شق ہوگئی اور کوہ آتش فشاں کی طرح گندھک، لاوا، اور پگھلے ہوئے پتھروں کا دریا بہہ نکلا۔ یہ طوفان انگریزی مورچوں تک پھیلتا چلا گیا۔ اگر فوج نے اس مقام سے کوچ کیا ہوتا تو ایک فرد واحد بھی زندہ نہ بچتا۔

اب اندر سنگھ نے رات کا پورا واقعہ حرف بحرف جنرل صاحب کو سنا دیا۔ وہ بیحد خوش ہوا اور افسران بالا کو بھی اس کی کارگذاری سے آگاہ کر دیا، پھر کیا تھا اندر سنگھ میجر بنا دیا گیا اور انگریزی رسالہ کے محافظ دستہ کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔

وہ کبھی کبھی پیغام بری کی خدمات بھی انجام دیتا تھا اور اس کو اس کام سے خاص دلچسپی تھی۔ اس سلسلے میں اس پر دو بار بم بھی گرے مگر ایشور کو اُسے زندہ رکھنا منظور تھا، چنانچہ تیسری مرتبہ اس پر ایسا گولہ گرا کہ اُس کے گھوڑے کا پچھلا حصہ بالکل کٹ گیا اور وہ خود بھی زخمی ہوا مگر تائید ایزدی سے اس کی جان بچ گئی۔ ایک مرتبہ اس نے آسٹرین کیمپ میں جاکر جاسوسی کا کام کیا، چنانچہ ترک سپاہی کا بھیس اختیار کیا اور سارے کیمپ کا نقشہ اس طرح اپنے دماغ میں جما کر لایا کہ جب اس کو کاغذ پر بنا کر جنرل میکفرسن کے روبرو پیش کیا تو اُس کیمپ کے فتح کر لینے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی۔

جرمن جاسوس انگریزی بھیس بدل کر کیمپ میں آتے اور بار بار دھوکا دے جاتے مگر ایک مرتبہ اس نے جرمنی کے مشہور جاسوس وای کو ہیلنگڈن کو ایسا گرفتار کیا کہ بڑے بڑے افسر عش عش کرنے لگے۔ اس کے پاس پروانہ راہداری اور انگلستان کے بڑے بڑے آدمیوں کی سفارشی چٹھیاں اور تعارفی خطوط تھے۔ اُس کا بیان تھا کہ وہ اپنے دوست انگریز افسران سے ملنے آیا ہے وہ خود انگریز کی طرح انگریزی بولتا اور جرمنوں کو گالیاں دیتا تھا، لیکن جب تلاشی لی گئی تو اس کے پاس آلات خبر رسانی برآمد ہوئے، جو جو نقشے اُس نے بنائے تھے وہ انگریزی فوج کے بہت بڑے حصہ کو برباد کر دینے کے لئے کافی تھے۔ اندر سنگھ نے اس کو اتفاقیہ ایک ہوائی جہاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ بہرحال راز فاش ہونے پر وای کو ہیلنگڈن کو سزائے موت دی گئی، لیکن اندر سنگھ نے اس کو قید رکھنے کی سفارش کی جو منظور ہوئی۔

اندر سنگھ نے جرمن کیمپ میں جاسوسی کی کوشش کی، یہ آسٹرین کیمپ نہ تھا یہاں وہ پکڑا گیا، اُس کا عہدہ معلوم ہونے پر اُس کو گولی مار دینے کا حکم ہوا، لیکن اُس نے کہا کہ "ہیلنگڈن کی جان بچانے والا میں ہی ہوں۔ اگر مجھ کو مارا گیا تو میرے دوست اُس کو دیگر سات جرمنوں کے ساتھ مار ڈالیں گے۔"

اس پر اس کو بھی قید کر لیا گیا اور ڈھائی برس تک وہ بآرام جرمنی میں رہا۔ جب اس کی زندگی کی خبر انگریزی کیمپ میں پہونچی تو انگریزوں نے چار جرمن قیدیوں اور وای کو ہیلنگڈن کے معاوضہ میں اُسے چھڑا لیا۔ وہ وہاں سے بھی خالی نہیں آیا، صوبہ لورین کے مشہور قلعہ ایلسس کا ایسا مکمل خاکہ اپنے دماغ میں لے آیا کہ انگریزی فوج نے اس کو دو ہی ہفتوں میں لے لیا۔

امریکہ کے میدان جنگ میں آتے ہی جرمنوں کا زوال شروع ہو گیا۔ بادشاہ سلامت بنفس نفیس فرانس تشریف لائے، فوجوں کا معائنہ کیا۔ کارکردگی کے خطابات، تمغہ جات تقسیم ہوئے۔ اندر سنگھ کی خدمات کسی انگریز افسر سے کم نہ تھیں اس لئے ملک معظم نے اندر سنگھ سے ہاتھ ملایا، اور خود اپنی زبان مبارک سے اس کی بہادری کی تعریف کر کے اس کو کرنیل بنا دیا اور پنشن اور جاگیر کی سندیں عطا کیں۔ پھر خود اپنے ہاتھ سے اُس کے سینہ پر وہ تمغہ لگایا جس کی تمنا بڑے بڑے جنگی افسران کو رہتی ہے۔ کرنل سردار بہادر اندر سنگھ کے سینہ پر وہ ستارہ چمک رہا تھا جس کو "وکٹوریہ کراس" کہتے ہیں۔

(۵)

بوڑھا۔ ندھیر سنگھ لاٹھی ٹیکتا ہوا باہر آیا۔ ابھی دن اچھی طرح نہیں نکلا تھا، وہ گھبرا گیا اُس کی زبان سے نکلا:-

"ہے پرمیشر یہ کیا وبال ہے؟"

وسیع احاطہ پولیس نے گھیر لیا تھا، داروغہ جی کرسی پر ڈٹے تھے، بولے:-

"ٹھاکر! ہمارے پاس وارنٹ ہے، ہم تمہاری تلاشی لیں گے۔ ہم کو قتل کی تحقیقات کرنا ہے سب سے پہلے ملزمہ کو حاضر کرو۔"

"سرکار! کون ملزمہ، کس کا قتل؟"

"تمہاری بھتیجی رکمنی، اور اپنے ہی لخت جگر کا قتل۔"

"نہیں سرکار، یہ اتہام ہے، بہتان ہے، کوئی دشمن میری اور اس کی عزت لینا چاہتا ہے۔ وہ ہرگز ایسی نہیں ہے۔"

"جی ہاں، جب سولہ سترہ برس کے بعد ثبوت مل گیا تب آپ اس کو بےگناہی کی سند دے رہے ہیں، آپ پولیس کو نہیں جانتے۔ سات سمندر کے پار ہم لوگ پتہ لگا لیتے ہیں۔ پاتال کھود کر ہم سراغ نکال لاتے ہیں۔"

بوڑھا رندھیر سنگھ رو دیا، اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"داروغہ جی! مرتے وقت میری بے عزتی نہ کیجئے۔"

"ضابطہ اور قانون کے سامنے ہم لوگ مجبور ہیں۔"

سارا گاؤں جمع ہو گیا، مکان کی تلاشی لی گئی، کوئی مشتبہ چیز نہیں نکلی، بیانات تحریر ہوئے۔ چودھری ملّو رام مکھیا نمبردار نے کہا "اندر سنگھ میرا دوست تھا، وہ سترہ برس سے لاپتہ ہے، جانے سے کچھ دن پہلے اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ بھیّا میری تو رنڈی سے بیاہ ہوا ہے، گاؤں بھر سے نگاہیں لڑاتی ہے۔ مجھ سے یہ بے عزتی نہیں دیکھی جاتی۔ میں تو اب یہاں کسی طرح نہ ہوں گا۔ یہ کہہ کر وہ دوسرے ہی دن چلا گیا۔ ایک مہینہ بعد میں نے کئی بار رول کے دن رکمنی کو ایک غیر مرد سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ ایک دن جب پینٹھ لگی ہوئی تھی اور میں تہ بازاری وصول کر رہا تھا، سریندر سنگھ دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا، وہ آدمی اور رکمنی اُس کو دیکھ رہے تھے، پھر رکمنی نے اُس کو بلا لیا، بدلو بھیّا اُس دن رنگون جا رہے تھے، وہ دو مہینہ ہوئے واپس آئے ہیں۔ ایک دن اُنھوں نے مجھ سے سریندر سنگھ کا پتہ پوچھا تو میں نے کہا کہ وہ تو مدت ہوئی کھو گیا ہے، اس پر اُنھوں نے آہ بھر کر کہا کہ ہاں وہ کہاں سے آتا وہ تو دنیا سے چلا گیا" میں نے ضد کر کے اُس سے حال پوچھا تو اُس نے سارا قصہ سنا دیا۔ میرے تو بدن کے رونگٹے کانپ اُٹھے اور میری زبان سے بے ساختہ یہی نکلا کہ بھئی ایسی ڈائن کو تو ضرور سزا ملنا چاہیئے۔ اس جرم کا چھپانا جرم ہے، تم سرکار میں خبر کر دو۔"

بدلو نے کہا "میں رنگون جا رہا تھا، میرے پاس بستر کے علاوہ ایک چھوٹا سا بکس تھا، دُور جانا تھا اسٹیشن بھی فاصلہ پر تھا، اس لئے میں تیسرے پہر ہی چل دیا۔ گاؤں کے اُتر کی طرف جو ٹوٹی ہوئی مسجد ہے اُس میں میں نے کسی بچہ کے رونے کی آواز سنی، میں ٹھہر گیا، تھوڑی دیر بعد رکمنی ایک آدمی کے ساتھ باہر نکلی۔ وہ تو گاؤں کی طرف چلدی اور وہ مرد ایک گٹھری لئے ندی کے کنارے پہنچا، اُس نے ادھر اُدھر دیکھ کر اُس بوجھ کو ندی میں ڈال دیا۔ ندی پار سے رام ہرکھ پانڈے آ رہے تھے۔ میں نے اُس جگہ کو دیکھا جہاں اُس نے وہ گٹھری کنارے پر رکھی تھی وہ جگہ خون سے رنگی ہوئی تھی۔ میں نے پانڈے سے پوچھا تم نے کیا دیکھا تو اُنھوں نے کہا کہ کوئی پانی میں گٹھری پھینک رہا تھا۔ پھر میں نے اُن کو وہ جگہ دکھلائی جہاں خون پڑا تھا۔ مجھکو جلدی تھی شام ہو رہی تھی اور کھیوا جلدی کر رہا تھا۔ میں ندی پار کر کے چلا گیا مگر

کی صورت ابھی تک میرے دل میں نقش ہے ۔ اگر دیکھ پاؤں پہچان جاؤں۔ جب میں لوٹا تو سریندر کے کھو جانے کا حال سُنا ۔ مَیں سمجھ گیا کہ ہو نہو گٹھری میں اُسی کی لاش تھی۔ ملو رام کی رائے سے مَیں نے تھانہ میں اس کی رپٹ کر دی ۔

رام ہر کھ موضع کندری کو آ رہا تھا، وہ ندی پار کسی کام سے دوسرے گاؤں کو گیا تھا، اس نے گٹھری پھینکتے دیکھا تھا ، بدلو نے اس کو وہ جگہ خون سے بھری ہوئی دکھلائی تھی، جب وہ گاؤں میں آیا تو اُس نے رکمنی کو اور ایک غیر مرد کو باتیں کرتے دیکھا تھا، وہ آدمی اس کے دیکھتے ہی چلا گیا تو اس نے رکمنی سے پوچھا کہ وہ کون تھا ۔ رکمنی نے کہا تھا کہ وہ اس کا دیور لگتا ہے اور اندر سنگھ کی خبر لایا تھا ۔ اب بھی میں اس آدمی کو دیکھوں تو شاید پہچان لوں، مگر بات بہت دنوں کی ہو گئی ہے ۔

رمدیا نے کہا " میں تو بڑے ٹھاکر سے بہت ڈرتی ہوں، مَیں نے کسی سے کچھ نہیں کہا مگر بات سچی ہے ۔ جن دنوں اندر سنگھ بھاگے ہیں دوسرے گاؤں کا ایک مرد دیوار کے نیچے گھنٹوں رکمنی سے باتیں کیا کرتا تھا، ایک دن وہ کہہ رہا تھا جو تیرے ساتھ جنجال نہ ہوتا تو تجھکو ساتھ لے جاتا ۔ رکمنی نے کہا کہ تم ہی کیوں نہیں انتظام کر دیتے ، تو اُس نے کہا تھا کہ مل کر کریں گے ۔ مَیں نے ساری بات پھر نہیں سُنی ۔ رکمنی سے البتہ ایک دفعہ کہا تھا اور وں سے مل مل کے ٹھاکر کی ناک کیوں کٹاتی ہے ، مگر یہ سُنکر وہ چپ ہو گئی ۔

رندھیر سنگھ بولے " ہائے رام کیا کوئی اپنے بیٹے کو مار سکتا ہے ۔ اور سریندر تو اُسے بڑا پیارا تھا ۔ "

داروغہ نے ڈانٹ کر کہا " بڈھے تو تریا چرتر کو کیا جانے ، رکمنی اب تو کہہ کیا کہتی ہے ۔ "

" تم سب ملے ہوئے بدمعاش ہو ، حکومت اور روپیہ کی لالچ میں اندھے ہو رہے ہو ، تمہارے سامنے کچھ کہنا ، بھینس کے آگے بین بجانا ہے ، نہ تمہارے پاس دھرم ہے اور نہ آنکھیں " ۔

داروغہ نے بگڑ کر کہا " اب تیری ساری بدمعاشی نکالونگا ، پھانسی پر نہ لٹکوا دیا تو میرا نام نہیں ، پھر سپاہیوں سے کہا کہ اس کو گرفتار کر لو ۔ ضمانت نہیں ہو سکتی ، دفعہ ۳۰۲ کا جرم ہے " ۔

رندھیر سنگھ نے دو سو روپیہ کی پوٹلی داروغہ جی کے سامنے رکھدی اور کہا ۔

" سرکار عزت تمہارے ہاتھ ہے " ۔

تلے میں ہزار روپیہ بھی اس معاملہ میں نہیں لے سکتا ہوں"

لمو رام کے ہاں دعوت ہوئی، کڑھائی چڑھی، مٹھائی بنی، جشن ہوا اور پولیس والے خوش خوش تھانہ کو واپس چلے گئے۔

(۲)

مسٹر ایس۔ ایس۔ رابرٹسن آئی۔سی۔ایس حال ہی میں ولایت سے آئے تھے اور یہ اُن کا پہلا تقرر تھا۔ چھ ماہ تک مختلف صیغوں میں کام سیکھتے رہے، اب پورے اختیارات ملنے پر مہتمم خزانہ مقرر ہوئے تھے۔ کبھی کبھی فوجداری کے مقدمے بھی ان کے پاس بھیج دیئے جاتے تھے رکمنی کا مقدمہ پہلے ایک ڈپٹی کلکٹر کے پاس گیا، گواہان ثبوت گذرے، ملزمہ کی طرف سے کسی قسم کی پیروی نہیں ہوئی، یکایک ان ڈپٹی صاحب کا تبادلہ ہوگیا، اس لئے یہ مقدمہ مزید کارروائی کے لئے رابرٹسن صاحب کے اجلاس میں منتقل ہوکر آگیا۔ اس اجلاس میں آج اس کی پہلی پیشی تھی، چارج شیٹ لگنے والا تھا۔ کارروائی شروع کرنے سے پہلے جنٹ صاحب نے ملزمہ سے پوچھا کہ واقعی بڑا افسوس اور تعجب ہے کہ تم نے اپنے بیٹے کو خود ہی ہلاک کردیا۔

کورٹ انسپکٹر نے کہا "حضور، وہ تو سولہ سترہ برس تک خبر بھی نہ ہوئی، مگر خون کہیں چھپا کرتا ہے، آخرکار ہمارے تھانہ دار صاحب نے برآمد ہی کرلیا۔ واقعاتی ثبوت کے ساتھ ملزمہ بھی جرم سے انکار نہیں کرتی"

"واقعی، کیا یہ درست ہے"

ملزمہ نے آہستہ سے کہا "مجھکو جرم سے اقبال ہے بشرطیکہ مجھکو پھانسی دیدی جاوے"

حاکم نے کہا "یہ ہمارے اختیار سے باہر ہے، مقدمہ سشن جائیگا، آخری حکم جج صاحب دینگے"

کورٹ انسپکٹر صاحب بولے "حضور معاملہ صاف ہے، ممکن ہے اسکی خواہش پوری ہوجائے"

اتنے میں ایک فوجی افسر بے دھڑک اجلاس میں آیا اور حاکم کو مخاطب کرکے کہا "ادھر دیکھئے، میرا کام بہت ضروری ہے" اوس کی رفتار و گفتار نے نوجوان مجسٹریٹ کا مزاج برہم کردیا، اُس نے ترشروئی سے جواب دینا چاہا کہ اُس کی نگاہ سپاہی پر پڑی، فوجی ہملٹ اس پر شتر مرغ کے پروں کی کلغی، کرنیل کا نشان، بائیں تمغے سینے پر لگے ہوئے۔ ان سب کے اوپر سنہرا اوکٹوریہ کراس ستاروں میں چاند کی طرح چمکتا ہوا دیکھکر نوجوان حاکم کھڑا ہوگیا، ہاتھ ملاکر

کی صورت ابھی تک میرے دل میں نقش ہے ، اگر دیکھ پاؤں پہچان جاؤں۔ جب میں لوٹا تو سرنیدر کے کھو جانے کا حال سنا ۔ میں سمجھ گیا کہ ہو نہو گٹھڑی میں اسی کی لاش تھی ۔ ملو رام کی رائے سے میں نے تھانہ میں اس کی رپٹ کر دی ۔

رام ہرکھ موضع کندرئی کو آ رہا تھا ، وہ ندی پار کسی کام سے دوسرے گاؤں کو گیا تھا اس نے گٹھڑی پھینکتے دیکھا تھا ، بدلولے نے اس کو وہ جگہ خون سے بھری ہوئی دکھلائی تھی ، جب وہ گاؤں میں آیا تو اس نے رکمنی کو اور ایک غیر مرد کو باتیں کرتے دیکھا تھا ، وہ آدمی اس کے دیکھتے ہی چلا گیا تو اس نے رکمنی سے پوچھا کہ وہ کون تھا ۔ رکمنی نے کہا تھا کہ وہ اس کا دیور لگتا ہے اور اندر سنگھ کی خبر لایا تھا ، اب بھی میں اس آدمی کو دیکھوں تو شاید پہچان لوں ، مگر بات بہت دنوں کی ہو گئی ہے ۔

رمدیا نے کہا " میں تو بڑے ٹھاکر سے بہت ڈرتی ہوں ، میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا مگر بات یہی ہے ، جب دنوں اندر سنگھ بھاگے ہیں دوسرے گاؤں کا ایک مرد دیوار کے نیچے گھنٹوں رکمنی سے باتیں کیا کرتا تھا ، ایک دن وہ کہہ رہا تھا جو تیرے ساتھ جنجال نہ ہوتا تو تجھکو ساتھ لے جاتا ۔ رکمنی نے کہا کہ تم ہی کیوں نہیں انتظام کر دیتے ، تو اس نے کہا تھا کہ ملکر کریں گے ، میں نے ساری بات پھر نہیں سنی ۔ رکمنی سے البتہ ایک دفعہ کہا تھا اوروں سے مل مل کے ٹھاکر کی ناک کیوں کٹاتی ہے ، مگر یہ سنکر وہ چپ ہو گئی ۔

رندھیر سنگھ بولے " ہائے رام کیا کوئی اپنے بیٹے کو مار سکتا ہے ، اور سرنیدر ، تو اُسے بڑا پیارا تھا ۔"

داروغہ نے ڈانٹ کر کہا " بڈھے تو تریا چرتر کو کیا جانے ، رکمنی اب تو کہہ کیا کہتی ہے ۔"

" تم سب ملے ہوئے بدمعاش ہو ، حکومت اور روپیہ کی لالچ میں اندھے ہو رہے ہو ، تمہارے سامنے کچھ کہنا ، بھینس کے آگے بین بجانا ہے ، نہ تمہارے پاس دھرم ہے اور نہ آنکھیں ۔"

داروغہ نے بگڑ کر کہا " اب تیری ساری بدمعاشی نکالونگا ، پھانسی پہ نہ لٹکوا دیا تو میرا نام نہیں ، پھر سپاہیوں سے کہا کہ اس کو گرفتار کر لو ۔ ضمانت نہیں ہو سکتی ، دفعہ ۳۰۲ کا جرم ہے "

رندھیر سنگھ نے دو سو روپیہ کی پوٹلی داروغہ جی کے سامنے رکھدی اور کہا ۔

" سرکار عزت تمہارے ہاتھ ہے ۔"

تلمرے میں ہزار روپیہ بھی اس معاملہ میں نہیں لے سکتا ہوں۔"

ملو رام کے ہاں دعوت ہوئی، کڑھائی چڑھی، مٹھائی بنی۔ جشن ہوا اور پولیس والے خوش خوش تھانہ کو واپس چلے گئے۔

(۶)

مسٹر ایس۔ ایس۔ رابرٹسن آئی۔سی۔ایس حال ہی میں ولایت سے آئے تھے اور یہاں کا پہلا تقرر تھا۔ چھ ماہ تک مختلف صیغوں میں کام سیکھتے رہے۔ اب پورے اختیارات ملنے پر مہتمم خزانہ مقرر ہوئے تھے۔ کبھی کبھی فوجداری کے مقدمے بھی ان کے پاس بھیجدیے جاتے تھے رکمنی کا مقدمہ پہلے ایک ڈپٹی کلکٹر کے پاس گیا۔ گواہان ثبوت گذرے، ملزمہ کی طرف سے کسی قسم کی پیروی نہیں ہوئی، یکایک ان ڈپٹی صاحب کا تبادلہ ہوگیا، اس لئے یہ مقدمہ مزید کارروائی کے لئے رابرٹسن صاحب کے اجلاس میں منتقل ہو کر آگیا۔ اس اجلاس میں آج اس کی پہلی پیشی تھی، چارج شیٹ لگنے والا تھا۔ کارروائی شروع کرنے سے پہلے جنٹ صاحب نے ملزمہ سے پوچھا کہ واقعی بڑا افسوس اور تعجب ہے کہ تم نے اپنے بیٹے کو خود ہی ہلاک کردیا۔

کورٹ انسپکٹر نے کہا "حضور، وہ تو سولہ سترہ برس تک خبر بھی نہ ہوئی، مگر خون کہیں چھپا کرتا ہے، آخرکار ہمارے تھانہ دار صاحب نے برآمد ہی کرلیا۔ واقعاتی ثبوت کے ساتھ ملزمہ بھی جرم سے انکار نہیں کرتی۔"

"واقعی، کیا یہ درست ہے۔"

ملزمہ نے آہستہ سے کہا "مجھکو جرم سے اقبال ہے بشرطیکہ مجھکو پھانسی دیدی جاوے۔"

حاکم نے کہا "یہ ہمارے اختیار سے باہر ہے، مقدمہ سشن جائیگا، آخری حکم جج صاحب دینگے۔"

کورٹ انسپکٹر صاحب بولے "حضور معاملہ صاف ہے، ممکن ہے اسکی خواہش پوری ہوجائے"

اتنے میں ایک فوجی افسر بے دھڑک اجلاس میں آیا اور حاکم کو مخاطب کرکے کہا "ادھر دیکھیئے، میرا کام بہت ضروری ہے۔" اوس کی رفتار و گفتار نے نوجوان مجسٹریٹ کا مزاج برہم کردیا، اُس نے ترشروئی سے جواب دینا چاہا کہ اُس کی نگاہ سپاہی پر پڑی، فوجی ہملٹ اس پر شتر مرغ کے پروں کی کلغی، کرنیل کا نشان، بائیں تمغے سینے پر لگے ہوئے۔ ان سب کے اوپر سنہرا و کٹوریہ کراس ستاروں میں چاند کی طرح چمکتا ہوا دیکھکر نوجوان حاکم کھڑا ہوگیا، ہاتھ ملاکر

کہا "کونیل صاحب معاف فرمائیے میں ایک سنگین مقدمہ کی سماعت کر رہا تھا، آپ تشریف رکھیں آپ کا کام ابھی ہوتا ہے"

فوجی افسر بیٹھ گیا، ملزمہ کی طرف دیکھ کر اس نے کہا "عورت کا مقدمہ ہے"

مجسٹریٹ نے جواب دیا "ہاں، میرے اجلاس میں تو آج ہی یہ مقدمہ منتقل ہو کر آیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی بدچلنی سے تنگ آکر اس کا خاوند گھر سے نکل گیا، پھر اس نے اپنے عاشق کی خاطر اپنا بیٹا مار ڈالا۔ چپراسی! بڑے بابو کو سلام دو۔ ملزمہ! پھانسی کے لئے کیوں بیتاب ہو؟

"اس وجہ سے کہ خاوند اور بچہ کو گنوا کر، اس بے عزتی کو اٹھا کر زندہ رہنا نہیں چاہتی"

"اچھا اچھا۔ میں تمہارا بیان لکھوں گا، کرنیل صاحب آپ کتنا روپیہ لیں گے"

"فی الحال پچیس ہزار۔ مجھکو دس ہزار موٹر کی قیمت دینی ہے۔ آج ہی خریدی ہے، اور پھر شام سے پہلے کچھ اور ضروریات خرید کر کندری جانا ہے"

حاکم نے کہا "کندری کا نام میں نے سنا ہے۔ یہاں سے پچیس میل ہے، آپ کا نیا موٹر ایک گھنٹہ میں پہنچا دے گا"

بڑے بابو نے کہا "حضور کرنیل صاحب چک پر دستخط فرما دیجئے۔ پورا نام اور عہدہ تحریر فرمائیے گا"

مہتمم خزانہ نے چک اٹھا کر ذرا بلند آواز سے پڑھا "کرنیل سردار بہادر اندر سنگھ کمانڈنٹ نمبر ۳۶ راجپوت میرٹھ۔ ہاں کیا یہی آپ کا نام اور عہدہ ہے"

اندر سنگھ نے اثبات میں سر ہلایا۔

ملزمہ نے زنجیر زور سے کھڑکھڑائی۔ سپاہی نے جو کٹہرہ میں ملزمہ کے پاس کھڑا تھا خفگی سے بولا "کیا کرتی ہے، سیدھی کھڑی رہ"

مہتمم خزانہ نے کہا "آپ ذرا تشریف رکھیں۔ روپیہ ابھی آتا ہے" چارج شیٹ کا فارم نکالکر ملزمہ کی طرف دیکھکر کہا "تمہارا نام"

"رکمنی کنور"

"باپ کا نام" "سورج سنگھ"

سکونت! "موضع کندری"

خاوند کا نام "میں مرتے وقت اس کو بدنام نہیں کرنا چاہتی"۔

کورٹ انسپکٹر نے کہا "حضور، اصل یہ ہے کہ اس کا بیسیوں سے تعلق رہا ہے، کس کس خاوند کا نام بتلائے۔"

"شیرنی کو زنجیر میں جکڑ کر بدمعاش تو جو چاہے سو کہہ لے، اگر میں آزاد ہوتی تو تجھکو کچا چبا جاتی۔"

حاکم اجلاس کی طرف مخاطب ہو کر اُس نے کہا "سرکار! میں راجپوت کی بیٹی ہوں، زندھیر سنگھ زمیندار کنڈرئی میرے چچا ہیں۔ میرے پران پت ضرور مفقود الخبر ہیں۔ میں نے اپنے کلیجہ کے ٹکڑے کو نہیں مارا ہے، وہ مجھ سے چھن ضرور گیا ہے۔ میں بے گناہ ہو کر بھی پھانسی پانا چاہتی ہوں۔"

ملزمہ کے منہ کی چادر سرک گئی، گورا چہرہ راجپوتی خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ اُس نے پھر کہا۔

"ہے کرشن بھگوان کیا مجکو بالکل بھول گئے، ساتھ ہی میرے پران ادھار میرے دیوتا اندر......"

لمبی کرچ نیام سے نکلی، تمغوں میں کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ فوجی سردار اجلاس کے کٹہرہ پر سے کود کر ملزمہ سے لپٹ گیا۔ "میری رکمنی، میری پیاری تجکو نہ کرشن بھگوان بھولے ہیں اور نہ تیرا پیارا اندر، کس کی تاب ہے جو تجکو پھانسی دے سکے۔"

عدالت اس حیرت انگیز تماشے کو دیکھ رہی تھی، حاکم نے سر جھکا کر نیچی نگاہ سے آہستہ سے کورٹ انسپکٹر سے پوچھا "مقتول کا نام کیا ہے۔"

"سریندر سنگھ"

نوجوان حاکم چونک پڑا، کرسی پیچھے گر گئی، میز کے کاغذات اور لوازمات کو جھٹکا لگا، سب چیزیں بے ترتیب ہو گئیں، رابرٹسن میز پر چڑھ گیا پھر ملزمہ کے کٹہرہ میں کود پڑا، اُس کے گلے میں باہیں ڈال دیں "اماں، اماں، یہ رہے تمہارے سریندر سنگھ۔"

(۷)

پادری رابرٹسن ہندوستان میں پچیس برس رہے تھے، جائز و ناجائز طریقوں سے ہزاروں بھیڑوں کو حضرت مسیح کے گلے میں شامل کیا تھا۔ ملو رام کی بد طینتی سے سریندر سنگھ ان کو مل گیا، حسین ذہین بچہ دیکھکر وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی، اچھی طرح پالا، سولہ سال تعلیم دلوائی آئی سی ایس کا امتحان پاس کر کے وہ ہندوستان آیا، اپنے ہی ضلع میں تعینات ہوا۔ پادری نے ہندوستان آتے وقت اُس کی قومیت، ولدیت، سکونت، ماں کی عسرت و افلاس، باپ کی گمشدگی سب بتلا دی تھی، اسی وجہ سے اس کا نام بھی سریندر سنگھ ہی رہنے دیا تھا صرف اپنا خاندانی نام رابرٹسن ایزاد کر دیا تھا۔

جب تلورام نے پولیس کو ملا کر رکمنی کنور کو اپنے ہی بیٹے کا قاتل قرار دلا کر چالان کر دیا تو قضا و قدر نے بچھڑے ہوئے باپ، ماں اور بیٹوں کو ایک ہی جگہ ملا دیا۔ گناہگار گرفتار ہوئے اور کیفر و کردار کو پہونچے۔

ایک سال گذر گیا، کندرئی اندر سنگھ کی جاگیر کا ایک جزو ہے۔ اسی موضع کے شمالی طرف کرنیل سردار بہادر اندر سنگھ وی۔سی کی عالی شان کوٹھی بنی ہوئی ہے۔ تھوڑے فاصلہ پر کرشن جی کا مندر تعمیر ہو گیا ہے جس کا سنہری کلس کئی میل سے دکھلائی دیتا ہے۔ ہر اتوار کی شام کو ایک موٹر اس مندر کے سامنے رکتی ہے، اس میں سے ماں، باپ، بیٹا اتر کر مندر میں جاتے ہیں۔ جب آرتی ہوتی ہے تو باجہ کے ساتھ ایک آواز انگریزی لہجہ میں سنائی دیتی ہے۔ ہرے کرشن، ہرے کرشنا، کرشنا کرشنا ہرے ہرے۔

سائنس اور اخبار

سائنس کی ایجادیں ہر لحظہ اخباروں کو نئے معیار پر لا رہی ہیں، اب یہ معمولی بات ہے کہ امریکہ میں مکا بازی کا مقابلہ ہو اور وہیں سے اسکی تصویریں لندن میں اخبار کے دفتر میں پہنچ جائیں اور ادھر مقابلہ ختم ہوا اور ادھر پانچ ہزار میل کے فاصلہ پر لوگ دو گھنٹہ کے اندر اسکی تصویریں دیکھ لیں۔

سائنس ایسے ذرائع کی تلاش میں ہے جن سے پیغامات اور تصاویر کی ترسیل اس قدر آسان اور ارزاں ہو جائے کہ تمام اخبار اُس سے بخوبی مستفید ہو سکیں۔ کل کا اخبار ایک عظیم الشان ٹرسٹ کے ماتحت ہوگا، اس ٹرسٹ کے ہیڈ آفس میں واقعات عالم کے باتصویر حالات موصول ہونگے اور پھر وہاں سے ٹرسٹ کے تمام متعلقہ اخباروں میں لیڈنگ آرٹیکل، ایڈیٹوریل نوٹ تصویریں، مختصر اور مسلسل افسانے اور مضامین غرضیکہ ایک اعلیٰ درجہ کی جملہ دلچسپیوں کا سامان لاسلکی کے ذریعہ بھیجے جائیں گے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مرکزی دفتر میں جو خبر کمپوز ہو رہی ہے یا جو تصویر چھپ رہی ہے وہی خبر اور تصویر سارے ملحقہ اخباروں کے مطابع میں بعینہ کمپوز ہوتی جائیگی، اور اس ٹرسٹ کے جملہ اخبار آٹومیٹک کمپوزیشن کے ذریعہ ایک خاص بلند صنعتی معیار کے مطابق تیار ہونگے۔

(چندن)

تنقید کتب

نفسیات عنفوان شباب

مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم - اے ، پی ایچ - ڈی
رائل سائز ۲۱۴ صفحات - ملنے کا پتہ ، مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ، دہلی

یہ پروفیسر ایڈوارڈ اشپرانگر کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے جو براہ راست جرمن زبان سے کیا گیا ہے اس میں عنفوان شباب کی نفسیات سے بحث کی گئی ہے اور متعدد ابواب پر مشتمل ہے . شروع میں مصنف کا ایک مختصر دیباچہ ہے جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں :-

"مجھے معلوم ہے کہ میں نے جو تصویر جرمن نوجوانوں کی پیش کی ہے وہ ہر ملک اور عہد کے نوجوانوں پر پوری نہیں اُترتی . غالباً ہندوستان میں جو حضرات ہمدردی کی نظر سے اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں گے اُن کو دونوں ملک کے نوجوانوں کی عام خصوصیات میں مشابہت معلوم کرنے سے اتنا فائدہ نہ ہوگا جتنا باہمی فرق پر غور کرنے سے لیکن بعض قوموں میں باوجود ظاہری اختلاف کے ایک معنوی رابطہ پایا جاتا ہے جس کی بنا اس پر ہوتی ہے کہ دونوں میں گہری روحانیت مشترک ہے ، اور دونوں کی قسمت قریب قریب یکساں ہے . جرمن ، اور ہندوستانی اہل دل جب کبھی ملتے ہیں تو انھیں اس ہمرنگی اور ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے ...... ہم جرمنوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر قوم کو خود اپنے روحانی سرمایہ پر زندگی بسر کرنا چاہیئے ...... ہم عرصہ سے ہندوستانیوں کے گہرے عقائد اور روحانی سکون قلب سے متاثر بلکہ مسحور ہیں - ہماری قوم کے بڑے بڑے ارباب فکر فریڈرش شلیگل ولہلم فان ہمبولٹ اور شوپن ہاؤ ایر نے محبت کی نظروں سے ہند قدیم کے تمدن کا مطالعہ کیا ہے ، ان لوگوں کے ذریعہ سے جو پیام محبت ہندوستان سے آیا تھا اس کے جواب میں جرمنی یہ کتاب پیش کرتا ہے"

مندرجہ بالا اقتباس کے مطالعہ سے اس کتاب کے مفید ہونے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے مطالعہ کے بعد بہت سی ضروری و مفید باتیں معلوم ہو سکتی ہیں - نوجوانوں کی عنفوان شباب کی نفسیات

کے ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، عشق و محبت، اخلاقی نشو و نما، پیشہ کا تعلق، سیاسیات سے دلچسپی، مذہبی جوش، احساس زندگی وغیرہ ہر پہلو خصوصیت سے لائق مطالعہ ہے۔ اُردو میں اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ نئی کتاب ہے۔ لیکن بقول مترجم "یہ فلسفہ کی کتاب ہے اور اس میں بھی ایک خاص زاویہ نگاہ کی حامل ہے اس لئے اگر اس کے مطالب کے سمجھنے میں کچھ دقت ہو تو (قارئین) بددل نہ ہوں، غور و توجہ سے مطالعہ کیا جائیگا تو یہ دقت دُور ہو جائیگی"۔

اس ترجمہ میں کہیں کہیں زبان کی خامیاں نظر آتی ہیں مگر موضوع کی خوبیوں کے لحاظ سے ان کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

ارتقا

از مشتاق احمد وجدی صاحب، ڈمائی سائز۔ ۱۰۰ صفحات۔ مجلد قیمت [illegible]

مطبوعہ انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد دکن

مسئلہ ارتقا مغربی ممالک میں ایک معرکۃ الآرا مسئلہ بن گیا ہے اور اس پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اردو میں اس قسم کی غالباً کوئی کتاب نہیں ہے، اس لئے اس کتاب کی اشاعت پر انجمن ترقی اردو مستحق مبارکباد ہے۔

اس میں شک نہیں کہ علمی اور فلسفیانہ مسائل سے صرف اُردو داں حضرات کو کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو داں حضرات کو اس قسم کی کتابوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے تاکہ ان کے علم میں وسعت پیدا ہو اور اہل مغرب کی کوششوں سے سبق حاصل کر کے وہ بھی کچھ کام کر سکیں۔

ہندو اخلاقیات

مصنفہ مسٹر جی۔ اے چندا ورکر بی، اے۔ رائل سائز ۱۳۲ صفحات۔ قیمت [illegible]

ملنے کا پتہ: پروہت اینڈ کو، ریزیڈنسی بازار، حیدرآباد دکن۔

یہ کتاب مسٹر چندا ورکر نے "اے مینول آف ہندو اتھکس" کے نام سے انگریزی زبان میں تالیف کی تھی جس کو مولوی غلام ربانی صاحب نے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ کتاب کی غرض تالیف خود مصنف کے الفاظ میں یہ ہے کہ "ہندو نوجوانوں کو مذہبی اور اخلاقی تعلیم دینے کی جو زبردست ضرورت ہے اُسے اکثر مصلحین تعلیم تسلیم کر چکے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندو نوجوانوں کو شروع ہی سے اپنے مذہب کے اصول اور اپنے اداروں کی تاریخ سے واقف کر دیا جائے۔ موجودہ تالیف اسی ضرورت کی تکمیل کے

لئے پبلک کے سامنے پیش کی جاتی ہے"

یہ کتاب چودہ ابواب پر مشتمل ہے اور ان میں اخلاقی تعلیم و اصول اخلاق ہیں مثلاً ویدوں کی اخلاقی تعلیم، اپنشدوں کی اخلاقی تعلیم، منو کے اصولِ اخلاق، مہابھارت کے اصول اخلاق وغیرہ۔ آخر کے دو ابواب میں ہندوؤں کا اخلاقی مذہب اور ہندو رشیوں کا عقیدہ اکمیت بیان کیا گیا ہے۔ تمام اخلاقی تعلیم و اصول وید، اپنشد، شاستر، گیتا اور مشہور رشیوں کے عقائد سے لئے گئے ہیں حسب ضرورت بعض ابواب کے آخر میں اصل سنسکرت اشلوک بھی لکھدیے گئے ہیں، اقوال و مواعظ کا انتخاب بڑی محنت سے کیا گیا ہے اور ترجمہ میں حسب ضرورت وضاحت و تشریح سے کام لیا گیا ہے۔

اخلاقی اصول تمام مذاہب میں قریب قریب یکساں ہیں اور ان کا مطالعہ ہر صورت سے مفید ہے اگرچہ کتاب کی غایت تالیف ہندو نوجوانوں کو اپنی اخلاقی تعلیم سے باخبر کرنا ہے مگر دوسرے مذہب کے لوگ بھی اس کتاب کا مطالعہ کر کے مستفید ہو سکتے ہیں۔

تشریح رازِ معرفت معروف بہ جواہراتِ اسلام

مؤلفہ مسٹر تپیت رائے جین بیرسٹرایٹ لا دہلی، کراؤن سائز، ۱۴۴ صفحات۔ قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ: ہیرالال پنالال، دریبہ کلاں، دہلی

یہ کتاب جس مقصد کو پیش نظر رکھکر لکھی گئی ہے وہ بہت کچھ قابل قدر و مستحق ستائش ہے، اس مقصد کو خود مؤلف کے الفاظ میں سن لیجئے:۔

"دین اسلام کے بارے میں لوگوں کے مختلف خیالات ہیں، پس یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی اصلیت حال کا پتہ لگایا جائے، اور اس کے قیمتی جواہرات کو ناقص پتھروں اور چکنا چور شیشے کے ٹکڑوں سے علٰحدہ کر کے اس کے حسن تجلی کو بنی نوع انسان کے سامنے رکھا جاوے جس سے مسلم اور غیر مسلم سب کا فائدہ منصور ہے۔"

یہ کتاب بارہ ابواب میں منقسم ہے جن میں مدعائے دین، حیاتِ ابدی، تناسخ ارواح، قربانی گاؤ وغیرہ مسائل پر بحث کی گئی ہے اور سند میں حضرت مولانا روم کی مثنوی کے اشعار پیش کئے گئے ہیں ممکن ہے کہ ان اشعار کے جو معانی بیان کئے گئے ہیں وہ علمائے اسلام کے نزدیک مقبول نہ ہوں بہرصورت چونکہ مقصد تالیف ہندو مسلم اتحاد و اتفاق ہے اور دونوں فریق کو ایک دوسرے کے مذہب کے مطالعہ کرنے اور اس کو سمجھنے کی ترغیب دیگئی ہے اسلئے مؤلف کی کوشش داد کی مستحق ہے۔

دیوان یقین

مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی۔اے۔ ڈمائی سائز۔ ۱۹۲ صفحات۔ مجلد قیمت عہ/
ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد دکن

نواب انعام اللہ خاں یقین اُردو زبان کے ابتدائی دَور کے خوش کلام شاعر اور مرزا مظہر کے شاگرد رشید تھے۔ جوانی میں راہی ملک بقا ہوئے تھے، ان کا کلام کمیاب ہے اور خاص خاص اصحاب کے پاس قلمی و مطبوعہ دیوان ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے متعدد نسخوں کی مدد سے مقابلہ و تصحیح کے بعد یہ دیوان مرتب کیا ہے، شروع میں مرزا صاحب کا ایک بسیط دیباچہ ہے جو اٹھانوے صفحات پر حاوی ہے اس میں یقین کے ذاتی حالات کے علاوہ جو خصوصیت سے تحقیق کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں۔ ان کے کلام پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اصل دیوان ہے جس میں صرف چونسٹھ صفحات ہیں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔ ہر غزل میں صرف پانچ اشعار ہیں، بطور نمونہ ایک غزل درج ذیل ہے:-

بلائے عقل سے کچھ چھوٹنے کی راہ نہیں ۔۔۔ بغیر میکدہ یارو! کہیں پناہ نہیں
بتاں، خدا کی خدائی کے سب مظاہر ہیں ۔۔۔ جو ان کا بندہ کہاوے تو کچھ گناہ نہیں
نہ کر مضائقہ گر تجھکو ہے ستم کی ہوس ۔۔۔ دیارِ عشق ہے، یاں کوئی دادخواہ نہیں
خجل نہ کر مجھے، مہماں نہ ہو مرا اے عشق ۔۔۔ کہ میری آنکھ میں آنسو، جگر میں آہ نہیں

جہاں کے بیچ کہیں آبرو نہیں اُس کو
یقیں جو حضرتِ خوباں کا خاکِ راہ نہیں

مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے جس قدر محنت و تحقیق سے یہ دیوان مرتب کیا ہے اُس کے لئے وہ مستحق مبارکباد ہیں۔ امید ہے کہ اہل ذوق اس دیوان کی قدر کریں گے اور مؤلف کی کوششوں کی داد دیں گے۔

روح بہار

(مسز نیڈو کی ایک انگریزی نظم کا ترجمہ)

بہار، اے پُر فضا بہار، تیری روح نہاں ہے، بلبل کے چہچے میں یا خندۂ گل میں، یا شبنم کے رقص میں جو چاندنی میں ہو رہا ہے، یا نسیم کے جھونکوں میں، جب وہ علی الصبح پیام دوست لاتے ہیں:-

شلیہ

تیری روح پوشیدہ ہے۔ عروس کی امیدوں میں ـــ دوشیزہ کے خوابوں میں۔ جنکے دل کی کلی ابھی نہیں کھلی ہے۔ (ماخوذ)

ہمالہ سے دو دو باتیں

از جناب شیام موہن لال جگر بی اے بریلوی

بھلا مجال کہاں مجھ سے بے زبانوں کی — کہ منہ سے بات کہوں کچھ فلک نشانوں کی
ترے وجود سے عالم یہ ہوگیا روشن — کہ خاکِ ہند میں رفعت ہے آسمانوں کی
وہ پھول ہیں ترے دامن میں سامنے جن کے — بہار گرد ہے دنیا کے گلستانوں کی
گپھاؤں سے تری نکلیں تو سارے عالم میں — صدائیں گونج اٹھیں توحید کے ترانوں کی
بلندیوں سے تری وہ رواں ہوئے چشمے — حیات جن سے ہے دنیا کے باغبانوں کی
مئے مجاز میں جو نشۂ حقیقت ہے — وہ یادگار ہے تو عشق کے نشانوں کی
تری بلندیِ عز و وقار کے آگے — چلی نہ ایک ہوائی جہاز رانوں کی
یہ خامشی، یہ بلندی، یہ جود و شانِ ثبات — تو ہی قدیم نشانی ہے بے نشانوں کی
وہ صور پھونک دے اپنے لبِ مبارک سے — کہ یاد تازہ ہو بھولے ہوئے فسانوں کی

اٹل ہوں جن کے ارادے خیال جن کے بلند
اٹھیں اب ایسے زمینِ وطن سے حوصلہ مند

ازل کے روز ستم کا یہ بندوبست ہوا — کوئی بلند ہوا اور کوئی پست ہوا
اگر فقیر کی قسمت میں بوریا آیا — تو شاہ کے لئے مسند کا بندوبست ہوا
کسی کا دل نہ بھرا تاج و گنج لے کر بھی — کسی کے ہاتھ جو کملی لگی تو مست ہوا
کسی کی رفعتِ ہمت سے تو بھی نیچا ہے — کوئی وہ ہے کہ خود اپنی نظر میں پست ہوا
خودی پہ غالب و زردار و بامراد مٹے — ضعیف و بیکس و مسکیں خدا پرست ہوا
امیدِ خلد پہ سنیاس کوئی لے بیٹھا — شرابِ ناب لنڈھائی کسی نے مست ہوا
وفورِ غم سے کوئی زندگی سے عاجز ہے — کسی کا عیش بڑھا وہ کہ خود پرست ہوا
رہِ نیاز میں کوئی ہے پائمالِ جہاں — تفنگ و توپ کوئی لیکے چیرہ دست ہوا
غلامِ ساقیِ باطن مکیں پہ شیدا ہے — خرابِ بادۂ ظاہر مکاں پرست ہوا

زمانہ میں کوئی اِک حال پر رہا ہی نہیں
ہماری ذلت و پستی کی انتہا ہی نہیں

نہ ہوتا آج حمایت پہ تو اگر اپنی — نہ بھول بیٹھتے راحت میں ہم خبر اپنی
جہاں پہاڑ ہیں لاشیں وہاں نظر آتیں — بناتے شوق سے سینوں کو ہم سپر اپنی
خیالِ نسبت رہِ اتحاد مٹ جاتا — نفاقِ قوم سے بنتی نہ جان پر اپنی
رگوں میں خون سروں میں جنون بڑھ جاتا — پناہ دیتی ہمیں قوتِ جگر اپنی
بلندیاں نہ کبھی ہوتیں نہ سدِ راہ اگر — تو گھوم پھر کے نہ رہتی یہیں نظر اپنی
مثالِ موجِ ہوا ہم رواں دواں پھرتے — بساط پھیلاتی سارے جہان پر اپنی
جہان بھر کی حمایت پہ ہم تلے ہوتے — جو ہوتی ہاتھ میں تلوار اور سپر اپنی
نکل کے گھر سے جنھوں نے کیا جہاں بیدار — نہ دے سکے وہ سلف ہم کو کچھ خبر اپنی
تو ہی تو مانعِ الطاف آسمانی ہے — ترے سبب سے ہے فریاد بے اثر اپنی

اگر بڑا ہے تو چھوٹوں کی بات بھی سن لے
کسی کا قصۂ دردِ حیات بھی سن لے

ہوا ہے تجھ کو اگر قرب آسماں حاصل — تو بیکسوں کی نہ فریادِ غم میں ہو حائل
کسی کے رنج سے پانی نہ ہو تو کیا ہے جگر — کسی کے غم پہ نہ روئے لہو تو کیا ہے دل
کسی کے کام نہ آئے تو کیا بلندی ہے — نہ جائے پستیٔ ہندی تو تجھ سے کیا حاصل
نباہنا حقِ ہمسائگی اگر ہے تجھے — ہمارے ساتھ تڑپ تو بھی صورتِ بسمل
رگوں سے خون کے دریا بہا کے دکھلا دے — ہٹا کے سنگِ جگر ناخنوں سے کر گھائل
یہی ہے فرض یہی اقتضا مروت کا — دکھا دے عرش پہ تو چیر کر ہمارا دل
رگوں کو کاٹ کے اِک اِک نشان دکھلا دے — جہاں جہاں سے وہ زخمی جہاں جہاں گھائل
بیانِ قصۂ غم ہو رقیبِ صبر و قرار — فغانِ درد سے ہل جائیں قدسیوں کے دل
تڑپ تڑپ کے نہ آہوں سے چین لینے دے — کرم پہ اپنے نہ جبتک کہ عرش ہو مائل

جو یہ نہیں تو سرک جا نظر کے آگے سے
دعا کا وقت ہے ہٹ جا جگر کے آگے سے

جواب ہمالہ

ہمالیہ نے سنا جب یہ دلخراش کلام
بھر آئے دیدۂ پرنم میں اشکِ لالہ فام

اک آہِ سرد بھری اور یوں ہوا گویا
عبث کیا ہے مجھے تو نے موردِ الزام

محب و محسن و ہمدرد و دستگیر و شفیق
زیادہ مجھ سے کوئی ہند کا ہو تو لے نام

ازل سے میں نے جو انجام خدمتیں دی ہیں
نہ پوچھ مجھ سے کہ واقف ہیں سب خواص و عوام

عذابِ ہند سے آٹھوں پہر تڑپتا ہوں
تپش دروں سے ہے سینے پہ نشترِ آلام

وہ غم ہے اُف کہ کلیجے میں پڑ گئے ناسور
رواں ہے دیدۂ پرنم سے سیلِ اشکِ مدام

فلک کی سمت ہے رخ ایک پانوں پہ ہوں کھڑا
یہی دعا ہے شب و روز اور صبح و شام

رحیم رحم کہ ہندی بھی تیرے بندے ہیں
زمانہ ہو گیا سہتے ہوئے انھیں آلام

پڑے ہوئے ہیں غریبوں کی جان کے لالے
ستا رہی ہے اب ان کو گردشِ ایام

دکھا دے شانِ کرم جلد اے غفور و رحیم
مٹا دے ان کے ستارے سے کلفتِ ایام

وہاں سے آئی ہے رہ رہ کے آہ یہ آواز
بھلا دیا ہے ترے ہند نے ہمارا پیام

اٹھا کے رکھا ہے ویدوں کو طاقِ نسیاں پر
فسانہ کر دیے گیتا نے پاک کے احکام

تمام قوم وہ آداب بھول بیٹھی ہے
کبھی تھا جن سے یہ خطہ بھی قدسیوں کا مقام

نہ نام ہے کہیں اخلاق کا نہ ایماں کا
نہ حوصلے نہ کہیں حوصلوں میں استحکام

نہ دل میں بوئے وفا ہے نہ پاسِ غیرت ہے
نہ رنگ چہرے پہ اپنا ہے اور نہ اپنا نام

قدیم رنگِ محبت سے شرم آتی ہے
نئے بتوں کے ہیں بندے نئی ادا کے غلام

جگر میں درد نہ سینوں میں جوش ہے باقی
پیا ہے بادۂ تہذیبِ نو کا جب سے جام

کچھ اس طرح سے پندار کے ہیں متوالے
کہ ایک بھائی کا چھونا ہے دوسرے کو حرام

بٹے ہیں ایک سے یہ صد ہزار قوموں میں
تو ہی بتا دے کہ کیا ہے نفاق کا انجام

کہیں بھی ان میں رہی بوئے قومیت باقی
غلط ہے دے جو انھیں کوئی ہندیوں کا نام

مگر وہ غیرت و عصمت کی دیویاں جن سے
وفائے ہند کو حاصل ہوئی حیاتِ دوام

انھیں کی فرض شناسی انھیں بچائے ہے
وگرنہ مٹ گیا ہوتا جہاں سے ان کا نام

اگر ہے پاس تجھے ان کی زندگانی کا
تو جا کے دے مری جانب سے تو انھیں یہ پیام

جہاں ہے دین وہیں عیش کامرانی ہے
وہیں بقا ہے وہیں فیضِ آسمانی ہے

آرزو

(از سید سلطان احمد صاحب عظیم آبادی)

اے مرے خامۂ پرزور روانی دکھلا — پھر مجھے جوہر شمشیر معانی دکھلا
نوجوانوں کی طرح شان جوانی دکھلا — ہم زباں بن کے مرا سحر بیانی دکھلا
آرزو نام ہے کس کا یہ بتادوں سب کو
اس کی ہنستی ہوئی تصویر دکھادوں سب کو

ہے وہ کیا چیز جو محنت پہ لگا دیتی ہے — جادۂ منزل مقصد کا پتا دیتی ہے
خار یا سنگ کو رستے سے ہٹا دیتی ہے — اپنے مطلوب سے طالب کو ملا دیتی ہے
آرزو دل کی ہے وہ شوق بھی نام اُسکا ہے
مائل طرز عمل کردے یہ کام اُس کا ہے

اس کے پابند ہیں سب خدمتیان ہستی — بادۂ طرز عمل کی ہے اِسی سے مستی
ہے یہی رہبر عنوان فراز و پستی — اس نے عالم میں بسا دی نہیں کیا کیا بستی
گوشہ گوشہ ہوا آباد جو ویرانے کا
اور عالم ہوا کچھ دہر کے مے خانے کا

آرزو ہی سے ہے کاشانۂ دل کی زینت — یہ نہو گر تو ہے سُنسان حریم الفت
اس کی پوچھے کوئی ارباب وفا سے عظمت — ہے یہی باعث تسکین مریض فرقت
کون وہ دل ہے کہ جس میں نہیں جلوا اسکا
سارے عالم کی زبانوں پہ ہے چرچا اسکا

اے مری آرزو سو جاں سے میں تجھ پر قرباں — تیرے کس کس کے نہیں سر پہ ہیں بار احساں
بھر دیئے گوہر مقصود سے جیب وداماں — کردیا تو نے بہم عیش کا سارا ساماں
تجھ سے وابستہ مساعی جمیلہ سارے
تو نہ جس دل میں ہو کیونکر نہ وہ ہمت ہارے

تیرے قدموں کی بدولت نہیں کیا کیا ہوتا　　بڑھتی توقیر کہ رتبہ نہیں اعلا ہوتا
رازِ سربستہ تجھی سے ہے ہویدا ہوتا　　تیری تحریک سے ہر کام ہے برجا ہوتا
دھیان ٹلتا نہیں ہنگامِ تگ و دو تیرا
تو وہ رستہ ہے کہ کٹتا نہیں رہرو تیرا

رباعیات

(از منشی تلوک چند محروم بی اے)

(۱)

اے خالقِ ذوالجلال اے ربِّ غفور　　ہے تیرے کرم سے جملہ نیرنگِ ظہور
ہے رحمتِ عام کارفرما تیری　　محروم ہوں میں تو اس میں میرا ہے قصور

(۲)

ہستم بجہاں اگرچہ غرقِ عصیاں　　دارم امیدِ رحمتش در دل و جاں
دانندۂ ہرچہ در ضمیرم گزرد　　بینندۂ ہرچہ میکنم در پنہاں

(۳)

خورشید و قمر کی روشنی ہے جاں بخش　　تاروں میں عیاں جھلک ہی ہے جاں بخش
کہلائے نہ کیوں حسنِ ازل جانِ جہاں　　جب پرتوِ عکس سرسری ہے جاں بخش

(۴)

مضطر نہ مصیبتوں میں ہرگز ہو بشر　　بڑھ جاتا ہے اس سے اور کلفت کا اثر
تڑپے گر دام میں بہت مرغِ اسیر　　الجھن بیش آئے گی اسے الجھن پر

لطفِ سخن [1]

منظاہر حسن صاحب ظاہر

یہ اور مسلم ہے کہ تو سب میں ہے شامل — لیکن تجھے ہم سب سے جدا دیکھ رہے ہیں
اللہ رے مصور ترے ہاتھوں کی صفائی — تصویر سے تصویر جدا دیکھ رہے ہیں
عاشق کے سرہانے وہ دمِ نزع ہیں بیٹھے — مٹتی ہوئی تصویر وفا دیکھ رہے ہیں

خورشید علی صاحب خورشید

یہ زہد یہ تقویٰ ہو مبارک تجھے زاہد — ہم مست ہیں مستی میں خدا دیکھ رہے ہیں

حکیم رضوان احمد صاحب رضوان

وہ مستعدِ قتل ہیں میں جینے سے بیزار — اب دیر ہے کیا اور وہ کیا دیکھ رہے ہیں
اب دیکھیے موت آئے کہ وہ آئیں شبِ غم — ہم کیفیتِ بیم و رجا دیکھ رہے ہیں

حافظ حاجی فخرالدین صاحب فخری پانی پتی

ہم قصدِ حرم کر کے چلے دیر میں پہونچے — صد حیف مقدر کا لکھا دیکھ رہے ہیں

احسان اللہ خاں صاحب احسان سہارنپوری

دنیا میں رہے پردہ نشیں بن کے ہمیشہ — محشر میں انھیں جلوہ نما دیکھ رہے ہیں

نانک سنگھ صاحب قمر

وہ پوچھتے ہیں آپ کی نظریں ہیں کدھر کو — اب آپ سے ہم کیا کہیں کیا دیکھ رہے ہیں

محمد اسمٰعیل صاحب ذبیح شکوہ آبادی

آتی ہے اجل کو بھی اجل ہجرِ بتاں میں — آتی نہیں ہم راہِ قضا دیکھ رہے ہیں

کور سرن لال صاحب ادیب لکھنوی

چھائی ہوئی گلشن پہ گھٹا دیکھ رہے ہیں — آئی ہوئی توبہ پہ بلا دیکھ رہے ہیں

[1] ماری آباد کے ایک مشاعرہ کا انتخاب مرسلہ مولوی محمد اظہار الحسن بی اے۔ ایل ایل بی۔

اک اپنی برائی تو نظر میں نہیں آتی — ہر چیز مگر اس کے سوا دیکھ رہے ہیں
ایجاد سے محروم رہے وائے غلامی — غیروں ہی کے نقشِ کفِ پا دیکھ رہے ہیں

محمد یعقوب صاحب فن سہارنپوری

تڑپ تڑپ کے چلاتے ہیں گلے پہ یہ خنجر — تھم تھم کے تڑپنے کا مزا دیکھ رہے ہیں
اک حشر بپا اٹھتی جوانی نے کیا ہے — قامت کو قیامت سے سوا دیکھ رہے ہیں

عبدالخالق صاحب نہال سیوہاروی

رفتار سرو ہی ہے تو خنجر ہے تبسم — قاتل تری ہر ایک ادا دیکھ رہے ہیں

گوپی ناتھ صاحب امن لکھنوی

بالیں پہ مری جمع ہیں احباب دمِ نزع — خاموش ہیں انجامِ وفا دیکھ رہے ہیں
یہ دعویٔ جانبازیٔ اغیار غضب ہے — ہم پیشِ نظر اپنی قضا دیکھ رہے ہیں
اک وہ جو بدلنے کو ہیں رنگِ رخِ عالم — اک ہم کہ زمانہ کی ہوا دیکھ رہے ہیں

علی رضا صاحب رضا اٹاوی

پروانوں سے پوچھو کہ وہ کیا دیکھ رہے ہیں — کیا آگ کے شعلہ میں خدا دیکھ رہے ہیں
وہ بزم میں خود اپنی ادا دیکھ رہے ہیں — یہ دیکھنے والے مجھے کیا دیکھ رہے ہیں
خود بینی سے رغبت ہے تو دیکھیں مرے دلکو — اک کانچ کے ٹکڑے میں وہ کیا دیکھ رہے ہیں
آشوبِ قیامت کو ترے عہدِ ستم میں — یا سنتے چلے آئے تھے یا دیکھ رہے ہیں
یہ رونے پہ آئیں تو زمانہ کو رلا دیں — لیکن تری مرضی کو رضا دیکھ رہے ہیں

رباعی

(از جناب محروم بی-اے)

افسردہ شباب کا جنوں ہوتا ہے — دل پر اک ماتمی سکوں ہوتا ہے
محروم اس انقلاب پر کیا حیرت ہے — پیری آتی ہے جب تو یوں ہوتا ہے

علمی خبریں اور نوٹ

منشی سورج نرائن صاحب مہر دہلوی اور خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب کی وفات حسرت آیات پر اردو زبان جتنا ماتم کرے کم ہے۔ ان حادثات سے ہماری بزم ادب سُونی ہو گئی ہے۔ دونوں صاحب صف اول کے اُردو مصنفین میں شمار ہوتے تھے۔ دونوں حضرات زمانہ کے قدیم مضمون نگار تھے، دونوں کی قلمی عنایات سے زمانہ کی گذشتہ جلدیں زیربار احسان ہیں۔ دونوں قدردانانِ اُردو سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ منشی سورج نرائن صاحب اپنے وقت کے ادیب فاضل اور ہندو فلسفہ کے ماہر کامل تھے۔ آپ کا شمار اُن بزرگ ہستیوں میں تھا جن پر عالم باعمل کا لقب صادق آتا ہے اور اس حیثیت سے آپ کی یاد عرصہ دراز تک لوگوں میں قائم رہیگی۔ آپکی متعدد تصانیف نظم و نثر آپ کے نکتہ دانی اور نکتہ سنجی کی بہترین یادگار ہیں۔ آپ نے فلسفہ کے دقیق سے دقیق مسائل جس خوبی و خوش اسلوبی سے اُردو داں جماعت کے سامنے پیش کئے ہیں۔ اُن سے نہ صرف آپ کے ہمعصر ہی مستفید ہوئے ہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے بھی دل و دماغ مسرور و منور ہوتے رہیں گے۔ آپ کی زندگی میں بعض بڑے بڑے حادثات پیش آئے لیکن ان صبر آزما موقعوں پر آپ سے جس تسلیم و رضا کا اظہار ہوا وہ آپ کی روحانی عظمت کا ثبوت تھا۔ زمانہ کے ابتدائی دور میں ان اہم مسائل زندگی پر آپنے جو قابل قدر مضامین لکھے وہ آج تک رسالہ کے لئے باعث فخر ہیں۔ ایک عرصہ سے آپ دنیا سے کنارہ کش سے ہو گئے تھے اور کئی سال سے خالص مذہبی رسالوں کے سوا دوسرے پرچوں میں مضمون لکھنا چھوڑ بیٹھے تھے۔ مگر پرانی محبت کے تقاضے سے آپ اپنے قدیم احباب و متوسلین کی ترقی سے برابر دلچسپی لیتے تھے چنانچہ زمانہ کی جشن جوبلی میں آپ نے بھی اظہار خوشی فرما کر ہماری حوصلہ افزائی فرمائی تھی۔ آپ کی وفات سے اُردو میں ہندو فلسفہ کے باریک نکات کا سمجھانے والا کوئی شخص باقی نہ رہا۔ ایشور آپ کی روح پُرفتوح کو غریق رحمت کرے۔ درحقیقت ایسے لوگوں کی موت کو معمولی موت سمجھنا غلطی ہے کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو خاک میں ملکر حیات ابدی پا جاتے ہیں۔ انسانی روح کے لئے اس سے زیادہ کیا مسرت ہو سکتی ہے کہ فرائض کی تکمیل کے بعد وہ اپنے خالق سے جا ملے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

مہر صاحب کا کلام زیادہ تر مسلسل ہے جس کو لفظی صنائع و بدائع سے چنداں تعلق نہیں بلکہ ہر شعر میں واردات قلب کی کیفیتیں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دنیائے خارجی میں جو حسرت انگیز و عبرت خیز نظارے چشم بینا نے دیکھے اور دنیائے داخلی کی جو کیفیتیں دلِ دردمند نے محسوس کیں انھیں کا ہو بہو نقشہ فاضل شاعر نے اشعار میں شرح و بسط کے ساتھ کھینچ دیا ہے۔ بہر حال حقیقت بیں نگاہوں کے لئے آپ کی نظم و نثر مستقل نفع و دلچسپی کی چیزیں ہیں۔ آپ عرصہ دراز تک سررشتہ تعلیم پنجاب کے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس اور ٹکسٹ بک کمیٹی پنجاب کے رپورٹر رہے۔ آپنے بچوں کے لئے بھی انگریزی کی بہت سی اخلاقی نظموں کا ترجمہ کیا ہے

مرزا سلطان احمد صاحب بھی ملک کے مشہور و ممتاز ادیب تھے، آپ کا شمار بھی زمانہ کے قدیم قلمی معاونین میں ہے

آپ کے بیسیوں مضامین رسالہ میں شائع ہوکر مقبول و مشہور ہو چکے ہیں۔ آپ کو بھی اخلاق اور فلسفہ کے مضامین سے طبعی لگاؤ تھا۔ آپ نے ان موضوع پر صدہا مضامین لکھے ہونگے۔ دراصل ہندوستان کا شاید ہی کوئی اُردو رسالہ آپ کے عالمانہ مضامین سے محروم رہا ہو۔ آپ کے مضامین عموماً ادق اور خشک ہوا کرتے تھے اور ان میں عربی اصطلاحات کا زیادہ استعمال ہوا کرتا تھا اس لئے وہ عام فہم تو نہ ہوتے تھے لیکن اہل ذوق انھیں ہمیشہ غور سے پڑھا کرتے تھے۔ آپ کا طرز تحریر ہمیشہ سنجیدہ اور مدلل و فلسفیانہ ہوتا تھا۔ آپ نے بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں جن میں "فلسفہ شاعری" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آپ نہایت خوش اخلاق اور باوضع واقع ہوئے تھے۔ مضامین کے متعلق آپ نے شاید ہی کسی کی درخواست رد کی ہو۔ آپ فرقۂ احمدیہ کے مشہور و معروف بانی مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے فرزند اکبر تھے۔ لیکن اعتقادات کے لحاظ سے وہ ان کے پیرو نہیں ہوئے۔ آپ عرصہ تک پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے عہدہ پر مامور رہے اور ملازمت کی مدت پوری کرنے کے بعد خطاب و پنشن کے ساتھ کنارہ کش ہوکر اپنے وطن میں مقیم تھے۔ آپ کی وفات سے اُردو زبان کو جو نقصان پہونچا ہے اُسکی تلافی آسان نہیں ہے۔

زمانہ بابتہ نومبر ۱۹۲۶ء میں مسٹر گجادھر پرشاد ایم۔اے نے منشی تن لال آفریں الہ آبادی مرحوم کی بنارس کے متعلق ایک مثنوی "کاشی استت" (فارسی) کا مختصر تذکرہ کیا تھا۔ اس کے بعد زمانہ بابتہ جنوری ۱۹۲۷ء میں مسٹر رام پرشاد بی۔اے (علیگ) نے اس مثنوی کے متعلق کسی قدر تفصیل سے مضمون لکھا تھا جس میں اس کا مطبوعہ ہونا بھی ظاہر کیا گیا تھا۔ یہ مضامین پڑھکر ہمارے نوجوان دوست منشی جے دیال خلف منشی رام دیال صاحب فینانشل سکریٹری ریاست جاورہ کو اس مثنوی کی تلاش ہوئی۔ بالآخر جوئندہ یابندہ کی مثل صادق آئی اور مثنوی مذکور مطبع نولکشور لکھنؤ سے مل گئی۔ نولکشور پریس میں اکتوبر ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ افسوس یہ اطلاع ہمکو اس وقت ملی جب منشی جے دیال صاحب اس عالم فانی میں باقی نہیں ہیں۔ اس تلاش کے ایک ماہ بعد آپ بھی اپنے برادر بزرگ منشی سکھ دیال کی طرح عین عالم شباب میں اپنے والد نامدار کو دائمی مفارقت کا داغ دے گئے۔ منشی رام دیال صاحب جنکا گرامی نامہ کسی دوسری جگہ شائع کیا جارہا ہے رسالہ زمانہ کے قدیم ترین قدردانوں اور اولین خریداروں میں ہیں۔ روز اجراء (یعنی فروری ۱۹۰۳ء) سے ابتک رسالہ زمانہ کا کوئی پرچہ آپ کے مطالعہ سے محروم نہیں رہا۔ افسوس پے در پے حادثات نے آپ کو اس پیرانہ سالی میں پریشان کر رکھا ہے۔ چنانچہ اپنے عہدہ سے کنارہ کش ہوکر اب ریاست جاورہ سے اپنے وطن بریلی تشریف لے آئے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ کن الفاظ میں آپ کے ساتھ ہم اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کریں۔ ایسی مقام میں انسان مجبور ہوجاتا ہے، پروردگار حقیقی آپ کو ان حادثات کے برداشت کی قوت عطا فرمائے۔ اور آپ کے مرحوم اعزا کی روح کو غریق رحمت کرے۔

تصاویر اس ماہ کی تصاویر میں ایک تصویر سترھویں صدی کی ایرانی مصوری کا نمونہ ہے جس میں ایک اونٹ کی بار برداری کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ دوسری تصویر عہد مغلیہ کی ہندوستانی مصوری کا نمونہ ہے جس میں فیلخانہ سے بھاگے ہوئے ایک ہاتھی کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اصل تصویریں برٹش میوزیم لندن میں موجود ہیں جن کی نقلیں خاص طور پر زمانہ کے لئے حاصل کی گئی ہیں۔ ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال اس سال ایوان رياستہائے ہند کے چانسلر منتخب ہوئے ہیں۔ آج کل آپ گول میز کانفرنس کی کامیابی کے لئے سرگرم کوشش ہیں۔ ایک

طرف آپ راجگانِ ہند میں فیڈرل اسکیم کو ہر دلعزیز بنانے میں مصروف ہیں۔ دوسری طرف ہندو مسلم گتھی کے سلجھانے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ نے اپنی حب الوطنی اور قابلیت کا سکہ دلوں میں بٹھا دیا ہے۔ مسٹر وجے راگھو آچاریہ کا شمار ملک کے قابل ترین بزرگوں میں ہے، آپ کے علم و فضل قابلیت و تجربہ کاری کا دُور دُور شہرہ ہے۔ آپ آیندہ ماہ کے ہندو مہا سبھا کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے ہیں۔

مراسلات

مرحوم منشی تن لال صاحب آفریں الہ آبادی

منشی تن لال صاحب کے متعلق دو مضمون زمانہ ماہ نومبر ۱۹۳۰ء و جنوری ۱۹۳۱ء میں طبع ہوئے ہیں جو ناظرین کرام کی نظر سے گذرے ہونگے۔ کاشی استت کے دیکھنے کا مجھے اور بندہ زادہ جے دیال کو بہت اشتیاق تھا، چنانچہ اس کے بہم رسانی کی کوشش کی گئی اور منشی رام پرشاد صاحب ہیڈ ماسٹر ہمیرپور کو تحفۃ الاحباب کے حاشیہ سے کاشی استت نقل کرکے بھیجنے کے لئے تکلیف دی گئی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

جے دیال جی نے اس کی تلاش میں بہت کوشش کی اور بالآخر کتاب کاشی استت مطبع منشی نولکشور سے مطبوعہ حاصل ہوگئی۔ چنانچہ چند نسخے منگا کر اصحاب قوم میں تقسیم بھی کئے گئے۔ جے دیال جی کا ارادہ تھا کہ واقفیت عامہ کے لئے مطبوعہ کاشی استت کی دستیابی کا حال زمانہ میں شائع کرائیں لیکن افسوس ان کی عمر نے وفا نہ کی اور کتاب مطبوعہ دستیاب ہونے کے ایک ماہ بعد ان کا انتقال ہوگیا۔

چونکہ کتاب کی دستیابی کا ذکر رسالہ زمانہ میں شائع کرانا ضروری تھا نیز مرحوم جے دیال جی کے ارادہ کے تکمیل کا بھی خیال تھا اس لئے یہ چند سطریں ضبط تحریر میں لائی گئیں۔

نسخہ کاشی استت جو مطبع منشی نول کشور سے مطبوعہ حاصل ہوا ہے وہ اکتوبر ۱۸۸۱ء شعبان ۱۲۹۸ھ سنہ ۱۲۹۱ فصلی کنوار سمبت ۱۹۳۸ بکرم میں بہ تحریک و تصحیح منشی گردھاری لال صاحب نائب واصلباقی نویس صدر لکھنؤ متخلص بہ آسد طبع ہوا ہے۔

منشی رام پرشاد صاحب و بابو گنگا دھر پرشاد صاحب مطبوعہ نسخہ مطبع منشی نول کشور سے منگا کر اس کی مطابقت اپنے پاس والے نسخہ سے فرمالیں تو خوب ہو۔

نیازمند رام دیال سکسینہ
(سابق فینانشیل سکریٹری ریاست جاورہ)

فہرست مضامین زمانہ جلد ۵۶ جنوری لغایۃ جون ۱۹۳۱ء

تصاویر: روح اور گناہ (رنگین) شاہنشاہ شاہجہاں اور ایک عالم دین۔ ٹمرک کے کنارے کا منظر۔ کالا ہرن اور اُسکا نگہبان۔ شیر اور بھینسے کی لڑائی۔ مریخ کی تصویر۔ مریخ کے نباتات و حیوانات۔ مولانا محمد علی مرحوم۔ عکس رخِ یار (رنگین)۔ ایک عالم دین کا مدرسہ۔ مصروفِ مطالعہ نوجوان۔ سولہویں صدی کی ایرانی مصوری کے دو نمونے۔ مہاتما گاندھی۔ لارڈ ارون۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ بابو پشن نرائن بھارگو۔ نورجہاں کا حسن تدبیر (رنگین) راز و نیاز (کانگڑا قلم کی مصوری کا نمونہ)۔ انوار سہیلی کے ایک قصہ کا منظر۔ تصویر شیر محمد قوال (عہد مغلیہ کی مصوری کا نمونہ)۔ ملکہ قلوپطرہ۔ ہمپی کے کھنڈرات کا عام منظر۔ جین مندر اور دریائے تنگ بھدرا کا منظر۔ رگھوناتھ جی اور وٹھل سوامی کے مندر۔ مہاتما گاندھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ ورکنگ کمیٹی کانگریس۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور۔ آنریبل مہاراجہ محمود آباد مرحوم۔ شریمت گنیش شنکر ودیارتھی مرحوم

نثر

یاد رفتگاں

تنقید کتب :۔

نظم

یہ سب کتابیں مئی ۱۹۳۱ء میں شایع ہوئی ہیں

کلام جوہر (مکمل)

مولانا محمد علی کا وہ کلام جو بالفاظ مدیر تسنیم ان کے قلب کی زبان ان کے جذبات کی ترجمان اور ان کے واردات کا بیان ہے اسمیں تصنع و تکلف کا کہیں گذر نہیں اسکی آواز دل سے نکلتی ہے اور اسی لئے دل پر اثر کرتی ہے۔ کلام جوہر کے اس اڈیشن میں مولانا کے کلام کا وہ حصہ بھی شامل کر دیا گیا ہے جو عرصہ ہوا علیگڈھ سے عرض جوہر کے نام سے شائع ہوا تھا۔ دیباچہ۔ از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ضخامت تقریباً ۱۶۰ صفحات قیمت ۶ر

انتخاب حسرت

(از جلیل احمد قدوائی صاحب بی۔اے علیگ)

کبھی کی تھی جواب دوا کیجئے گا	مجھے پوچھ کر آپ کیا کیجئے گا
مرے دعوی بےنیازی کو سنکر	ہنسے وہ کہ کیا کیا نہ کیجئے گا
سیہ کار تھے باصفا ہوگئے ہم	ترے عشق میں کیا سے کیا ہوگئے ہم
نہ جانا کہ شوق اور بڑھ کے گا پھر	وہ سمجھے کہ اس سے جدا ہوگئے ہم
فنا ہو کے راہ محبت میں حسرت	سزاوار علم بقا ہوگئے ہم

انتخاب حسرت نہایت اچھے کاغذ پر چھپا ہے ضخامت ۱۴۸ صفحہ ٹائیٹل ریج سرخ رنگین قیمت ایک روپیہ ۱عہ

کھیتی

(جدید ڈراما)

از محمد مجیب صاحب بی۔اے (آکسن) مسلمانوں کی دینی اور قومی رہنمائی، مسلمانوں کی ذہنی اور قومی رہنمائی کے لیے ایک عجیب ڈراما۔ مذہب اور اخلاق کس رستے پر چلانا چاہیئے، زمانہ کی مصلحتیں، قوم و ملت کی ضروریات سب پر ایک نظر ڈالی گئی ہے اور ایک معیار بھی تجویز کیا گیا ہے جو رہنمائی کے امیدواروں کو پرکھنے میں کام آسکتا ہے۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ ضخامت ۸۰ صفحات قیمت ۶ر

آزادی

مترجمہ

سعید انصاری۔ بی۔اے (جامعہ)

جان اسٹوارٹ کی کتاب لبرٹی کا ترجمہ اور بامحاورہ ہے۔ مل انگلستان کے ان چند ارباب فکر میں سے ہے جنہوں نے اپنی بلند خیالی اور زور قلم سے نہ صرف انگلستان کے خیالات پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے بلکہ یورپ کے اہل فکر میں بھی اسکا لوہا مانا جاتا ہے یہ کتاب سیاسیات کے درس کا ایک اہم جزو ہے اس ترجمہ کے شروع میں پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن) کا ایک مقدمہ ہے اور ترجمہ کے ساتھ حواشی۔ قیمت عہ

سیرۃ الرسول

طبع چہارم

تاریخ الامت کا پہلا حصہ بڑے سائز پر عرصے سے نہیں ملتا تھا اب مئی ۱۹۳۱ء میں چوتھی بار طبع کرایا ہے ہائی اسکول کے طلباء کیلئے سیرۃ پر اس سے زیادہ مفید کتاب شاید ہی کوئی ہو۔ عام مطالعہ کرنے والے بھی پڑھکر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مولانا اسلم جیراجپوری کی کتاب تاریخ الامت کے سات حصے ہیں جنمیں مکمل تاریخ خلافت آگئی ہے۔ ساتوں کی مجموعی قیمت ۱عہ اور اس پہلے حصے یعنی سیرۃ الرسول کی قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے عہ

مکتبۂ جامعہ۔ قرولباغ دہلی

پنڈت ... پرنٹر ... کانپور

زمانہ

مرتبہ دیانرائن نگم بی۔ اے

نمبر ۲	اگست ۱۹۳۱ء	جلد

فہرست مضامین

تصاویر: لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند اور مہاتما گاندھی

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت ممالک غیر سے سالانہ ... ششماہی ... ہندوستان کیلئے ششماہی [illegible]

زمانہ

جلد ۵۷ — اگست ۱۹۳۱ء — نمبر ۲

فلسفۂ غالب

(از مسٹر جگدیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی)

شاعری روحانی غذا کا سامان مہیا کرتی ہے، شاعر کو فطرت کے ہر ذرہ میں عرصۂ دو عالم کی وسعت ہر آواز میں صدائے جاں نواز اور ہر قطرہ میں دریا نظر آتا ہے۔ ہر وہ شے جو بادی النظر میں تمام دلفریبیوں کو زائل کر چکی ہو، شاعر کے سازِ روح کو اپنی مضراب سے ایسے اچھوتے نغموں سے مالا مال کر دیتی ہے کہ سامعہ کان ملاحت بنجاتا ہے۔

شاعر کی دنیا وسیع و غیر محدود ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی طبع آزمائی کسی خاص مضمون یا موضوع کی پابند نہیں۔ لیکن اس کے باوجود دنیا کی شاعری ان چند مضامین کی حدود سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

(۱) معرکۂ حسن و عشق	(میر۔ سودا۔ ناسخ۔ آتش۔ ذوق۔ مومن اور غالب)
(۲) رزم و بزم اور مرثیہ خوانی	(انیس اور دبیر)
(۳) نعت و مذہب	(خسرو وغیرہ)
(۴) مدح و ہجو	(سودا وغیرہ)
(۵) مصوری فطرت	(آزاد اور اُن کے مقلدین)
(۶) حب وطن و ملت پرستی	(حالی اور اُن کے مقلدین)
(۷) فلسفہ و اخلاقیات	(غالب وغیرہ)

اپنے معاصر شعراء کی طرح مرزا غالب نے بھی (ہجو گوئی کو چھوڑ کر) قریب قریب ہر عنوان پر زورِ طبع دکھایا ہے۔ اگر اُردو میں بیدل کا تتبع کر کے وہ میر، سودا، جرأت، انشاء اور ذوق سے بازی لے گیا ہے تو فلسفی شعراء کی دنیا میں اُسے ملٹن اور گوئٹے جیسے بلند پایہ سخن سنجوں کی ہمنوائی کا فخر حاصل ہے

فارسی میں جو نسبت ظہوری اور نظیری کے کلام کو عُرفی اور طالب کے کمال سے ہے بعینہٖ وہی علاقہ مرزا کی اُردو شاعری کا میر اور سودا سے ہے۔ غالب کا فارسی کلام سلمان، ظہیر، انوری، خاقانی نظیری، عرفی، طالب اور عمر خیام کے کلام کے ہم پلہ ہے۔ نثر میں بھی مرزا نے ابوالفضل اور ظہوری جیسے مسلّم الثبوت ادیبوں کی صف میں نمایاں جگہ حاصل کی ہے

یہاں مرزا کے کلام پر بحیثیتِ مجموعی تبصرہ کر کے اُس کے محاسن کو نمایاں کرنا مقصود نہیں بلکہ اسکی "حقیقتِ مشاہدہ" کو "دیدۂ عبرت نگاہ" کے روبرو عریاں کرنا اور اسکی فلاسفی کو "گوشِ نصیحت نیوش" تک پہنچانا ہے۔ فلسفۂ غالب سے لذت آشنا ہونے کے لئے یہ امر بہت ضروری ہے کہ اس ماحول سے واقفیت حاصل کر لی جائے اس کے بغیر کسی شاعر کی عظمت کا صحیح اندازہ کرنا ناممکن ہے

یہ حقیقت ہے کہ مرزا نے فنِ شعر کی تحصیل فارسی شعراء سے کی اور اپنے کلام میں بھی ان کا تتبع کیا، اس لئے یہاں فارسی ادب کے اُس حصہ کا مختصر تذکرہ نامناسب نہ ہوگا جو غالب کے عہد تک عرصۂ ظہور میں آتا رہا۔

جہاں تک بہاریہ کلام کا تعلق ہے دنیا کی شاید ہی کوئی دوسری زبان فارسی کا مقابلہ کر سکے یہی وجہ ہے کہ فارسی شعراء نے غزلگوئی کو دیگر اصنافِ سخن پر ترجیح دی اور حُسن و عشق کی ہنگامہ خیزی و معرکہ آرائی کے لئے اس سے بہتر صنف اور ہو بھی کیا سکتی تھی؟

غزل گو شعراء نے بالعموم پردۂ مجاز میں عشقِ حقیقی کا اظہار کیا ہے، اس قسم کے عشقیہ مضامین کا نادر نمونہ سعدی، حافظ اور خسرو کے یہاں بکثرت موجود ہے۔ جس پایہ کے رزمیہ مضامین فردوسی اور نظامی کی مشہورِ عالم مثنویوں (شاہنامہ اور سکندر نامہ) میں ملتے ہیں، دنیا کی بہت کم زبانوں میں ایسا بیش قیمت ذخیرہ نظر آئیگا۔ فلسفہ اور اخلاقیات کی تعلیم صوفی مشرب شعراء اور سعدی و خیام کے یہاں ملتی ہے۔ فطرت کے حسنِ ملیح میں فارسی شعراء کے لئے کوئی کشش نہ تھی یہی وجہ ہے کہ یہاں اس کے مصوروں اور ترجمانوں کی کمی ہے۔

تصوف اور غالب | مسلکِ صوفیاء کی بنیاد بھی مصوری کی طرح صنفِ نازک کی نگاہِ نازکی رہین ہے ۸۵۲ء سے اس رندانہ مشرب کی ابتدا ہوئی، اور عائشہ خاتون کی تبلیغی سرگرمیوں نے اس کی نشر و اشاعت کو

قابل قدر وسعت دی۔ صوفیوں نے بھی ویدانت کی تلقین (आत्मानं विद्धि) کے مطابق اپنی حقیقت کو معلوم کرنے کو مقدم سمجھا اور ترک لذات کی عادت ڈالی۔ یونان سے یہی صدا آتی ہے :- (Gnothi seauton) اور قرآن کا بھی ارشاد ہوتا ہے "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ"

عائشہ کے معتقدین اس لئے صوفی (پشمینہ پوش) کہلائے کہ انھوں نے بیش بہا لباس جو دنیادار اور عیش پسندوں کو مرغوب تھا یکلخت ترک کر کے سادگی اختیار کی اور صوف یا اون کو زیب تن کیا۔

صوفیوں کا مذہب کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ وہ اسلام ہی کا ایک جزو ہے۔

دنیا کے فلاسفروں نے صرف ان دو طریقوں پر کاربند ہو کر عالم موجودات کی حقیقت، روح و مادہ اور خدا کی ہستی وغیرہم اہم مسائل سے بحث کی ہے :-

(۱) تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ظاہر اشیاء کے وجود کے متعلق نتیجہ اخذ کرنا۔

(۲) تخیلات و تصورات کو دلائل عقلی کی کسوٹی پر پرکھ کر انسانی وجود کی حقیقت و علت وغیرہ معلوم کرنا

ان میں سے دوسرا طریقہ زیادہ آسان و مفید مانا گیا ہے۔ صوفیوں نے بھی اسی شاہراہ پر گامزن ہو کر منزل مقصود کی جستجو کی ہے۔ مسٹر براؤن کی رائے ہے کہ آریوں کی تعلیم (تلقین اور سنسکرت منکروں) کے عقائد کا صوفی مذہب پر بہت کچھ اثر ہوا ہے۔ بعض صوفی شعراء کے یہاں (جن کا فارسی ادب ایک مستقل حصہ ہے) اس حقیقت کے ثبوت موجود ہیں کہ ہندو مسلمانوں کے ارتباط باہمی سے ہی "صوفی ازم" کی جڑ مضبوط ہوئی یہاں صرف یہی مثال کافی ہوگی کہ صوفیوں نے انتہائی خلوص و رواداری سے کام لیکر ہندوؤں کی بت پرستی کو کفر و لعنت کے بجائے اصل ایمان قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

مسلماں گر بدانستی کہ بت چیست　　بدانستی کہ دیں در بت پرستی ست　　(گلشن راز)

مزید ثبوت کے لئے ایم۔ ضیاء الدین، وان کریمر (Von Kremer) اور ڈوزی (Dozy) وغیرہ اصحاب کی آراء بھی پیش کی جاسکتی ہیں مگر یہاں ایک ہی ثبوت کافی ہے

صوفیوں کے فلسفہ کی توجیہ و تشریح تو ایک مبسوط تبصرہ کی محتاج ہے، یہاں صرف اس حصہ کا بالاختصار تذکرہ کیا جاتا ہے جس کا نفس مضمون سے کچھ نہ کچھ لگاؤ ہے۔

جبر و اختیار دونوں عقیدوں پر ایمان رکھنے والے صوفی اس بارے میں بالکل متفق ہیں کہ خدا کی ذات "وحدہٗ لاشریک" ہے اور اسی کے ایک اشارہ (کُن فیکون) پر ظاہری دنیا اور خالق کے وجود کی مظاہر اشیاء، عالم وجود میں آئیں۔ ان کے اعتقاد کے موافق دنیا کی ہر شے ایک بے حقیقت فریب طلسم ہے صرف خدا کی ذات قادر و قیوم ہے، دوسری ارواح اور مادی اشیاء اسی لافانی ذات پاک کا جزو ہیں آگے

چلکر اس عقیدہ میں تراش وخراش ہوئی ہے، اور دنیا اور اُس کے لوازمات کو خالق کے صفات حمیدہ سے معرا بجز و قرار دیا گیا ہے۔ منصور اس سے بھی آگے گیا اور "انا الحق" کا ادعا کر کے سزا وار دار ہوا۔

منصور کا "نعرۂ انا الحق" ہندو فلسفہ سے بہت کچھ مشابہ ہے، حالانکہ تفصیلات کے لحاظ سے اس سے کسی قدر مختلف ہے۔ ہندو فلسفہ خالق دو عالم کے تین صفات (۱) ستہ (۲) چیت اور (۳) آنند بتاتا ہے، اور روح کو تیسری صفت کے علاوہ باقی دونوں پر قادر مانتا ہے، اور بعض ناقابل تردید دلائل کی بنا پر مدعی ہے کہ روح پیہم کشاکش او مسلسل جدوجہد کے بعد اس تیسری صفت پر بھی قابو پا سکتی ہے اسی لئے روح کا ازلی اور غیر فانی ہونا ضروری ہے۔ مشہور جرمن مصنف اور فلسفی کانٹ بھی روح کو لافانی ثابت کرنے کے لئے قریب قریب اسی طریقہ پر استدلال کرتا ہے اور روح کو بشر کا منتہائے نظر قرار دیکر منصور کی ہمنوائی کا دم بھرتا ہے[2]

گو کانٹ اور منصور دونوں کے خیالات ہندو فلسفہ کی طرح جامع نہیں، پھر بھی حقیقت سے قریب ہیں۔ ہندو فلاسفی کے متذکرہ بالا نظریہ کے صحیح مفہوم کو شمس تبریزی نے خوب ادا کیا ہے۔

جنبش ہر ذرہ باصلِ خودت است ہر چہ بود میل کسے آں شود
جان و دل از جذبۂ میل و ہوش ہم صفت دلبر و جاناں شود

"ہمہ اوست" صوفیوں کا عام عقیدہ ہے۔ دنیا کی حقیقت اُنکی نظروں میں اس کے سوا کچھ نہیں

جہاں خود جملہ امر اعتباری ست ہم آں یک نقطہ کاندر دور ساری ست

روح اور خالق کے مابین جو رشتہ صوفیوں نے قائم کیا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو:-

آنانکہ طلبگار خدائید خدائید حاجت بطلب نیست شمائید شمائید
چیزیکہ نگردید گم از بہر چہ جوئید کس غیر شما نیست کجائید کجائید
وجودِ اولیا او را چو عضو اند کہ او کلیست و ایشاں ہمچو جزو اند
جنابِ حضرتِ حق را دوئی نیست دراں حضرت من و ما و توئی نیست
من و ما و تو و او ہست یک چیز کہ در وحدت نباشد ہیچ تمیز

---

[1] अहम ब्रह्म द्वितीय न अस्ति (अद्वैत वाद)

[2] "Act as a member of the Kingdom of ends."

.... Society is the Kingdom of ends."

"سوسائٹی حیات بشری کے حقیقی مقاصد کا شیرازہ ہے، ہمارا فرض ہے کہ ہم اسی منظم شیرازہ کے جزو لاینفک کی حیثیت سے فرائض انسانیت کی تکمیل کریں۔"

غالب کو بہار بنانہ ازل سے شاعر کا دل اور فلسفی کا دماغ ودلیعت ہوا تھا۔ اس کتاب حقیقت نے صوفیوں کے عقائد سے بہت کچھ استفادہ حاصل کیا، چنانچہ کلام غالب زبان حال سے اس امر کی شہادت دیتا ہے، کہیں عالم نصروت میں وہ صوفیوں کا ہمزبان ہے ؏

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود

کہیں عالم جبروت میں ان کا ہمنوا ہے ؎

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

اور کہیں عالم لاہوت میں وحدت الوجود کا حامی اور مدعی ہے ؎

نہ ہو یہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود　　ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

اولیاء کی طرح غالب بھی صرف خدا کی ہستی کو ازلی تسلیم کرتا ہے اور عالم موجودات کے ذرہ ذرہ کے عدم و وجود کو اسی ایک ذات سے وابستہ سمجھتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؏

نہ تھا جب کچھ خدا تھا اور نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ہے تجلی تری سامانِ وجود　　ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

دنیا کی حقیقت بھی غالب کی نظروں میں بالکل وہی ہے جو صوفی شعراء کی نگاہ میں ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد　　عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں　　ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

منصور کی طرح غالب بھی روح و خالق کے رشتہ کی حقیقت سے آشنا ہے ؎

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن　　ہم کو منظور تنک ظرفیِ منصور نہیں

نہ تھا کچھ تو خدا تھا اور نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

مرزا نے عام صوفیوں کی طرح خالق کو "کل" اور روح و مادہ کو "جزو" مانا ہے۔ ؎

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل　　کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر　　ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

عمر خیام اور غالب | متصوفین کے علاوہ ایک اور بھی بزرگ ہستی ہے جس کا فلسفۂ غالب رہین منت ہے اور یہ خراسان کا مشہور حکیم عمر خیام ہے (ہر چند خیام کا سن ولادت یقین کے ساتھ تعین نہیں کیا جا سکتا مگر عام طور پر اس کی تاریخ پیدائش سنہ ۱۰۲۰-۱۰۱۵ء بیان کی جاتی ہے)

اس میں شبہ نہیں کہ ایرانی خیام اور ما قبل الاسلام بھی فانی انسان اور ازلی خدا کے باہمی رشتہ کی

دریانت میں غلطاں و پیچاں تھے۔ چنانچہ زرتشت کے مذہب کے دوران فروغ میں بھی مانی ومزدک کی تحریکات کو قبولیت عامہ کا فخر حاصل تھا۔ ادھر بدھ اور ویدانت کے فلسفہ نے حدود خراسان میں اپنا سکہ جلا رکھا تھا۔ کچھ ایرانیوں کی ذہنیت بھی ایسی تھی کہ متصوفین کے معتقدات میں حزن وملال، یاس و حسرت کے عناصر شامل ہو گئے۔ چنانچہ فارسی ادبیات میں خیام سے بہت پہلے ایک محزون وملول شاعر گذرا ہے جس کا نام شہید بلخی تھا اور جو رودکی کا ہمعصر خیال کیا جاتا ہے، اس کے کلام سے حزن ویاس کے اشارات پائے جاتے ہیں، جو غالباً گوتم بدھ کی تلقین کا نتیجہ ہیں۔ گوتم کی نظروں میں کائنات کے تمام مناظر ومظاہر عارضی، ناکارہ اور ہیچ تھے۔ اور زندگی کا مقصود اعلیٰ ہوا وہوس کو مٹا کر نروان حاصل کرنا تھا۔

اس کے علاوہ یونانی فلسفہ بھی یونان اور دیگر اقطاع مغرب سے ایرانی ذہنیت کو من حیث المجموع متاثر کرتا رہا۔ ۴۳۵-۳۵۶ء ق م میں سیرین کا مشہور فیلسوف ارسٹپیس (Aristippus) ایک نئے فلسفۂ حیات کی تبلیغ میں مصروف تھا۔ اُس نے دنیا کی ناپائداری وبے ثباتی، مستقبل کی تاریکی اور انسانی عقل کی نارسائی ومعذوری سے متاثر ہو کر طربیہ زندگی کو مقصودِ ہستی قرار دیا۔

ارسٹپیس کی وفات کے چند سال بعد (۳۴۱-۲۷۰ء ق م) ایپکیورس (Epicurus) نے بھی قدرے تغیر وتبدل کے ساتھ اس کی تبلیغی سرگرمیوں کو از سر نو تازہ کرنے کی سعی کی۔ اور قریب قریب اسی نظریہ کی تائید کی جو اس کے پیشرو کا مقولہ تھا۔ مادھو آچاریہ "سرو درشن سنگرہ" کے باب اول میں رقمطراز ہیں کہ ہندِ قدیم میں چرواک منی نے بھی اپنے پیروؤں کو یہی تلقین کی تھی، ان کی تعلیم کا بنگال میں صدہا سال تک چرچا رہا۔ بہرحال یہ خیالات زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہندی اور یونانی تہذیب کی جائے اتصال (ایران) تک بھی جا پہونچے، اور رنگین مزاج خیام ہوریس (Horace) ہائین اور بائرن کی طرح موجِ حیات کی اُس طغیانی میں بہہ گیا۔

دسویں صدی کے مشہور طبیب ابو جعفر نے پہلے پہل ایرانی ذہنیت کی جبلی افسردگی وانقباض کا ردِ عمل تلاش کیا اور غالب کی طرح مے ونغمہ کو "اندوہ ربا" کہہ کر جو دم عیش ومسرت میں گذرے اُسے غنیمت جانا۔ بلاشبہ خیام صوفیوں کی تعلیم کی طرح ان خیالات سے بھی متاثر ہوا۔

اگرچہ خیام کے کلام کے ظاہری مطلب کو مدنظر رکھکر اس کے خلاف کفر والحاد کا فتویٰ صادر کیا گیا اور اُسے موردِ عتاب ٹھہرایا گیا ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ خود خیام کی رباعیات شاہد ہیں کہ وہ بھی اہل ایمان کی طرح خدا کی ہستی کا قائل ہے ؎

در صومعہ و مدرسہ و دیر و کنشت ترسندہ ز دوزخند و جویائے بہشت

آنکس کہ ز اسرار خدا با خبر است — زیں تخم درا اندرون دل ہیچ نکشت

صرف یہی نہیں بلکہ اُسے نام (خدائے قدیر) کے رحیم ہونے میں بھی مطلق کلام نہیں سے

خیام از بہر گنہ ایں ماتم چیست — در خوردن غم فائدہ بیش وکم چیست

آں را کہ گنہ نکرد غفراں نبود — غفراں برائے گنہ آمد غم چیست

خیام جب دنیا کی نیرنگیوں کی جانب آنکھ اٹھاتا ہے تو اُسکے دل و دماغ میں بیقرار نہ شکوک کی بے شمار لہریں اٹھتی ہیں، اور وہ عالم اضطراب میں یہ سوال کرنے لگتا ہے سے

ہر چند کہ رنگ و بوے زیباست مرا — چوں لالہ رخ و چو سرو بالاست مرا

معلوم نشد کہ در طرب خانۂ خاک — نقاشِ من از بہر چہ آراست مرا

اور جب کوئی طمانیت بخش جواب نہیں ملتا تو وہ کانٹ گوئیتو کے خیال کے مطابق ایرانیوں کی فطری زندہ دلی کے مطابق مے نوشی و مدہوشی کی ظلمتوں میں حیات انسانی کا منتہائے مقصود تلاش کرنے لگتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان وجہان سب کچھ فانی ہے اور مستقبل بحر ذخار کی نامعلوم گہرائیوں سے بھی زیادہ مبہم و نامعلوم! پس وہ وفور یاس اور جوش دیوانگی میں پکار اٹھتا ہے۔

زاہد گو بہشت با حور خوش است — من می گویم شراب انگور خوش است

ایں نقد بگیر دست از آں نسیہ بدار — آوازِ دہل شنیدن از دور خوش است

چوں عہدہ نمی شود کسے فردا را — خالی خوش کن تو ایں دلِ سودا را

مے نوش بنور ماہ اے ماہ کہ ماہ — بسیار بیاید و نیابد ما را

لیکن خیام مے گساری کو گناہ خیال کرتا ہے۔ اسی لئے اُس نے یہ اعلان بھی کیا ہے سے

مے خوردنِ من نے از برائے طرب است — نے بہر فساد و ترک دین و ادب است

خواہم کہ بہ بیخودی بر آرم نفسے — مے خوردن و مست بودنم زیں سبب است

حیات و ممات کے مسائل کا حل دریافت کرنے میں وہ ارسٹیپس اور اپی کیورس کا ہمخیال نظر آتا ہے

چوں مردن تو مردن یکبارگی است — یک بارہ بمیر ایں چہ بیچارگی است

خونے ونجاستے و مشتے رگ و پوست — در کار نبود ایں چہ غم خوارگی است

خیام راحت و آرام کی آرزو سے خراب کو امید موہوم سمجھے ہوئے ہے اور اس بارے میں دنیا سے جو اس کے نزدیک خود بے بقا اور دار المحن ہے قطعاً مایوس ہے سے

شادی مطلب کہ حاصلِ عمر دمے است — ہر ذرہ ز خاک کیقبادے و جمے است

احوال جہاں و اصل این عمر کہ ہست خوابے و خیالے و فریبے و دمے است

پنچیز، ہوریس اور ایکلیسسٹر (Ecclesiastes) کی طرح اس کی دانست میں بھی اسی سرآ کا ایک ایک تشنہ لب ذرہ تغیر پذیر اور جادۂ عدم و فنا پر بسرعت گام زن ہے۔ ہوریس (مشہور اطالوی شاعر) کہتا ہے:۔

"وہ شیرہ بہار کے ناز پرورد پھول اپنی آب و تاب ہمیشہ اسی طرح قائم نہیں رکھ سکتے، ماہتاب کا روئے رنگین اسی طرح درخشاں و تاباں نہیں رہتا۔ نہ بارش نور میں وہ یکسانیت جمال نظر آتی ہے۔ پھر بقا نے دوام کے تیرہ و تار تصور کی کیا حقیقت ہے؟ کون جانتا۔۔۔۔"

ہر چند خیام کی نظروں میں رونا بے سود ہے اور حال کی عارضی مسرت، زندہ دلی اور ہنسنا ہنسانا زندگی کا ماحصل ہے، مگر میرا خیال ہے کہ اس نے بھی اسٹوا کس (سقراط وغیرہم) سنکس (زینو وغیرہم) اور ناگوں کی طرح رنج و راحت سے بے نیاز رہنے کی کنایۃً حمایت کی ہے۔ شاید اسی لئے وہ حال کی عارضی مسرت یعنی گناہ آلود طربیہ زندگی سے برگشتہ ہوکر خود فراموشی و بیخودی کی تمنائے حصول میں شراب کا طالب نظر آتا ہے۔ اور ترک لذات کا دوسرا پہلو لئے خداوند دو عالم کی لازوال رحمت کے توکل کے رنگین کُہر میں کھویا رہتا ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ خیام کا فلسفہ ہائین اور بائرن کی طرح حال کی عارضی مسرت تک محدود ہے مگر جیسا کہ اوپر واضح کیا جاچکا ہے یہ فیصلہ ہنوز ناقص و تشنۂ تحقیق ہے۔

بہر حال غالب پر خیام کی رباعیات کا بھی براہ راست اثر ہوا ہے۔ غالب کا فلسفہ اس وقت تک تقریباً نامکمل ہے جب تک کہ خیام کے فلسفۂ حیات کے اثرات کو ذہن نشین نہ کر لیا جائے چنانچہ حتی الامکان سطور بالا میں اُن نکات کو مجموعی طور پر یکجا کر دیا گیا ہے جن کو مرزا نے بے چون و چرا قبول کر لیا ہے۔ یہاں غالب کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن کا خیام کی رباعیات سے موازنہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ مرزا نے حکیم موصوف سے کس قدر استفادہ کیا ہے۔

خیام جنت کو "نسیہ" قرار دیکر اس کے وجود سے منکر ہے مگر غالب بہ بانگِ دہل کہہ رہا ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ابتدا میں مرزا نے بھی خیام کی طرح عیش و نشاط کو زندگی کا مقصد اعلیٰ قرار دیا ہے ؎

اب تو آرام سے گذرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے

بعد ازاں مایوس ہوکر کہا ہے ؎

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے ونوش ہے[۱]

مرزا نے خیام سے بڑھکر ترکِ لذات کی تلقین کی ہے، کہتے ہیں ؎

ترکِ لذت ہی نہیں لذت سے کم کچھ مزا اس کا بھی چکھا چاہیئے

ترکِ لذات کی وادیِ بے پایاں میں غالب کے پائے عقل نے بھی خیام کی طرح لغزش کی ہے خود مرزا بادۂ آتشیں کے ایک جرعہ کا طالب ہے مگر اسی نیک نیتی کے ساتھ ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

ایک اور بات بھی ہے جس میں غالب اور خیام باہم ہمخیال ہیں۔ وہ دنیا کی بے ثباتی کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کے بھی مقر ہیں کہ رنج وراحت کے ناخوشگوار و پسندیدہ اثرات ہی تکلیف کا باعث ہیں، پس عیش کی تمنا کرنا ہی غم سے نجات پانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

غالب کا فلسفہ میر سودا اور ان کے سلسلہ کے شعراء نے غزل کو عشقِ حقیقی ومجازی کے دائرہ میں محصور کردیا تھا، لیکن مرزا نے ان تمام قیود کو توڑکر غزل کی تنگیٔ دامن کی پردہ پوشی کی اور اسے قدما کے خلاف فلسفۂ حیات واخلاقیات کی نازک خیالیوں سے مالامال کردیا۔ تاہم غالب کی تخیل رسا کی بلند پروازیوں کو جس کشادہ دامانی کی ضرورت تھی، عروسِ فکر آج بھی اس کی تمنائے حصول میں لرزاں ہے ؎

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ جب ہم میر، سودا اور ذوق وغیرہ کے مطالعہ سے مضمحل ہوجاتے ہیں تو روح کی تشنگی دور کرنے کے لئے ہمیں غالب کی صحبت یاد آتی ہے۔

پیدائش عالم کی ساعت سے لیکر آجتک بشر تکوین وتخلیق کائنات اور اپنے وجود کی علت غائی دریافت کرنے کی متواتر کوششوں میں منہمک رہا ہے۔ مرزا کے روبرو بھی یہی عقدۂ لاینحل درپیش تھا مگر وہ دنیا کے عالم اسباب ہونے (اور कारण भावात कार्य भाव) کے عالمگیر قانون کی حقیقت کا رازداں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں فخر رازی، افلاطون، جلال رومی، حافظ اور غزالی عالمِ یاس میں "ماعرفنا" پکار اٹھتے ہیں غالب کمال سکون کے ساتھ کہتا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

غالب متصوفین کی طرح توحید وجودی کا معتقد ہے ؎

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

---

[۱] دیکھئے مکمل قطعہ۔

وہ اس راز کا محرم بھی ہے کہ تخلیق عالم خالق کے فکر عمل کی محتاج ہے۔ اسی لئے کہتا ہے ؎ ع

"ذرہ بے پرتو خورشید نہیں"

اس کی نظروں میں کائنات کی پیدائش کی علت حسن کی خود بینی کے سوا اور کچھ نہیں ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

غالب مادہ کے وجود سے منکر ہے اور روح کو خالق کا ایک جزو منفک تسلیم کرتا ہے ؎

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

دوسرے شعر کی تفسیریں تو بہت ہوئیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان میں سے ایک بھی غالب کے صحیح مفہوم کی ترجمانی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ صاف شعر ہے جس میں فیلسوف شاعر نے تصویر کے پردہ میں روح اور مادہ کی ماہیت کی جانب اشارہ کیا ہے، اور کاغذی پیرہن سے پیکر تصویر (روح) کے جسم خاکی کو تشبیہ دیکر مادہ کی بے ثباتی کا ثبوت پیش کیا ہے، نہ کہیں خیال فریادی ہے نہ فضول تلاش مطالب کی گنجایش۔

غالب روح اور خدا کی ہم رنگی کے لئے اعلان کرتا ہے ؎

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے

کمار انبھٹ اور سوامی شنکر اچاریہ کا نظریہ بھی بالکل یہی ہے اور بائبل میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے[۱]

اپنی حقیقت کو پہچان لینا مرزا کی نظروں میں خدا تک رسائی حاصل کر لینے کے مرادف ہے ؎

پھر بیخودی میں بھول گیا راہ کوئے یار — جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

یہ اس لئے کہ ع — اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے

---

[۱] ایک مشہور تامل شاعر نے غالباً سوامی شنکر آچاریہ کی تلقین سے متاثر ہو کر بعینہ یہی مفہوم نظم میں ادا کیا ہے۔ یہ تامل گیت گوور (Gover) کی زبان سے سنیئے:-

The wise man saith
That God, the omniscient essence, fills all space.
And time, He can not die or end, In him all things exist.

عالم کا قول ہے کہ وہ عالم کی وسعت کا ذرہ ذرہ اور وقت کا ایک ایک ناممکن التقسیم لحظہ خدائے قیوم کی تجلی سے معمور ہے۔ وہ ہر جگہ موجود اور بقائے دوام کا مالک ہے، اسی کی ذات پاک پر تمام اشیاء کے وجود کا انحصار ہے۔"
فرانس کا مشہور فلاسفر اسپنوزا اس بارے میں تامل شاعر کا ہم خیال نظر آتا ہے۔

غالب اپنی حقیقت کے بارے میں یوں گویا ہے ؎

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے   جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

چونکہ صوفیا کے نزدیک ماسوا قطعاً معدوم ہے اس لئے غالب اس نئے انداز سے اپنی لاعلمیِ حقیقت کا اعتراف کرتا ہے ؎

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز   میں ہوں اپنی شکست کی آواز

پھر کہتا ہے ؎   ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

گو وہ حیاتِ انسانی کو عارضی و فانی تصور کرتا ہے (ع ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے) لیکن چونکہ روح کو جزوِ خالق تسلیم کر چکا ہے اس لئے اس کے لافانی ہونے میں ایمان رکھتا ہے ؎

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا   میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

اس شعر کی تشریح بھی صحیح نہیں ہوئی ہے، ورنہ مرزا نے مسئلۂ تناسخ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بلاشبہ شاعر نے مصرعۂ ثانی میں بالِ عنقا سے مادہ مراد لی ہے جو اس کی نظروں میں معدوم ہے۔ اس طرح کمال خوبی کے ساتھ مادہ کی فنا اور روح کے ثبات پر استدلال کیا ہے۔ اور یہ یقیناً ہند و فلسفہ کا ناقابل تردید اثر ہے جس کا رنگ غالب پر بھی غالب ہے۔

مرزا گوتم بدھ کی تعلیم سے بھی متاثر ہوا ہے، چنانچہ خود بھی اسی کی طرح دنیا کو آلائش و آلام کی بستی قرار دیتا ہے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں   خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یہی وہ تاثر ہے جو شیلے کی زبان زد ہے:-

"ابر باراں کے گنجینۂ پنہاں میں کوئی ایک قطرہ بھی ایسا نہیں جو کبھی انسان کی رگ و پے میں خون بنکر موجزن نہ ہوا ہو، نہ خاک کا ایک ذرہ بھی ایسا ہوگا جو کبھی کسی فرد کا جزو نہ ہوا ہو۔"

اُپنشدوں نے ہستی کے وجود کو "مایا" سے تعبیر کیا ہے۔ ڈے کارٹ جیسے مادہ پرستوں کے خلاف برکلے نے بھی اس بعید از تردید نظریہ کی تائید کی ہے[1]۔ غالب کی ہمہ گیر طبیعت سے یہ توقع کرنا کہ وہ ثباتِ عالم کے بارے میں کوئی جداگانہ رائے رکھتا ہو عبث ہے۔ موج ہوا پر طلسمِ فریب باندھنے کی سعیِ لاحاصل کے سوا کچھ نہیں۔ غالب نے بارہا کہا ہے ؎

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور   جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

---

[1] (Nothing exists beyond a percepient mind)

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا　　کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل　　گرمیِ بزم ہے یک رقص شرر ہونے تک

تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن　　چشم وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم　　لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

یہاں اس اعتراض کی گنجایش رہ جاتی ہے کہ آخر خالق کو ایک فضول شے کی تعمیر کے لئے خواہ مخواہ دردِ سر مول لینے کی کیا ضرورت تھی؟ غالب اس اعتراض سے بے خبر نہ تھا اس لئے اُس نے پیش بندی کرلی ہے ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

گوتم بودھ کی طرح زیست کا ماحصل غالب کے نزدیک بھی بیش از رنج و غم اور کچھ نہیں ؎

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ　　دیکھیں کیا گذرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

انسان روزِ ازل ہی سے اس غمکدہ میں بارِ الم اُٹھانے کے لئے بادیدۂ پُرنم آیا ہے اور اُسے روزِ اول سے موت کا کھٹکا لگا ہے ؎

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے　　سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

مرزا کو خیالِ مرگ ہی ملول و آزردہ خاطر رکھتا ہے چنانچہ رقمطراز ہے۔ ع

خیالِ مرگ کب تسکین دلِ آزردہ کو بخشے

اور ؎

ملتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی　　عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

غالب کے یہاں ہراس فنا کی رسائی دنیائے دنی کے اُس پار عدم تک ہے ع

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل

موت کے علاوہ حزن و ملال کی ایک اور وجہ بھی ہے جو غالب نے ماہرِ نفسیات کی حیثیت سے نمایاں کی ہے، اور وہ یہ کہ ہماری بیشتر تکالیف کا سرچشمہ تعیش پرور خواہشات نفسانی ہی ہیں۔ درحقیقت آرام طلبی جوانی کا ایک دلفریب خواب ہے جس کی تعبیر طوفانِ اضطراب ہے۔ چنانچہ ابتداءً (غالباً عنفوانِ شباب میں) مرزا نے بھی فکرِ مآل کو مدفِ عدم التفاتی قرار دیا اور خیام اور بلبھ سوامی کی طرح نفس پرستی و شکم پروری کو دوائے دردِ دل تجویز کرکے کھاؤ پیو اور خوش رہو کا نسخہ تحریر کردیا ع

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں

کیونکہ؎ رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

مگر جب انجام کی جانب نگاہ کی تو ہوش ہوا کہ ع

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی

چنانچہ پھر خیال آیا ع مے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجئے

جبکہ دنیا سرائے فانی ہے اور ؎

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل گرمیِ بزم ہے یک رقصِ شرر ہونے تک

بالآخر فیصلہ کیا کہ ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یہاں غالب نے غم کو جان کا ساتھی اور موت کو وابستۂ غم کا علاج مان لیا ہے، اور اس طرح خوفِ فنا کو بے سود ثابت کر دیا ہے۔ مرگ کے جاں گسل مسئلہ پر مرزا نے اپنے خیالات کو ذرا شرح و بسط کے ساتھ واضح کیا ہے۔ غالب کے پہلو بہ پہلو براؤننگ کو بھی رکھ لیجئے اور ایک ہی مسئلہ پر دونوں کے خیالات کا موازنہ کر کے غالب کی اہمیت کا اندازہ کیجئے ع

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟

The best is yet to be ....

The last of life for which the first was made.

(وہ انتہائی مقصودِ حیات، ابتدائے زیست جس کی منت کشِ احسان ہے ابھی دور ہے ہاں مآلِ زندگی کا اتمام ہونا باقی ہے)

غالب مہاتما سقراط کی طرح حذرِ مرگ کو وہم ذمیم تصور کرتا ہے اور یہ اس لئے کہ ؎

موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟

غالب ایک محرمِ حقیقت کی حیثیت سے پتہ دیتا ہے کہ حیاتِ انسانی کا مقصودِ حقیقی عارضی عیش کے سراب سے گذر کر مسرتِ دوام حاصل کرنا ہے ع

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اسی کا نام حیاتِ جاوید ہے اور اسی کو ہندو فلسفی واصلِ حق ہونا یا نروان کا حصول کہتے ہیں۔ مرزا ان حقائق سے بدرجۂ اتم واقف تھا کہ

حال و قالی از ورائے حال و قال غرق گشتہ در جمالِ ذوالجلال

غرقۂ نے کہ خلاصی باشد ش یا بجز دریا کسے بشناسد ش

اسی لئے کہہ گیا ہے ؎

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے کام اچھا ہے وہی جس کا مآل اچھا ہے

اس لافانی سکون و مسرت کے حصول کے جو وسائل و ذرائع مرزا نے بتائے ہیں اُن میں سے ایک ترک لذات ہے۔ اپنی گذشتہ زندگی پر نقادانہ نظر کرکے شاعر نے جو ناخوشگوار نتیجہ اخذ کیا اس نے اس کے عقائد و عزائم میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ جب اُس نے دیکھا کہ ع

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

تو اُس پر رازِ حقیقت کا انکشاف ہوئے بغیر نہ رہا اور اس معرفت آشنائے "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" کی جدوجہد پر غالب آکر کہہ ہی دیا ؎

ترکِ لذت بھی نہیں لذت سے کم کچھ مزا اس کا بھی چکھا چاہیئے

ٹیگور اور رومی کا بھی یہی مذہب ہے۔ انگریزی کا مشہور شاعر لانگ فیلو دامنِ زندگی کو تمام دلچسپیوں سے لبریز پاتا ہے، لیکن براؤننگ اور غالب اُسے تمام مسرتوں سے عاری دیکھتے ہیں۔ ان کے لئے وہاں کچھ خوبصورتی نہیں اور نہ کوئی دلکشی ہے۔ اول الذکر کی طرح آخر الذکر بھی ہمت و استقلال کے ساتھ زندگی سے عمر بسر کرنے کے حامی ہیں، لیکن ان کے عقائد میں بڑا فرق ہے۔ خدا کا توکل تو سبھی کو ہے[1] لیکن غالب کی بزرگی یہ ہے کہ اُس نے تلاش حق کا صحیح راستہ دریافت کرکے اس کا احساس کیا ہے اور ہر دو حریفانِ مغرب دائرۂ عقیدت سے باہر نہ نکل سکے۔

غالب اور براؤننگ دونوں کے لئے دنیا مصائب اور کلفتوں کی دنیا ہے۔ لیکن دونوں میں سے ایک بھی ان آفات و صعوبات سے ہراساں و نڈھال ہو کر جادۂ مستقیم سے کبھی نہیں بھٹکا۔ براؤننگ کو ہمتِ مرداں کا خیال ہے:-

Bear the brunt, in a minute pay glad life's arrears,

of pain, darkness and cold." (Prospice)

Then, welcome each rebuff

That turns earth's smoothness rough.

Each sting that bids nor sit nor stand but go,

---

[1] براؤننگ کانٹ کے نظریہ کا مؤید ہے۔ "Trust God" "God is in heaven"
یہی کلمات غالب کے بھی وردِ زبان ہیں۔ ع گر کوئی نہیں ہے تو مری جان خدا ہے"

Be our joys three parts pain."

(Rabbi Ben Ezra)

(کشمکش حیات کے مصائب برداشت کرلو، اور ایک ہی لمحہ میں رہی سہی دشواریوں کا قرض بروئے خنداں بیباق کردو)

(راستے کے ہر اس روڑے کا خیر مقدم کرو جو ہموار سطح زمین کو دشوار گذار بنادے، اور ہر اس چٹکی کا جو اٹھنا بیٹھنا محال کردے۔ کاش ہماری تکالیف مسرتوں سے سہ چند ہوتیں۔)

اور بقول غالبؔ:-

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام　　ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس　　برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب　　لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں　　ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن　　غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

ع　　سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے

غالبؔ کا مقولہ ہے کہ

درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

یہاں مرزا نے ایک ایسی زبردست حقیقت کا انکشاف کیا ہے جس کی مثال براوننگ کے یہاں بھی نہیں ہے۔ غالبؔ کا فلسفہ ہرزہ سرائی سے قطعاً پاک و معرا ہے۔ دخترِ رز کی مدح سرائی میں وہ خیامؔ اور حافظؔ کا ہم پلہ ہے۔ مگر ع

رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے، خوشا موجِ شراب

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی　　کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خط ایاغ کا

یہاں شراب خوری اس لئے روا نہیں کہ وہ "داروئے اندوہ ربا" ہے بلکہ اس لئے کہ وہ بیخودی کی کیفیت طاری کردیتی ہے اور بیخودی قطرہ کو واصل دریا کردیتی ہے، چنانچہ کہا بھی ہے کہ "بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ": مے پرستی و بادہ خواری کے باوجود بھی مرزا کی طبیعت اتنی بے لوث ہے کہ اس کے دامنِ تقویٰ پر اس نجس چیز کا ایک بھی دھبہ نظر نہیں آتا۔

وجودِ عالم کی طرح اُسے فردوس و عدم سے بھی انحراف ہے ؎

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا	وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا
ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود	ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب سے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ	آخر تو کیا ہے؟ اسے نہیں ہے

تشبیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم

یہ کرم کی فلاسفی ہی کا نتیجہ ہے جو غالبؔ جنت و عدم کے وجود سے منحرف ہے۔

میرؔ نے تو ترکِ اسلام ہی پر قناعت کی تھی مگر ذرا مرزا کو بھی دیکھئے ع

نہ حشر و نشر کا قائل نہ دین و ملت کا

وہ موحد ہے اور اس کا کیش ترک رسوم ہے اور حقیقت میں ہونا بھی یہی چاہیئے۔ کیونکہ ع

عاشقاں را مذہب و دیں نیستی

نیز ؎ مردِ خدا زاں سوئے کفر است و دیں | مردِ خدا را چہ خطا و صواب

مرزا کا ایمان وفاداری و استواری کے مقدس جذبہ میں مستور ہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے | مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

متذکرہ شعر کو پڑھکر گمان ہوتا ہے کہ مرزا نے گیتا کی تعلیم کی مستغنی عن التعریف تشریح کردی ہے خدا کی بندگی اس کے نزدیک بے وقت و فضول مشغلہ میں تضیع اوقات کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ؎

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی | بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

پھر ع ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے

ہاں خداوندِ بے نیاز کی بے غرض عبادت میں کوئی مضائقہ نہیں ؎

گر تجھکو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ | یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

مخلصانہ و بے غرضانہ اپنے فرائض کی تکمیل کرنا ہی حقیقی مذہب ہے جسپر خیر عالم کا صحیح معنوں میں انحصار ہے۔ بقول ملٹن

"They also serve who only stand and wait"

(J. Milton, on his blindness.)

(وہ بھی اس احکم الحاکمین کے وفادار خدام ہیں جو انتظار کی خاموش گھڑیاں صبر و سکون کے ساتھ گذار دیتے ہیں۔)

مشہور جرمن فیلسوف کانٹ بھی تکمیل فرائض کو زندگی کا اہم ترین پہلو تصور کرتا ہے اور ادائیگی فرض بحیثیت فرض" پر زور دیتے ہوئے اس حقیقت کو بھی فراموش کردیتا ہے کہ "God is Love" خدا محبت مجسم ہے۔ مگر غالب کے یہاں ایسی بات ہونا محال ہے۔ اُس نے ہندوؤں کے بے عدیل ولافانی فلسفہ سے استفادہ کیا ہے جہاں بھگوان کو بھی پریم کے بس میں بےبس مانا گیا ہے۔ گوسوامی تلسی داس جی کی شہرہ آفاق تصنیف اسی پریم چرچا سے پُر ہے۔ غالب کو اسکا بھی ہوتوف تھا یعنی یہ کہ

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے　　انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

غالب کے بعض معتقدات بظاہر اسلام کے منافی ہیں لیکن اس نے حقیقت کو بے نقاب کرنے میں کبھی پس وپیش نہیں کیا۔ اسلام نے قدم قدم پر جنت کا لالچ دیا ہے مگر غالب پکار رہا ہے سه

طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

الغرض غالب بادۂ حب وطن سے سرشار، تعمیر قوم، مذہبی رواداری اور آزادیِ ملک کے درد سے مضطرب نوجوانوں کو پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے:

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو !　　میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے!!

وہی درد، وہی لگن اور وہی اضطراب جو گوئٹے کو خدمتِ وطن کے لئے اُبھار رہا ہے، وہی جوش اور وہی جذبہ جس نے نپولین، جون آف آرک، پرتاپ، ٹیپو، نانا اور لکشمی بائی کو حیاتِ دوام بخشی اور جواب بھی تا ابد اسی طرح بروئے کار رہے گا۔ غالب کی رگ رگ میں جاری وساری ہے۔ اگر ایک طرف یہ التزام ہے تو دوسری طرف خود حقیقت بے نقاب ہوکر چشم حقیقت بیں کو دعوت نظارہ دے رہی ہے۔ دریں صورت اگر دیوانِ غالب کو ایک الہامی کتاب کہا جائے تو بیجا نہیں ہے۔

رسید کتب

کبیر صاحب۔ مؤلفہ پنڈت منوہر لال زتشی۔ قیمت ۱۲؍۔ مطبوعہ ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد۔

لمعات منیر }
مرأت منیر } از مولوی محمد منیر لکھنوی۔ قیمت ۸؍ و ۴؍۔ مطبوعہ مطبع مجیدی کانپور

علمی کہانیاں۔ از حکیم مظفر حسین اظہر دہلوی۔ قیمت ۸؍۔ مطبوعہ صدیق بک ڈپو۔ لکھنؤ

انقلاب افغانستان۔ از محمد حسین خاں بی۔ اے۔ ملنے کا پتہ۔ سید حمید خاں۔ نئی بستی۔ جالندھر۔

بیرم خاں کی بغاوت

(از مسٹر لال بہادر سنگھ بی۔ اے)

جب بیرم خاں خانخاناں وکیل السلطنت ہوگیا تو در حقیقت سلطنت میں اسکا ہمپایہ کوئی نہ رہا اور اُس کی طاقت سب امرا اور وُسا پر حاوی ہوگئی۔ یہ انسانی خاصہ ہے کہ جب انسان کسی غور شان کی جگہ پر مامور ہوتا ہے تو حتی الوسع اُسے قائم رکھنے کی تدبیریں کرتا ہے۔ چنانچہ خانخاناں نے بھی اپنے اقتدار کو مستحکم اور دیرپا بنانے کے لئے ان اُمرائے سلطنت کو جو اس کے رقیب تھے کسی نہ کسی حیلہ سے علحدہ کردیا۔ تاردی بیگ کا قتل اور شاہ ابوالمعالی کا قید کیا جانا اسی سلسلہ کے واقعات ہیں۔ غرض اس نے ہر پہلو سے اپنی جگہ کو محفوظ اور پائدار بنانے کی کوشش کی اور اکبر کی نابالغی کے زمانہ میں اس کے اتالیق کی حیثیت سے چار سال تک نہایت اولوالعزمی کے ساتھ نظام سلطنت کو سنبھالے رکھا۔ اس زمانہ میں اس نے ماہم انگہ اور دیگر اراکین سلطنت کی دلجوئی کا کوئی خیال نہیں کیا بلکہ بعض اوقات قصداً اُن کی دلشکنی کی، اُس نے شاہی مہاوتوں کا عزل و نصب اور فیل خانہ کا انتظام بھی جو بادشاہ کے اختیار میں ہوتا تھا اپنے ہی ہاتھ میں لے لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیرم خاں کے خلاف ایک زبردست سازش قائم ہوگئی۔ اس سازش کے اور بھی بہت سے وجوہ تھے مثلاً بیرم خاں شیعہ مذہب تھا اور سلطنت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر وہ زیادہ تر اپنے ہی ہم مذہبوں کو مقرر کرتا تھا۔ چنانچہ اس زمانہ کے پنج ہزاری عہدہ داروں میں کم از کم پچیس اصحاب شیعہ تھے حالانکہ ان سے بہتر لیاقت والے لوگوں کی کمی نہ تھی۔ صدر الصدور کے اعلیٰ رتبہ پر شیخ گدائی کے تقرر سے بھی سنی حضرات کو بہت رنج ہوا اور وہ بیرم خاں کے دشمن ہوگئے۔ اس کے علاوہ بہت سے دوسرے امرائے سلطنت مثلاً علی قلی خاں اور پیر محمد کو خانخاناں کے مقابل میں ذاتی شکایتیں بھی تھیں غرض بیرم خاں کے خلاف سازش کے نشو و نما پانے اور زور پکڑنے کا پورا سامان تیار تھا

اکبر کو خود بھی اپنے خودسر اتالیق سے نفرت ہوچلی تھی، اس کے دل میں بھی اپنے اختیارات کو آزادی سے برتنے کی خواہش پیدا ہوگئی تھی۔ ماہم انگہ کو یہ سب حال معلوم تھا اور وہ ان طریقوں

سے بھی واقف تھی جن کی بدولت بادشاہ بیرم خاں کو زیر کرنے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

۱۹۔ مارچ ۱۵۶۰ء کا واقعہ ہے کہ اکبر شکار کے لئے آگرہ سے باہر گیا، اُس نے اپنے چچا کامران کے صاحبزادے ابو القاسم کو بھی ساتھ لیا، خورجہ کے مقام پر شہاب الدین احمد خاں سے ملاقات ہوئی جو اس وقت پنجاب کا حکمران تھا۔ شہاب الدین نے بادشاہ سے دہلی چلنے اور اپنی بیمار والدہ سے ملاقات کرنے کی درخواست کی۔ اکبر راضی ہو گیا اور فوراً دہلی کو کوچ کا حکم دیا۔ مارچ کے اختتام پر دہلی پہونچکر اس نے اپنا مشہور فرمان جاری کیا جس میں اُس نے عنان سلطنت کو خود اپنے ہاتھ میں لینے کا اعلان کر دیا۔

یہاں پر یہ دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اکبر آگرہ سے شکار کے لئے روانہ ہوتے وقت ماہم انگہ کی سازش سے واقف تھا یا نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا علم اُسے دہلی پہونچنے پر ہوا۔ مگر اکبر کا اپنے چچا زاد بھائی ابو القاسم کو ساتھ لے جانا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ آگرہ سے روانہ ہوتے وقت اس سازش کے ہر پہلو سے واقف تھا اور کوئی راز اس سے پوشیدہ نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ابو القاسم آگرہ میں رہ گیا تو بیرم خاں اُسے تخت پر بٹھلانے کی کوشش کریگا، یہ محض اس کی دور اندیشی اور دانشمندی تھی کہ اُس نے ابو القاسم کو اپنے قبضہ میں رکھنے کی غرض سے اپنے ساتھ ساتھ رکھا۔ اس کا شاہد عارف محمد قندھاری جیسا آدمی ہے جو بیرم خاں کا ایک جانباز اور وفادار ملازم تھا، اس کا بیان ہے:۔

"بنابریں حضرت خاقان اکبر بندہ پرور فرصت غنیمت شمردہ باچند از خاصان از دارالخلافت آگرہ بطریق شکار سوار گشتہ متوجہ دہلی شدند۔"

اب یہ امر تحقیق ہے کہ اکبر پوری واقفیت وعزم کے ساتھ آگرہ سے دہلی کو روانہ ہوا اور وہاں پہونچنے کے بعد اس نے مذکورۂ بالا فرمان جاری کیا۔ لیکن حکومت کو یک بیک بیرم خاں کے ہاتھ سے چھین لینا کوئی آسان کام نہ تھا، اس کے لئے اکبر کو اپنی طاقت مضبوط کرنا اور ارکین سلطنت کو بھی اپنے حلقۂ اثر میں لانا ضروری تھا۔ یہی نہیں بلکہ اُسے انتظامات حکومت میں ردّ و بدل کر کے نظم ونسق کو سنبھالنا بھی تھا۔ لیکن بقول شخصے خدا بھی انھیں کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں اور تقدیر و تلوار میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اقبال شاہی چمکا اور جتنے مدبّران سلطنت اور ملازمان حکومت تھے سب اس آفتاب عالمتاب کے زیر سایہ دست بستہ حاضر ہونے لگے۔ جب بیرم خاں کو معلوم ہو گیا کہ شاہی طاقت زور پکڑ رہی ہے تو اُس نے عاجزی کے ساتھ اکبر سے مصالحت کرنے کی

کوشش کی لیکن ماہم انگہ اور اس کے طرفدار اس بات کو کب گوارا کرسکتے تھے۔ کیونکہ اس مصاحبت باہمی میں اُنھیں ذاتی خطرات تھے۔ لہذا بیرم خاں کو صاف جواب دیدیا گیا۔

اس وقت بیرم خاں کے لئے صرف دو باتیں تھیں، یا تو وہ شاہی حکم کی مخالفت کرکے اپنے قوت بازو سے اپنی عزت قائم رکھنے کی کوشش کرتا یا طوق غلامی پہنکر بادشاہ کے روبرو حاضر ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نہایت اہم سوال تھا جس کا جواب بیرم خاں کے لئے کچھ آسان نہ تھا۔ تقریباً چار سال تک وہ شاہی عزو وقار کا مزہ اُٹھا چکا تھا اب اپنے ننگ و ناموس کے قائم رکھنے کا مسئلہ درپیش تھا لیکن اس عزت کے قائم رکھنے میں اب خود بادشاہ کی مخالفت ہوتی تھی جس شاہی خاندان کی بنیاد کو ہندوستان میں مستحکم کرنے کے لئے اس نے اپنا خون پسینہ ایک کردیا تھا آج اُسے برباد کرنے کے لئے وہ خود کیسے تیار ہوسکتا ہے۔ وضعداری کے لحاظ سے اُسے اپنی وفاداری کا خیال آخری وقت تک قائم رہا، مگر اُسے دو میں سے ایک کام کرنا ضروری تھا، یعنی یا تو وہ بدنامی کے ساتھ حکومت و اقتدار حاصل کرے یا نیک نامی کے ساتھ دائمی عزت کی طرف مائل ہو۔ اُس نے خاکساری کا راستہ پسند کیا اگرچہ اس طرز عمل سے خود اس کے بعض مصاحب اس کے خلاف ہوگئے مگر اُس نے ان کی پروا نہ کی۔

اسی اثنا میں بیرم خاں کو شاہی فرمان ملا کہ خود گوالیار چلا جائے اور وہاں پہونچکر دوسرے فرمان کا منتظر رہے۔ مگر اس حکم کے برخلاف خانخاناں نے مکہ جانا طے کیا اور ۱۰۔ اپریل سنہ ۱۵۶۰ء کو آگرہ سے روانہ ہوکر الور جا پہونچا۔

کاونٹ وان نوئر (Count Von Noer) صاحب کا خیال ہے کہ بیرم خاں کا مکہ جانے کا ارادہ مصلحت سے خالی نہ تھا۔ درحقیقت وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کے باہر مکہ پہونچکر وہاں سے مدبرانہ چالوں سے اکبر کے خلاف ہندوستان میں بغاوت کرکے بادشاہ کو اپنے کو واپس بلانے پر مجبور کرے۔ اس جرمنی کے مشہور مورخ کی علمی لیاقت کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ کہنا غیرمناسب نہ ہوگا کہ اس کا یہ بیان کہ بیرم خاں نے مکہ سے ہندوستان میں بغاوت کرنے کا خیال کیا تھا ناقابل قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جب بیرم خاں کو ہندوستان میں رہکر ہی کامیابی کی امید نہ تھی تو وہ ہندوستان سے دور رہ کر کیسے کامیاب ہوسکتا تھا۔ خصوصاً سولھویں صدی میں جبکہ دور دراز ملکوں کے سفر میں اس قدر دشواریاں تھیں اس لئے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بیرم خاں نے جو ارادہ مکہ جانے کا کیا تھا وہ بالکل سچا تھا مگر بیرم خاں کے دل کی صفائی اور سچائی ماہم انگہ اور اس کے رفقاء کار کے سیاہ دلوں کو

صاف نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ ان کو ہمیشہ سے بیرم خاں کا ڈر تھا۔ ماہم انگہ نے بہادر خاں کو لشکر کے ساتھ الور سے طلب کیا اور اکبر نے خود ایک فوجی دستہ لیکر پنجاب کی طرف کوچ کرنے کا وعدہ کیا۔ کیونکہ پنجاب بیرم خاں کی جاگیر تھی اور یہ مقام خطرے سے خالی نہ تھا۔

الور کے مقام پر بیرم خاں کو ایک دوسرا فرمان ملا جس میں اُسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ شاہی طبل و علم واپس کر کے مکہ چلا جائے۔ اس فرمان کو خانخاناں تک پہونچانے کے لئے اکبر نے اپنے معزز استاد عبد اللطیف کو مقرر کیا تھا۔ نظام الدین جس نے اس فرمان کو نقل کیا ہے کہتا ہے کہ خط نہایت مدبرانہ تھا۔ اس کا لہجہ پر معنی اور اس کی زبان شستہ و مودبانہ تھی۔ بیرم خاں نے نہایت صبر و تحمل کے ساتھ اس فرمان پر عمل کیا اور الور سے ناگور کا راستہ لیا۔ وہاں پہونچکر اس نے بادشاہ کو طبل و علم اور دیگر چیزیں واپس کر دیں۔ اس پر بھی ماہم انگہ اور اس کی پارٹی کو چین نہ آیا چنانچہ اس کے بعد پیر محمد کی ماتحتی میں ایک فوجی دستہ روانہ کیا گیا۔ مشہور مورخ بدایونی کا بیان ہے کہ پیر محمد جو بیرم خاں کا ملازم اور ماتحت رہ چکا تھا اپنے پرانے آقا کو مکہ بھیجنے اور اس کی نگرانی کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا بہرحال اس بے عزتی کو بیرم خاں جیسا بہادر شخص کب گوارا کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے یہ عزم صمم کر لیا کہ وہ اپنی تلوار کے زور سے ماہم انگہ اور دیگر مخالفوں کو مخالفت کا مزہ چکھائے، مگر اب بھی اُسے اپنے بادشاہ کے خلاف کارروائی کرنے کا خیال نہ تھا۔ اس کا مطلب صرف اپنے دشمنوں کی گوشمالی کر کے اُنھیں ہوش میں لانا تھا۔ وہ ناگور سے بیکانیر گیا اور وہاں پورے دو مہینے قیام پذیر رہا۔ بیکانیر ناگور سے شمال و مغرب کی جانب ہے۔ اگر بیرم خاں کو بحری راستے سے مکہ جانا تھا تو اُسے سورت کی جانب یعنی جنوب و مغرب کی طرف کوچ کرنا لازم تھا نہ کہ شمال و مغرب کی جانب۔ بہرحال یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیرم خاں شمال و مغربی جانب کیوں گیا۔ کہا جاتا ہے کہ بیرم خاں جیسے بہادر شخص کو بری راستہ سے قندھار اور فارس ہو کر مکہ جانا باوجود خطرہ اور جانفشانی کے بحری راستہ کے مقابلے میں بہتر معلوم ہوا۔ اُس زمانہ کے مورخ بدایونی کے قول کے مطابق حقیقت یہ ہے کہ خانخاناں نے ناگور سے بیکانیر اس لئے کوچ کیا کہ اُسے جودھ پور کے راجہ مالدیو سے خطرہ تھا جو کہ بہت سے راجپوت سپاہی لے کر گجرات کا راستہ روکے ہوئے تھا۔ بیرم خاں راجہ مالدیو کی چال ڈھال کو بغور دیکھ رہا تھا۔ مگر جب پیر محمد اس کے پیچھے روانہ کیا گیا تو بیرم خاں کو بہت غصہ آیا اور اُس نے گجرات کی طرف جانے کا ارادہ ترک کر کے پنجاب جانے کا ارادہ کر لیا، کیونکہ پنجاب اس کی جاگیر تھی اور وہاں اُسکو اکبر کے خلاف پوری مدد مل سکتی تھی۔ چنانچہ بیرم خاں نے پنجاب پہونچکر بغاوت کر دی۔

شاہی دربار میں بھی پوری پوری تیاریاں ہو رہی تھیں مگر یہ سوال کہ شاہی فوج کس کی ماتحتی میں بھیجی جائے پیچیدہ ثابت ہوا۔ بالآخر یہ خدمت شمس الدین اتگہ کے سپرد ہوئی جس سے امداد و اعانت پورا وعدہ کیا گیا، لیکن جیسا کہ ظہور میں آیا کوئی امداد وقت پر نہ پہونچی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب کارروائی ماہم انگہ ہی کی تھی کیونکہ وہ شمس الدین اتگہ کی مخالف تھی اور چاہتی تھی کہ شمس الدین کو شکست ہو وہ مارا گیا جائے۔ لیکن اگر شمس الدین کو شکست ہوتی تو کیا ماہم انگہ اور اکبر محفوظ رہ سکتے تھے؟ ہرگز نہیں اس میں شک نہیں کہ شمس الدین بہت پریشان ہوا اور یہ محض شاہی اقبال تھا کہ وہ بیرم خاں کے مقابلہ میں کامیاب ہوگیا۔ اس وقت تک اکبر خود میدان جنگ میں آپہونچا تھا۔ خانخاناں نے اس لڑائی میں دیکھا کہ اس کا عزیز دوست حسین جالیر جو کہ اس کے خلاف لڑ رہا تھا مارا گیا۔ بیرم خاں کا دل ٹوٹ گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اس نے اپنا ایک سفیر بادشاہ کے پاس بھیجا اور اظہار عجز و نیاز کیا۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ منعم خاں جو اس کا جانی دشمن اور تمام سرداروں کا سرغنہ تھا خود اس کی حفاظت کا وعدہ کرے اور اس کے خیمہ میں آکر اسے بادشاہ کے پاس لیجائے یہ عرضداشت منظور ہوئی اور بیرم خاں منعم خاں کے ہمراہ ننگے سر پگڑی گردن میں لپیٹے دست بستہ بادشاہ کے روبرو حاضر ہوگیا۔ اُمرائے دربار ایک قطار میں اس کی پیشوائی کے لئے آگے بڑھے اور اکبر نے اپنے پُرانے اتالیق کو بڑی عزت کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا۔

بیرم خاں نے جو آخری الفاظ بادشاہ کے سامنے کہے اُن سے اُس کی باطنی صفائی اور سچائی کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ جب اس سے کہا گیا کہ اگر وہ دربار میں رہنا پسند کرے تو کالپی کی صوبیداری اس کے لئے موجود ہے یا اگر وہ مکہ جانا پسند کرے تو حسب حیثیت وظیفہ مقرر ہو جائیگا۔ تو بیرم خاں نے جواب دیا کہ جب ایک مرتبہ شاہی اعتبار مجھ سے منقطع ہوگیا تو میرے لئے دربار میں رہنا مناسب نہیں ہے، لہٰذا مجھے اپنے خیالات کو اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف ہی مائل کرنا چاہیئے۔ یہ کہہ کر اس نے مکہ شریف جانے کی اجازت چاہی، بادشاہ نے خلعت بخشی اور ایک بہت بڑی پنشن منظور کر کے حج کرنے کی اجازت دی۔ لیکن یہ منظور خدا نہ تھا کہ بیرم خاں مکہ پہونچے، اُسے تو پاٹن (گجرات) میں اپنے ایک پُرانے حقیر دشمن کا شکار بننا تھا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ہر حقیقت پسند آدمی مندرجہ بالا بیان سے یہ معلوم کر سکتا ہے کہ بیرم خاں دل کا صاف اور سیدھا آدمی تھا اور اوّل اُس کو بادشاہ کی مخالفت کرنا ہرگز منظور نہ تھا۔ عدا تعمیل اُس نے پہلے ہی سے خاکساری اختیار کر لی تھی اور شاہی حکم کی تعمیل نہ کر سکنے کی وجہ سے ہندوستان

چھوڑ کر خود مکہ جا رہا تھا، مگر ماہم انگہ اور اس کی پارٹی نے بیرم خاں کو بغاوت پر مجبور کیا، مسٹر اسمتھ کا بیان ہے کہ بیرم خاں دل سے بغاوت پر آمادہ نہ تھا، اس لئے جب وہ گرفتار ہوا تو وہ بہت خوش ہوا۔ لہذا ایسی حالت میں بیرم خاں کے لئے "بغاوت" کا لفظ استعمال کرنا بالکل نامناسب ہے، وہ درحقیقت اس معنی میں باغی نہیں تھا جس میں کہ یہ لفظ عموماً استعمال کیا جاتا ہے۔

زرّیں اقوال

(۱) راست کرداری اور صداقت زندگی جنت کی کنجی ہے۔

(۲) سب سے بہتر دولت علم ہے۔

(۳) قناعت میں بہترین راحت ہے

(۴) حرص کو چھوڑ دینے سے انسان خوش رہتا ہے۔

(۵) جس شخص میں انانیت نہیں ہوتی اس کو سب لوگ عزیز رکھتے ہیں۔

(۶) مذہب کا علم دانائی ہے، خدا سے بے خبر رہنا جہالت ہے۔

(۷) کوئی شخص محض ویدوں کے مطالعہ سے برہمن نہیں بن جاتا، برہمن صرف نیک چلنی سے برہمن بنتا ہے

(۸) جو ہمیشہ دوسروں کی بھلائی کی فکر کرتا ہے وہ بہترین قسم کا انسان ہے۔

(۹) جوانی میں ایسے کام کرو جن سے بڑھاپے میں تم کو خوشی حاصل ہو۔

(۱۰) مذہب کی حفاظت حق گوئی سے ہوتی ہے۔

(۱۱) راستبازی عرش پر جانے کا زینہ ہے۔

(۱۲) جب تک جسم تندرست ہے اور موت کے آنے میں کچھ دن باقی ہیں نیک کام کئے جاؤ۔

(۱۳) آدمی کو کسی واقعی خطرہ کے پیش آنے سے قبل خوفزدہ نہیں ہونا چاہئیے۔

(۱۴) عریانی، اُلجھی ہوئی جٹا، فاقہ کشی، بھبھوت ملنا یہ سب چیزیں اُس شخص کو پاک نہیں کر سکتیں جس نے خواہشات نفسانی کو مغلوب نہیں کیا ہے۔

(۱۵) اپنے نفس کو پہچانو، ذرا دیکھو کہ گنے میں شکر، دودھ میں گھی اور پھول میں خوشبو ہوتی ہے۔

(ماخوذ)

میر حسن کے دو معاصرین

میر افسوس و میر حسینی

(از سید اسد اللہ قادری۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس)

میر حسن دہلوی پر جو محققانہ مضمون زمانہ جنوری میں شائع کیا گیا تھا، اسی ضمن میں میر حسن کے دو معاصرین کے حالات بھی ہدیۂ ناظرین ہیں۔

میر شیر علی افسوس میر علی مظفر خاں کے بیٹے تھے، اُن کے آبا و اجداد خواف کے رہنے والے تھے اور سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادقؓ پر منتہی ہوتا ہے۔ اس سلسلہ سے سید بدرالدین نامی ایک بزرگ نے ہندوستان میں آکر نارنول (قریب آگرہ) میں سکونت اختیار کی۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ان کے والد اور چچا سید غلام علی خاں آگرہ سے ترکِ وطن کرکے دلی چلے آئے، اور نواب امیر خاں عمدۃ الملک بہادر انجام کی سرکار میں ملازم ہوگئے۔ افسوس ۱۱۴۸ھ ۱۷۳۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ۱۱۵۹ھ ۱۷۴۶ء میں جب نواب امیر خاں کا انتقال ہوگیا تو اُن کے والد پٹنہ چلے آئے اور یہاں نواب میر قاسم علی خاں کے داروغہ سلیح خانہ مقرر ہوئے۔ اس کے بعد میر جعفر علی کی ملازمت کی، جب یہ معزول کئے گئے تو افسوس اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے۔

افسوس کو شعر گوئی کا شوق قیام پٹنہ میں ہوگیا تھا، چنانچہ لکھنؤ کی فضا نے ان کو اس کا مشتاق اور گرویدہ بنادیا۔

افسوس حیدر علی خاں حیران کے خاص شاگرد تھے، مورخین نے لکھا ہے کہ ان کو حسن سے تلمذ تھا جو محض غلط ہے۔ اس کے لئے دیباچۂ سحر البیان دیکھئے۔

لکھنؤ میں یہ نواب نوازش علی خاں کی سرکار میں دس برس تک ملازم تھے۔ اور نواب حسن رضا خاں نائب سلطنت کی سفارش سے کرنل اسکاٹ سے ملاقات کی، کرنل نے ان کو لائق پاکر دو سو روپیہ ماہوار پر مامور کرکے کلکتہ بھیجدیا اور زاد راہ کے لئے پانسو روپیہ بھی عطا کئے انھوں نے کلکتہ جاتے ہوئے مرشد آباد میں قیام کرکے مرزا علی لطف مصنف گلشن ہند سے ملاقات کی۔

آفسوس فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ممتاز اور مشہور اہل قلم میں ہیں، انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں آرائش محفل (تصنیف ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء) زیادہ مشہور ہے۔ یہ ہندوستان کی تاریخ ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں آفسوس نے بہت سی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، اور اس کا سب سے بڑا ماخذ منشی سوجان رائے کی خلاصۃ التواریخ ہے۔ دوسری کتاب گلستان سعدی کا اردو ترجمہ ہے جو "باغ اردو" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ ان کا دیوان بھی ہے۔ افسوس کا انتقال ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں ہوا۔ (تاریخ ادب اردو صفحہ ۹)

امیر بہادر علی حسینی کے حالات زندگی نہیں ملتے ہیں یہ بھی فورٹ ولیم کالج سے متعلق اور وہاں کے میر منشی تھے، انھوں نے ذیل کی کتابیں تالیف کیں۔

(۱) اخلاق ہندی لکھی جو ہتوپدیش کے ایک فارسی ترجمہ کا بامحاورہ صاف اور سلیس ترجمہ ہے فارسی ترجمہ شاہ نصیر الدین بہاری کے حکم سے مفتی تاج الدین نے مفرح القلوب کے نام سے کیا تھا۔

(۲) گلکرسٹ کی گرامر کا اردو میں ترجمہ کیا جو صرف و نحو اور فن عروض کا رسالہ ہے۔

(۳) تاریخ آسام مصنفہ شہاب الدین طالش کا ترجمہ کیا جس میں میر جملہ کے فتوحاتِ آسام کا ذکر ہے۔

(۴) چوتھی کتاب نثر بےنظیر ہے جو مثنوی سحر البیان کی اردو ہے۔ (تاریخ ادب اردو صفحہ ۹)

کلمات

۱۔ بزدل ہمیشہ جری بننے کا اظہار کرتے ہیں۔

۲۔ سچ بات جو ایک مرتبہ آدھی کہی جائے وہ آگے چلکر سب سچ ہو جاتی ہے۔

۳۔ غم کی کوئی مقدار نہیں ہے، نہ اس کی کوئی حد ہے، وہ بجلی کی طرح آتا ہے اور آگ کی طرح جاتا ہے۔

۴۔ محبت، دوسرے کو اپنا بنانے کے لئے ایک طرح کی خودغرضی ہے۔

۵۔ مصنوعی تبسم نفرت کی علامت ہے۔

۶۔ زور سے چیخنے والے ہمیشہ اپنی شخصیت کا اثر بہت جلد لوگوں کے دلوں پر بٹھا دیتے ہیں۔

۷۔ محبت دشمنی پیدا کرتی ہے، مگر دشمنی محبت نہیں پیدا کر سکتی۔

(اختر جوناگڑھی)

بدھ مذہب اور تھیٹر

(از رائے بہادر پنڈت شیو نراین شمیم، ایڈوکیٹ۔ لاہور)

موسیقی ایک طاقت ہے جو لطیف، مؤثر اور ولولہ خیز ہے، جسمانی اور روحانی دونوں قسم کے اثر اس میں بیان کئے جاتے ہیں۔ تجربات اور مشاہدات موسیقی کی طاقت کا کافی ثبوت دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ ہر ایک طاقت نیکی اور بدی دونوں کاموں میں استعمال ہو سکتی ہے، یہ کلیہ موسیقی پر بھی حاوی ہے۔

کوئی عشرت کدہ ایسا نہ ہوگا جو موسیقی سے خالی ہو، شاید ہی کوئی محفل عیش اس سے معرا ہو، حسن و عشق کے راز و نیاز، سلام و پیام میں بھی اس کو بہت دخل ہے۔ عیاشی اوباشی اور بدکاری میں بھی اس سے کام لیا جاتا ہے۔ ان مشاغل کے لئے موسیقی کے وہ طرز اور وہ راگنیاں منتخب کیجاتی ہیں جو ادنیٰ جذبات کو مشتعل کرتی ہیں۔ وہ جملے، فقرے، غزلیں وغیرہ جو خواہشات شہوانی کو افروختہ کریں بدترین کہلانے کے مستوجب ہیں۔ یہی کیفیت بعض بانیان مذہب نے دیکھی ہوگی جس کی وجہ سے اُنھوں نے اپنے پیروؤں کو اس قسم کے مشغلوں سے احتراز کرنے کی تلقین کی ہوگی ورنہ یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ موسیقی کو جو ایک قدیم علم ہے اور جسے روح کی غذا تصور کیا گیا ہے فی نفسہٖ ممنوع اور معتوب کیا گیا ہو کیونکہ فنون لطیفہ و نفیسہ ایسی کشش رکھتے ہیں جن کو امتناعی ہدایتیں خواہ وہ زمین سے آئیں یا آسمان سے اُتریں روک نہیں سکتیں۔ کسی نہ کسی راستہ یا تدبیر سے حضرت انسان اپنے جذبات کی تشفی کر ہی لیتا ہے، یہ سوال اور ہے کہ جذبات نیک ہوں یا بد۔

بودھ مت میں ابتدا میں موسیقی اور تھیٹر سے مخالفت شروع ہوئی تھی کیونکہ اس وقت خیال عام تھا کہ ایسے ذوق اور شوق مخرب اخلاق ہیں، لیکن یہ خیال رفتہ رفتہ رفع ہو گیا، چنانچہ بدھ مت کے بڑے بڑے پیرو ڈراما لکھنے لگے تھے کہ ڈراما تبلیغ مذہب کا ایک زبردست وسیلہ بن گیا، چنانچہ ڈاکٹر چکرورتی نے "گریٹر انڈیا سوسائٹی بولیٹن نمبر ۴" میں ڈرامے کے رواج کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"بودھ مت نے جلد ہی تھیٹر کی مخالفت چھوڑ دی، حتیٰ کہ تھیٹر بدھ ازم کی تعلیم کا ایک وسیلہ بنگیا

اور یہاں تک آزادی دیدی گئی کہ ایکٹر گوتم بودھ کا سروپ دھارن کرکے ڈرامے کی تکمیل کے لئے اسٹیج پر آگئے۔"

سفرنامہ ہینگ تسنگ چینی سیاح سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے عروج کے زمانہ میں موسیقی کا مرکز ختن تھا، وہاں مدرسے بنائے گئے تھے جن میں گانا سکھایا جاتا تھا اور اب یہ ثابت ہوچکا ہے کہ بودھی شبد جنھیں گاتھا کہا جاتا ہے، سادہ راگ میں گائے جاتے ہیں، کوئی بودھی مندر ایسا نہیں جہاں بھکشو ڈھولک نہ رکھتے ہوں اور اس کے ساتھ گاتھا نہ گاتے ہوں۔

ہم کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ عیسائیوں اور ہندوؤں نے جس شوق سے موسیقی کو داخلِ عبادت کیا ہے مسلم صوفیا اور بودھی بھکشوں نے اتنا ذوق نہیں دکھلایا، لیکن یہ صحیح ہے کہ ان دونوں مذہبوں میں اب پہلی سی ممانعت نہیں رہی ہے۔

ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ موسیقی کا اگر نفاست اور متانت سے استعمال کیا جائے یعنی سُر ایسے انتخاب کئے جائیں جن میں سلاست اور روانی زیادہ ہو تو بعض بدرجۂ اولیٰ دلآویز دلکش اور مؤثر ہوجاتے ہیں۔ مثلاً مرثیہ اگر راگنی میں ادا ہو تو زیادہ گداز اور سوز پیدا کرتا ہے۔ حقانی غزل اگر قوالی میں گائی جاسے تو محویت پیدا کردیتی ہے۔ مگر راگ کی باریکیاں، رنگ آمیزیاں اور تانیں جو فن موسیقی کے لحاظ سے تحسین حاصل کرلیتی ہیں عبادت کے لئے غیر موزوں ہیں۔

کلمات

۱۔ فرصت تعیش پیدا کرتی ہے، اور تعیش کا نتیجہ بوقت ضعف اور موت کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

۲۔ صرف تعلیم ہی ایسی چیز نہیں ہے جو انسان کی سیرۃ کو بناتی ہے۔

۳۔ محبت کی آنکھیں ہوتی ہیں جو اید کو اندھی ہوجاتی ہیں اگر حُسن کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔

۴۔ ہر چیز جو دہشت انگیز ہے خوبصورت نہیں ہوسکتی۔

۵۔ بلند رتبہ پر پہونچنا تنہا ہوجانے کے برابر ہے۔	(اختر جوناگڈھی)

معاشرت حاضرہ اور اخلاق انسانی

از چودھری دگمبر داس، وکیل ہائی کورٹ۔ اورنگ آباد

از مذہبم مپرس کہ مومن نہ کافرم   من رسم ایں دیار ندانم، مسافرم

تمدن انسان کے ترقی یافتہ حالات نے باہمی تعلقات کے لئے جہاں بہت سے خوشگوار مواقع پیدا کر دیے ہیں، وہاں خواہشات کے بھوت نے ان اسباب و حالات کی بدولت اس کی زندگی کو تلخ و منغص بھی کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ہمیشہ خواہشات کی تکمیل میں منہمک رہتا ہے مگر یہ وہ مرض ہے جس کا کوئی علاج نہیں اور بجائے اس کے کہ اُسے راحت و اطمینان نصیب ہو روز افزوں خواہشات و نت نئے سامان عیش و عشرت نے اس کو محتاج و غریب بنا رکھا ہے۔

ہمارا قدیم اخلاق اور پرانا مذہب تو ہم کو دنیا سے کم سے کم محبت کرنا اور زیادہ سے زیادہ بے تعلق رہنے کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان اپنے متعلقین سے قطع تعلق کرکے اور دنیا سے منہ موڑ کر کسی ویرانہ میں جا بیٹھے۔ مدعا صرف یہ ہے کہ انسان دنیوی خواہشات کو حتی الامکان کم کرے تاکہ اطمینان کے ساتھ مالک کو یاد کرنے کا موقع نصیب ہو۔ اسی کا نام ترک دنیا ہے۔ سعدی کا قول ہے ؎

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است   تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن ست

اور موجودہ زمانہ کے بزرگ ترین مصلح مہاتما گاندھی بھی فرماتے ہیں:۔

"جو جینے کے لئے کھاتا ہے، سیوا کرنے کے لئے جیتا ہے، صرف پیٹ پالنے کے لئے کماتا ہے وہ کام کرتے ہوئے بھی کوئی کام نہیں کرتا۔ وہ ہنسا کرتے ہوئے بھی اہنسک ہے۔"

"دنیوی معاملات اور دھرم کے درمیان فرق نہ ہونا چاہیئے۔ دھرم کے خلاف بیوہار کو چھوڑ دینا چاہیئے، یہ سمجھ کر کہ سب جگہ کامل اہنسا ناممکن ہے، اہنسا کو ایک طرف رکھ دینا ہنسا ہے جرم ہے، جہل ہے۔"

"سچی انسانیت اسی میں ہے کہ ہمارا طریقۂ عمل ہمیشہ اہنسا کے مطابق ہو" (نوجیون ہندی صفحہ اول مورخہ ۴ اپریل ۲۹ء)

الغرض انسان کو اسی قدر عیش وراحت کی فکر کرنی چاہیئے جس قدر زندہ رہنے کے لئے لازمی ہو نہ یہ کہ انسان کو نفس پرستی کے لئے بد دیانتی کرنے پر آمادہ ہونا اور دغا و فریب، حق تلفی، رشوت ستانی، بے انصافی، بداخلاقی اور دروغ بیانی کو اپنا شعار بنانا پڑے۔

اس وعظ کہن کا موجودہ زمانہ میں مضحکہ اڑایا جا سکتا ہے اور اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم کو اب اپنی بلندی سے پستی کی طرف آنے کی ضرورت ہی نہیں۔ سائنس کی روز افزوں ترقی اور نوبہ نو ایجادات سے ہم محروم نہیں ہو سکتے۔ ہوائی جہاز اڑ رہے ہیں، بے تار کی برقی اطلاعیں حاصل ہو رہی ہیں، سینما اور تھیٹر موجود ہیں، اچھا کھانا، اچھا پہننا، اچھی سواری سب کچھ میسر ہے پھر یہ فضول باتیں کیوں سنی جائیں۔ اس روشن زمانہ میں برقی روشنی کے سامنے صدیوں کا قدیم دھندلا دیا کس طرح فروغ پا سکتا ہے۔

مگر جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے سامان عیش کی فراوانی سے زندگی تلخ بھی ہو گئی ہے۔ اب ہر شخص اخلاق و آداب علم و فضل میں مساوات کا متمنی نہیں ہے۔ لیکن کم از کم سوٹ، بوٹ، موٹر، بنگلہ، سینما، کلب ڈراما، ہوٹل، لباس و جائداد میں بڑے سے بڑے دولت مند کا مقابلہ کرنے کے لئے لوگ بیقرار رہتے ہیں۔ اعلیٰ اخلاق ضمیر کو مطمئن و مسرور کرنے کے لئے کافی نہیں سمجھے جاتے بلکہ جسم کو مادی تکلفات سے خوشنما بنانے کی فکر دامنگیر رہتی ہے۔ آج ایک معمولی انسان کا روحانیت سے بہت کم تعلق باقی رہ گیا ہے اور مادہ پرستی اس کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔ آپ کے شہر کے پارک میں یا تھیٹر میں جس شان سے ایک متمول شخص کسی خاص نشست پر بیٹھا ہوگا اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر بعض معمولی اصحاب بھی اپنے خاص احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے نظر آئیں گے۔ خواہ اس کے لئے ان کو اپنے بعض ضروری اخراجات کو ملتوی کرنا پڑے، خواہ اس کے لئے بعض فرائض اور ذمہ داریوں کی ادائگی میں کوتاہی ہو۔

اس میں شک نہیں کہ ہر شخص کے پہلو میں دل ہے، ہر ایک انسان کے دل میں خواہشیں فطرتاً پیدا ہوتی ہیں، بقول شاعر "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے"۔ لیکن بہت سی خواہشیں ایسی ہیں جن کا پورا ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ جن کے تکمیل کے ذرائع آسانی سے میسر نہیں آسکتے ہیں، اور جن کی وجہ سے بہت لوگوں کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ اس لئے انسان کی بوالہوسی کا بہترین علاج یہی ہے کہ "ہر چہ گیرید مختصر گیرید" پر عمل کیا جائے اس مقولے پر عمل کرنا آج بھی ویسا ہی ضروری ہے جیسا کہ ہمیشہ تھا۔ اسی پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے قوم کی قوم پریشان و مبتلائے آلام ہے۔

سو روپیہ ماہوار کی آمدنی اور سوا سو روپیہ خرچ، نہ کیسہ [illegible] ہے

کہ ان کو حاصل کرنے کے لئے جائز و ناجائز ہر طریقہ سے کام لینا پڑتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ طرز معاشرت نے انسان کو عجیب مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ آج یورپ و امریکہ میں اس قدر بے چینی کیوں ہے؟ اُن کی دانشمندی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟ لیکن اس دنیوی راحت و آرام کے لئے دنیا میں کس قدر مظالم روا رکھے جاتے ہیں۔ پست اقوام محض اپنی پستی کی وجہ سے یوروپین قوموں کی جولانگاہ بنی ہوئی ہیں، مانا کہ ایک قابل و قوی شخص قابل و ناتوان کے مقابلہ میں راحت کا زیادہ مستحق ہے، لیکن یہ حالت منشائے فطرت کے خلاف ہے اور کب تک قائم رہ سکتی ہے۔ اور دیکھئے کہ اہل دول اپنے متعلقین و وابستگان دامن دولت سے کس درجہ دیانت سے کام لے رہے ہیں۔ اُن کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور عیش و راحت کی غیر محدود خواہشات نے دیانت و ایمانداری، انصاف و اخلاقی فرائض سے اُنھیں بے خبر بنا دیا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اُن کو اخلاقیات کی صحیح تعلیم دی جائے اور انسانیت و مساوات کی حقیقت و اصلیت سے آگاہ کیا جائے تاکہ ہر انسان اپنی اپنی حیثیت کے مطابق دنیا و لذائذ دنیا سے فائدہ اُٹھا سکے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا میں حفظ مراتب باقی نہ رہے، ادنیٰ طبقہ کے لوگ جا و صاف و بہتر ہیں کمترین خواہ مخواہ گستاخ ہو جائیں، خورد بزرگوں کا احترام کرنا چھوڑ دیں، ذی علم و جاہل میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔ بلکہ غرض یہ ہے کہ ہر شخص کے حقوق کا خیال رکھا جائے اور ایک دوسرے کے ظلم و ستم کا شکار نہ ہونے پائے۔

ہمارے یہاں کے امیروں کی حالت کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ راقم الحروف کو اپنے ایک دوست کے ساتھ گرمیوں کے آغاز میں بمبئی کے ایک متمول رئیس کے بنگلہ پر جانے کا اتفاق ہوا جو والکشور میں واقع ہے جہاں گورنر بمبئی کی بھی کوٹھی ہے، اس وقت اس بنگلے میں چند ملازموں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ متعدد شاندار کمرے تھے، تمام بنگلہ فرش و فرنیچر، دلکش تصاویر و اشیا سے آراستہ تھا، دریا کے کنارے سے سرد و خوشگوار ہوا آ رہی تھی مگر اس محل کے مالک ان دنوں مہابلیشور میں قیام فرماتے تھے، یہاں کی آب و ہوا ان کو پسند نہ تھی، یہاں کی گرمی ان سے برداشت نہ ہو سکتی تھی۔ ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کے گھر میں اللہ کا دیا سب ہی کچھ موجود ہے جو چاہیں کھائیں، جس طرح چاہیں بسر کریں۔ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام ممالک کی نادر اشیا اُن کے کمروں کی زینت ہیں، اور دیگر سامان راحت کی بھی کمی نہیں ہے لیکن اُنھیں گھر میں رہنا زحمت معلوم ہوتا ہے وہ کسی سوسائٹی کی تلاش یا صحت کی جستجو میں پہاڑوں پر یا

ایسے مقامات پر رہنا پسند کرتے ہیں جہاں قدم قدم پر نئی دلچسپیوں کے سامان اور مصارف کثیر کے موقع پیش آتے ہیں اس لئے سفر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ گھر میں سب ہی کچھ موجود ہے لیکن فیشن کا اقتضا ہی یہ ہے کہ چند ماہ سیر و سفر میں بسر ہو۔ ظاہری سبب حصول صحت کا واہمہ ہوتا ہے لیکن نتیجہ میں صحت کو فائدہ پہونچنے کی بہ نسبت نقصان کا زیادہ موقعہ رہتا ہے اور ایسی پر ایسے اصحاب پہلے سے بھی زیادہ سست اور بیمار نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی حالت پر جس قدر رحم کیا جائے کم ہے۔ درحقیقت اس قسم کے حضرات امارت کے بیمار روگ میں مبتلا ہیں اور اسی وجہ سے دائم المریض رہتے ہیں۔ ان کو نہ انسانیت سے تعلق ہے اور نہ دنیا کی حقیقی مہذب اقوام کے کارناموں سے کوئی علاقہ ہے۔ ہاں ہمارے مذہبی عقیدہ کی رو سے یہ لوگ اپنی قسمت کا کھاتے ہیں اور چین کی بنسی بجاتے ہیں مگر تاکے۔ قدرت اپنے قانون کی خلاف ورزیوں کی سزا دیے بغیر نہیں رہتی۔ چنانچہ اس وقت اس سچائی سے زیادہ کسی اور سچائی کی کوئی قیمت ہے نہ اس اعتراض کا کوئی اور معقول جواب ہے۔ لیکن کیا ہم انسانیت کے رشتہ اور قوم و ملک کے واسطے اس قدر شکوہ کرنے کے بھی مستحق نہیں کہ ان کی بداعمالیوں اور ان کے نتائج سے عالم متاثر ہے اور دوسرے اُن کی تقلید میں برباد ہو رہے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرتی و اخلاقی بدنظمی کے نتائج ظاہر ہو رہے ہیں۔ نظام تمدن درہم برہم ہو رہا ہے، گھر گھر فتنہ و فساد برپا ہے۔ بھائی بھائی، باپ اور بیٹے ایک دوسرے کے مخالف ہو رہے ہیں جب گھر ہی میں امن چین نہیں تو باہر مختلف المذاہب و معاشرت جماعتوں میں کیا خاک اتحاد ہو سکتا ہے؟ محض نمود و نمائش سے وہ گوہر مقصود حاصل نہیں ہو سکتا جو دانشمندوں کا مقصود خاطر ہے یعنی امن۔ محبت۔ راحت یہ سب نعمتیں جبھی حاصل ہونگی جب ہم انصاف و انسانیت و باہمی ہمدردی کو اپنا رہنما بنائیں گے۔ اس لئے یہی دعا ہے کہ

خدا ہم سب کو حقیقی معنی میں انسان بنائے!

خدا کی روشنی

(میری کوریلی کی ایک نظم کا ترجمہ)

(از مسٹر دلشاد نبی۔ بی۔ اے (علیگ)

بادلوں کی کالی پیلی فوجوں نے کوچ کیا، کہرے کے دھندلے دھندلے کالے پردے آہستہ آہستہ ہٹ گئے۔ ہلکے نیلے آسمان کے نیچے اونچے پہاڑ صاف طور پر دکھائی دینے لگے، ان کی بلند چوٹیاں برف کی چادریں اوڑھے ہوئے آسمان سے باتیں کرتی ہوئی نظر آئیں۔ تھوڑی دیر بعد پہاڑوں کے پوربی ڈھالوں پہ ایک تیز شعاع نمودار ہوئی، اس کی گرمی سے برف پگھلنے لگی، اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے بنفشہ کے پھولوں کو شگفتہ کر دیا۔

دو آدمیوں کی دھندلی دھندلی شکلیں روشنی کی طرف بڑھیں۔ وہ کئی گھنٹے کی چڑھائی طے کر چکے تھے، انھوں نے روشنی کو دور سے دیکھ لیا تھا اب وہ دونوں اس جگہ آ پہونچے۔ وہ دونوں بھائی تھے لیکن جب وہ روشنی کے قریب پہونچے تو بدگمانی اور غصے سے ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

ایک آدمی نے کہا "تمہارا یہاں کیا کام ہے، روشنی میری ہے"

دوسرے نے جلدی سے جواب دیا "ہرگز نہیں، بیوقوف! تو جھوٹ بولتا ہے۔ روشنی میری ہے"

ان کے ماتھوں کے بل سمٹ کر رہ گئے، وہ اپنی اخوت و محبت بالکل بھول گئے اور لڑنے لگے اور اتنا لڑے کہ ان کے بدن سے خون کے فوارے جاری ہو گئے۔ تمام زمین پر خون بہنے لگا یہاں تک کہ بنفشہ کے پھول خون آلودہ ہو کر مرجھا گئے اور سوکھ کر گر گئے۔

یکایک دونوں کے درمیان میں ایک سایہ ظاہر ہوا، اس سایہ کا نام "موت" تھا۔ دونوں ڈر کے مارے لڑتے ہوئے ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور اپنی آنکھوں کو بند کر کے وہاں سے بھاگ نکلے۔ اور وہ سایہ ان کے پیچھے ہو لیا۔ ان کا خون جو کہ زمین پر بہہ رہا تھا خشک ہو گیا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلی۔ بنفشہ کے پھولوں نے گہری نیند کے بعد آنکھیں کھولیں، خدا کی روشنی اب تک پہاڑوں پر موجود تھی

اس کے بعد دو عورتیں روشنی تک آئیں۔ وہ دو بڑی رانیاں تھیں۔ ان کے سروں پر جواہرات سے جڑے ہوئے سنہرے تاج تھے، ان دونوں کے درمیان میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا جس کی کمر میں پر لگے ہوئے تھے، وہ آہ و نالہ کر رہا تھا گویا دم اس کے لبوں ہی پر تھا۔ وہ دونوں جب روشنی تک پہنچیں تو

تو ایک دوسرے کو غصہ کی نظر سے دیکھنے لگیں۔

ایک نے کہا "تو اپنی گو سے محبت کے دیوتا کو علیحدہ کر دے، اب ہم اپنی منزل مقصود کو پہونچ چکے ہیں اپنے حسن جاں بخش کی قسم "روشنی" اور "محبت" دونوں میری ہیں۔"

دوسری نے جھڑک کر کہا "اری فریب کی دیوی! میری موجودگی میں خوبصورتی سے تجھے کیا نسبت میں ملکہ حسن ہوں، محبت کا دیوتا میرا نوکر ہے اور روشنی تو میری میراث ہے، لڑائی بالکل فضول ہے۔ "محبت" اور "روشنی" دونوں میری ہیں۔"

پھر دوبارہ سایہ ظاہر ہوا، دونوں رانیاں زرد پڑ گئیں اور آہستہ آہستہ چھلاوے کی طرح ہوا میں غائب ہو گئیں۔ لیکن پروں والا بچہ وہیں پڑا رہا۔ روتا رہا، اور خدا کی روشنی پہاڑوں پر بدستور موجود رہی۔

کچھ دیر کے بعد ایک اکیلا تھکا ہوا مسافر روشنی کی طرف بڑھا، اوپر کو نظر کئے ننگے سر آیا، تھما، چاروں طرف نظر ڈالی اور مسکرا دیا۔ اس کے تمام اعضا تکان سے سست ہو رہے تھے۔ بلا انعام کی مشقت سے اس کے ہاتھ سخت ہو گئے تھے۔ اس کے سست اور زرد چہرے سے امارت و شان نمایاں تھی، اس کے منہ سے ایک آہ نکلی اور دونوں لب وا ہوئے۔

"یہ روشنی ہے! اے میرے خدا میں تیری شان کے قربان!!"

محبت کا دیوتا جو کہ زمین پر پڑا ہوا آنسو بہا رہا تھا کھسک کر اس کے قریب آیا اور اس نے اس آدمی کے پاؤں کو چوم لیا، اور سسکتے ہوئے پوچھا "تم کون ہو جو کہ "روشنی" کی تلاش میں اتنی دور حیران ہوئے ہو اور جس کے لبوں پر حمد و ثنا کے سوا حسد و کینہ کا نام تک نہیں۔"

اجنبی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں دنیا میں ایک نہایت ہی حقیر اور ناچیز شے سمجھا جاتا ہوں میں ہر شخص کی آنکھوں میں کھٹکتا ہوں، اور ہر شخص میرا دشمن ہے۔ میں "روشنی" کی تلاش میں تنہا نکلا اور اُسے پا لیا۔ روشنی کے پیدا کرنے والے کے صدقے جس نے مجھے گمراہ نہیں کیا۔ میرا نام "سچائی" ہے جس سے ہر شخص بہت ہی زیادہ نفرت کرتا ہے۔"

سایہ پھر نمودار ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس میں چمک پیدا ہونے لگی اور وہ روشنی میں تبدیل ہو گیا۔ تھکی ہوئی زرد اور کمزور "سچائی" شعاع نورانی سے سیراب ہونے لگی اور توانا و تنومند ہو گئی محبت کے دیوتا کے آنسو خشک ہو گئے آسمان سے فرشتوں کے دلآویز نغمے سنائی دینے لگے اور خدا کی روشنی پھیل کر تمام پہاڑوں کو چمکانے لگی۔

خدا کی روشنی

(میری کوریلی کی ایک نظم کا ترجمہ)

(از مسٹر دلشاد نبی۔ بی۔ اے (علیگ)

بادلوں کی کالی پیلی فوجوں نے کوچ کیا، کہرے کے دھندلے دھندلے کالے پردے آہستہ آہستہ ہٹ گئے۔ ہلکے نیلے آسمان کے نیچے اونچے پہاڑ صاف طور پر دکھائی دینے لگے، ان کی بلند چوٹیاں برف کی چادریں اوڑھے ہوئے آسمان سے باتیں کرتی ہوئی نظر آئیں۔ تھوڑی دیر بعد پہاڑوں کے پوربی ڈھالوں پر ایک تیز شعاع نمودار ہوئی، اس کی گرمی سے برف پگھلنے لگی، اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے بنفشہ کے پھولوں کو شگفتہ کر دیا۔

دو آدمیوں کی دھندلی دھندلی شکلیں روشنی کی طرف بڑھیں۔ وہ کئی گھنٹے کی چڑھائی طے کر چکے تھے، اُنھوں نے روشنی کو دُور سے دیکھ لیا تھا اب وہ دونوں اس جگہ آ پہونچے۔ وہ دونوں بھائی تھے لیکن جب وہ روشنی کے قریب پہونچے تو بدگمانی اور غصے سے اُن کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

ایک آدمی نے کہا "تمہارا یہاں کیا کام ہے، روشنی میری ہے"

دوسرے نے جلدی سے جواب دیا "ہرگز نہیں، بیوقوف! تو جھوٹ بولتا ہے۔ روشنی میری ہے"
اُن کے ماتھوں کے بل سمٹ کر رہ گئے، وہ اپنی اخوت و محبت بالکل بھول گئے اور لڑنے لگے اور اتنا لڑے کہ ان کے بدن سے خون کے فوارے جاری ہوگئے۔ تمام زمین پر خون بہنے لگا یہاں تک کہ بنفشہ کے پھول خون آلودہ ہو کر مرجھا گئے اور سوکھ کر گر گئے۔

یکایک دونوں کے درمیان میں ایک سایہ ظاہر ہوا، اس سایہ کا نام "موت" تھا۔ دونوں ڈر کے مارے لڑتے ہوئے ایک دوسرے سے جدا ہوئے، اور اپنی آنکھوں کو بند کر کے وہاں سے بھاگ نکلے۔ اور وہ سایہ ان کے پیچھے ہو لیا۔ اُن کا خون جو کہ زمین پر بہہ رہا تھا خشک ہو گیا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلی۔ بنفشہ کے پھولوں نے گہری نیند کے بعد آنکھیں کھولیں، خدا کی روشنی ابتک پہاڑوں پر موجود تھی

اس کے بعد دو عورتیں روشنی تک آئیں۔ وہ دو بڑی رانیاں تھیں۔ اُن کے سروں پر جواہرات سے جڑے ہوئے سنہرے تاج تھے، ان دونوں کے درمیان میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا جس کی کمر میں پر لگے ہوئے تھے، وہ آہ و نالہ کر رہا تھا گویا رحم اس کے لبوں ہی پر تھا۔ وہ دونوں جب روشنی تک پہونچیں

تو ایک دوسرے کو غصہ کی نظر سے دیکھنے لگیں۔

ایک نے کہا "تو اپنی گو سے محبت کے دیوتا کو علیحدہ کر دے، اب ہم اپنی منزلِ مقصود کو پہونچ چکے ہیں اپنے حسنِ جاں بخش کی قسم "روشنی" اور "محبت" دونوں میری ہیں"۔

دوسری نے جھڑک کر کہا "اری فریب کی دیوی! میری موجودگی میں خوبصورتی سے تجھے کیا نسبت ہیں ملکۂ حسن ہوں، محبت کا دیوتا میرا نوکر ہے اور روشنی تو میری میراث ہے، لڑائی بالکل فضول ہے، "محبت" اور "روشنی" دونوں میری ہیں"۔

پھر دوبارہ سایہ ظاہر ہوا، دونوں رانیاں زرد پڑ گئیں اور آہستہ آہستہ پھلاوے کی طرح ہوا میں غائب ہو گئیں لیکن پروں والا بچہ وہیں پڑا رہا اور روتا رہا اور خدا کی روشنی پہاڑوں پر بدستور موجود رہی۔

کچھ دیر کے بعد ایک اکیلا تھکا ہوا مسافر روشنی کی طرف بڑھا، اوپر کو نظر کئے ننگے سر آیا تھا، چاروں طرف نظر ڈالی اور مسکرا دیا۔ اس کے تمام اعضا تکان سے سست ہو رہے تھے۔ بلا انعام کی مشقت سے اس کے ہاتھ سخت ہو گئے تھے۔ اس کے سُست اور زرد چہرے سے امارت و شان نمایاں تھی، اس کے منہ سے ایک آہ نکلی اور دونوں لب وا ہوئے۔

"یہ روشنی ہے! اے میرے خدا میں تیری شان کے قربان!!"

محبت کا دیوتا جو کہ زمین پر پڑا ہوا آنسو بہا رہا تھا کھسک کر اس کے قریب آیا اور اس نے اس آدمی کے پاؤں کو چوم لیا، اور سسکتے ہوئے پوچھا "تم کون ہو جو کہ "روشنی" کی تلاش میں اتنی دور حیران ہوئے ہو اور جس کے لبوں پر حمد و ثنا کے سوا حسد و کینہ کا نام تک نہیں"۔

اجنبی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں دنیا میں ایک نہایت ہی حقیر و ناچیز شے سمجھا جاتا ہوں میں ہر شخص کی آنکھوں میں کھٹکتا ہوں، اور ہر شخص میرا دشمن ہے۔ میں "روشنی" کی تلاش میں تنہا نکلا اور اُسے پا لیا۔ روشنی کے پیدا کرنے والے کے صدقے جس نے مجھے گمراہ نہیں کیا۔ میرا نام "سچائی" ہے جس سے ہر شخص بہت ہی زیادہ نفرت کرتا ہے"۔

سایہ پھر نمودار ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس میں چمک پیدا ہونے لگی اور وہ روشنی میں تبدیل ہو گیا۔ تھکی ہوئی زرد اور کمزور "سچائی" شعاع نورانی سے سیراب ہونے لگی اور توانا و تنومند ہو گئی محبت کے دیوتا کے آنسو خشک ہو گئے آسمان سے فرشتوں کے دلآویز نغمے سنائی دینے لگے اور خدا کی روشنی پھیل کر تمام پہاڑوں کو چمکانے لگی۔

شیخ و برہمن

(از ڈاکٹر اعظم کریوی سابق مدیر "اکبر" الہ آباد)

شیخ منیر اور پنڈت دیا شنکر کی دوستی صرف اُن کے گاؤں کچھنا ہی تک نہیں بلکہ دُور دور تک مشہور تھی۔ شیخ جی کے پاؤں میں کانٹا چبھتا تو پنڈت جی کے دل پر چوٹ لگتی اور اگر پنڈت جی کو کوئی تکلیف ہوتی تو شیخ جی بے چین ہو جاتے۔ جب تک دونوں آپس میں مشورہ نہ کر لیتے کسی کام میں ہاتھ نہ لگاتے۔ پنڈت جی کے یہاں جب ست نراین کی کتھا ہوتی تو شیخ منیر کے ہاتھ میں سارا انتظام رہتا اور شیخ منیر کے یہاں میلاد شریف کی مجلس ہوتی تو پنڈت جی انتظام کرتے۔ گھر بھی دونوں کا ملا ہوا تھا۔ سامنے ایک نیم کا درخت تھا اسی کے نیچے چبوترہ پر دونوں کی نشست رہا کرتی۔ رات کو گاؤں کے اور دو چار آدمی وہاں آ جاتے اور ادھر اُدھر کی باتیں ہوا کرتیں۔ صبح کے وقت گاؤں کے اکھاڑے پہنچ جاتے۔ دونوں اکھاڑے کے خلیفہ تھے۔ جوانی میں بڑی بڑی کشتیاں ماری تھیں لیکن اب ضعیفی کا عالم تھا۔ شاگرد کشتیاں لڑاتے اور داؤں پیچ بتاتے تھے۔ کبھی دل میں آ جاتا تو زور بھی کرا دیتے۔ جب کہیں دنگل ہوتا تو شاگردوں کے ساتھ ضرور جاتے۔ ان کے دم قدم کی برکت سے کچھنا کے پہلوان جس دنگل میں گئے فتحمند واپس آئے۔ شیخ جی اور پنڈت جی کا شمار گاؤں کے بڑے کاشتکاروں میں تھا، دونوں کے پاس اتنی موروثی کاشتکاری تھی کہ بخوبی بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ مختلف مذاہب کے پیرو ہوتے ہوئے بھی ان میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ وہ پریم کے پجاری تھے، محبت نے اُن کے دلوں سے شیخ و برہمن کی تفریق دُور کر دی تھی۔ ظاہر میں وہ دو لیکن باطن میں ایک تھے۔ اسے اتفاق سمجھیے یا خدا کی قدرت کہ دونوں کی صرف ایک ایک ہی اولاد ہوئی۔ شیخ جمن اور جٹا شنکر بھی اپنے والدین کی طرح آپس میں لنگوٹیا یار تھے۔ دونوں ایک ساتھ ہی اُٹھتے بیٹھتے، کھیلتے کودتے۔ شیخ جمن کی شادی میں پنڈت دیا شنکر اور جٹا شنکر کے بیاہ میں شیخ منیر اگوا بنے تھے۔ غرض جب تک پنڈت جی [illegible] شیخ جی [illegible] ایک جان اور دو قالب بنے رہے اور مرے بھی تو اتفاق سے ایک ہی [illegible] سُرگباش ہوئے اُن کے پیچھے شیخ جی بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

(۲)

شیخ منیر اور پنڈت دیا شنکر کے مرنے کے بعد ایک سال تک دونوں گھروں کے تعلقات بدستور رہے لیکن جب پنڈت دیا شنکر کی برسی ہوئی اور جٹا شنکر نے خلاف معمول شیخ جمن سے کوئی مشورہ نہ لیا تو [illegible]ن کو بہت ناگوار گذرا۔ برسی میں جو ست نراین کی کتھا ہوئی اس میں بھی جٹا شنکر نے شہر سے کسی نئے پرچارک کو بلایا۔ پرچارک جی بزعم خود جوشیلے اور قوم پرست واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے کتھا کے بعد بات چیت میں سنگٹھن پر خاص طور پر زور دیا اور دانستہ یا نادانستہ کچھ مسلمانوں کے خلاف بھی کہہ ڈالا۔ شیخ جمن کتھا میں موجود تھے۔ اُن کے لئے یہ نئی بات تھی۔ بچپن ہی سے اُن کے تعلقات ہندوؤں سے خصوصاً جٹا شنکر سے برادرانہ تھے۔ اگر سنگٹھن کے علاوہ پرچارک جی مسلمانوں کے خلاف کچھ نہ کہتے تو کوئی اعتراض کا موقع نہ تھا۔ جمن پڑھا لکھا نہیں گنوار تھا۔ اُس نے سمجھا کہ یہ سب جٹا شنکر ہی کے اشارہ سے ہوا ہے ہمیشہ کا دستور تھا کہ جب ست نراین کی کتھا ختم ہوجاتی تو جمن بھی پرشاد لیکر اپنے گھر جایا کرتے تھے۔ لیکن اس مرتبہ کتھا ختم ہوتے ہی پرشاد لئے بغیر شیخ جمن منہ لٹکائے گھر واپس ہوئے۔ ان کو واپس جاتے دیکھ کر جٹا شنکر کی ماں نے کہا "بیٹا! ایسی جلدی کیا ہے؟ تھوڑا ٹھہرو پرشاد لیکر جانا۔"

"ماسی! مجھے آج گھر پر بہت ضروری کام ہے پرشاد [illegible] یہ کہتے ہوئے شیخ جمن نکل گئے۔ اگر جٹا شنکر اُن کو روکتے تو ممکن تھا کہ شیخ جمن ٹھہر جاتے لیکن اس کا موقع ہی نہ ملا کیونکہ جٹا شنکر [illegible] مشغول تھے اور اُنھوں نے شیخ جمن کو جاتے نہیں دیکھا۔

ساون کا مہینہ تھا دونگرہ (پہلی بارش) پڑ چکا تھا۔ جتائی شروع ہوچکی تھی۔ شام کا وقت تھا کہ [illegible] اپنے کندھے پر ہل رکھے ہوئے بیلوں کو ہانکتے اپنے کھیت سے گھر واپس آرہے تھے۔ راہ میں [illegible] ملاقات اپنے ایک دوست گھسیٹے خاں سے ہوئی۔ گھسیٹے خاں نے کہا "کہو شیخ جی کل تو تم نے [illegible] سے مسلمانوں کو خوب گالیاں دلوائیں۔"

"میں اور مسلمانوں کو گالیاں دلواؤں گا۔ جھوٹ بالکل جھوٹ۔ ہاں کل جٹا شنکر کے یہاں کتھا تھی [illegible] گیا ضرور تھا۔ وہاں جو کچھ بات چیت ہوئی اُس میں میری کیا خطا تھی؟"

"[illegible] گاؤں کے مسلمان اس کا الزام تم ہی پر رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارے سامنے [illegible] گالیاں دی گئیں اور تم چپ چاپ سنتے رہے۔ خدا کی قسم میں اگر وہاں موجود ہوتا تو [illegible] بہادیتا۔ لیکن [illegible] ایسی جگہ جانے ہی کیوں لگا۔ ہندوؤں کی کتھا اور اُن کی دوستی تمہیں کو [illegible] ہوا [illegible] جٹا شنکر تمہارا دیوالہ نہ نکال دے تو بات ہی نہیں۔"

شیخ جمن خود تو جٹا شنکر سے ناراض تھے۔ لیکن اس وقت تک اتنی عقل رکھتے تھے کہ کسی غیر کی زبان سے جٹا شنکر کی بُرائی سُن نہیں سکتے تھے۔ جل کر بولے "میں خود جٹا شنکر سے سمجھ لونگا کسی غیر کو میرے معاملہ میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔"

گھسیٹے خاں نے دیکھا کہ شکار قابو سے باہر ہوا جاتا ہے۔ کہنے لگے "ہاں بھئی جٹا شنکر تمہارا سب کچھ ہے۔ میں تو غیر ٹھہرا۔ میں نے بھر پایا اب تم سے کبھی کچھ نہ کہونگا۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے گاؤں کے قریب پہونچ چکے تھے۔ راہ میں ملّا کمال مل گئے۔ ملاجی نے پوچھا "کہو یارو! کیا باتیں ہو رہی ہیں۔"

گھسیٹے خاں کو سہارا مل گیا، کہنے لگے "کل جٹا شنکر کے یہاں مسلمانوں کو خوب گالیاں دی گئیں۔ شیخ جی وہاں موجود تھے، لیکن چپ چاپ بیٹھے رہے۔ اسی پر میں نے جو ان سے کہا تو اُلٹے مجھ ہی سے خفا ہونے لگے۔"

ملّاجی بولے "اس میں بگڑنے کی کون بات تھی، جمن کو خدا جانے جٹا شنکر نے کیا گھول کر پلا دیا ہے کہ یہ اُسی کی غلامی میں لگے رہتے ہیں، حالانکہ جٹا شنکر سے کسی بات میں کم نہیں ہیں۔ کیوں گھسیٹے میں سچ کہتا ہوں نا؟"

شیخ جمن کے جواب سے گھسیٹے خاں کچھ مایوس ہو چکے تھے مگر ملّاجی کے ساتھ دینے سے ان کا دل بڑھ گیا، بولے "اجی ان کے سامنے جٹا شنکر کوئی چیز نہیں۔ یہ ہر بات میں اُس سے بڑھکر ہیں مگر ان کو سمجھائے کون۔ جب گاؤں کا کوئی مسلمان کتھا میں شریک نہیں تھا تو ان کو وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ جو مسلمان ہندوؤں کی کتھا سُنتا ہے وہ کافر ہو جاتا ہے۔ کیوں ملاجی یہ سچ ہے نا؟"

ملّاجی کی دوڑ گاؤں کی مسجد ہی تک تھی، اُردو کی پہلی کتاب بھی ختم نہیں کی تھی کہ مُلاجی بن گئے۔ کلام پاک کی دو چار آیتیں طوطے کی طرح رٹ رکھی تھیں جس سے وہ خود کو زبردست عالم سمجھنے لگے تھے، مُردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں ان کو تو اپنے حلوے مانڈے سے کام تھا۔ گھسیٹے خاں نے اُن سے فتویٰ مانگا تو دل میں خوش ہو کر فرمانے لگے "ہاں حدیث کی بڑی کتابوں میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ جو کافروں سے میل جول رکھتا ہے وہ بھی کافر ہو جاتا ہے۔"

شیخ جمن کا کلیجہ کانپ اُٹھا، آہ مجھے یہ بھید سے کیوں نہ معلوم تھا، میں نے دھوکا کھایا۔ اس نے بڑی حسرت سے ملّاجی سے پوچھا "کیوں ملاجی جو مسلمان پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں وہ بھی ہندوؤں سے میل جول رکھنے سے کافر ہو جاتے ہیں [illegible]

مُلاجی نے منھ بنا کر کہا "شرعی معاملات میں دلیل وحجت کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ حدیث میں لکھا ہے میں نے بتا دیا، آگے تم جانو تمہارا کام"۔

اب سب شیخ جمن کے دروازہ پر پہنچ چکے تھے۔ شیخ جمن نے ہل کندھے سے اُتار کر زمین پر رکھدیا گھسیٹے خاں اور مُلاجی کے لئے چارپائی بچھادی۔ گھسیٹے خاں نے شیخ جمن سے ہمدردی کرتے ہوئے مُلاجی سے پوچھا "بیچارے شیخ جی کو کیا معلوم تھا کہ کتھا سننے سے مسلمان کافر ہوجاتا ہے۔ خیر جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اب کوئی ایسی ترکیب بتائیے جس سے یہ پھر پکّے مسلمان ہو جائیں"۔

مُلاجی نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا "ہاں توبہ کا دروازہ بند نہیں ہے، کیوں جمن تم اپنے باپ کی برسی کب کروگے؟"

"آج کے آٹھویں دن برسی ہوگی"۔

"برسی میں میلاد شریف کی محفل بڑی شان سے کرو اور وعظ کے لئے شہر سے کوئی مولوی بلاؤ۔ کہنے کو تو میں بھی وعظ کہہ سکتا ہوں لیکن بھائی گاؤں کا معاملہ ہے میں اس میں دخل نہیں دینا چاہتا۔ شہر سے جو مولوی صاحب بلائے جائیں وہ بھی اپنے وعظ میں ہندوؤں کی خوب خبر لیں۔ اس طرح سے تم جٹا شنکر سے بدلے لوگے۔ پندرہ بیس روپیے کا خرچ ہے لیکن تمہارے لئے یہ معمولی بات ہے"۔

شیخ جمن نے کہا "خیر روپیئے کی کوئی فکر نہیں، لیکن میں تو شہر کے کسی مولوی صاحب کو نہیں جانتا"۔

مُلاجی بولے "اس سے تم بے فکر رہو میں سب انتظام کرلوں گا"۔

شیخ جمن جال میں پھنس گئے۔ مُلاجی نے اُنھیں کچھ سوچنے کا موقعہ ہی نہ دیا۔ چنانچہ جب شیخ جمن کے یہاں محفل میلاد شریف منعقد ہوئی تو شہر سے مُلاجی کسی بڑے مولانا کو بلا لائے۔ انھوں نے اپنے وعظ میں فتویٰ دیدیا کہ ہندوؤں سے ملنا جلنا یا ان سے کسی قسم کا تعلق رکھنا کفر ہے۔ وعظ کہکر بڑے مولانا تو واپس تشریف لے گئے مگر جو آگ پنڈت جی کے پرچار سے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی وہ اب مولانا کے وعظ سے یکبارگی بھڑک اُٹھی اور گاؤں کا امن خطرہ میں پڑ گیا۔

(۳)

صبح کا وقت تھا پنڈت جٹا شنکر اپنے چبوترہ پر بیٹھے لالہ بہاری لال پٹواری اور چھوٹے لال بنیئے سے باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دور پر شنکر واچمار زمین پر بیٹھا موتج کی رسی بٹ رہا تھا، شیخ جمن اپنے گھر سے نکلے ان کو دیکھکر جٹا شنکر نے کہا "کہو شیخ جی! ہندوؤں کو گالیاں دلاکر اب تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہوگیا"۔
شیخ جمن نے تیوری چڑھاکر جواب دیا "جو جیسا کہے گا ویسا سنے گا"۔ "وہ دن بھول گئے جب تم

نے مسلمانوں کو گالیاں دلائی تھیں۔ سچ ہے میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو۔"

"لیکن اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔"

"دیکھا جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے شیخ جمن آگے بڑھ گئے، چبوترہ پر بیٹھے نہیں۔

چھوٹے لال بنیئے نے کہا "شیخ جی تو بہت بگڑے ہوئے ہیں۔"

پٹواری "رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی۔"

چھوٹے لال "شیخ جی کا کسی سے مقابلہ پڑے گا تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوجائیگا۔"

شنکر واچار نے دیکھا کہ وہی سب سے پیچھے رہا جاتا ہے۔ بول اُٹھا "یار بگیہ جمین (زمین) پا تا اکڑت (اکڑتے) ہیں۔ کہوں جمیدار ہوت تو ہم لوگن کا کچا کھائے جات (کہیں زمیندار ہوتے تو ہم لوگوں کو کچا کھا جاتے)"

اب جٹا شنکر کی باری تھی، کہنے لگا "یہ تو یہاں پرواہ کس کو ہے۔ گاؤں میں گنتی کے تو مسلمان ہیں، ہم چاہیں تو ان کو مار کر بھگا دیں گے۔" وہ لو بھگوان داس مہاراج بھی آگئے، ان کی رائے بھی لے لو۔

بھگوان داس مہاراج گاؤں کے پروہت تھے۔ انھوں نے جب سارا معاملہ سُنا تو کہا "ان ملکشوں کا کبھی وشواش نہیں کرنا چاہیئے۔ سب کو ان سے اسہوگ کرنا ہی اچھا ہے۔ پرماتما کرے سب مسلمان گاؤں چھوڑ کر بھاگ جائیں۔"

شنکر واچار اُچھل پڑا "یا مہاراج! تم نے بڑی ماکول (معقول) بات کہی۔ دھن ہے تمہری بُدھی کو۔ کہو مہتو تمہار کا رائے ہے (تمہاری کیا رائے ہے)"

چھوٹے لال بنیئے نے جواب دیا۔ "مُدا (لیکن) ہمارا نُکسان (نقصان) ہوگا۔"

پٹواری نے سنبھالا "نہیں نہیں تم اس کی کوئی فکر نہ کرو۔"

آخر کار مہاراج بھگوان داس کی رائے سب نے مان لی اور اسی دن سے گاؤں میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ جہاں کبھی ہندو و مسلمان آپس میں برادرانہ تعلقات رکھتے تھے وہاں اب نفاق کا بیج بو دیا گیا۔ شیخ و برہمن کی جنگ سے پریشان ہوکر امن و امان کی دیوی گاؤں سے رخصت ہوگئی۔

(۴)

ایک دن پنڈت جٹا شنکر کے بیلوں کی چرہی میں شیخ جمن کی مرغی چلی گئی۔ جٹا شنکر نے ڈھیلا مارا جمن نے دیکھ لیا۔ پہلے ڈھیلے کا کیا ذکر اگر جٹا شنکر مرغی کو جان سے بھی مار ڈالتے تو شیخ جی کو کوئی صدمہ نہ ہوتا لیکن اب تو لاگ ڈانٹ تھی، جمن نے سوچا کہ جٹا شنکر نے جان بوجھ کر اُن کی مرغی کو ڈھیلا مارا ہے۔ بگڑ کر

بولے "تم نے میری مرغی کو ڈھیلا کیوں مارا؟"

"ہمارا نقصان کرے گی تو ہم ضرور ماریں گے۔"

"آئے کہیں کے بڑے مارنے والے، اب مارو تو بتائیں۔"

"اچھا یہ بات ہے تو اپنی مرغی بھیجکر دیکھ لو۔"

"اب اس ضد پر تو میری مرغی ضرور جائے گی، میں بھی دیکھوں گا کہ کون مائی کا لال میری مرغی کو مارتا ہے۔"

"شیخ جی، بس زیادہ نہ بڑھو، زبان سنبھال کر بات کرو نہیں تو اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ تمہاری مرغیاں میرا نقصان کریں اور اگر میں کچھ کہوں تم بجائے شرمندہ ہونے کے الٹا مجھے آنکھیں دکھاتے ہو۔"

"تم کو کچھ کہنا تھا تو مجھ سے کہتے میری مرغی کو مارنے والے تم کون ہوتے ہو۔ میں تم سے دبنے والا آسامی نہیں ہوں، تم ایک کہوگے تو میں ہزار کہونگا۔ تم نے مجھے سمجھا کیا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں سمجھا، مجھ سے زیادہ بولوگے تو ساری شیخی خاک میں ملا دونگا۔"

"آہا چیونٹی چلی بہرائچ" تمہاری یہ مجال کہ مجھ سے آنکھ ملاؤ، اچھا آؤ لیں، اب دیر کیا ہے لاٹھی لیکر آجاؤ، آج ہی ہمارا اور تمہارا فیصلہ ہو جائے۔" یہ کہہ کر شیخ جمن گھر سے لاٹھی لینے کے لئے دوڑے۔ ماں نے گھبرا کر پوچھا "کیا معاملہ ہے" لیکن جمن نے غصہ میں کوئی جواب نہ دیا۔ ادھر بھی جب جٹا شنکر گھر سے لاٹھی لیکر باہر نکلنے لگے تو اُن کی ماں نے ٹوکا مگر وہ بھی بغیر کچھ کہے جلدی سے باہر آگئے۔

اس اثنا میں گاؤں کے اور بھی ہندو مسلمان جمع ہوگئے تھے۔ مسلمانوں نے شیخ جی کا ساتھ دیا اور کہا "شیخ جی گھبرانا نہیں ہم سب تمہارے ساتھ ہیں، اگر آج تم دب گئے تو اتنا سمجھ لینا کہ پھر ہندو ہمارا گاؤں میں رہنا دشوار کردیں گے۔" دوسری جانب ہندوؤں نے جٹا شنکر کو اُبھارا "خبردار مسلمانوں سے دبنا نہیں۔ اکڑے رہو۔"

دونوں جانب کے لوگ مرنے مارنے پر تیار ہوگئے۔ اب یہ جٹا شنکر اور شیخ جمن کی لڑائی نہ تھی بلکہ شیخ و برہمن کی جنگ تھی۔ گاؤں میں زمینداروں کا ظلم برداشت کیا جاسکتا ہے، لگان کی وصولیابی کے وقت کارندوں کی مار پھٹکار سہی جاسکتی ہے، پیادوں کی گالیاں کھائی جاسکتی ہیں، حاکم پرگنہ کی بیگار میں کوئی عذر نہیں کیا جائیگا۔ لیکن اس وقت شیخ و برہمن کا سوال پیدا ہوگیا تو فاقہ کش ہندو مسلم کسان اپنی جان قربان کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ مگر اس جنگ میں نہ تو کتھا والے پرچارک اور نہ میلاد شریف

والے مولانا شریک تھے۔ اس وقت مجلس میں چنگاری ڈال کر وہ دوسرے سے تماشا دیکھنے والوں میں بھی نہیں ہیں۔ فریقین جوش غضب میں پاگل ہو رہے تھے انجام کی کسی کو کوئی فکر نہ تھی ہندوؤں نے "جے، جے" اور مسلمانوں نے "اللہ اکبر" کا نعرہ مارا۔ دونوں جانب کے سردار شیخ جمن اور پنڈت جٹا شنکر سب سے پہلے لاٹھی سنبھال کر آگے بڑھے، قریب تھا کہ دونوں جانب سے لاٹھیاں چل جائیں کہ اسی وقت جٹا شنکر اور شیخ جمن کی مائیں دوڑتی ہوئی آئیں اور دونوں کے درمیان کھڑی ہو گئیں۔ جوش پر آیا ہوا دریا تھم گیا، اٹھی ہوئی لاٹھیاں جھک گئیں۔

مہاراجن نے اپنے لڑکے جٹا شنکر کو مخاطب کر کے کہا "تو میرے جیتے جی جمن پر لاٹھی نہیں چلا سکتا، تجھے مارنا ہی ہے تو پہلے اپنی ماں پر لاٹھی چلا، میں جمن کو تجھ سے کم نہیں سمجھتی ہوں۔ وہ بھی میرا بچہ ہے جس کو تو آج مارنے چلا ہے اسی کو تیرے پتا جی اپنی جان سے بڑھکر سمجھتے تھے۔ آج تم دونوں بھائیوں کی لڑائی سے اُن کی آتما کو کتنا دُکھ پہونچ رہا ہوگا۔ ہائے وہ میل ملاپ کے دن کیا ہوئے۔ تیری تو عقل ماری گئی ہے، تو دوسروں کے بہکانے میں آگیا ہے، مسلمان برسوں سے اس گاؤں میں رہتے چلے آئے ہیں انھوں نے ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا ہے، اُن سے لڑائی مول لینا اچھا نہیں۔ آپس کی لڑائی سے سارا گاؤں تباہ ہو جائیگا جنھیں تو اپنا دوست سمجھتا ہے وہ وقت پڑنے پر تیرا ساتھ نہ دینگے۔ فوجداری سے جیو ہتیا ہوگی، اس کا پاپ کس پر پڑے گا"۔ ادھر تو مہاراجن جٹا شنکر کو سمجھا رہی تھیں اور ادھر شیخ جمن کی ماں جمن کو لعنت ملامت کر رہی تھیں "میں جٹا شنکر پر ہرگز کوئی آنچ نہ آنے دونگی، وہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے، میرا کیا میں تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں، آج نہ مری کل مری۔ مارنا ہے تو مجھے مار ڈال، میرے خون سے تیرا غصہ ٹھنڈا ہو جائیگا۔ ایک مرغی کے پیچھے تو جٹا شنکر کی جان لینے چلا ہے۔ توبہ! توبہ! جو لوگ چاہتے ہیں کہ تم دونوں بھائیوں کو لڑا کر تماشا دیکھیں اُن کی منشا میری زندگی میں پوری نہیں ہو سکتی۔ جب تک مہاراجن اور میں زندہ ہوں اس گھر میں پھوٹ نہیں پڑ سکتی"۔

اتنا کہکر وہ مہاراجن کی طرف بڑھیں، دونوں گلے مل کر رونے لگیں، بہت ہی پُر اثر اور حسرتناک نظارہ تھا۔ دونوں ماؤں کی محبت آمیز تقریر اور پاک آنسوؤں نے بغض و عناد کے خس و خاشاک کو بہا دیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دل صاف ہو گئے۔ جٹا شنکر او شیخ جمن آگے بڑھے اور دونوں گلے مل گئے۔ سب یکبارگی چلا اٹھے

"ہندو مسلمان کی جے"

تنقید کتب

پدم پراگ

(پہلا حصہ۔ ہندی اشری ان پنڈت پدم سنگھ جی شرما کے مختلف مضامین اور ایڈیسیوں کا مجموعہ۔ انگلیڈ۔ صفحات ۲۴۴ متعدد تصویریں۔ مجلد قیمت ۲؍ پبلشرز۔ بھارتی پبلشرز لیمیٹڈ، مراد پور (پٹنہ)

(از پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی بی اے)

پنڈت پدم سنگھ ہندی دنیا میں تعارف سے مستغنی ہیں، اہالیان اُردو کو یہ بتانا کافی ہوگا کہ آپ "ہندی ساہتیہ سمّیلن" (ہندی ادبی کانفرنس) کی کرسیِ صدارت کو دو بار زینت بخش چکے ہیں۔ آپ ہندی کے اُن چند اہل زبانوں اور مصنفوں میں ہیں جو سنسکرت کی فضیلت کے سوا اُردو فارسی کی پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ پھر کیا تعجب کہ آپ اُردو ہندی کی نقیض سے مبرا اور ادبی رواداری کی روح رواں ہیں جیسا کہ اسی مجموعۂ زیر نظر کے ملاحظہ سے ظاہر ہوگا۔ ہندی کے متعدد رسالے آپ کے رشحات قلم سے اکثر مالا مال ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے آپ کی بڑی تصنیف جس میں آپ نے ہندی کے فنِ شاعری کے نکات کی تشریح اور عالمانہ تنقید کے خزانے بھر دیئے ہیں ہندی کے مشہور شاعر بہاری کی ست سئی کی شرح ہے۔

پنڈت جی کی ادبی رواداری کی طرف ابھی اشارہ ہوا ہے، اس کے ساتھ ملی رواداری بھی آپ کا نمایاں شعار ہے۔ چنانچہ مجموعۂ زیر نظر میں جہاں بھگوان کرشن، سوامی دیانند، پنڈت گنپتی شرما پر مضامین دیکھنے میں آتے ہیں، خلیفہ مامون رشید، امیر خسرو، مولانا آزاد، اور اکبر پر بھی مضامین موجود ہیں، اور پھر لطف یہ کہ معرفانہ خلوص اور محاسن کی داد دینے میں بُخل کا نام نہیں۔

کلاسیکل نفزیت اور کلام کی لطافت آپ کی تحریر کے عنصر اعظم ہیں۔ آپ کی تحریریں اگرچہ تازہ اور نئے موضوع پر ہوتی ہیں اور آپ کا طرز تنقید بھی نئے اصولوں پر مبنی ہوتا ہے لیکن آپ کی انشا کی زبان وہ نہیں جو آجکل عموماً ہندی کتابوں میں دیکھی جاتی ہے، میرا مطلب کھڑی بولی کی مذمت سے نہیں بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ دلیل کی گرانباری اور مضامین کے وقیع ہونے کے ساتھ زبان کی عذوبت، بیان کی سلاست اور کلام کی لطافت آپ کی تحریر کے خاص جوہر ہیں

پھر عجب کیا کہ پنڈت جی برج بھاشا کے حامی اور وکیل ہیں۔ جس طرح اُردو میں کہیں کہیں ٹکسالی زبان اور محاورے کی شان میں گستاخی کی جا رہی ہے اسی طرح ہندی میں بھی بعض مہاشیوں نے انحراف کا جھنڈا اُٹھایا ہوا ہے اور برج بھاشا کے خلاف احتجاج شروع ہے۔ آپ نے ساہتیہ سمیلن کے ایک خطبۂ صدارت میں اس سوال کو کے کر دندان شکن جواب دیئے ہیں اور برج بھاشا سے نظیریں پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ جو الزام ہے کہ برج بھاشا کی شاعری میں جذبۂ شجاعت اور رزم کا رنگ مفقود ہے غلط اور بے بنیاد ہے۔

پنڈت پدم سنگھ جی کی ہندی غرابت اور اغلاق کے اُس نقص سے پاک ہے جو اُردو کی مانند عام ہندی لکھنے والوں کے کلام میں مخل فصاحت ہوتا ہے، ملاحظہ ہو، اکبر مرحوم کے متعلق لکھتے ہیں:-

"اکبر صاحب دل کے بڑے صاف اور سبھاؤ کے ملنسار تھے، پریاگ میں ہندی ساہتیہ سمیلن کا جو اُتسو ہوا تھا اس اوسر پر بہت سے ہندی ساہتیہ سیوکوں کی ملاقات میں نے اکبر صاحب سے کرائی تھی، جو ملا وہی تعریف کرتا ہوا لوٹا۔ پروفیسر رامداس جی گوڑ اور پنڈت شری دھر پاٹھک جی بھی پہلی بار میرے ساتھ اکبر صاحب سے ملے تھے.........."

اب دیکھیئے یہ وہ زبان ہے جسے ہندوستانی کہہ سکتے ہیں، اور یہی وہ زبان ہے جو کل ملک یا ملک کے بیشتر حصہ کی زبان ہو سکتی ہے جس کی ترویج کی طرف فاضل سر شاہ سلیمان نے حال میں الہ آباد کی ہندوستانی اکیڈیمی کی توجہ دلائی یا پروفیسر سلیم آنجہانی کوشش کرتے رہے۔ جب کبھی ملک کو یکایک چک بندیوں سے فرصت ملی اور زاویۂ نظر وسیع ہو کر اُس کی آنکھ ہندوستان پر پڑی اور وطنیت اور عالمگیر ادبیت کا حلقہ گانو، قصبے اور شہر کے سوانے سے باہر نکل کر ہمالہ کی تلیٹی اور سمندر کے کناروں تک پہنچا تو ایسے بالغ نظر اصحاب کی تلاش ہوگی جیسے پنڈت جی شری پدم سنگھ جی شرما ہیں۔

کیا اچھا ہوتا کہ تلک کے گیتا رہسیہ کی طرح پدم پراگ بھی اُردو میں شایع کیا جاتا جس سے اُردو کے ساتھ ملک کی زبان کو بے انتہا فائدہ پہنچتا۔

ہمیں امید ہے کہ اس کتاب کی ویسی ہی قدر ہوگی جس کی وہ مستحق ہے اور نہ صرف ہندی جاننے والے بلکہ اُردو داں بھی اس سے مستفید ہونگے۔ اور دعا ہے کہ پنڈت جی کو درازی عمر اور کامل فراغت نصیب ہو تاکہ ملک اُن کی ذات بابرکات سے پورا فائدہ اُٹھا سکے۔

کبیر صاحب

مؤلفہ پنڈت منوہر لال زتشی - مطبوعہ ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد - رائل سائز - ۱۵۲ صفحات ، مجلد، قیمت ۱۱/

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں مشہور صوفی کبیر داس کے متعلق تمام ضروری باتیں جمع کر دی گئی ہیں ۔ سب سے پہلے مذہب سے فلسفانہ مگر نہایت عام فہم اور دل نشین طریقہ سے بحث کی گئی ہے کہ مذہب کیا ہے اور اس کی ضرورت کیا ہے ۔ اس کے بعد ہندو مذہب کی ارتقا کی مختصر کیفیت قابل قدر طریقہ پر بیان کی گئی ہے ۔ پھر کبیر صاحب کے ذاتی حالات ۔ ان کی تعلیم و تلقین ، اُن کی شاگرد یا ان کے پنتھ وغیرہ کے حالات لکھے گئے ہیں ۔ کبیر صاحب کی شاعری کے ذیل میں اُن کے کلام کا مختصر انتخاب بھی اس طرح پیش کر دیا گیا ہے کہ اول اصل دوہا یا نظم ناگری حروف میں لکھدی گئی ہے پھر اس کو اُردو حروف میں لکھکر اس کا ترجمہ یا تشریح کر دی گئی ہے ۔ عموماً صوفی مشرب بزرگوں کی طرح کبیر صاحب کا بھی مسلک "ہمہ از وست و ہمہ اوست" تھا ۔ اس لئے ان کی تعلیم و تلقین ہر مذہب و ملت کے اصحاب کے واسطے مفید و کار آمد ہے ۔ شاید اسی لیے کبیر صاحب میں یہ خصوصیت ہے کہ ہندو مسلمان دونوں قومیں آج تک ان سے عقیدت رکھتی ہیں اور اپنے اپنے طریقہ پر اس کا اظہار کرتی ہیں

موجودہ زمانہ میں جبکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے تعلقات کشیدہ ہو رہے ہیں اگر دونوں قوموں کے فہمیدہ اصحاب کبیر صاحب کی تعلیم و تلقین کو بغور پڑھکر اس پر عمل کریں تو اُمید ہے کہ اکثر اختلافات جو درحقیقت فروعی ہیں دُور ہو جائیں گے ۔ لہذا ہم ناظرین زمانہ سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں ۔

اس کتاب کی زبان نہایت سلیس ہے ، اس کا طرز بیان بھی نہایت عام فہم ہے ، مشکل اور اہم مسائل کو بھی فاضل مصنف نے نہایت آسان پیرایہ میں بیان کیا ہے ۔ ہماری رائے میں یہ کتاب ہندوستانی زبان کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ بھی پیش کرتی ہے ۔ ہم اس کی اشاعت پر اکیڈمی و نیز پنڈت منوہر لال صاحب زتشی کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں ۔

پیامِ محبت

مصنفہ سوامی بھولا ناتھ - سائز ۲۶×۲۰/۱۶ حجم ۱۶۰ صفحات - مجلد مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ

یہ اسم با مسمّیٰ کتاب ہے ۔ سوامی بھولا ناتھ ایک صوفی مشرب بزرگ ہیں جو اس عقیدہ کے قائل و داعی ہیں کہ محبت ہی سب کچھ ہے ۔ اس سلسلہ میں بکثرت صوفیانہ رموز و نکات بیان کئے گئے ہیں اور

جا بجا خواجہ حافظ، مولانا مغربی، حضرت سرمد شہید اور دوسرے صوفی شعرا کے اشعار نیز خود مصنف کے اشعار برمحل چسپاں کئے گئے ہیں۔ کتاب لائق مطالعہ ہے اور اگر دنیا دار اس کو غور سے پڑھیں گے تو امید ہے کہ وہ بہت سی تکالیف سے اگر بالکل بے نیاز نہیں تو حسب استعداد ضرور رہا ہو جائیں گے

در حقیقت رنج و راحت اعتباری چیزیں ہیں اور غم و مسرت کا مدار صرف خیالات پر ہے۔ اگر ہم رنج و راحت کے خیال کو اپنے دل و دماغ سے دور کر دیں تو پھر دنیا میں نہایت آسانی سے زندگی بسر ہو سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام صوفیوں نے دنیا کی مذمت کر کے انسان کو اس سے علیحدہ رہنے کی تعلیم دی ہے۔ دنیا سے الگ رہنے کے معنی یہ نہیں کہ انسان سب سے تعلقات منقطع کر کے گوشہ گیر ہو جائے بلکہ غرض یہ ہے کہ اپنے خیالات کو صرف دنیا ہی سے وابستہ نہ کر دے اور مالک حقیقی کا خیال بھی رکھے اور اس طرح چند روزہ زندگی کو ہنسی خوشی سے گذار دے۔

تابش خیال

از حضرت آفسر امروہوی۔ کراؤن سائز۔ ۱۲۰ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ: حضرت مصنف۔ رام سوامی۔ کراچی۔

یہ جناب آفسر امروہوی کی غزلیات کا مجموعہ ہے۔ شروع میں مختصر دیباچہ اور اس کے بعد اسرار احمد صاحب کا لکھا ہوا مقدمہ ہے۔ بعد ازاں آفسر صاحب کا کلام (صرف غزلیات) ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۹ء تک سلسلہ وار درج ہے۔ یعنی جس ترتیب سے غزلیں کہی ہیں اسی ترتیب سے اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

آفسر صاحب قدیم طرز سخن کے دلدادہ ہیں، ان کے کلام میں صفائی و روانی کے ساتھ دلکشی بھی موجود ہے، چند اشعار نمونہ کے طور پر درج ذیل ہیں:-

بڑی راحت میں ہوں دنیا و دیں سے بے خبر ہو کر　　چمک اٹھی مری قسمت تمہارا سنگ در ہو کر

سیاہی جس قدر پھیلی ہوئی تھی میری قسمت کی　　تری زلف سیہ میں آ گئی ہے مختصر ہو کر

مآل نیک و بد کی فکر میں پڑنے سے کیا حاصل　　قدم رکھتا ہوں راہ عشق میں شوریدہ سر ہو کر

مثال بوئے گل لے چل مجھے اے شوق آزادی　　قفس میں کس لئے بیٹھا رہوں بے بال و پر ہو کر

ثبوت عاجزی کے بعد ان کو رحم آئیگا　　مری فریاد آفسر کام دیگی بے اثر ہو کر

جناب مصنف کی تصویر بھی شامل کتاب ہے۔

نیرنگِ فطرت

مصنفہ پنڈت اندرجیت شرما - سائز ۲۰×۲۶/۱۶ - ۱۷۲ صفحات - مجلد
قیمت ۱۲/ - ملنے کا پتہ : اُردو بک ڈپو ، ماچھرہ ضلع میرٹھ۔

پنڈت اندرجیت شرما کے نام سے ناظرینِ زمانہ بخوبی واقف ہونگے۔ ان کا کلام وقتاً فوقتاً زمانہ میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ یہ شرما صاحب کی اخلاقی وادبی نظموں اور غزلوں کا دلکش مجموعہ ہے جس میں اکیاسی ۸۱ نظمیں ہیں اور باقی غزلیں اور قطعات وغیرہ۔

شرما صاحب کے کلام کے متعلق ہم اُن کے اُستاد مولانا ندرت میرٹھی کی رائے سے متفق ہیں کہ :-

"یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ (نیرنگِ فطرت) کوئی صحیفۂ آسمانی ہے جس میں کسی غلطی ، فروگذاشت یا کوتاہی وسہو کا امکان ہی نہ ہو کیونکہ اس کا مصنف (اندرجیت شرما) بھی آخر انسان ہے فرشتہ نہیں ...... البتہ شرما صاحب کا اندازِ بیان سادہ و دلکش ہونے کے علاوہ غیر مانوس ترکیبوں پیچیدہ وادق بندشوں اور خلافِ قیاس مبالغوں سے پاک وصاف ہے"۔

ناظرین کے تفننِ طبع کے لئے شرما صاحب کی غزلوں کے چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں :-

کیا پوچھتے ہو حال دلِ داغدار کا　　پہلو میں دیکھتا ہوں تماشا بہار کا
بخشا فروتنی نے یہ رتبہ کہ بعدِ مرگ　　ہر ذرہ عرش بوس ہے میرے مزار کا
انساں کیا بچے خلشِ روزگار سے　　ہر پھول صحنِ باغ میں زخمی ہے خار کا
دل سے مرے جو اُٹھ گیا پردہ رخِ مجاز کا　　نقشہ نظر میں کھنچ گیا تیرے حریم ناز کا
بڑھتی رہیں کدورتیں مٹنے نہ پائی کاہشیں　　پڑتا رہا دلوں پہ جو سایہ رخِ مجاز کا
سجدے درِ حبیب پر کرتے رہے تمام عمر　　پھر بھی ادا نہ ہو سکا ہم سے تو حق نماز کا

مصنف کی تصویر بھی اس مجموعہ کی ظاہری صورت کی زینت میں اضافہ کر رہی ہے۔

انقلاب افغانستان

از محمد حسین خاں بی ، اے (علیگ) سائز ۲۰×۲۶/۱۶ ۲۰۴ صفحات
ملنے کا پتہ : سید حمید خاں - نئی بستی - جالندھر

مسٹر محمد حسین خاں افغانستان میں ناظم تعلیمات تھے۔ اس کتاب سے پہلے انھوں نے "افغان بادشاہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں سابق شاہ افغانستان امان اللہ خاں صاحب کی مدح وستائش میں زورِ قلم صرف ہوا تھا۔ مگر اب انقلاب سلطنت کے ساتھ تختِ حکومت پر دوسرا حکمران جلوہ افروز ہے، اس لئے مسٹر محمد حسین خاں صاحب کی رایوں میں بھی انقلاب عظیم پیدا ہوگیا ہے، چنانچہ اب اس کتاب میں

امان اللہ خاں صاحب کی خامیاں، خود رائی، رموزِ سلطنت سے ناواقفیت وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے اور موجودہ بادشاہ غازی محمد نادر خاں کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ مصنف کتاب ہذا اکیس ۲۱ سال افغانستان میں رہ چکے ہیں۔ ناظم تعلیمات ہونے کے ساتھ ہی وہ ملکی سیاسیات میں بھی برابر حصہ لیتے رہتے تھے جس کی وجہ سے اُنھیں گیارہ سال تک افغانستان کے جیل میں بھی رہنا پڑا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اپنے مشاہدات و ذاتی معاملات تفصیل سے لکھے ہیں اور امان اللہ خاں کو ہر حیثیت سے بُرا ثابت کیا ہے۔ مشاہدات تک تو خیر کچھ مضائقہ نہ تھا مگر ذاتی معاملات کا جا بجا تذکرہ اس بات کی دلیل ہے کہ مصنف کو سابق شاہ افغانستان سے ذاتی کدو کاوش ہے اس لئے اس کتاب میں امان اللہ خاں کی جس قدر بُرائیاں کی گئی ہیں اُن کی قدر و قیمت میں بہت کمی ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ امان اللہ خاں سے بعض اہم غلطیاں ہوئیں جن کا نتیجہ تخت و تاج سے محروم ہونے کی صورت میں ظاہر ہوا مگر یہ مشاہدہ بھی کتنا عبرت خیز ہے کہ جو شخص کل ان کا مداح تھا آج وہی ان کی اس قدر ہجو کر رہا ہے۔

بہر حال اب جبکہ امان اللہ خاں تخت و تاج سے محروم ہو چکے اور غازی محمد نادر خاں سریر آرائے حکومت ہیں لہٰذا "اترا شحنہ مروک نام" کے اصول پر امان اللہ خاں میں جس قدر عیوب ہوں کم ہیں اور موجودہ بادشاہ میں جتنے محاسن ہوں تھوڑے ہیں۔ جن حضرات نے "افغان بادشاہ" کا مطالعہ کیا ہے یا جو صاحب افغانستان کے سیاسی معاملات سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کو یہ کتاب بھی ملاحظہ کرنا چاہیئے تاکہ ایک ہی قلم کے لکھے ہوئے تصویر کے دونوں رخ سامنے آجائیں۔ بادشاہ وقت، عمائدین سلطنت، بچہ سقا وغیرہ کی متعدد تصاویر شامل کتاب ہیں جن سے اس کی دلکشی میں خاصہ اضافہ ہوتا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ زبان کے لحاظ سے اس کتاب میں بکثرت خامیاں پائی جاتی ہیں اور اندازِ بیان بھی مربوط نہیں ہے۔

علمی کہانیاں اور مکالمے

از حکیم مظفر حسین آظہر دہلوی۔ کراؤن سائز۔ ۹۶ صفحات قیمت ۸ؔ ملنے کا پتہ: صدیق بک ڈپو۔ لکھنؤ

اس کتاب میں نوعمر طالب علموں کی معلومات میں اضافہ کرنے کی غرض سے چند مضامین آسان زبان میں لکھے گئے ہیں۔ جن میں خیالات کا اثر جسم پر، آلات خبر رسانی، ہوائی جہاز وغیرہ کا بیان ہے۔ طلبا کی دلچسپی کے لئے زیادہ تر مکالمہ کی صورت اختیار کی گئی ہے۔ امید ہے کہ جس مقصد سے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے اس میں کامیاب ہوگی۔

سہ نظم ہاشمی

از سید ہاشمی فرید آبادی، کراؤن سائز۔ ۴۲ صفحات۔ قیمت ۴ر

ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد دکن

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ تین نظموں کا ایک مختصر مجموعہ ہے، تینوں نظموں کے اشعار کی مجموعی تعداد صرف پچاس ہے جن کو چھیالیس بتیس صفحوں پر ٹائپ میں شائع کیا گیا ہے، انہیں اکثر و بیشتر اشعار ایسے ہیں جن کو معما کہا جا سکتا ہے اور اس لئے محتاج تشریح ہیں۔ اگرچہ ہر بند کے شروع میں عنوانات لکھ دئیے ہیں تاہم اشعار عام فہم نہیں، کہیں کہیں فن کی خامیاں اور نامانوس ترکیبیں بھی ہیں مثلاً

نفس گرامی ترا دہر سے ہمساز ہے — ساز جدا ہیں مگر ایک وہی آواز ہے

اس میں لفظ "ترا" غور طلب ہے، یا

خود کدۂ ظلمت میں شمع سوزاں ہے — خود کہ ساز غنودہ کی تار جنباں ہے

میں "ساز غنودہ"۔

مسکن کنج دوام میں فراغت دوام ہے — ہنر، شرف، کراتیں مشقتوں کا نام ہے

اس شعر میں "مشقتوں کا نام ہے" کے بجائے "مشقتوں کے نام ہیں" ہونا چاہیئے۔

غرض موجودہ صورت میں یہ نظمیں کچھ زیادہ مفید معلوم نہیں ہوتیں۔ اگر ان کو پوری تشریح و توضیح کے ساتھ شائع کیا جاتا تو شاید کارآمد ہوتیں۔

شوپنہار

از مسٹر مجنوں بی۔ اے، کراؤن سائز۔ ۱۲۰ صفحات۔ مجلد، قیمت عمر

ملنے کا پتہ: ایوان اشاعت، گورکھپور

ہمارے دوست مسٹر مجنوں گورکھپوری اردو زبان کی توسیع و ترقی کے دلدادہ ہیں، آپ نے ایوان اشاعت قائم کر کے جدید مطبوعات اور قدیم ادبی کتابوں کے عمدہ ایڈیشن شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے، چنانچہ اس وقت تک دو تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ کتاب زیر تبصرہ میں جرمنی کے مشہور شاعر فلسفی آرتھر شوپنہار کے حالات زندگی اور اس کے فلسفہ پر ایک نظر ڈالی گئی ہے، شروع میں مؤلف صاحب کا لکھا ہوا ایک دیباچہ اور تاریخی مقدمہ ہے۔ اس کے بعد شوپنہار کے حالات زندگی اور اس کے فلسفہ پر تبصرہ ہے۔ مابعد الطبیعات، جمالیات اور اخلاقیات خاص عنوانات ہیں، فلسفہ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔ مؤلف کا انداز بیان بہت دلکش ہے۔

زہرِ عشق

مرتبہ جناب مجنوں بی اے، کراؤن سائز، ۱۴۲ صفحات، مجلد، قیمت ۱۲/

ملنے کا پتہ: ایوانِ اشاعت، گورکھپور

مثنوی زہرِ عشق مصنفہ نواب مرزا شوق لکھنوی اتنی مشہور و عام ہے کہ اس پر کسی قسم کے تبصرہ کی ضرورت مطلق نہیں۔ پیشِ نظر نسخہ میں جو بات قابلِ لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ اس مثنوی کے متعلق حضرت مجنوں، مولانا عبد الماجد دریابادی، حضرت احسن لکھنوی اور جناب نیاز فتحپوری کی رائیں اور تبصرے لائقِ مطالعہ ہیں، علاوہ ازیں ایک رنگین اور دو سادہ تصاویر مثنوی کے بعض مناظر کا نقشہ پیش کر رہی ہیں۔

زہرِ عشق کے جذب و اثر سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا، خواص سے زیادہ عوام اس کے مداح ہیں، اور یہ وہ خوبی ہے جو اُردو کی دوسری مثنویوں میں نہیں پائی جاتی حضرت مجنوں کا یہ کہنا سچ ہے کہ شوق اگر یورپ میں پیدا ہوا ہوتا تو اس کی یہ مثنوی بہت مقبول ہوتی کیونکہ یورپ آرٹ یا بالفاظ دیگر عریانی کا دلدادہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ آرٹ کی حسن و خوبی سے ہر اہلِ نظر متاثر ہوتا ہے۔

اس مثنوی میں یہ حسن و خوبی بحدِ کمال موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ بھی دلآویز انداز میں پیشِ نظر ہے۔ بایں ہمہ چونکہ یہ مثنوی جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے اس لئے نوجوانوں کے لئے اس کا مطالعہ پہلے کی طرح اب بھی کچھ بہت زیادہ مفید نہیں ہے۔

بہرکیف جو حضرات کتابوں کے عمدہ ایڈیشن اپنے پاس رکھنا چاہتے ہوں ان کو یہ نسخہ ضرور منگانا چاہیئے۔

بحرِ تبسم

از حضرت شوکت تھانوی۔ سائز $\frac{20 \times 26}{16}$ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ: نسیم بک ڈپو، لٹلیر آباد، لکھنؤ

حضرت شوکت تھانوی کا نام ادبی دنیا میں کافی مشہور ہے، اور ان کے ظریفانہ مضامین اکثر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ چند ماہ قبل ان کے چند مضامین کا ایک مجموعہ "موجِ تبسم" کے نام سے شائع ہو کر مقبولِ عام ہو چکا ہے۔ یہ دوسرا مجموعہ ہے اور اس میں اٹھارہ ظریفانہ مضامین ہیں بعض مضامین مطبوعہ ہیں اور بعض غیر مطبوعہ۔ جن حضرات نے "موجِ تبسم" کا مطالعہ کیا ہے وہ تو شوکت صاحب کے دلچسپ اندازِ تحریر سے یقیناً واقف ہونگے مگر جن لوگوں کو اس کا اتفاق نہیں ہوا ہے اُن کی واقفیت کے واسطے صرف اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ جب کام کرتے کرتے دماغ تھک جائے تو "بحرِ تبسم" پڑھیئے۔ امید ہے کہ تکان دُور ہو جائیگی۔

شروع میں حضرت نیاز فتحپوری کا لکھا ہوا ایک مختصر مقدمہ ہے اور مصنف کی تصویر بھی شامل کتاب ہے۔

قلم

(از خان بہادر سید الشعرا سید علی محمد شاد عظیم آبادی مرحوم)

اے قلم طرۂ دستار فصاحت تو ہے شانۂ کاکلِ سلمائے بلاغت تو ہے
شمع ظلمت کدہ فہم و فراست تو ہے کاشفِ پردۂ اسرار شہادت تو ہے
چن کے دریائے حقیقت کے گہر لائے گا
جب ذرا غرق ہوا تہہ کی خبر لائے گا

باکمالوں کا شفیق، اہلِ ریاضت کا رفیق راز دارِ حکما، خازنِ اہلِ تحقیق
ہے تری نوکِ زباں شرحِ مضامینِ دقیق تیری رفتار متیں، چال تری نستعلیق
جس سے مطلب ہو اُسی بات کو چُن لیتا ہے
لب تک آتی نہیں آواز کہ سُن لیتا ہے

رباعی

جو منزلت انتساب ہو جاتے ہیں
اِک رخ سے مگر خراب ہو جاتے ہیں
انسان کے سینے میں ہنر کے ہمراہ
کچھ عیب بھی باریاب ہو جاتے ہیں (جوش)

افکار صفی

(از لسان الملک جناب صفی لکھنوی)

کیونکر یہاں تمہاری طبیعت بہل گئی — اتنی ہی زندگی ہمیں اے خضر کھل گئی
بیساختہ اک آہ جو منھ سے نکل گئی — اللہ رے انقلاب کہ دنیا بدل گئی
جب ایک روز جان کا جانا ضرور ہے — پھر فرق کیا وہ آج گئی خواہ کل گئی
ممنون ہوں جہاں کے نشیب و فراز کا — اکثر بگڑ کے خود مری حالت سنبھل گئی
جب دم نکل گیا، خلش غم بھی مٹ گئی — دل میں چبھی تھی پھانس جو دل سے نکل گئی
کیا اک لحد کا خرچ سرِ شام، اسی قدر — کچھ پھول رکھدیے گئے، اک شمع جل گئی

ذکر زبان آتش مرحوم کیا صفی
اک شمع تھی جو نور کے سانچے میں ڈھل گئی

رباعی

بہتر کوئی شے اس سے زمانے میں نہیں — مثل اس کا خدا کے کارخانے میں نہیں
کیونکر نہ ہو بے نیاز کو عجز پسند — یہ جنس نفیس اس کے خزانے میں نہیں

ولہ

طفلی بھی ہوئی آہ جوانی بھی تمام — پیری کا بھی ہونا ہے یہی کچھ انجام
مائل سوئے خاک ہے جو قد پُر خم — اب ڈھونڈھ رہا ہے اپنی راحت کا مقام

برسات کا ایک منظر

(از مسٹر شیام موہن لال جگر بریلوی بی۔ اے)

دن ڈھلا فطرت ہے جوشِ حسن پر آئی ہوئی / محوِ تزئیں یا ہوسِ شوخ رعنائی ہوئی
دل کشا رنگینیاں ہیں ہر طرف چھائی ہوئی / اور شفق بھی پھول کر کیا رنگ ہے لائی ہوئی
نقرئی بادل کے ٹکڑے لال پیلے ہو گئے
کچھ بسنتی کچھ پیازی کچھ سنہرے ہو گئے

مسکراتی کسمساتی ناز سے آتی ہوئی / ملتی ہیں رنگینیاں آپس میں اٹھلاتی ہوئی
چھیڑ خانی کرتی چلتی ہیں ہوا کھاتی ہوئی / دل کو پہلو سے لئے جاتی ہیں بہکاتی ہوئی
کیا سرور افزائے جاں ہے کیسی فرحت بیز ہے
دل کشائی دل نشینی سے فضا لبریز ہے

ہلکی ہلکی ٹھنڈی ٹھنڈی کیا ہوا ہے واہ وا / روح تازہ ہو گئی دل ہو گیا جس سے ہرا
جان میں جان آ گئی اور جی اٹھی ساری فضا / شمعِ ہستی کی تجھی سے روشنی ہے اے ہوا
کچھ نہ ہو باغِ جہاں میں اے ہوا گر تو نہ ہو
پھول پیڑوں میں نہ ہوں پھولوں میں رنگ و بو نہ ہو

جھیل کی لہریں جو آئیں موج میں گانے لگیں / ڈالیاں پیڑوں کی وہ جھومیں کہ بل کھانے لگیں
جسم سے لگ کر ہوائیں دل کو گرمانے لگیں / اور جگر میں آرزوئیں آگ بھڑکانے لگیں
وہ دمِ جاناں کی نکہت بیزیاں یاد آ گئیں
گیسوؤں کی وہ شمیم انگیزیاں یاد آ گئیں

ہلکی ہلکی پھوئیوں پھوئیوں گر چکی ہے اک پھوار / ہو چکا ہے پتے پتے بوٹے بوٹے کا نکھار
ڈوبتے سورج کی کرنوں نے کھلائی ہے بہار / سبزۂ نورستہ رنگیں ہوا ہے زرنگار
اک چمن زارِ نگاریں دامنِ نظارہ ہے
حسنِ جاں پرور کی آغوشِ فضا گہوارہ ہے

حسنِ فطرت ہے کہ یہ محبوبۂ جوشِ بہار / خوشنما ہے جس کی سج دھج دل کشا جس کا سنگار

سرو قد محوِ خرامِ ناز ہے مستانہ وار — ہر قدم پہ جان صدقے ہر ادا پہ دل نثار
اک ردا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
"اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی"

جنگلوں میں رہ کے دن بھر ڈھور ڈنگر چل دیئے — گھاس کا آخر تنکا کھا کے سب گھر چل دیئے
تال کا پانی پیا بشاش ہو کر چل دیئے — آئے تھے جس راستے سے پھر اُسی پر چل دیئے
خوشی خوشی شام کا بارِ گراں سر پہ لئے
آگے پیچھے جا رہے ہیں گردنیں نیچی کئے

دھیمی دھیمی بج رہی ہیں ہر قدم پر گھنٹیاں — بن گئی ہے جن کی دُھن روحِ فضائے آسماں
ایک جانب بہہ رہا ہے چشمۂ آبِ رواں — درسِ حیرت دے رہی ہیں جس کی نغمہ سنجیاں
ذرے ذرے میں نظر آتی ہے کیفیت بھری
ہے زمیں سے آسماں تک بادۂ وحدت بھری

آسماں پر اک طرف کیسی لگی ہے آگ سی — ساحلِ گنگا پہ یہ کس کی چتا روشن ہوئی
جاں نثاری اور طہارت سے بھری ہے روشنی — اے عروسِ حسنِ فطرت تو ہوئی کس پہ ستی؟
شب ہوئی جاں تاوانِ مہر اور لُٹ گیا
زندگی کا تیری ساماں تیرا زیور لُٹ گیا

اے ازل کے حسن کی مشاطہ و آئینہ دار — اُف ترا جوشِ نشاطِ مرگ اے شیدائے زار
تھیں تری رنگینیاں شوقِ شہادت کی بہار — تو ستی ہونے کو آئی تھی کئے سولہ سنگار
غم سے تیرے جوشِ جانبازی کی کلیاں کھل گئیں
اور تمنائیں تری رنگینیوں میں رل گئیں

آہ اے جانبازِ صادق مایۂ صد نازِ شوق — تیرے سوزِ غم نے دکھلایا ہے کیا اعجازِ شوق
مشعلِ راہِ محبت ہے ترا اندازِ شوق — سارے عالم کی ہے تو عقدہ کشائے رازِ شوق
زندگی کا لطف کچھ غم کی پرستاری میں ہے
اور اگر جنت ہے تو مرگِ وفاداری میں ہے

وہ نگارِ آتشیں رُخ شاہ خوبی اب کہاں — اور ہی نقشہ جمائے گا یہاں اب آسماں
ہر طرف آثارِ تعظیم و مسرت ہیں عیاں — کس کی آمد کی ہے سُن گُن چپ ہے جو سارا جہاں

کس کا ہوگا خیر مقدم کس کا ہے یہ انتظار
شانِ قدرت کی پری بیٹھی ہے جو کرکے سنگار

ساز رکھے ہیں کئی نغمہ کہیں پیدا نہیں — بھر رہے ہیں تار راگوں سے مگر چھیڑا نہیں
نغمہ ہائے جاں فزا شاید ابھی پیدا نہیں — آشنائے لحنِ داؤدی لبِ گویا نہیں

ہر رگ و پے میں دکھائی دے رہی ہے رس بھری
بن کے فطرت آئی ہے اس دم مجسّم راگنی

دیکھئے وہ ملکۂ جادو نظر آئیں لتا — (جن کے شوقِ دید میں عالم عجب نظارت کا تھا
اپنی لب پر خامشی اور دل میں اک محشر بپا — سر کھلے اور رنگِ شفق پر ہوئی جلوہ نما

روئے سیمیں دیکھتے ہی گونج اٹھے کوہ و دکاں
بن گیا بزمِ سرود و رقص کیف آگیں سماں

مستِ عشرت ہو کے بول اٹھا مجیرا اک طرف — مینڈکوں نے دفعتہً ڈھول بجایا اک طرف
جھینگروں نے چیخ پر چھیڑا ہے بینا اک طرف — محوِ حیرت ہو کے بول اٹھا پپیہا اک طرف

بج رہے ہیں ساز کتنے ہی مگر لے ایک ہے
اس کے متوالوں کا نشہ ایک ہے مے ایک ہے

سر پہ کرنوں نے بٹھایا لا کے اک سونے کا تاج — ذرے ذرے نے دیا تحسین و مدحت کا خراج
اک سکونِ بے نیازی سے بھرا ہے سارا راج — مٹ گیا ہے صفحۂ ہستی سے حرفِ احتیاج

دستِ سیمیں خسروانہ زرفشاں ہے ہر طرف
ہر طرف دریائے آبِ زر رواں ہے ہر طرف

دو قدم آئی رخِ سیمیں سنہرا ہو گیا — حسن بالا پر حرارت سے دوبالا ہو گیا
ابر بڑھ کر آگیا ہلکا سا پردہ ہو گیا — حسن کا شعلہ وہ چھپ کر ہالا ہو گیا

نیلگوں بادل کے پردے میں ایاغِ نور ہے
یا کسی خوش رو کے دامن میں چراغِ نور ہے

کرنیں چھن چھن کر گریں اور نور برسانے لگیں — حسن کی نیرنگیاں آنکھوں میں سما جانے لگیں
دل کے ذروں کو جگا کر رقص میں لانے لگیں — انبساطِ روح سے کیفیتیں آنے لگیں
حسنِ رنگیں میں جگر کا شوق ملجانے لگا — اور سرورِ جاں بڑھا ایسا کہ خواب آنے لگا

خمسۂ غزل حضرت داغ مرحوم

(از حضرت احسن مارہروی)

اُس کی ہر بات میں یکرنگی و یکتائی ہے
انتہا یہ کہ بُرائی میں بھی اچھائی ہے
جانتے ہیں ہم اُسے، ہم سے شناسائی ہے
داغ ہر چند جہاں گرد ہے سودائی ہے
آپ کے سر کی قسم آپ کا شیدائی ہے

کبھی مسجد میں دعا کی، کبھی کی خدمتِ دیر
مگر افسوس کہیں کچھ نہ ہوا حاصلِ سیر
ہو گیا خوبیِ تقدیر سے شر باعثِ خیر
صورتِ وصل نہ تھی کوئی بجز رنجشِ غیر
وہ جو بگڑے ہوئے آئے ہیں تو بن آئی ہے

عمر بھر یاد رہے گا یہ مآلِ بیداد
خوب پائی ستم ایجاد نے بیداد کی داد
حسرتِ دید کی اب ختم نہ کیوں ہو روداد
اور کیا خاک ملے گی دلِ بسمل کی مراد
جو تماشا ہے جہاں کا وہ تماشائی ہے

اُن سے کی جائے جو اُمیدِ شفا بیجا ہے
کہ طبیبوں کی دواؤں میں دھرا ہی کیا ہے
اپنی مرضی کے موافق یہ علاج اچھا ہے
جب کبھی بیٹھے بٹھائے خفقان اُچھلا ہے
ہم نے جا کر اُسی کوچے کی ہوا کھائی ہے

جانتے ہیں کہ نہیں راحتِ جاں زحمتِ عشق
پھر بھی دل سے نہیں ہوتی ہے جدا حسرتِ عشق
کیا بتائے کوئی اصلیت و ماہیتِ عشق
نہیں معلوم کہ ہیں کون بلا حضرتِ عشق
یوں تو اپنی بھی زمانے سے شناسائی ہے

نہ سہی عہدِ جوانی کے جو دن رات نہیں
احسن انسان ہے، فرشتہ نہیں جنات نہیں
ذکرِ ماضی ہو اگر کچھ تو بُری بات نہیں
داغ گو اب کسی گلرو سے ملاقات نہیں
ہم نے برسوں اسی گلشن کی ہوا کھائی ہے

لطفِ سخن

(از جناب اختر جونا گڈھی)

آئینہ میں وہ اپنی حیا دیکھ رہے ہیں
یہ حسنِ ادا ہے کہ ادا دیکھ رہے ہیں

دل نذرِ وفا ہو کے بھی بربادِ جفا ہے
کیا کیا ستم اربابِ وفا دیکھ رہے ہیں

وعدہ سے ہوئی دل کی تڑپ اور زیادہ
ارمانوں کا اک حشر بپا دیکھ رہے ہیں

معلوم تھا عشاق کا انجامِ محبت
ہم آج یہ کانوں کا سنا دیکھ رہے ہیں

دردِ غمِ الفت سے بقا ہے مرے دل کو
وہ دل کو مرے محوِ فنا دیکھ رہے ہیں

بے مہریِ الفت کا اثر ہے کہ شب و روز
اختر کو جو ہم تلخ نوا دیکھ رہے ہیں

(جناب منور لکھنوی)

کام کی شے ہے نہ کعبہ کی نہ بتخانے کی خاک
عشق کے مذہب میں ہے سجوہ ویرانے کی خاک

اب نہ آبادی کی مٹی ہے نہ ویرانے کی خاک
اور ہی کچھ ہو گئی ہے تیرے دیوانے کی خاک

اس میں کعبہ کی نہ مٹی ہے نہ بتخانے کی خاک
قدر کیا دیندار جانیں میرے کاشانے کی خاک

کون کہتا ہے اسے رونا یہ رونا ہی نہیں
آنسوؤں سے شمع کے بھیگی نہ پروانے کی خاک

اور بربادی سے بڑھ جائے گی اسکی آب و تاب
آتشِ سیال بن جائے گی پیمانے کی خاک

اس میں سوزِ حسن بھی ہے اور گدازِ عشق بھی
جوہروں کا ایک مجموعہ ہے پروانے کی خاک

گرد سے اس کی بچاتے کیا ہیں دامن اہلِ زہد
اڑ کے مسجد میں بھی جا پہونچے گی میخانے کی خاک

رندِ مشرب ہم ہیں ساقی سے عقیدت ہے ہمیں
اپنی آنکھوں سے لگا لیتے ہیں میخانے کی خاک

دیدنی ہے اے منور شانِ مرگِ بے خودی
اڑ کے ہفت افلاک پر پہنچی ہے دیوانے کی خاک

(جناب بسمل الہ آبادی)

دیکھ سنبھل سنبھل کے چل رہ گذرِ حیات میں
چوک نہ جائے تو کہیں موت ہے تیری گھات میں

لطفِ نشاط و عیش کیا آئے ہمیں حیات میں
روح ہماری قید ہے کشمکشِ نجات میں

کہہ دو قضا سے آئے اب کچھ نہیں کائنات میں
بیٹھ گیا ہوں تھک کے میں رہ گذرِ حیات میں

یہ بھی کرم ہے کیا کرم، یہ بھی ستم ہے کیا ستم
کر گئے مجھ پہ وہ جفا پردۂ التفات میں

خاک اڑانے سے ہوا مجھ کو وفا کا تجربہ دل کی ہے قدر ہر جگہ حسن کی کائنات میں
بسمل خنجر ادا آج تڑپ کے مر گیا موت لگی ہوئی تھی کیا پہلے سے اپنی گھات میں

(از جناب بیمنی سرشار خیرپور سادات)

یہ دلداریاں بھی دل آزاریاں ہیں محبت کے پردے میں عیاریاں ہیں
وہ عشق میں لاکھ دشواریاں ہیں وفاؤں کے بدلے جفاکاریاں ہیں
جفائیں وفائیں نظر آ رہی ہیں محبت کی کیسی فسوں کاریاں ہیں

مری سرد آہ دل پہ ہنستا ہے ظالم! چھپی ان میں جانسوز چنگاریاں ہیں
جنہیں آپ بے ہوشیاں کہہ رہے ہیں حقیقت میں وہ عین ہشیاریاں ہیں
نتیجہ ہے یہ میری خاموشیوں کا جفاؤں کی پھر گرم بازاریاں ہیں
نہیں بے ضرورت یہ محشر خرامی کسی کے مٹانے کی تیاریاں ہیں
تمہارے بدلنے سے ہم کیوں بدلتے ابھی تک وہی نازبرداریاں ہیں
کہاں اب وہ سرشار اگلے زمانے وفاداریاں اب ریاکاریاں ہیں

(از مولوی محمد طاہر فاروقی طاہر)

کبھی جام وحدت سے سرشار ہیں ہم کبھی ساز کثرت سے ہشیار ہیں ہم
نہیں عاشقوں کو غم لن ترانی صدائے انا الحق سے سرشار ہیں ہم
نہ رکھا کہیں منہ دکھانے کے قابل بس اے زندگی تجھ سے بیزار ہیں ہم
دوئی کو مٹایا، خودی کو بھلایا اب الحمدللہ سبکسار ہیں ہم
نہ کانٹوں کا کھٹکا نہ ڈر باغباں کا صبا کی طرح نرم رفتار ہیں ہم
سمائیں کہاں اپنے جلوے خودی میں فضائے جہاں پر ضیا بار ہیں ہم
زہے عجز کوشی، زہے عفو کیشی گرانبار تھے ہم سبکسار ہیں ہم
سبک روح کر دے، سبک روبنا دے کہ تر دامنی سے گراں بار ہیں ہم
جنون محبت سے فرصت کسے ہے نہ بیہوش ہیں ہم نہ ہشیار ہیں ہم
کبھی تو سر عجز خم کر لیں طاہر
بڑھاپے میں جھکنے پہ ناچار ہیں ہم

علمی خبریں اور نوٹ

خمخانۂ جاوید اُردو زبان کے شعرا کا سب سے بسیط اور جامع تذکرہ ہے مگر اس کی صرف اول چار جلدیں اس کے نامور مصنف کی زندگی میں شائع ہو سکیں، ابھی چار جلدیں اور شائع ہونے کو باقی ہیں یہ عظیم الشان ادبی خدمت ناتمام ہی رہ جاتی مگر شائقین اُردو کی خوش قسمتی سے لالہ سری رام صاحب مرحوم مؤلف تذکرہ نے اپنے انتقال سے قبل اس کی تکمیل کا انتظام کر دیا تھا اور پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی بی۔ اے کو یہ اہم خدمت سپرد کر دی تھی۔ آپ سے بڑھکر اس خدمت کا کوئی اہل بھی نہ تھا آپ اس کی خاطر کشمیر کی ایک ماتحت ریاست کی وزارت سے کنارہ کش ہو کر کئی ماہ سے دفتر خمخانۂ جاوید میں تشریف لے آئے ہیں، چنانچہ آپ کی کوشش سے اس تذکرہ کی پانچویں جلد مکمل ہو کر صاف ہو رہی ہے اور امید ہے کہ اس سال کے خاتمے سے پہلے ہی شائع ہو جائیگی۔

ہز ایگزالٹیڈ ہائی نس نظام دکن کی مذہبی عقیدت اور ادبی قدر دانی کا تمام ملک میں بجا طور پر شہرہ ہے حال میں اعلیٰحضرت نے قرآن شریف کے گورمکھی ترجمے کے لئے پانچ ہزار روپیہ سکہ عثمانیہ کا عطیہ دیا ہے۔

زمانہ کے کسی گزشتہ نمبر میں کشمیری پنڈت شعرا کے ایک مبسوط تذکرہ کی تدوین و طبع کا ذکر کیا جا چکا ہے، اس تذکرہ کا نام "بہار گلشن کشمیر" ہے۔ اور حال ہی میں اس کی پہلی جلد شائع ہو گئی ہے۔ اس جلد میں ایک سو پچاسی (۱۸۵) شعرائے ماضی و حال کے سوانحی حالات و انتخاب کلام درج ہے جو سات سو ساٹھ (۷۶۰) صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ لکھائی چھپائی نہایت صاف اور کاغذ اعلیٰ درجہ کا ہے، ہر صفحہ پر سرخ جدول ہے اور کتاب مجلد ہے اور پچاس سے زیادہ شعرا کی تصاویر سے مزین بھی ہے۔ غرض ظاہری صورت دیدہ زیب ہے باطنی خوبیوں کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ یہ اُس قوم کے اہل سخن کے حالات و کلام پر مشتمل ہے جو اپنی علمی سرگرمیوں میں ہمیشہ ممتاز رہی ہے۔ ہندوؤں میں فارسی زبان کی تحصیل اور اس میں داد سخن سنجی دینے میں کایستھوں کے علاوہ جس قوم نے ناموری حاصل کی وہ کشمیری پنڈت ہیں

موجودہ زمانہ میں بھی اس کے افراد اپنی علم دوستی میں شہرۂ آفاق ہیں۔ چنانچہ اس تذکرہ میں بشتر ایسے شعرا کے حالات ہیں جو فارسی میں شعر کہتے تھے باقی اُردو زبان میں شعر کہنے والے ہیں۔

پنڈت برج کشن کول بیخبر و پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق مبارکباد کے مستحق ہیں کہ برسوں کی محنت و جستجو کے بعد اُنھوں نے اتنے شعرا کے حالات و کلام بہم پہنچا کر یہ مبسوط تذکرہ مرتب کیا جو ان کی علم دوستی و قوم پرستی کا بہترین ثبوت ہے۔ ناظرین زمانہ کو اس تذکرہ میں بہت سے ایسے شعرائے نامدار کا بھی ذکر ملیگا جن کے کمال شاعری سے وہ اس رسالہ کے صفحات میں بخوبی محظوظ ہو چکے ہیں۔ ہم کو امید ہے کہ یہ تذکرہ نہ صرف کشمیری صاحبان ہی کے لئے باعث دلچسپی ہوگا بلکہ عام قدردانان اُردو بھی اس سے مستفید ہوسکیں گے۔ شائقین انڈین پریس الہ آباد یا جناب شوق الہ آباد سے طلب فرمائیں۔

جواسیر العجائب کے نام سے کلکتہ مدرسہ کی طرف سے ایک قدیم قلمی کتاب کا ترجمہ شائع ہوا ہے جس میں سخنور عورتوں کے حالات ہیں۔ اس تذکرہ یا تاریخ کے مؤلف علامہ فخری بن امیرالاہرادی ہیں جو اکبر اعظم کے عہد سلطنت میں گزرے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب اکبر اعظم کی تخت نشینی کے موقعہ پر ارکانِ سلطنت و رعایا کی جانب سے مختلف قسم کے تحائف اور نذرانے پیش کئے گئے تھے تو علامہ فخری نے یہ کتاب شہنشاہ ہند کے نذر کی تھی۔ اس میں تیئیس ۲۳ مسلم خواتین کا ذکر ہے جو اعلیٰ درجہ کی سخنور گزری ہیں۔

اصل کتاب مولانا محمد متوطن منگل کوٹ ضلع بردوان کے قبضہ میں تھی، مولانا موصوف عربی و فارسی کے مشہور عالم تھے اور قلمی کتابوں کا ایک نایاب ذخیرہ ان کے پاس تھا۔ پچیس سال کے قریب ہوئے کہ وہ لاولد فوت ہوئے اور اُن کے بعد یہ ذخیرہ آپ کے عزیز مولوی اظہارالحق کو ملا جنھوں نے اب اس کو مدرسہ کلکتہ کو عطا فرما دیا ہے۔

مشہور و معروف ماہر آثار قدیمہ سرارے اسٹائن نے گلگت چھاؤنی (کشمیر) کے گردو نواح میں ایک غار سے ایک لکڑی کا صندوق برآمد کیا ہے جس میں بھوج پتر پر زبان سنسکرت میں پوتھیوں کے نمونہ کے قلمی نسخے رکھے ہوئے ملے ہیں جن میں اکثر تو برہمی طرز تحریر کے مطابق لکھے ہوئے ہیں اور بودھوں کی ان قلمی تحریروں کے مشابہ ہیں جو چینی ترکستان کے کھنڈروں سے برآمد ہو چکے ہیں، ان میں بعض نسخے ایسے بھی ہیں جو برہمی طرز تحریر میں لکھے ہیں جو زمانہ قدیم میں کشمیر اور ہندوستان کے شمالی

مغربی کوہستانی علاقہ میں رائج تھا۔ ماہرین آثار قدیمہ کی رائے ہے کہ ان میں بعض نسخے کم از کم چھٹی صدی عیسوی کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور ایک پوتھی برہمی زبان میں کاغذ پر لکھی ہوئی ایسی بھی ملی ہے جس کی نسبت خیال ہے کہ وہ مشرقی ترکستان میں لکھی گئی تھی۔ ابھی تک اس بڑے غار اور اس کے قریب کے تین اور چھوٹے چھوٹے غاروں کو پورے طور پر دیکھا نہیں جا سکا ہے۔ جس کے لئے دربار کشمیر کی اجازت خاص کی ضرورت تھی مگر ان غاروں سے اور بھی بہت سی تاریخی دلچسپی کی چیزیں برآمد ہونے کی اُمید ہے۔

ایک مدت سے حیدرآباد دکن میں اعلیحضرت نظام دکن کی سرپرستی میں اُردو زبان کا نستعلیق ٹائپ ایجاد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس میں ایک حد تک کامیابی بھی ہو چکی ہے۔ چنانچہ گورنمنٹ پریس حیدرآباد میں ٹائپ تیار ہو گیا ہے اور بعض سرکاری کاغذات اس ٹائپ میں طبع بھی ہونے لگے ہیں۔ اب ہمعصر رہبر دکن سے یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی ہے کہ ایک صاحب مسٹر حشمت اللہ صاحب قریشی بی۔ اے نے ایک نیا نستعلیق ٹائپ ایجاد کیا ہے جو نہایت خوبصورت ہے۔ موجد کا دعویٰ ہے کہ یہ ٹائپ نستعلیق کے مروجہ طریقہ کے مطابق استادانِ خوشنویسی کے اصول کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ اس ٹائپ کے صرف تین سو جوڑ طباعت کی روزمرہ ضروریات کے لئے کافی ہیں اور اس کا سائز بالکل تحریر کے مطابق ہے اور ہاتھ کا لکھا ہوا ایک صفحہ کا مضمون ٹائپ میں بھی ایک ہی صفحہ میں آ جائیگا۔ اگر ٹائپ مذکور واقعی موجد کے دعوے کے بموجب ہے تو اُردو زبان کی ایک بہت بڑی ضرورت رفع ہو جائیگی۔ موجودہ نستعلیق اور نسخ ٹائپ میں خوبصورتی کی کمی کے علاوہ سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ اس سے کتاب کی ضخامت دوچند ہو جاتی ہے۔ کیونکہ عموماً ایک صفحہ کا مضمون دو صفحوں میں آتا ہے جس کی وجہ سے کتاب کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور عام شائقین اس کو خریدنے سے مجبور رہتے ہیں۔ اگر یہ نقص دُور ہو گیا تو پھر کاتبوں کی ضرورت باقی نہ رہیگی اور رسائل و کتب آسانی کے ساتھ شائع ہو سکیں گے۔

تصحیح زمانہ بابتہ جون ۱۹۱۳ء صفحہ ۳۹۹ پر جناب اقبال ورما سحر ہتگامی کی جو نظم شائع ہوئی ہے اس کے چوتھے بند کا چوتھا مصرعہ بجائے ع

لطف نظم و نثر اور لطفِ زباں رخصت ہوا

یوں پڑھنا چاہیئے ع لطفِ فن رخصت ہوا لطفِ زباں رخصت ہوا

مباحثہ

"تماہی"

ہندستانی اکیڈیمی الہ آباد کے "تماہی" رسالہ "ہندستانی" کے متعلق قدامت پرست طبقے میں اچھا خاصہ مباحثہ ہوگیا ہے۔ اور جیساکہ ناظرین واقف ہیں بعض معترضین نے غیر ضروری جوش سے کام لیکر خود اکیڈیمی پر جا بجا نکتہ چینی کی ہے۔ زمانہ میں تصویر کے دونوں رخ دکھائے جاچکے ہیں اور اصولی حیثیت سے بھی ان صفحات میں بحث کی جاچکی ہے۔ حال میں ہمعصر "ہندستانی" میں بھی اس بحث پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے اور ہمعصر "ایوان" گورکھپور نے بھی اس پر ایک قابل قدر نوٹ لکھا ہے۔ ہم ان دونوں تحریروں کو ناظرین کی دلچسپی کے لئے درج ذیل کرتے ہیں:۔

"ہندستانی" بابت جولائی ۱۹۳۱ء میں ایڈیٹر صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"تماہی" پر اصولی اعتراض یہ ہے کہ ہندی اور فارسی لفظ کو ملا کر اس قسم کا تصرف ناجائز یا نامرغوب ہے، لیکن لغوی حیثیت سے ان لفظوں کے بارے میں کیا ارشاد ہوگا؟

(۱) تپائی

(۲) ترابا، تراہی،

(میر) صدقے اترتے سراسی چوراہے پر تمام — کیوں ایک راہ تیری تراہی میں رہ گئی

(۳) تسالا (تین برس کا)

(۴) چوراہا (جہاں ہر چہار طرف کو راستہ جاتا ہو)

(بحر) گراہے کوئی پتلا اس بت کا فر کے صدقہ کا — کہ چوراہے کو اکثر پوجتے ہندو نکلتے ہیں

(۵) چوگلا۔ گل چار برگ۔ چار پنکھڑی کا پھول۔

(بحر) بہار عالم امکاں نہایت بے حقیقت ہے — عناصر کو سمجھ اک چوگلا ہے باغ فانی کا

(۶) چوگوشیا

(۷) چومنزلا۔ چار منزل کا مکان

(۸) سہ رخا۔ سہ پہل

کیا مذکورہ لفظوں کی ساخت وصورت بالکل "تماہی" کی نہیں ہے؟

چھماہی کے لئے بعض صاحبوں کو اصرار ہے کہ صرف "فردے کی چھماہی ہوتی ہے"، سند میں غالب

کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے:-

رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

لیکن اس شعر میں یہ ممانعت کہاں ہے کہ چھ ماہی کو اس کے اصلی معنوں میں نہ استعمال کیا جائے؟ غالب ہی کا شعر اس کے بعد کا ملاحظہ فرمائیے:-

مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقید حیات اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

یہاں چھ ماہی ذو معنی ہے، ایک مردے کی چھ ماہی دوسری چھٹے مہینے تنخواہ دیئے جانے کی رسم۔

اس لئے یہ کہنا کہ چھ ماہی صرف مردے کی چھ ماہی کو کہتے ہیں، ہمارے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا صاحب فرہنگ آصفیہ نے بھی ششماہی کے معنی چھ ماہی اور نصف سال کے دیئے ہیں اور مردے کی چھ ماہی کا خفیف سا بھی اشارہ نہیں کرتے۔

بہرصورت ہندی اور فارسی لفظوں کو ملا کر ان پر تصرف کرنے کا جہاں تک اصولی تعلق تھا اس کی مثالیں دیدی گئیں، لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس پر قیاس کر کے کوئی نیا لفظ نہیں ڈھالا جا سکتا لیکن یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ "تماہی" کوئی نیا لفظ نہیں ہے اور نہ اس زمانے کے لوگوں کے مخترعات میں ہے۔

صاحب فرہنگ آصفیہ سہ بندی کے معنوں میں سہ ماہہ اور تماہہ دیتے ہیں (جس سے مراد ہے) وہ قسط جو تیسرے مہینے ادا کی جائے۔

لغوی حیثیت سے جہاں تک "تماہی" کے جواز و عدم جواز کی بحث تھی ختم ہو گئی مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لغوی حیثیت سے کسی لفظ کے صحیح و جائز ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ انشا و ادب میں بھی اسے ضرور جگہ دی جائے "تماہی" اصولی حیثیت سے صحیح ہو لیکن سہ ماہی کے ہوتے ہوئے اس کا استعمال ایک غیر ضروری اجتہاد تھا۔

لیکن صورت یہ پیش آئی کہ ہندستانی اکیڈیمی کے اردو اور ہندی کے رسالوں کے لئے ایک ایسے نام کی تلاش ہوئی جو دونوں کے لئے یکساں کام دے سکے اور جس طرح ہندستانی اکیڈیمی کا اطلاق اردو اور ہندی دونوں شعبوں پر یکساں طور پر ہوتا ہے اسی طرح خیال ہوا کہ رسالوں کا نام بھی ایسا ہونا چاہیئے جس سے لفظی تفریق میں کمی ہو اور ہندی اور اردو میں جو خلیج حائل ہے بڑھنے نہ پائے۔ اس خیال کے زیر اثر اردو اور ہندی اڈیٹوریل بورڈوں نے تماہی کے لفظ کو رسالہ کے سرورق کے لئے قبول کر لیا ان تمام حالات کے بعد ہم نہیں سمجھتے کہ "تماہی" کے متعلق کسی منصف مزاج شخص کو اعتراض کی گنجائش باقی رہ سکے۔ (ہندستانی بابتہ جولائی ۱۹۳۶ء)

رسالہ "ایوان" گورکھپور جولائی ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں رقمطراز ہے:-

(رسالہ) ہندستانی نے کے لئے بجائے سہ ماہی کے "تماہی" کا لفظ ایجاد کیا گیا ہے، اور اُردو کے بعض رسالے اس کے خلاف بڑا شور مچا چکے ہیں .... سب سے زیادہ معقول اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ "تماہی" کا لفظ اصول قواعد کی رو سے بنایا نہیں جا سکتا، یعنی ہندی اور فارسی کو مرکب کر کے ہم اُردو میں کوئی لفظ نہیں بنا سکتے لیکن یہ کس زبان کا قاعدہ ہے؟ کم از کم اُردو زبان کا تو یہ قاعدہ نہیں ہو سکتا جو سرتاسر نہ جانے کتنی زبانوں سے مخلوط و مرکب ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی زبان کے قواعد بھی مخلوط ہو نگے اور کسی ایک زبان کے قواعد سے یقیناً مختلف ہوں گے ...... جب فارسی کے اساتذہ مکتب کی جمع بجائے مکاتب کے "مکتبہا" اور نفس کی جمع بجائے انفاس کے "نفسہا" بناتے ہیں، یا جب عربی لفظ "الم" میں فارسی لاحقہ "ناک" شامل کر کے "المناک" بنا لیتے ہیں تو کیوں نہیں اعتراض کیا جاتا؟ مختصر یہ کہ "تماہی" پر صرف اس لئے اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں سابقہ اور لاحقہ دونوں دو زبانوں سے ماخوذ ہیں اور خاصکر جب اس سے پہلے چھماہی کی سند موجود ہے۔

(ایوان - جولائی ۱۹۳۱ء)

ہندستانی

لفظ "ہندستانی" کے متعلق ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب نے ایک مضمون رسالۂ "ہندستانی" بابت جولائی ۱۹۳۱ء میں لکھا ہے اور عقلی و نقلی دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ "ہندستانی" بغیر واؤ کے صحیح ہے۔ ذیل میں اس کا مختصر اقتباس ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

"ہندستان یا ہندستانی" کے بلا واؤ لکھنے پر بعض صاحبوں کو اعتراض ہے، اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اُردو بولنے والے عام طور پر اس کا تلفظ محض پیش کے ساتھ کرتے ہیں اور فصحا کی زبان پر بھی ہندستان اور ہندستانی ہے گو کہ ہندوستان اور ہندوستانی بھی غلط نہیں، اس لئے ہندستان اور ہندستانی صحیح ہے اور ہندوستان اور ہندوستانی بھی۔

شاید کچھ لوگوں کو اس جواب سے اس وجہ سے تشفی نہ ہو کہ ان کے خیال کے مطابق فارسی میں ہندوستان ہی ممکن ہے۔ ہندیوں نے بیجا تصرف کر کے ہندستان بولنا شروع کر دیا ...... فارسی میں بہت سے لفظ ایسے ہیں کہ ان میں ا - و - یا - ی لکھتے بھی ہیں اور حذف بھی کر دیتے ہیں۔ کچھ لفظ ایسے ہیں کہ ان میں واؤ کے لکھنے کی ضرورت نہیں یا واؤ لکھنا ان لفظوں میں غلط ہے۔ مگر کاتب اکثر ان میں 'و' لکھ دیا کرتے ہیں

اس کی بہترین مثال "دوکان" ہے کہ اس میں واؤ لکھنا بھی غلط ہے اور بولنا بھی۔ اس غلطی کی تکرار کتابت میں اتنی ہوئی کہ بہت سے لوگ دُکان کو (جو صحیح ہے) عامیوں بلکہ جاہلوں کی زبان سمجھنے لگے اور دوکان کا لفظ (جو قطعاً غلط ہے) ان کی زبانوں پر بھی چل پڑا۔ شاعروں نے البتہ اپنے کلام میں دُکان کو راہ دی جیسے:- وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دُکان اپنی بڑھا گئے

متاخرین نے بھی دُکان کہا:-

دکاں بند کرکے رہا بیٹھ جو	تو وہی اُس نے بالکل ہی لُٹیا ڈبو

بعض لفظوں میں تلفظ کے لحاظ سے واؤ نہیں ہے۔ صرف پیش کے ظاہر کرنے کو واؤ لکھتے ہیں اور ایسے "واؤ بیان ضمہ" کہتے ہیں یا "واؤ مسروقہ" کہ لکھا جاتا ہے اور پڑھا نہیں جاتا جیسے خواجہ وغیرہ میں۔ کچھ لفظ ایسے ہیں جن کا تلفظ دونوں طرح صحیح ہے اور اس لئے ان کو کبھی واؤ کے ساتھ لکھتے ہیں اور کبھی بغیر واؤ کے جیسے اوستاد۔ استاد۔ اوشام۔ اشتام۔ اوفتاد۔ افتاد۔ اومید۔ امید۔ بوستان بستان۔ روستم۔ رستم۔ .... یہی حال ہندوستان کا ہوا۔ پہلے ہندستان ہوا۔ پھر ہندستان اسی طرح ہندوبار سے ہندبار۔ چنانچہ فارسی کے لغت نویسوں نے یوں لکھا ہے۔

(۱) فرہنگ جہانگیری (نولکشوری) جلد ۲ صفحہ ۶۱

ہندستان مخفف ہندوستان است۔ اوستاد فرخی فرماید۔

گر ز جود تو نسیمے بگذرد بر زنگبار	ور ز خشم تو سمومے بر وزد بر ہندساں
ہندواں را آتش سوزندہ آرید شاخ ریح	زنگیاں را شوشۂ زریں برآید خیزراں

(۲) بہار عجم (نولکشوری ۱۹۱۶ء) جلد ۲ صفحہ ۴۹۷

ہند۔ بالکسر و ہندوبار و ہندوزار و ہندوستان دیار معروف۔ ہندستاں آں و آنرا سواد اعظم نیز گویند و ہندستان اغلب کہ در اصل ہند استھان بود ...... کہ در ہندی اصلی بمعنی مکان و ماوا است و بریں قیاس عربستان و فرنگستان و مانند آں۔

(۳) برہان قاطع۔

ہندستان با سین بے نقطہ بروزن ہندوان مخفف ہندستانست و ہندستان مخفف ہندوستان فاضل مضمون نگار نے فارسی کی بکثرت مثالیں لکھی ہیں جن میں ہندستان نظم کیا گیا ہے۔ ان میں سے چند یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

(۱) دخترے خرد دارم دلبرے	بادہ خواہر بوم ہندستاں

(۲) خرام کرد میانِ دیارِ ہندستاں   گذشت رایت عالی نہ گنبد دوّار

(۳) برشگال اے بہار ہندستاں   اے نجات از بلائے تابستاں

(۴) گرسش باید بیک فتح آئی   زہندستاں فرد شوید سیاہی

(۵) درآمد قاصدے از راہ تعجیل   زہندستاں حکایت کرد تا نیل

المختصر ڈاکٹر صاحب نے سیر حاصل بحث کے بعد یہ ثابت کردیا ہے کہ ہندستانی صحیح ہے۔ جو صاحب مفصل بحث دیکھنا چاہیں وہ "ہندستانی" ملاحظہ فرمائیں۔

چندن (لاہور) سال حال کے جدید رسائل میں ہمارا معزز ہمعصر "چندن" خصوصیت سے قابل قدر ہے۔ اس میں علمی وادبی مضامین، دلچسپ نظمیں اور پُرلطف غزلیں اور اُردو۔ بنگالی۔ پنجابی وغیرہ زبانوں کے رسائل سے دلچسپ اقتباسات ہوتے ہیں۔ ہر ماہ دو تین تصویریں بھی ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہیں۔ لکھائی۔ چھپائی نہایت اعلیٰ - صاف و خوبصورت، حجم تقریباً اسّی صفحہ ماہوار ہوتا ہے۔ سرورق رنگین و مصوّر ہے۔ اس کے ایڈیٹر ہمارے قابل دوست مسٹر سدرشن ہیں جو اُردو کے نامور افسانہ نگار ہیں۔ شروع سال رواں سے انھوں نے "سدرشن پبلشنگ ہاؤس" کے نام سے ایک دارالاشاعت بھی قائم کیا ہے جس کی بدولت اُردو لٹریچر میں بیش قیمت اضافہ ہونے کی امید ہے۔ "چندن" جس تیز رفتاری سے ترقی کر رہا ہے اس کو مدنظر رکھکر ہمکو پوری امید ہے کہ وہ بہت جلد ملک کے ادبی رسائل میں ممتاز جگہ حاصل کریگا۔ چندن کا سالانہ چندہ پانچروپیہ ہے۔

ملنے کا پتہ: سدرشن پبلشنگ ہاؤس، ریلوے روڈ۔ لاہور۔

تصحیح زمانہ بابتہ جون ۱۹۳۱ء میں بعض رسائل پر تنقید کے سلسلہ میں مرزا یگانہ کا ایک شعر بھی زیر بحث آگیا تھا۔ اس کے متعلق مرزا صاحب ہمکو لکھتے ہیں کہ "نیرنگ خیال" کے کاتب نے "حباب" کو "حیات" لکھ دیا ہے۔ اصل شعر یوں ہے ؎

بیرہن میں کیا سما سکتا حباب جاں بلب
ہستیٔ موہوم کا خواب پریشاں دیکھ کر

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۱۱

زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم بی۔ اے

نمبر ۳	ستمبر ۱۹۳۱ء	جلد ۵۷

فہرست مضامین

تصاویر اعلیٰ حضرت نظام دکن اور لارڈ اردن۔ مرحوم مہاراجہ صاحب بنارس۔ مسٹر سی۔ پی۔ راما سوامی لا ممبر گورنمنٹ ہند۔ ہز ہائینس سر آغا خاں۔

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا



[illegible]



ہز ایکسلنسی لارڈ ارون سابق وائسرائے ہند اور اعلیحضرت نظام دکن

زمانہ

جلد ۵۷ — ستمبر ۱۹۳۱ء — نمبر ۳

سلاطین عماد شاہیہ

(از سید احمد اللہ قادری نائب ایڈیٹر "تاریخ" حیدرآباد)

سلطان علاء الدین خلجی (۶۹۵ھ ۱۲۹۵ء – ۷۱۵ھ ۱۳۱۵ء) کے حملہ دکن کے بعد جنوب میں مسلمانوں کی جو سب سے پہلی سلطنت قائم ہوئی تھی وہ گلبرگہ کا عظیم الشان بہمنی خاندان تھا۔ اس میں بڑے بڑے زبردست فرمانروا پیدا ہوئے۔ بہمنی خاندان تقریباً ڈیڑھ سو سال تک نہایت جاہ و جلال کے ساتھ برسر حکومت رہا۔ نویں صدی ہجری کے اخیر زمانے میں کچھ ایسے انقلابات پیش آئے کہ یہ خاندان ختم ہو گیا اور اس کی وسیع مملکت پانچ چھوٹی چھوٹی بادشاہیوں میں تقسیم ہو گئی۔

۱۔ احمد نگر میں	نظام شاہی سلطنت	سنہ ۸۹۱ھ / ۱۴۸۶ء	سنہ ۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۳ء
۲۔ بیجاپور میں	عادل شاہی سلطنت	سنہ ۸۹۵ھ / ۱۴۸۹ء	سنہ ۱۰۹۷ھ / ۱۶۸۶ء
۳۔ برار میں	عماد شاہی سلطنت	سنہ ۸۹۵ھ / ۱۴۹۰ء	سنہ ۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء
۴۔ بیدر میں	برید شاہی سلطنت	سنہ ۸۹۶ھ / ۱۴۹۰ء	سنہ ۱۰۱۸ھ / ۱۶۰۹ء
۵۔ گولکنڈہ میں	قطب شاہی سلطنت	سنہ ۹۲۴ھ / ۱۵۱۸ء	سنہ ۱۰۹۸ھ / ۱۶۸۷ء

ان حکومتوں کے بانی سلطنت بہمنیہ کے صوبہ دار تھے، جو اُن کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بادشاہ بن گئے اور کم و بیش دو صدی تک نہایت اطمینان کے ساتھ حکمرانی کرتے رہے۔ ان کے حدود بہت دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ شمال میں ان کی عملداری کوہ بندھیاچل پر ختم ہوتی تھی اور جنوبی حد دریائے کرشنا

کے نیچے بیلور تک وسیع تھی۔ ان سلاطین میں سب سے پہلے احمد نظام الملک نے ۸۹۱ھ میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ اس کے بعد ۸۹۵ھ میں بیجاپور اور برار نے آزادی حاصل کی۔

شاہان برار بیجانگر کے رہنے والے تھے۔ ان کے آباء و اجداد راجہ بیجانگر کی اولاد سے تھے۔ سلطان احمد شاہ بہمنی (۸۲۵ھ ۱۴۲۲ء - ۸۶۲ھ ۱۴۵۷ء) نے جب بیجانگر پر حملہ کیا تو اس خاندان سے ایک لڑکا مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہو گیا۔ بادشاہ نے اس کو مسلمان کر کے فتح اللہ نام رکھا۔ بعد میں خان جہاں حاکم برار کے تفویض کیا۔ فتح اللہ چونکہ بادشاہ کا پروردہ اور منظور نظر تھا اس لئے خان جہاں نے اس کی نہایت احتیاط کے ساتھ پرورش کی۔ جب یہ بڑا ہو گیا تو اپنا معتمد خاص بنا لیا۔ خان جہاں کے انتقال کے بعد یہ شاہی ملازمین کے زمرہ میں شامل ہو گیا اور بالکل قلیل عرصہ میں اس نے غیر معمولی ترقی حاصل کر لی۔ خواجہ محمود گاواں بھی اس پر خاص طور سے مہربان تھا۔ چنانچہ اس کی سفارش پر اسے عماد الملک کے خطاب سے سرفراز کیا، اور خان جہاں کی برار والی خدمت بھی دے دی، جس کے بعد پھر یہ برار واپس چلا گیا۔

فتح اللہ عماد الملک کے برار چلے جانے کے بعد خواجہ محمود گاواں کے قتل کا افسوسناک واقعہ پیش آیا خواجہ کے انتقال کے بعد سلطنت بہمنیہ تنزل پذیر ہو گئی۔ اس کے اکثر صوبہ دار خود سر اور باغی بن گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ احمد نگر اور برار خود مختار ہو گیا۔

فتح اللہ عماد الملک نے ۹۱۶ھ میں انتقال کیا۔ وفات کے بعد اس کا بیٹا علاء الدین عماد شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے برار کی بجائے گاویل[۱] کو اپنا مستقر حکومت قرار دیا۔ اور عماد شاہ کا لقب اختیار کر کے خطبہ و سکہ اپنے نام کا جاری کیا۔ اس کا زمانہ تاریخ میں باپ سے زیادہ روشن اور پرسکون گزرا ہے۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے احمد نگر پر یورش کی جس میں اسی کو نہایت بری طرح شکست ہوئی ۹۲۳ھ میں امیر برید والی بیدر نے قلعہ ماہور[۲] پر حملہ کیا اور خداوند خاں حبشی کو قتل کر کے قلعہ پر قابض ہو گیا۔ علاء الدین نے خداوند خاں کے لڑکوں کی حمایت میں امیر برید (۹۱۰ھ ۱۵۰۴ء - ۹۵۰ھ ۱۵۴۳ء) پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا مگر امیر برید کو جب اس کی خبر ہوئی تو بغیر لڑائی کے قلعہ خداوند خاں کے لڑکوں کو واپس کر دیا۔

---

[۱] یہ مقام بجواڑہ سے اور مدراس کے وسط میں ریلوے لائن پر واقع ہے۔ بہت قدیم تاریخی شہر ہے
[۲] برار کی ایک سرکار ہے جو پایان گھاٹ میں واقع تھا۔
[۳] یہ تاریخی مقام اور برار کی ایک سرکار ہے جو بالا گھاٹ میں تھا۔

علاء الدین عماد شاہ کی لڑائیوں میں پاتھری[۱] کا ۹۳۳ھ/۱۵۲۶ء کا معرکہ دکن کی تاریخ میں غیر معمولی شہرت رکھتا ہے۔ جس میں علاء الدین نے خاص امتیاز سے پاتھری کو برہان نظام شاہ (۹۱۴ھ–۹۶۱ھ/۱۵۰۸ء–۱۵۵۳ء) سے دوبارہ مفتوح کیا تھا۔ اس کے بعد نظام شاہ نے علاء الدین کو شکست دی، جس میں اُسے مجبوراً برہانپور بھاگنا پڑا۔ میران محمد شاہ (۹۲۶ھ–۹۴۲ھ/۱۵۲۰ء–۱۵۳۵ء) والی برہانپور سے اس کے نہایت مخلصانہ تعلقات تھے میران محمد شاہ نے علاء الدین کی خاطر بہ نفس نفیس برہان نظام شاہ کا مقابلہ کیا اور اس کو شکست دی۔ مگر خود اسی کی فوج کی غفلت کے باعث اُسے پسپائی ہوئی اور یہ برہانپور چلا گیا۔ اور عماد شاہ کاویل آگیا اس جنگ میں برہانپور اور برار کا بہت سا مال نظام شاہیوں نے تعاقب کرکے لوٹ لیا تھا، جس کی وجہ سے عماد شاہ اور میران محمد شاہ برہان نظام شاہ سے ناخوش ہوگئے تھے۔ میران محمد شاہ کے سلاطین گجرات سے بیحد تعلقات تھے اور گجرات کی قوت اس وقت بہت زبردست تھی۔ یہ سلاطین تیمور و اکبر کے ہم پلہ تصور کئے جاتے تھے۔ میران محمد شاہ نے اپنی شکست کا حال بہادر شاہ گجراتی (۹۳۲ھ–۹۴۳ھ/۱۵۲۵ء–۱۵۳۶ء) کو لکھ بھیجا اور اُس سے امداد طلب کی۔ اس پر بہادر شاہ گجراتی خود بڑودہ میں آکر ایک عرصہ تک مقیم رہا، عماد شاہ نے بہادر شاہ کو دکن آکر احمد نگر کو فتح کرنے کے لئے راضی کیا، اور اپنے بیٹے خضر خاں کو سلطان کے لانے کے واسطے بھیجا۔ آخر بہادر شاہ ایک جرار لشکر کے ساتھ دکن کی سرحد میں داخل ہوا۔ سب سے پہلے برار میں آیا، عماد شاہ نے برار کو نذرانے میں پیش کرکے شہر میں اُس کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور خود اُس کے امراء میں شریک ہوگیا۔ بہادر شاہ یہاں سے سیدھا احمد نگر کی تسخیر کے لئے روانہ ہوا، مگر سلطان نے بعض وجوہات کے باعث احمد نگر پر یورش نہیں کی، بلکہ دولت آباد کو فتح کرنے کے ارادہ سے اورنگ آباد چلا گیا۔ راستہ میں اس کی فوج کے دستہ کو امیر برید نے پسپا کیا اور اس کے سپہ سالار عالم خاں میواتی کو قتل کر ڈالا۔ اس غیر معمولی واقعہ کے باعث برہان نظام شاہ کو بڑی پریشانی ہوئی اور اُسے یہ خیال پیدا ہوا کہ بہادر شاہ اگر اس کا کچھ بھی اثر لے گا تو احمد نگر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ اس بنا پر اُس نے بہادر شاہ اور میران محمد شاہ فاروقی کے پاس صلح کا پیغام بھیجا اور مفتوحہ علاقے و مال غنیمت واپس کرنے کا وعدہ کیا۔ علاء الدین بھی ان لڑائیوں سے بہت خستہ حال ہوگیا تھا۔ اس لئے موقع کو غنیمت جان کر صلح منظور کر لی۔ محمد شاہ فاروقی نے بھی اتحاد قائم رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس پر علاء الدین اپنا تمام سامان ... قلعہ دولت آباد

۱؎ یہ علاقہ بھی بالاگھاٹ میں تھا، عماد شاہ کے اجداد یہیں کے باشندے تھے۔

میں بھیجکر خود برار واپس آگیا۔ میران محمد شاہ نے بہادر شاہ کو محاصرہ اٹھا کر گجرات چلے جانے کی رائے دی۔ اتفاق سے ان دنوں میں برسات کا موسم بھی آگیا تھا غرض کہ ان عذرات کے باعث بہادر شاہ اپنے دار السلطنت کو واپس چلا گیا۔

سنہ ۹۳۳ھ/۱۵۲۷ء میں اسمٰعیل عادل شاہ (۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء – ۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء) نے اپنی بہن خدیجہ سلطانہ علاءالدین عماد شاہ کو بیاہ دی۔ علاءالدین کا ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء میں انتقال ہوا۔

۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء میں اس کا بیٹا دریا عماد شاہ تخت پر متمکن ہوا، یہ اپنے باپ کا صحیح جانشین تھا اُس نے اپنی لیاقت اور فراست سے ایسے بڑے بڑے کام انجام دیئے تھے جو آج اصول حکومت کے لئے سرمایۂ ہدایت تصور کیئے جاتے ہیں۔ سنہ ۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء میں برہان نظام شاہ اول (۹۱۴ھ/۱۵۰۸ء – ۹۶۱ھ/۱۵۵۳ء) نے ابراہیم عادل شاہ اول (۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء – ۹۶۵ھ/۱۵۵۰ء) پر یورش کی جس میں بیجاپور کو سخت نقصان پہونچنے کا اندیشہ تھا۔ دریا عماد شاہ نے اُس وقت ابراہیم عادل شاہ کی بڑی مدد کی۔ اس کے ماسوا برہان نظام شاہ نے جب سنہ ۹۶۱ھ/۱۵۵۳ء میں انتقال کیا تو اس نے حسین نظام شاہ (۹۶۱ھ/۱۵۵۳ء – ۹۷۲ھ/۱۵۶۴ء) کو احمد نگر کے تخت پر بٹھانے کے لئے خاص اثر اور قوت سے کام لیا اور اپنی بیٹی دولت شاہ کا بھی اُس سے عقد کر دیا، جس کے باعث برار اور احمد نگر میں ایک رشتہ قائم ہو گیا۔

سنہ ۹۶۴ھ میں شہنشاہ اکبر (۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء – ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) نے باز بہادر بن شجاع خاں حاکم مالوہ کی سرکوبی کے لئے آدہم خاں کو روانہ کیا، آدہم خاں نے مالوہ آکر باز بہادر شاہ کو شکست دی اور ملک کو مغلیہ سلطنت میں شامل کر دیا اس کے بعد آدہم خاں کی خدمت پر اکبر نے پیر محمد کو مقرر کر دیا پیر محمد بڑا سخت گیر اور عجلت پسند آدمی تھا، اُس نے مالوہ آنے کے بعد باز بہادر کا جو ایک چھوٹے سے علاقے پر حکمران تھا استیصال کر دیا۔ یہ یہاں سے پریشان ہو کر میران محمد شاہ کے پاس برہانپور آیا میران محمد شاہ نے دریا عماد شاہ سے مدد مانگی اور اُسے خاص طور پر آنے کے لئے لکھا۔ لیکن دریا عماد شاہ بعض وجوہات کی بنا پر خود نہ جا سکا بلکہ اپنے سپہ سالار تفال خاں کو روانہ کیا۔ میران محمد شاہ تفال خاں اور باز بہادر تینوں ملکر مالوے پر حملہ آور ہوئے اور پیر محمد کو نہایت بری طرح شکست دی۔

تفال خاں کے واپس ہونے کے چند دن بعد سنہ ۹۶۴ھ/۱۵۵۶ء میں دریا عماد شاہ نے وفات پائی جس کے بعد اُس کا ہونہار فرزند برہان عماد شاہ (سنہ ۹۶۴ھ/۱۵۵۶ء میں) جانشین ہوا۔ لیکن یہ ابھی کم سن تھا، اس لئے تفال خاں سلطنت کا کام دیکھتا تھا جب یہ سن رشد کو پہنچا تو اس وقت بھی وزیر سلطنت کی عقل کل تھا۔ کچھ مدت کے بعد اس نے تفال خاں سے اپنی موروثی سلطنت طلب کی اسپر تفال خاں

نے اسے بقول فرشتہ نرنالہ میں قید کر دیا۔ اس وقت احمد نگر میں حسین نظام شاہ کا بیٹا مرتضیٰ نظام شاہ برسر حکومت تھا اس سے اور دریا عماد شاہ سے بڑی دوستی تھی جب اس کو برہان کے مقید ہونے کا حال معلوم ہوا تو بہت غمگین ہوا۔ اور تفال خاں کے پاس اپنا سفیر بھیج کر برہان عماد شاہ کو اس کا موروثی تخت حوالہ کرنے کی سفارش کی، تفال خاں نے مرتضیٰ (۹۷۲ھ ۱۵۶۵ء، ۹۹۶ھ ۱۵۸۷ء) کے کہنے پر کوئی التفات نہیں کیا۔ جس پر مرتضیٰ نظام شاہ نے ایلچ پور (برار) آکر تفال خاں کو محصور کر لیا، اور چنگیز خاں (وزیر مرتضیٰ نظام شاہ) نے سلطنت کو ایسا کمزور کر دیا کہ آئندہ مقابلہ کی مطلق طاقت نہ رہی ان کا بہت سامان و اسباب بھی لوٹ لیا۔ اور دو سو شتر، کئی جنگلی ہاتھی چھین لئے، تفال خاں مجبور ہوکر یہاں سے سیدھا گونڈوانہ کے جنگلوں میں فرار ہوگیا مگر چنگیز خاں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اس طرح تعاقب میں چھ مہینے گزر گئے۔ آخر پریشان ہوکر یہ برہانپور بھاگ گیا۔ مگر مرتضیٰ نظام شاہ نے محمد شاہ فاروقی (۹۷۴ھ ۱۵۶۶ء، ۹۸۴ھ ۱۵۷۶ء) کو پناہ نہ دینے کے لئے لکھا جس کے باعث تفال خاں قلعہ نرنالہ میں محصور ہوگیا۔ اس کا بیٹا شمشیر الملک کاویل کے قلعہ میں آکر سامان جنگ فراہم کرنے لگا۔ لیکن چنگیز خاں نے کئی گھمسان لڑائیوں کے بعد دونوں قلعے فتح کر لئے۔ تفال خاں، شمشیر الملک، برہان عماد شاہ اور چند مخصوص لوگوں کو قید کر دیا۔ ان قیدیوں کی تعداد چالیس تھی جن میں تفال خاں کے عزیز و اقارب بھی تھے۔ یہ سب کے سب قید کی حالت میں ایک رات میں مر گئے۔

مورخین کا بیان ہے کہ ان کو ایک ایسے مقام میں بند کیا گیا تھا، جہاں ہوا کا مطلق انتظام نہ تھا۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ مرتضیٰ نظام شاہ کے حکم سے یہ تمام کے تمام ایک ہی شب میں ختم کر دیئے گئے غرضکہ اس طرح ایک شاہی خاندان کا چراغ دنیا سے ہمیشہ کے لئے نہایت پُرحسرت طریقے سے گل ہوگیا یہ واقعہ ۹۸۲ھ ۱۵۷۴ء کا ہے، برار میں عماد شاہی خاندان نوے (۹۰) سال تک برسر اقتدار رہا، اس کے بعد یہ ملک، نظام شاہی بادشاہوں کے تصرف میں آیا۔

۱۔	فتح اللہ عماد الملک	۸۹۵ھ ۱۴۹۰ء	جلوس	۹۱۶ھ ۱۵۱۰ء	وفات
۲۔	علاء الدین عماد شاہ	۹۱۶ھ ۱۵۱۰ء	"	۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء	"
۳	دریا عماد شاہ	۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء	"	۹۶۹ھ ۱۵۶۰ء	"
۴۔	برہان عماد شاہ	۹۶۹ھ ۱۵۶۰ء	"	۹۸۲ھ ۱۵۷۴ء	"
۵۔	تفال خاں	۹۶۹ھ ۱۵۶۰ء	"	۹۸۲ھ ۱۵۷۴ء	"

برار کی ایک سرکار تھا جس میں ۳۷ محال تھے، علاقہ پایان گھاٹ میں واقع تھا۔


آگرہ
راجپوتانہ
مالوہ
مقبوضات سلاطین
گجرات
برہانپور
ایلچپور
خاندیس
احمدنگر
ماہور
گونڈوانہ
ورنگل
گولکنڈہ
بیجاپور
بیجانگر

سنسکرت زبان اور اسکے کارنامے

(از ٹھاکر جے آر۔ رائے صاحب بی اے)

ہندوستان میں۔ خیال عام ہے کہ سنسکرت مردہ زبان ہے اور مدت ہوئی کہ اس کے بولنے والے دنیا سے اٹھ گئے۔ اب اس کی مستی منظومات اور شاستروں تک محدود ہے۔ اسے زندہ زبانوں میں شمار کرنا واقعیت سے انکار کرنا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سنسکرت مردہ نہیں بلکہ زندہ جاوید زبان ہے اور پرانی زبانوں میں یہی ایک ایسی زبان ہے جو اس وقت تک تمام دنیا کے علمی حلقوں میں مقبول عام ہے۔

سنسکرت کی فصاحت بیان نہایت ارفع اور بلاغت کلام بہت بلند ہے۔ اس کی ادبیات بے شمار اور شستگی عدیم المثال ہے۔ سنسکرت لٹریچر کی جامعیت اور وسعت دنیائی ادبیات میں بے مثالی ہے۔ خیال اور معاشرت کا کوئی شعبہ اس سے علیحدہ نہیں رہا۔ اس کی قدامت اور ترقی کے اسباب اور دماغ سوزی کے لئے ایک دلچسپ مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ یونانی اور لاطینی جو اس کی ہم عصر سمجھی جاتی ہیں عرصہ ہوا نیست و نابود ہو چکی ہیں، ان کے بولنے والے مدت ہوئی دنیا سے اٹھ گئے۔ سنسکرت کے بولنے اور ویدوں کی رچائیں روایتی طریقہ سے پڑھنے والے نہ صرف سرزمین ہند میں پائے جاتے ہیں بلکہ دنیا کے تمام مہذب ملکوں میں سنسکرت کے شائق طلبا اور استاد موجود ہیں مگر یہ کہ آج بھی ایسا ہی ہے جیسا سکندر اعظم کے حملہ پنجاب کے وقت تھا۔ اس نے ہزاروں انقلاب دیکھے، قومیں بحر ضلالت سے نکلیں، اقبال کے ساتویں آسمان پر سرفراز ہوئیں، کبر و نخوت کے نشہ میں عدم آباد کو سدھار گئیں، سلطنتیں سربلند ہوئیں، اغیار کو پامال کیا، زوال سے دوچار ہوئیں، ہمیشہ کے لئے مٹ گئیں، مگر سنسکرت اپنی جگہ پر بدستور قائم ہے، اس کا ستارہ اقبال آسمان شہرت پر چمک رہا ہے۔ مغرب اور مشرق کی تمام یونیورسٹیوں میں اس کا چرچا ہے ہزاروں شوق سے اس کی تحصیل میں مشغول ہیں۔ صدہا استاد نہ صرف اعلیٰ تعلیم گاہوں

رہی ہیں اس کی تعلیم دینے میں مصروف نہیں بلکہ بڑی دماغ سوزی اور سینہ کاوی سے اس کی تحقیقاتیں کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں اس کا چرچا سب سے زیادہ ہے۔ مگر برہما، سیام، چین، جاپان، فلپائن، جاوا، آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں میں ہزاروں طلبا اور استاد اس کی تحصیل و تعلیم میں مشغول ہیں۔ اس وقت بھی سنسکرت کے پرانے قلمی نسخوں کی نقل اور اشاعت کا کام صدہا کتب خانوں میں ہو رہا ہے اور استادانِ سنسکرت کی تحقیقات کے نتائج انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں شائع ہوتے ہیں۔ قابل قدر پرانی کتابوں کے ترجمے دنیا کی تمام علمی اور ترقی یافتہ زبانوں میں ہو رہے ہیں۔ مستند کتابوں کے مختلف نسخوں کا مقابلہ بڑی احتیاط سے کر کے صحیح اور مستند اڈیشن مرتب کئے جاتے ہیں۔ سال بسال سنسکرت کے مطالعہ اور تحقیقات سے دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ پرانے نسخوں کی تلاش میں بڑی سرگرمی ظاہر ہو رہی ہے اور ان کے حصول میں دولت صرف کی جاتی ہے۔ اور اس میں ذرا بھی کلام نہیں ہے کہ مہذب دنیا کے ارباب تحقیقات السنہ کی جتنی تعداد سنسکرت کے کام میں مصروف ہے یونانی، لاطینی وغیرہ پرانی زبانوں کے کام میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ جن نازک خیال اور بالغ نظر رشیوں نے وید منتر بنائے تھے اور جو قواعد انھوں نے ان کی صحیح قرأت کے مرتب کئے تھے، ان کی اولاد میں ہزارہا پنڈت ایسے موجود ہیں جو آج بھی اپنے ابتدائی بزرگوں کی طرح اور انھیں کے انداز کے مطابق وید منتر پڑھتے رہتے ہیں۔ الیڈ اور آوڈیسے (یونانی) اور ورجل (لاطینی) کی رزمیہ نظمیں صحت و درستی سے پڑھنے والا ایک بھی نہیں ہے۔ یعنی مغرب کی ان تینوں مقبول عام رزمیہ تصنیفات کے مصنفوں کے ہم قوم اور ہمزبان عرصہ ہوا کہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس وجہ سے یورپ کے مختلف ملکوں کے علمائے یونانی و لاطینی اپنے اپنے میلان طبع کے مطابق تلفظ کرتے ہیں۔ لیکن وید، ویدانگ، براہمن، گرنتھ درشن اور دھرم شاستر صحت سے پڑھنے اور درست تلفظ سیکھنے کے واسطے ہزارہا آدمی غیر ممالک سے ہند کے پنڈتوں اور ودوانوں کے پاس آتے ہیں۔

مغرب کے مشہور مستشرقین کی آرا سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سنسکرت ایک زندہ جاوید زبان ہے۔ پروفیسر اے۔ اے میکڈانل آکسفورڈ یونیورسٹی کے نہایت ممتاز ماہر سنسکرت اور متعدد کتب کے مصنف ہیں، آپ کا انتقال ہوئے تھوڑا عرصہ گذرا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے آپ کا قول ملاحظہ کیجئے:۔ "فی زمانہ سنسکرت ہزاروں براہمنوں کی زبان ہے، جو اس سے بلا تکلف اظہار خیال کا کام لیتے ہیں۔ علمی مطالب اسی کے ذریعہ سے ادا ہوتے ہیں۔ رسالے اور کتابیں بھی اسی زبان میں طبع ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے کتب خانوں میں پرانی قلمی کتابوں کی نقل ہو رہی ہے۔ زمانہ قدیم لعبید کی طرح وید اس وقت بھی حفظ ہوتے ہیں اور پرانے دستور کے مطابق اچارن کئے جاتے ہیں۔ اگر کسی آفت سے تمام مطبوعہ وید تلف ہو جائیں تو پنڈتوں کے حافظہ سے از سر نو مرتب ہو سکتے ہیں"[1]

---

[1] ملاحظہ ہو "ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر" مصنف (مطبوعہ ۱۹۱۷ء)

ماہر موصوف ایک سے زیادہ مرتبہ سیاحت ہند کو آئے۔ مختلف صوبوں میں نامی پنڈتوں سے ملے، تبادلۂ خیال کیا اور چشم دید کوائف حوالۂ قلم کئے ہیں۔ ملک آسٹریا کے مشہور ماہر سنسکرت ڈاکٹر ونٹرنٹس کی اُستادانہ رائے بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

"کوئی صاحب خود سنسکرت کو مردہ زبان قرار نہیں دے سکتا۔ اس وقت کئی رسالے ملک ہند میں شائع ہوتے ہیں۔ معرکۃ الآرا مسائل پر بحث و تمحیص ان ہی رسائل کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ مہا بھارت بر سر عام آواز بلند پڑھی جاتی ہے۔ جو اس امر پر دال ہے کہ سامعین میں بعض لوگ اُسے تھوڑا بہت سمجھتے ہیں جب میں نے شانتی نکیتن میں مدراراکشش اور رام چرت کے پرانے ڈرامے ٹھیٹھ سنسکرت میں دیکھے جو وہاں کے طلبا نے مردوں اور عورتوں کے ایک شاندار مجمع میں دکھائے تھے تو مجھے یہ دیکھکر مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ سامعین سنسکرت کے مکالمہ کا لطف اُٹھاتے اور اس کا اظہار کرتے ہیں۔ اب بھی سنسکرت میں قصیدے کہے جاتے ہیں، کتابیں بھی لکھی جاتی ہیں۔ بڑے بڑے وِدوان اسی زبان میں نازک اور پیچیدہ مسائل پر بحث[5] کرتے ہیں۔"

ماہر موصوف بھی اور ممتاز ماہروں کی طرح ہندوستان کے ہر صوبہ میں سیاحت کر چکے ہیں۔ جو کچھ آپ لکھتے ہیں، وہ ذاتی تجربہ کی بنا پر لکھتے ہیں، اس وجہ سے ان کی رائے بہت وقیع ہے۔

علاوہ بریں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اس وقت ہندوستان میں تین مشہور رسالے سنسکرت میں شائع ہوتے ہیں۔ منجو بھاشنی (ہفتہ وار) کانجی ورم مدراس سے نکلتا ہے۔ سوریہ اُدے پندرہ روزہ ہے۔ اور سو بھارت (ماہوار) بنارس سے شائع ہوتے ہیں۔ ان رسالوں میں ادبیات کے گوناگوں پہلوؤں پر ہر قسم کے مضامین طبع ہوتے ہیں۔ مذہبی اور فلسفی اور مسائل سائنس کے قابل قدر مباحث پر بھی معرکۃ الآرا بحثیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ رسالوں سے قطع نظر ہر سال لاہور، الہ آباد، بنارس، کلکتہ، راجپوتانہ، مدراس، تریوندرم، میسور، پونا، بمبئی اور بڑودہ میں سنسکرت کی سیکڑوں کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ دھرم شاستر، ویاکرن، ڈراما، ادبیات اور فلسفہ پر مستند کتابیں چھاپی جاتی ہیں۔ یہ نشانات زندگی کے ہیں۔ سنسکرت کی ترقی کے واسطے امن و سکون کی فطری ضرورت ہے، اگر اس کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم الایام سے سنسکرت کی تمام معرکۃ الآرا اور غیر فانی کتابیں ایسے زمانہ میں تصنیف ہوئی تھیں جب ملک میں چاروں طرف امن کا دور دورہ تھا۔

یہ بات بھی غور کرنے کے لایق ہے کہ زبانِ سنسکرت کے جتنے قلمی نسخے اس وقت ملک ہندوستان

---

[5] ملاحظہ ہو "ہسٹری آف انڈین لٹریچر" جلد اول ص۲؟

دوسرے ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ دنیا کی باقی متروک و مہذب زبانوں کی کتابیں مجموعی طور پر اس کا پاسنگ بھی نہیں ہونگی۔ اس سے ایک طرف تو سنسکرت کی زلیست اور ہمہ گیری ظاہر ہے اور دوسری طرف اسلاف ہند کی علم پرستی اور ذوق شستہ عیاں ہوتا ہے۔ ذیل میں مطبوعہ کتابوں کا نہیں بلکہ ان پرانے قلمی نسخوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔ جو دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں پر اس بات کا ذکر کرنا غیر موزوں نہ ہوگا کہ ایشیائے وسطی کے وحشیوں نے جن میں ہن سب سے بڑھے ہوئے تھے نہ صرف شاندار مندر اور سربفلک محل مسمار اور منہدم کرکے اپنی فطری وحشت کا اظہار کیا تھا بلکہ کتب خانے بھی جلادیئے تھے اور بیش بہا کتابیں ضائع کردی تھیں جن کے حوالے دوسری کتابوں میں ملتے ہیں۔ اس کے باوجود لاکھوں کتابیں تباہی و غارتگری سے بچ گئی تھیں جو اب دنیا کے شاندار کتب خانوں کی مایۂ ناز ہیں۔ ہزارہا کتابیں اغیار لے گئے۔ انگریز مورخ وی۔ اے اسمتھ رقمطراز ہے کہ " ۶۴۵ء میں مشہور چینی سیاح ہیون تسانگ چھ سو ستاون قلمی نسخے بیس گھوڑوں پر لاد کر ملک چین کو لے گیا۔ یہ غالباً بودھ مت کی کتابیں تھیں، لیکن ان کے متعلق تلاش کرنا محال ہے۔ اسی طرح ایک اور انگریز کا بیان ہے کہ " لاسہ پایہ تخت کے بڑے لاسہ کے کتب خانے میں سنسکرت کی ہزارہا قلمی کتابیں موجود ہیں۔ جو ملک ہند کے بودھ پرچارک، پدم سم بھب اور اس کے ساتھیوں کی وساطت سے وہاں مہیا کی گئی تھیں۔" چین کے عالم عرصہ دراز سے علوم ہند سے بے حد دلچسپی ظاہر کرتے چلے آتے ہیں، اس وجہ سے وہاں پر ہزارہا کتابیں سنسکرت کی موجود ہیں۔ علاوہ ازیں جاپان ہندچینی، سیام اور جاوا و سماٹرا کے کتب خانوں میں بھی کئی ہزار قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔ مہابھارت اور رامائن اور گیتا کی کتھا خاص تقریبوں پر کی جاتی ہے۔ کئی ماہروں کا بیان ہے کہ جاوا و سماٹرا میں جو مشہور دھارمک کتابیں اب پائی جاتی ہیں وہ ملک ہند کی مستند پرانی کتابوں سے کچھ مختلف ہیں۔ گویا ملک ہند کے علاوہ قرب وجوار کے ایشیائی ملکوں میں بھی سنسکرت کے ہزاروں قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔ مگر ان کی معتبر فہرستیں موجود نہیں ہیں۔ البتہ ملک ہند اور یورپ کے مشہور کتب خانوں کے سنسکرت کے نسخوں کی فہرستیں مرتب ہوگئی ہیں۔ ذیل کے اعداد انہیں فہرستوں سے ماخوذ ہیں۔

یورپ کے جن عالموں نے بھارت سنسکرت کے واسطے دور و نزدیک شہرت حاصل کر رکھی تھی ان میں میکس مولر کا نام سب سے ممتاز اور بہت وسیع ہے۔ اس نے ۱۸۸۲ء میں آکسفورڈ کے طلبا کے سامنے ہندوؤں کے علمی کارناموں پر لیکچر دیتے ہوئے یہ بیان کیا تھا کہ " سنسکرت کے قلمی نسخوں کا

شمار دس ہزار ہے جو یونانی اور اٹلی کی پرانے زمانہ کی کتابوں کے مجموعہ سے کہیں زیادہ ہیں۔" یعنی میکس مولر کے زمانہ میں سنسکرت کی پرانی کتابوں کی تعداد یونانی اور لاطینی زبانوں کی قلمی کتابوں سے بیسوں گنا زیادہ تھی۔ یہ ستر سال پہلے کی کیفیت ہے۔ اس کے بعد بہت وسیع تحقیقات ہوئی بیسوں آدمی دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں کی طرف سے نادرالوجود قلمی نسخوں کی تلاش میں ملک کے ہر حصے میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اسی طرح پر ہزارہا نرالی کتابیں دستیاب ہو چکی ہیں جن کی ہستی کا میکس مولر کے زمانہ میں گمان بھی نہ تھا۔ برسوں کی تلاش و تحقیقات سے یہ ظاہر ہے کہ ملک میں لاکھوں قلمی کتابیں مختلف کتب خانوں میں بحفاظت رکھی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانہ کے شعبہ سنسکرت میں چھ ہزار تین سو قلمی کتابیں موجود ہیں۔ ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور کی سنسکرت لائبریری میں چھ ہزار چار سو نسخے ہیں۔ کوئن کالج بنارس کا کتب خانہ دنیا میں سب سے بڑا ہے جہاں پینتالیس ہزار قلمی کتابیں موجود ہیں، اور یہ ہندوؤں کے مشہور مقدس شہر کے شایان شان ہے کہ وہاں پر ادبیات سنسکرت کا سب سے بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ سارے ملک کے طلبا وہاں پر علمی پیاس بجھانے کو جاتے ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانے میں ہر قسم کے علوم کی سنسکرت کی قلمی پرانی کتابوں کی تعداد پچیس ہزار ہے۔ سنسکرت سہاتیہ پریشد کلکتہ میں پانچ ہزار نسخے ہیں۔ بریندر ریسرچ سوسائٹی راجشاہی کے کتب خانے میں بھی پانچ ہزار قلمی کتابیں موجود ہیں۔ اورینٹل لائبریری مدراس کے شعبہ سنسکرت میں تیس ہزار پرانی کتابیں ہیں۔ تنجور کے شاہی کتب خانے میں بارہ ہزار، ترایوندرم کے شاہی کتب خانے میں دس ہزار، میسور کے شاہی کتب خانہ میں سولہ ہزار، بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ پونا کے کتب خانے میں تیس ہزار قلمی کتابیں ہیں۔ آنند آشرم پونا کے کتب خانے میں آٹھ ہزار، یونیورسٹی لائبریری بمبئی کے شعبہ سنسکرت میں دو ہزار، ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی کے کتب خانہ میں آٹھ ہزار، کتب خانہ دربار بڑودہ میں سولہ ہزار قلمی کتابیں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں دربار لائبریری بیکانیر میں پانچ ہزار، الور میں چھ ہزار، اور دربار لائبریری جموں میں بارہ ہزار قدیم قلمی کتب ہیں۔ اس کے سوا جے پور، اودے پور، جودھ پور اور دیگر ریاستوں کے سرکاری کتب خانوں میں بھی ہزارہا پرانی قلمی کتابیں موجود ہیں۔ جن کی فہرستیں تیار نہیں کی گئی ہیں۔ مگر مذکورہ صدر کتب خانوں کی کتابوں کا شمار بھی ڈھائی لاکھ کے قریب ہے۔ دربار نیپال کے کتب خانے میں ہزارہا پرانی کتابیں بھوج پتر، چرم اور تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی موجود ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں وزیر اعظم نیپال نے پانچ ہزار جلدیں آکسفورڈ یونیورسٹی کی نذر کی تھیں۔ علم دوست رؤسا اور امرا نیز پنڈتوں کے پاس ہزارہا پرانی قلمی کتابیں مختلف علوم و فنون پر موجود ہیں جو ہمارے شمار

سے خارج ہیں۔ اگر ملک ہند میں سنسکرت کی قلمی کتابوں کا شمار پانچ سات لاکھ کے درمیان سمجھا جائے تو راستی سے بعید نہ ہوگا۔

اب یورپ کے کتب خانوں کی کیفیت ملاحظہ ہو، مشہور عالم سنسکرت کول بروک نے بڑی کوشش اور تندہی سے ایک لاکھ روپیہ خرچ کر کے شاندار کتب خانہ مہیا کیا تھا جسے وہ پنشن لینے کے بعد ولایت لے گیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا اس ذخیرہ میں بہت نایاب اور قابل قدر کتابیں تھیں جو اب وزیر ہند کے کتب خانہ کے شعبہ سنسکرت میں شامل ہیں اب ان کا شمار بتیس ہزار ہے۔ عجائب خانہ برطانیہ کے شعبہ سنسکرت میں چار ہزار اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں اٹھارہ ہزار قلمی نسخے ہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانہ میں پانچ ہزار پرانی نایاب کتابیں سنسکرت کی موجود ہیں۔ پیرس کا کتب خانہ بہت شاندار ہے جس کے شعبہ سنسکرت میں دس ہزار نسخے موجود ہیں۔ مگر یورپ میں پرانی سنسکرت کتابوں کا سب سے بڑا ذخیرہ برلن (پایہ تخت جرمنی) میں ہے جہاں تیس ہزار قلمی نسخے موجود ہیں۔ ان میں بہت سی دستی کتابیں ایسی ہیں جو آج کل کلیتہً نایاب ہو گئی ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ جرمنی کے ارباب تحقیقات علوم ہند سے کتنی دلچسپی لیتے ہیں اور تحقیقات علمی میں کس قدر دماغ سوزی سے کام لیتے ہیں۔ میونک اور کیمبرگ کی یونیورسٹیوں میں دو دو ہزار پرانی قلمی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ پایہ تخت روس کے سرکاری کتب خانے کے شعبہ شرقیہ میں دس ہزار نسخے سنسکرت کے موجود ہیں۔ وائنا صدر آسٹریا کے کتب خانے میں چار ہزار قلمی کتابیں بیان کی جاتی ہیں۔ اٹلی۔ ہالینڈ۔ بلجیم کی تعلیم گاہوں کے کتب خانوں میں بھی بہت سی سنسکرت کی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ مگر ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں لیکن جن بڑے بڑے کتب خانوں کا اوپر ذکر آیا ہے ان کے ذخائر سنسکرت کی فہرستیں مرتب ہو چکی ہیں جن کا مجموعی شمار ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ اب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملک ہند اور یورپ کے کتب خانوں میں ساڑھے تین لاکھ قلمی کتابیں موجود ہیں۔ امریکہ کی یونیورسٹیوں کے کتب خانوں میں جو ہزارہا سنسکرت کی کتابیں پائی جاتی ہیں ان کا کوئی حساب نہیں ہے اور نہ دنیا کی اور یونیورسٹیوں کے ذخائر سنسکرت کا کوئی مناسب تخمینہ مرتب کیا گیا ہے ہمارے خیال میں ملک ہند، ایشیا، یورپ، امریکہ اور دیگر ملکوں کی یونیورسٹیوں کے کتب خانوں میں ہر قسم کی قلمی سنسکرت کی کتابیں آٹھ لاکھ کے قریب ہونگی۔ اور یہ بات دعوے کے ساتھ بیان کی جا سکتی ہے کہ زبان سنسکرت کی ہمہ گیری جیسا کہ اس کے ان گنت قلمی نسخوں سے ظاہر ہوتا ہے اپنی نظیر آپ ہے۔ دنیا کی کوئی پرانی زبان

۱؎ قلمی کتابوں کے مندرجہ بالا اعداد و شمار کے لئے راقم مضمون پروفیسر بھگوت دت صاحب ایم۔ اے پروفیسر ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور کا مرہون منت ہے۔

اس لحاظ سے سنسکرت کی برابری کا دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔

سنسکرت کے احسانات علوم جدیدہ پر

اس کے علاوہ علوم جدیدہ پر بھی سنسکرت کے بیحد احسانات ہیں۔ اس کا ثبوت بھی مشہور ماہران مغرب کے اقوال ذیل سے ملے گا جو اس انقلاب عظیم کو بخوشی تسلیم کرتے ہیں جو مغرب میں علوم سنسکرت کی اشاعت کے طفیل میں رونما ہوا ہے۔

تاریخ تمدن کے دور جدید کا آغاز علوم ہند کے انکشاف سے ہوتا ہے جس سے ارباب تحقیق کے تمام مسلمہ تصورات تہ و بالا ہو گئے ہیں اور کئی نئے علوم کی بنیاد پڑی ہے۔ اضلاع متحدہ کے ماہر سنسکرت پروفیسر ایم۔ بلوم فیلڈ اس انقلاب عظیم کی نسبت جو سنسکرت کے طفیل میں اقلیم سائنس میں واقع ہوا ہے۔ یوں لکھتے ہیں "جب سے یونانی اور لاطینی زبان اور ان کی ادبیات کا مطالعہ اور تحقیقات شروع ہوئی ہے تاریخ تمدن میں ایک بھی ایسا معرکۃ الآرا واقعہ پیش نہیں آیا ہے جیسا اٹھارویں صدی کے آخری حصے میں علوم سنسکرت کا انکشاف ہے۔ لسانیات اور تاریخ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر علوم سنسکرت کا انقلاب خیز اثر نہ پڑا ہو۔ علوم ہند قدیم کے مطالعہ اور تحقیقات سے ہندیورپی تاریخ کے ابتدائی زمانہ پر بہت گہری روشنی پڑی ہے۔ اسی انسانی کا نظریہ اسی کی بدولت معرض وجود میں آیا ہے۔ لسانیات وصنمیات نسبتی، مذاہب، صنفی قانون، مختلف شعبہ جات تاریخ وفلسفہ یا تو اسی سے برآمد ہوئے ہیں یا اس کی تحقیقات کے قابل قدر نتائج سے ان کی قلب ماہیت ہوئی ہے[۵۱]۔ اور ان پر مستقل اثر رونما ہوا ہے۔" برطانیہ کے ماہر سنسکرت پروفیسر ریپسن کا قول بھی قابل لحاظ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "انیسویں صدی کے ارباب تحقیق نے زبان سنسکرت کو لاطینی، یونانی فارسی اور دیگر یورپی زبانوں کا مبدء قرار دیا تھا...... اس کی بدولت ہندیورپی قوموں کی جو چینی ترکستان سے آئرلینڈ تک آباد ہیں۔ تاریخ تمدن کے ابتدائی زمانہ پر معتد بہ روشنی پڑتی ہے۔ کیونکہ مشابہت زبان اور معاشیات اور معتقدات کی نوعیت اس سے ظاہر ہوتی ہے۔ سنسکرت کے مطالعہ سے انسان کی زبان کا تصور کسی قدر قطعاً بدل گیا ہے۔ علوم ہند قدیم کے مطالعہ سے پرانے زمانہ کے تمدنی حالات منکشف ہوتے ہیں۔ ان کا اثر اہل مغرب کی عقلی زندگی اور ان کے ذہنی مشاغل پر بھی بہت گہرا پڑا ہے[۵۲]" مغرب کے یہی دو ماہر ایسے نہیں ہیں جو سنسکرت کے مطالعہ کے معرکۃ الآرا نتائج کے قائل ہیں بلکہ مشہور پروفیسر اے۔ میکڈانل جن کا پچھلے دنوں انتقال ہو چکا ہے اس کے معترف ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں "احیاء العلوم کے بعد تاریخ تمدن میں ایسا کوئی واقعہ عالمگیر اہمیت کا واقع نہیں ہوا جیسا کہ علوم سنسکرت کا انکشاف ہے

---

۵۱ "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" جلد سوم صفحہ ۱۰۱

۵۲ ملاحظہ ہو "انشنٹ انڈیا" صفحہ ۲-۵-۶ مطبوعہ ۱۹۱۵ء

سے خارج ہیں۔ اگر ملک ہند میں سنسکرت کی قلمی کتابوں کا شمار پانچ سات لاکھ کے درمیان سمجھا جائے تو راستی سے بعید نہ ہوگا۔

اب یورپ کے کتب خانوں کی کیفیت ملاحظہ ہو، مشہور عالم سنسکرت کول بروک نے بڑی کوشش اور ہندہی سے ایک لاکھ روپیہ خرچ کرکے شاندار کتب خانہ مہیا کیا تھا جسے وہ پنشن لینے کے بعد ولایت لے گیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالہ کردیا اس ذخیرہ میں بہت نایاب اور قابل قدر کتابیں تھیں جواب زیر ہند کے کتب خانہ کے شعبۂ سنسکرت میں شامل ہیں اب ان کا شمار بیس ہزار ہے۔ عجائب خانہ برطانیہ کے شعبۂ سنسکرت میں چار ہزار اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں اٹھارہ ہزار قلمی نسخے ہیں کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانہ میں پانچ ہزار پرانی نایاب کتابیں سنسکرت کی موجود ہیں۔ پیرس کا کتب خانہ بہت شاندار ہے جس کے شعبۂ سنسکرت میں دس ہزار نسخے موجود ہیں۔ مگر یورپ میں پرانی سنسکرت کتابوں کا سب سے بڑا ذخیرہ برلن (پایۂ تخت جرمنی) میں ہے جہاں تیس ہزار قلمی نسخے موجود ہیں۔ ان میں بہت سی دستی کتابیں ایسی ہیں جو آج کل کلیتہً نایاب ہوگئی ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ جرمنی کے ارباب تحقیقات علوم ہند سے کتنی دلچسپی لیتے ہیں اور تحقیقات علمی میں کس قدر دماغ سوزی سے کام لیتے ہیں۔ بونگ اور کیمبرگ کی یونیورسٹیوں میں دو دو ہزار پرانی قلمی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ پایۂ تخت روس کے سرکاری کتب خانے کے شعبۂ شرقیہ میں دس ہزار نسخے سنسکرت کے موجود ہیں۔ وائنا صدر آسٹریا کے کتب خانے میں چار ہزار قلمی کتابیں بیان کی جاتی ہیں۔ اٹلی۔ ہالینڈ۔ بلجیم کی تعلیم گاہوں کے کتب خانوں میں بھی بہت سی سنسکرت کی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ مگر ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں لیکن جن بڑے بڑے کتب خانوں کا اوپر ذکر آیا ہے ان کے ذخائر سنسکرت کی فہرستیں مرتب ہوچکی ہیں جن کا مجموعی شمار ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ اب ظاہر ہوتا ہے کہ ملک ہند اور یورپ کے کتب خانوں میں ساڑھے تین لاکھ قلمی کتابیں موجود ہیں۔ امریکہ کی یونیورسٹیوں کے کتب خانوں میں جو ہزارہا سنسکرت کی کتابیں پائی جاتی ہیں ان کا کوئی حساب نہیں ہے اور نہ دنیا کی اور یونیورسٹیوں کے ذخائر سنسکرت کا کوئی مناسب تخمینہ مرتب کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں ملک ہند، ایشیا، یورپ، امریکہ اور دیگر ملکوں کی یونیورسٹیوں کے کتب خانوں میں ہر قسم کی قلمی سنسکرت کی کتابیں آٹھ لاکھ کے قریب ہونگی۔ اور یہ بات دعوے کے ساتھ بیان کی جاسکتی ہے کہ زبان سنسکرت کی ہمہ گیری جیسا کہ اس کے ان گنت قلمی نسخوں سے ظاہر ہوتا ہے اپنی نظیر آپ ہے۔ دنیا کی کوئی پرانی زبان

ؔ قلمی کتابوں کے متعلق جو بالا اعداد و شمار کے لئے راقم مضمون پروفیسر بھگوت دت صاحب ایم۔ اے پروفیسر ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور کا مرہون منت ہے۔

اس لحاظ سے سنسکرت کی برابری کا دعویٰ کرنے کی جرات نہیں کرسکتی۔

سنسکرت کے احسانات علوم جدیدہ پر

اس کے علاوہ علوم جدیدہ پر بھی سنسکرت کے بیحد احسانات ہیں، اس کا ثبوت بھی مشہور ماہران مغرب کے اقوال ذیل سے ملے گا جو اس انقلاب عظیم کو بخوشی تسلیم کرتے ہیں جو مغرب میں علوم سنسکرت کی اشاعت کے طفیل میں رونما ہوا ہے۔

تاریخ تمدن کے دور جدید کا آغاز علوم ہند کے انکشاف سے ہوتا ہے جس سے ارباب تحقیق کے تمام مسلمہ تصورات تہ و بالا ہوگئے ہیں اور کئی نئے علوم کی بنیاد پڑی ہے اضلاع متحدہ کے ماہر سنسکرت پروفیسر ایم۔ بلوم فیلڈ اس انقلاب عظیم کی نسبت جو سنسکرت کے طفیل میں علمی سائنس میں واقع ہوا ہے۔ یوں لکھتے ہیں

"جب سے یونانی اور لاطینی زبان اور ان کی ادبیات کا مطالعہ اور تحقیقات شروع ہوئی ہے تاریخ تمدن میں ایک بھی ایسا معرکۃ الآرا واقعہ پیش نہیں آیا ہے۔ جیسا اٹھارویں صدی کے آخری حصے میں علوم سنسکرت کا انکشاف ہے۔ لسانیات اور تاریخ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر علوم سنسکرت کا انقلاب خیز اثر نہ پڑا ہو۔ علوم ہند قدیم کے مطالعہ اور تحقیقات سے ہند یورپی تاریخ کے ابتدائی زمانہ پر بہت گہری روشنی پڑی ہے نسل انسانی کا نظریہ اسی کی بدولت معرض وجود میں آیا ہے۔ لسانیات و صنمیات نسبتی، مذاہب، صنائی قانون، مختلف شعبہ جات تاریخ و فلسفہ یا تو اسی سے برآمد ہوئے ہیں یا اس کی تحقیقات کے قابل قدر نتائج سے ان کی قلب ماہیت ہوئی ہے۔ اور ان پر مستقل اثر رونما ہوا ہے۔[1] برطانیہ کے ماہر سنسکرت پروفیسر البسن کا قول بھی قابل لحاظ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انیسویں صدی کے ارباب تحقیق نے زبان سنسکرت کو لاطینی، یونانی فارسی اور دیگر یورپی زبانوں کا مبدء قرار دیا تھا۔۔۔۔۔ اس کی بدولت ہند یورپی قوموں کی جو چینی ترکستان سے آئرلینڈ تک آباد ہیں۔ تاریخ تمدن کے ابتدائی زمانہ پر معتدبہ روشنی پڑتی ہے۔ کیونکہ مشابہت زبان اور معاشیات اور معتقدات کی نوعیت اس سے ظاہر ہوتی ہے۔ سنسکرت کے مطالعہ سے انسان کی زبان کا تصور نسبتہ قطعاً بدل گیا ہے۔ علوم ہند قدیم کے مطالعہ سے پرانے زمانہ کے تمدنی حالات منکشف ہوتے ہیں۔ ان کا اثر اہل مغرب کی عقلی زندگی اور ان کے ذہنی مشاغل پر بھی بہت گہرا پڑا ہے" مغرب کے دو ماہر ایسے نہیں ہیں جو سنسکرت کے مطالعہ کے معرکۃ الآرا نتائج کے قائل ہیں بلکہ مشہور پروفیسر اے۔ میکڈانل جن کا پچھلے دنوں انتقال ہوچکا ہے اس کے معترف ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں "احیاء العلوم کے بعد تاریخ تمدن میں ایسا کوئی واقعہ عالمگیر اہمیت کا واقع نہیں ہوا جیسا کہ علوم سنسکرت کا انکشاف ہے

---

[1] "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" جلد سوم صفحہ ۱

[2] ملاحظہ ہو "انشنٹ انڈیا" صفحہ ۵-۶ مطبوعہ ۱۹۱۵ء

السنہ، مذاہب، عقلی مشاغل کے کوائف اور پرواز فکر کے کارنامے اسی زبان کی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔ ہندوؤں کا سارا تمدن اسی میں مقید ہے ...... علم سنسکرت سے السنہ اضافی کی اور ویدوں کی زبان سے صنمیات نسبتی کی بنیاد پڑی ہے۔ گو اس انقلاب اہم کا اثر علوم کے تمام شعبوں میں رونما ہو رہا ہے۔ مگر سب سے بڑی تبدیلی فلسفہ اور مذاہب[51] میں نمایاں ہوئی ہے۔ ڈاکٹر ونٹرنٹس ایک بلند مرتبہ مستشرق ہیں آپ پراگ یونیورسٹی (بوہیمیا) کے مشہور استاد سنسکرت ہیں۔ آپ کی رائے یہ ہے: "ملک ہند کے قدیم ادبیات کے مطالعہ سے پرانی اور نئی زبانوں کی مناسبت باہمی واضح ہوئی، جس سے تاریخ تمدن کے دور جدید کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے وسیلہ سے قوموں کے مقدم التاریخ تعلقات[52] بخوبی ظاہر ہوتے ہیں۔" ان مشاہیر استادوں نے سنسکرت اور علوم جدیدہ پر عرصہ کی جامع و مانع تحقیقات کے بعد اپنی مسلمہ رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنسکرت لٹریچر کے مغرب میں مشتہر ہونے سے اقلیم سائنس میں بہت بڑا انقلاب رونما ہوا ہے۔ السنہ اضافی و مذاہب نسبتی صنمیات اور دیگر علوم کی ترقی و توسیع کو سنسکرت سے بہت مدد ملی ہے۔ یہاں پر وفیسر اے۔ اے۔ میکڈانل کی ایک اور رائے پیش کرنا ضروری ہے جس سے سنسکرت کا احسان جو اس نے تاریخ آدم پر کیا گیا ہے، ظاہر ہوتا ہے۔ عالی دماغ اور مستقل مزاج ماہران علوم سنسکرت کی دماغ سوزیوں اور عرق ریزیوں سے ہندو تمدنی کمالات کی ۳ ہزار سالہ صحیح اور معتبر تاریخ برآمد ہو کر مرتب ہو گئی ہے۔ السنہ۔ مذاہب۔ ادبیات۔ علوم و فنون اور اسلاف ہند کے صدہا سال کے معاشرتی حالات اور رسم و رواج کا مسلسل احوال صحت و درستی سے قلم بند کئے جانے کا مواد بہم پہونچ گیا ہے۔ ادبیات سنسکرت کی چھان بین سے تاریخ ہند قدیم پر بھی بہت مفید اثر پڑا ہے اس کے اوراق پریشاں کی صحیح ترتیب کا بہت کارآمد مسالہ بہم پہونچ گیا ہے۔ اب سے چوتھائی صدی پہلے جو تاریخ نصاب میں شامل تھی اس کا سب سے پرانا اور معتبر واقعہ سکندر اعظم کا حملۂ پنجاب تھا۔ جو ۳۲۶ ق۔م کا واقعہ ہے۔ مگر پچھلے تیس چالیس سال کے عرصہ میں جو تحقیقات ادبیات سنسکرت اور پالی زبان کی کتابوں کی ہوتی چلی آئی ہے۔ اس سے یہ بیش قیمت نتیجہ مرتب ہوا ہے کہ "معتبر تاریخ ہند کا زمانہ" ماہران تاریخ ہند نے اتفاق رائے سے سن عیسوی سے چھ سو برس پہلے قرار دیا ہے۔ "کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" جلد اول (ہند قدیم) مطبوعہ ۱۹۲۲ء میں ممتاز مستشرقین نے ہند قدیم کے متعلق متفرق مضامین شائع کئے ہیں جن کی معلومات کلیۃً سنسکرت ادبیات، پالی کتب اور کتبہ جات و سکہ جات

۵۱ ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر ص ۴۰۵ مطبوعہ ۱۹۱۷ء
۵۲ ہسٹری آف انڈین لٹریچر جلد اول ص ۱ مطبوعہ ۱۹۲۶ء

کمنہ سے ماخوذ ہیں۔ جن سے تحقیقات جدیدہ کی جامعیت اور قدر و قیمت بخوبی آشکارا ہے۔ پروفیسر ای۔ اے۔ کیتھ (ایڈنبرا) نے نظام تمدن پر جس میں ذات پات کی ابتدا اور جمہور کے مشاغل، معاشرت اور فلسفہ کی ابتدا اور سلاطین وسطی (مدھ دیش) میں آریہ تمدن کی اشاعت پر تازہ اور نرالے معلومات کی وسعت کے ساتھ بحث کی ہے۔ پروفیسر کارپینٹر (آپسالہ یونیورسٹی ناروے) نے جین مت پر اور پروفیسر ریس ڈیوڈس نے بدھ مت کی تاریخ اور ملکی حالات، اور مہاتما بدھ کے زمانہ کے اقتصادی حالات اور چندر گپت اعظم کے عہد حکومت کے کوائف قلمبند کیے ہیں۔ امریکہ کے ماہر سنسکرت پروفیسر ای۔ ڈبلیو۔ ہاپ کینس نے رزمیہ نظموں اور سوتروں سے تمدنی اور پولیٹیکل حالات اور راجہ و رعایا کے تعلقات اور معاشرت پر قابل قدر روشنی ڈالی ہے۔ اسی قسم کے اور سودمند مضامین بھی اس قیمتی کتاب میں پائے جاتے ہیں۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا میں جین مت اور بدھ مت کے بانیوں کا زمانہ نہایت معتبر تسلیم کیا گیا ہے۔

مغربی استادوں ہی پر کیا موقوف ہے، ملک ہند کے نو عمر ارباب تحقیق جنھوں نے مغربی استادوں سے اور نیز مغربی تعلیم گاہوں میں نئی تعلیم پائی ہے سنسکرت لٹریچر کی چھان بین بطور خود کر رہے ہیں۔ انھوں نے ان ہندو حکمرانوں کے حالات مرتب کرنے کی کوشش کی ہے جن کی روایات مہابھارت اور پرانوں میں پائی جاتی ہیں۔ جین مت کے بانی سے پہلے جو جو کشتری اقوام مختلف حصوں میں حکمراں تھیں ان کے حالات بڑی دماغ سوزی اور تحقیقات سے مرتب کئے ہیں۔ اقتصادیات ہند قدیم، فن حکومت اور دیگر مسائل پر معرکۃ الآرا کتابیں تالیف و شائع کی گئی ہیں۔ پروفیسر ابناش چندر داس نے اپنی جامع تحقیقات کا مضمون سب سے نرالا مقرر کیا ہے۔ جو ویدک[لہ] شائستگی کی ابتدا سے تعلق رکھتا ہے آپ نے دو معرکۃ الآرا کتابیں شائع کرکے علمی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ ماہر موصوف کی نادر تحقیقات سے بنی آدم کی تاریخ سلف کے اوراق منتشر مرتب کرنے کا قابل قدر مواد بہم پہنچ گیا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے محقق اس مبارک کام میں اور صوبوں کے ماہروں سے نسبتاً بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ قصہ کوتاہ سنسکرت کے انکشاف سے نہ صرف تاریخ ہند قدیم کے ابتدائی دور ہی کے معلومات مہیا ہو گئے ہیں بلکہ بنی نوع انسان کی تاریخ قدیم و جدید کے اوراق گم شدہ بھی دستیاب ہو گئے ہیں جو بجائے خود ایک نہایت شاندار کارنامہ ہے۔ جو انکشاف سنسکرت کی بدولت مرتب ہوا ہے، اگر زبان سنسکرت

لہ "رگ ویدک انڈیا" جلد اول مطبوعہ ۱۹۲۱ء اور "رگ ویدک کلچر" مطبوعہ ۱۹۲۵ء میں آپ کے بلند تخیلات پڑھنے چاہئیں۔ (ج۔ د۔ ر)

کی بہت پرانی کتابوں کا علم حاصل نہ ہوتا۔ تو بنی آدم کی تاریخ تمدن کا دورِ اولین قابل قدر اور معتبر معلومات سے سراسر ناآشنا رہتا۔ اور یہ کوتاہی کسی اور وسیلہ سے پوری نہ ہو سکتی تھی۔ اور انسان کی ترقی تمدن کے نہایت پرانے اور معتبر حالات ہم نہ پہونچ سکتے تھے۔ مشہور ماہر سنسکرت میکس مولر کا یہ قول ہے کہ "وید بنی آدم کے کتب خانے میں سب سے پرانی کتابیں ہیں۔" اسی وجہ سے ان کی قدر و قیمت کا کما حقہ اندازہ ناممکن ہے۔

اسلافِ ہند کی شائستگی سنسکرت میں جن علوم و فنون کا ذکر پایا جاتا ہے۔ وہ زمانۂ حال کے ماہران علم تمدن کے نزدیک کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک دلچسپ سوال ہے۔ جس کا جواب ماہران زمانۂ حال ہی کی زبان سے مناسب ہوگا:-

ماہران و ارباب فکر میں بی کڈ نے اپنی زندگی تمدن کے ارتقا اس کے معانی اور لوازمہ کی تشریح کے واسطے مخصوص کر رکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "تمدن کا اطلاق علوم و فنون، طرز حکومت، نظام معاشرت اور باہمدگر مشارکت عمل پر ہوتا ہے[1]۔ شائستگی (culture) اور تعلیم بھی اسی کی ذیل میں شمار ہوتی ہے۔ اس سے وہ لوازم اور خصوصیات مراد ہوتے ہیں جن کے باعث ہم وحشیوں سے برتر اور ممتاز شمار ہوتے ہیں۔" پروفیسر جے۔ ایس۔ میکنزی علم تمدن کے مشہور ماہر کی رائے بھی قابل غور ہے:-

"جب انسان ان اغراض سے تحریک پذیر ہوتا ہے جو انسانیت اور شائستگی کے متبائن ہوتے ہیں۔ تو ایثار علی النفس کی اہلیت ظہور میں آتی ہے۔ اور یہ تعلیم کے مترادف ہے جس کے جامع ترین معنی فطرت انسانی کی تکمیل اور پاکیزگی ہے۔۔۔۔ ادبیات میں سائنس اور صناعیوں (آرٹ) کے اغراض انتہائی شامل ہیں۔ فن شاعری، مذہب اور شائستگی کا سرتاج فلسفہ ہے جس کا مقصود اوانی عالم کے نشیب و فراز پر جامع و مانع نگاہ ڈالنا ہے۔ اس کے طفیل میں شاعری اور مذہب کے اعلیٰ ترین تخیلات میں ربط پیدا ہوتا ہے[2]۔" پروفیسر میکنزی کے خیال میں ادبیات کے اعلیٰ ترین مقاصد میں سائنس، صناعیاں، مذہب اور فلسفہ کے ادق ترین خیالات شامل ہیں۔ شاعری اور مذہب بغیر فلسفہ کے بے جان ہے۔ اب ایک تیسرے نامی ماہر ڈاکٹر جے۔ بی۔ کروزر کا قول ناطق ہے "عقل ارادت ہے، ارادت تصور ہے اور تصور خواہشات اور جذبات سے منسلک اور مربوط ہے۔۔۔۔ تمدن مذہب اور فن حکومت پر حاوی ہے، سائنس اس کا جزو لاینفک ہے۔ اور ان تینوں کا جو نیک اور سود مند اثر معاشرت پر پڑتا ہے۔ وہ بھی

---

[1] ماخوذ از "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" جلد سوم صفحہ ۲۹۶

[2] "آؤٹ لائین آف سوشیل فلاسفی" صفحہ ۲۲۶ سے ۲۴۸ تک مطبوعہ ۱۹۱۸ء (ع۔ م۔ ر)

تمدن ہی کے ذیل میں شمار ہوتا ہے۔ ... مذہب کے وسیلے سے اخلاقی، نفسیاتی اور عقلی زندگی میں موافقت اور موانست پیدا ہوتی ہے، جو اس کے اظہار استمراری کے واسطے لابدی ہے۔ مذہب کی بدولت اضطراب قلبی اور ہیجان باطنی رفع ہوتا ہے۔ اس سے کائنات کی علت حقیقی کی تحقیقات میں ہدایت اور تحریک نصیب ہوتی ہے۔ ... اس کے وسیلہ سے روح پاکیزگی اور خدا ترسی کی بہترین زندگی بسر کرنے کی قوت اور صلاحیت حاصل کرتی ہے۔" اور بڑے بڑے ماہروں کے آراء کے اقتباسات بھی پیش ہو سکتے ہیں، مگر ہمارے موجودہ مقصد کے واسطے اسی قدر کافی ہیں۔ اگر مغرب کے مشہور ارباب فکر اور ماہران علم تمدن کے مسلمہ معیار کے رو سے ادبیات سنسکرت پر گہری نگاہ ڈالی جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اہل سنسکرت کے علمی کارنامے جو ایسے زمانہ میں انجام پذیر ہوئے تھے جب زمانۂ حال کی متمدن قوموں کے اجداد لوازم شائستگی سے محروم اور ضروریات تمدن سے بیگانہ تھے تو ان کارنامہا کے واسطے سوائے تحسین و آفریں کے اور کیا زبان سے نکل سکتا ہے! مغرب کے مشہور ماہران سوشیالوجی (معاشیات) اور استادان انتھروپالوجی (لسانیات) کا اس امر پر اتفاق ہے کہ مذہب ہر قسم کی ترقیوں کا محرک اعظم ثابت ہوا ہے۔ پرانے زمانہ کے آریہ ہندوؤں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مذہب ایجاد کیا تھا جو رگ وید میں مذکور ہے۔ فلسفیانہ تخیلات بھی اسی پرانی اور مقدس کتاب میں پائے جاتے ہیں۔ نہ صرف یہی ان کا بہترین کارنامہ ہے بلکہ انھوں نے دنیا کی نہایت کامل شستہ اور جامع زبان بھی اختراع کی جو ان کے بیش بہا خیالات کی حامل بنی۔ انھوں نے ان خیالات کو پاکیزگی کے ساتھ پردۂ شعر میں ظاہر کیا۔ گویا بہترین زبان کے ساتھ فن شاعری کے بھی وہی موجد ہوئے۔ ویدوں کی رچاؤں کے پڑھنے کے قواعد بھی بنائے۔ ویاکرن (صرف و نحو) کا کمال سب سے نرالا ہے۔ پانینی سے بڑھکر عالی دماغ کوئی موجد گرامر دنیا میں نہیں گذرا۔ اگر سنسکرت کے دنیوی علوم و فنون کے لٹریچر پر نگاہ ڈالی جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اسلاف ہند قدیم کی ہمہ گیر قابلیت سے کوئی بات اور کوئی مسئلہ باقی نہ رہا۔ وہ ریاضیات اور فلکیات کے تمام شعبہ جات پر حاوی تھے، طب اور خواص الادویہ (جس میں جانوروں کے امراض و علاج کا طریقہ بھی شامل ہے) اور فن دواسازی، فن شاعری کے تمام نمونے اور ہر قسم کے ڈرامے اور قصے موجود ہیں۔ ادبیات پر خواہ کتنی ہی جامع و مانع نگاہ ڈالیے سنسکرت لٹریچر ہر ایک کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ زمانۂ قدیم بعید کے ہندوؤں نے لوازم تمدن ایجاد کیے ان کی اشاعت میں سرگرمی دکھائی، ہندوستان کے باہر لنکا، جزائر جاوا و سماٹرا، ملایا، سیام، ہند چینی

[1] ماخوذ از "سویلزیشن اینڈ پروگرس" مقدمہ صلا و نیز صفحہ ۲۶۲ و ۲۶۳

چین، تبت، ترکستان وغیرہ ملکوں میں ہندو تمدن کا اثر اب تک نمایاں ہے۔ اکثر ممتاز ماہروں کا یہ خیال ہے کہ ایران بابل، ایشیائے کوچک، یونان کا تمدن پرانے ہندو آریہ تمدن سے مستفاد ہے۔ اس لحاظ سے اہل سنسکرت علم بردارانِ تمدن کہلانے کے ہر طرح مستحق ہیں۔ ہندو آریہ بزرگوں کا سب سے بڑا کمال تمدنی ویدک شائستگی اور سنسکرت کا عجیب و غریب لٹریچر ہے جس کی بدولت علوم جدیدہ کی کایا پلٹ گئی ہے

درآمد شراب

ہندوستان میں غیر ملکوں سے جو شراب آتی ہے اُس کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے:۔

سنہ ۱۸۶۱ء	ایک کروڑ پچاس لاکھ روپیہ
سنہ ۱۸۷۱ء	دو کروڑ پچاس لاکھ روپیہ
سنہ ۱۸۸۱ء	پانچ کروڑ پچاس لاکھ روپیہ
سنہ ۱۹۰۵ء	آٹھ کروڑ دس لاکھ روپیہ
سنہ ۱۹۱۳ء	بارہ کروڑ پچہتر لاکھ روپیہ
سنہ ۱۹۲۰ء	اٹھارہ کروڑ بائیس لاکھ روپیہ
سنہ ۱۹۲۵ء	اکیس کروڑ روپیہ

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے واضح ہے کہ سنہ ۱۸۶۱ء سے سنہ ۱۹۲۵ء تک درآمد شراب میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے بعد کے اعداد موجود نہیں ہیں مگر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شراب کے استعمال کے خلاف ملک میں جو عام نفرت پیدا ہو گئی ہے اس کے اثر سے یقیناً کچھ نہ کچھ کمی ہوئی ہوگی۔ ہمارے خیال میں ہر محبِ وطن ہندوستانی کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ نہ صرف غیر ملکی شراب بلکہ ہندوستانی شراب کے استعمال سے بھی پرہیز کرے اور دوسروں کو اس کے خراب نتائج سمجھا کر اس کے استعمال سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔ اگر ایسا ہو جائے تو ہندوستان کا بہت روپیہ بچ جائے۔ (ماخوذ)

سیتا جی

(از مسٹر عبدالباقی جیراج پوری)

موجودہ زمانہ میں جبکہ یورپ کی کورانہ تقلید مشرقی تہذیب کے خط وخال تو مسخ کر رہی ہے اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ جامع الصفات مشرقی خواتین کی مبسوط سوانح عمریاں اس طریقہ پر لکھی جائیں جن کو پڑھکر مشرقی کیرکٹر کے وہ نقوش جو مشرق و مغرب کے ارتباط کی وجہ سے ہمارے دل و دماغ سے محو ہو رہے ہیں ابھر آئیں۔ لیکن ارباب نظر ان جلیل القدر ہستیوں سے عام طور پر عدم التفاتی و بے اعتنائی برتتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے یہاں باوجود مختلف علوم و فنون کے فروغ کے فن سیرت نگاری بالکل نامکمل حالت میں ہے۔ خصوصاً خواتین کے حالات بہت ہی کم لکھے گئے ہیں۔

کسی خاتون کے سوانح حیات مرتب کرنے میں سب سے زیادہ نازک مقام وہ آتا ہے جہاں سیرت نگار اس کے چال چلن، عادات و خصائل کا ذکر کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عورت کو بلحاظ حسن و جمال خواہ کتنا ہی عروج کیوں نہ حاصل ہو لیکن اگر وہ صفات حسنہ سے معرا ہے تو وہ اس پھول کے مثال ہے جس میں رنگ و بو نہ ہو، یا وہ ایسا نغمہ ہے جس میں کوئی الحان و ترنم نہ ہو۔ مکمل عورت ہونے کے لئے بہت سی باتیں ضروری ہیں۔ مثلاً شرم و حیا، عفت و عصمت، مہر و وفا، عجز و فروتنی، اخلاص و ایثار، ضبط نفس و خودداری، ادب و اخلاق۔ اگر عورت ان صفات سے متصف ہے تو اس کے مکمل عورت ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ اب ان خصوصیات کے لحاظ سے ہم سیتا جی کے سوانح عمری پر نظر ڈالتے ہیں۔

سیتا جی کی پرورش فطرت نے ایک ایسے خاندان کے سپرد کی جس کا ستارۂ اقبال نہایت آب و تاب کے ساتھ افق ہند پر چمک رہا تھا یعنی اس نیک نہاد شہزادی نے راجہ جنک کے گھر میں جنم لیا جن کے سطوت و جبروت کا شہرہ اُس وقت سارے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا، لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ مستقبل میں یہ اپنے خداداد حسن صورت و سیرت کی بدولت مشہور آفاق ہو گی اور اس کی سیرت دنیا بھر کی عورتوں کے لئے سبق آموز بنے گی۔

فطرت کی بے شمار فیاضیوں میں سب سے بیش بہا عطیہ یہ ہے کہ وہ جس ذات کو فروغ دینا چاہتی ہے

اس کو ایسے ماحول کے سپرد کر دیتی ہے۔ جہاں اخلاقی و ذہنی ترقی کے سب سامان اس کے سنوارنے میں مصروف کار رہتے ہیں۔ انھیں عمروں میں دماغی و ذہنی تعمیر کی وہ داغ بیل پڑتی ہے جسے ہم تربیت سے تعبیر کرتے ہیں اور جو اپنے دورِ مستقبل میں گوناگوں اثرات و کیفیات کے ماتحت نشو و نما پاتی رہتی ہے۔

اس ابتدائی منزل کے وہ دو چار نقوش جن کو بچہ اپنی دماغی بضاعت و صلاحیت کے مطابق قبول کر لیتا ہے۔ عمر کے آخری حصہ تک اس کے دماغ سے زائل نہیں ہوتے۔ فہم و ذکا، زہد و اتقا، تحمل و برداشت حلم و بردباری، عاجزی و انکساری، وفا شعاری و مروت، متانت و سنجیدگی جن کو سیتاجی فطرت کی طرف سے ایک ایک تعیس گروہ میں کے تناسب و توازن نے ان میں چار چاند لگا دیے۔ فطرت انسان کو جو کچھ سکھاتی پڑھاتی ہے وہ قید و بند کے مصنوعی درس و تعلیم کی دسترس سے باہر ہوتا ہے، تعلیم و تربیت دراصل ایک ہی سلسلہ کی دو مختلف کڑیاں ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ چاند ہے یہ ہالہ، وہ بو ہے یہ پھول، اگر کسی کی تربیت ناقص ہے تو تعلیم اس کی اصلاح کرتی ہے۔ سیتاجی جن کا دامن تربیت ان بیش بہا موتیوں سے بھرا ہوا تھا جب حلقۂ درس و تدریس میں داخل ہوئیں تو ان کے فطری جوہر اور بھی چمک اٹھے ایک قدیم مسلمان مورخ (قادر) جس کو نسوانی کیریکٹر کی تنقید سے خاص ذوق ہے سیتاجی کے بارے میں لکھتا ہے کہ "سیتا کی ولادت راجہ جنک کے گھر میں گویا طلوعِ آفتاب کی وہ پہلی کرن تھی جس کے خیر مقدم کے لئے دنیا بہت پہلے سے چشم براہ رہتی ہے" "جس کی آمد ظلمت کو نور میں اور تاریکی کو روشنی میں تبدیل کر کے سارے عالم پر اپنے جاہ و جلال کا سکہ جما دیتی ہے" یہی مورخ آگے چلکر لکھتا ہے کہ:۔

"سیتاجی اوائل عمر ہی سے غور و فکر اور تدبر و تامل کی عادی تھیں۔ بیکسوں کی غمخواری کرنا، غریبوں پر ترس کھانا، ناداروں کی دلجوئی کرنا ان کا روزمرہ کا دستور ہو گیا تھا۔ عام لڑکیوں کی طرح معمولی لہو و لعب سے ان کو نفرت تھی۔ راجہ جنک بھی جو بدرجہ جوہر شناس، ہنر پرور اور علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے اپنی بیٹی کو بیٹوں سے بھی بڑھکر سمجھتے تھے۔ انھوں نے ارکینِ سلطنت اور مدبرانِ مملکت کے مشورہ سے سیتاجی کے لئے ایسے قابل اتالیق مقرر کئے جو صبح و شام ان کی فطرت کے مطابق درس دیتے تھے چنانچہ سن شعور سے بہت پہلے انھوں نے وہ بات حاصل کر لی جس کو لوگ حیرت سے دیکھتے تھے۔ ابھی رسم سوئمبر کی ادائیگی کے دن بہت دور تھے کہ ان کے کمال اور استعداد کا چرچا تمام شمالی ہند میں پھیل گیا۔

سن شعور کو پہونچنے کے بعد عورت ایک ایسی اجنبی دنیا میں قدم رکھتی ہے جہاں اس کے ہر فعل و عمل، نقل و حرکت کا گہرا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اور وہ خود اپنے حسیات میں ایک ہیجان محسوس کرتی ہے۔

وہ صبح سے شام تک اس خیال میں محو رہتی ہے کہ وہ کیا سے کیا ہوتی جا رہی ہے۔ اس نازک، پرآشوب اور کشمکش کے دور میں پاکیزہ تربیت اور اعلیٰ تعلیم ہی عورت کے لئے مشعلِ ہدایت بن جاتی ہے۔ سیتاجی چونکہ تعلیم و تربیت دونوں کے فیوض سے کامل طور پر بہرہ اندوز ہو چکی تھیں اس لئے ان میں اس کیرکٹر کے تکمل اور پالنا بہلانے کی پوری صلاحیت پیدا ہو گئی۔ جس سیرت کے ساتھ قدرت نے سیتاجی کو وہ حسن و جمال بدرجۂ اتم بخشا تھا ان کا رفیق زندگی دنیا کا وہ عظیم القدر انسان ہوا جو شر و فساد، فسق و فجور کی بیخ کنی اور صداقت و راست بازی کا پیغام سنانے کے لئے دنیا میں آیا تھا۔ رام چندر جی کی بدولت سیتا جی کی زندگی بالکل مکمل ہو گئی۔ سیتاجی کی ازدواجی زندگی اُن کے گزشتہ دور سے کہیں زیادہ درخشاں اور شاندار ہے۔ سری رام چندر جی کے بن باس کے زمانہ میں اس نیک سرشت خاتون نے جس صبر و استقلال کا ثبوت دیا ہے اس سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ عورت اہم سے اہم مراحل زندگی میں مرد کے دوش بدوش چلنے کی قدرت رکھتی ہے۔

سری رام چندر جی کی جلاوطنی اور سیتاجی کی وفاشعاری کا واقعہ یہ مورخ (قادر) اس طرح لکھتا ہے کہ جب رام چندر جی کی تاج پوشی کا وقت آیا تو سارے اجودھیا میں چہل پہل تھی اور شہر کا گوشہ گوشہ دلہن بنا ہوا تھا، لیکن دوسرے ہی دن یہ خوشی غم سے بدل گئی، اور رام چندر جی کو اپنے محترم باپ کے حکم کی تعمیل میں ترکِ وطن کرنا پڑا۔ اس کشمکش اور ابتلا کے وقت سیتاجی نے جس وفاشعاری اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا وہ تاریخ ہند کا ایک روشن واقعہ ہے۔ تمام اعزا کی منت و سماجت کے باوجود سیتاجی رام چندر جی کے ساتھ جنگل کی تکالیف برداشت کرنے سے باز نہ آئیں، اور جس طرح موج آغوشِ آب سے جدا نہیں ہو سکتی اسی طرح یہ وفا پرست اور راست باز بیوی اپنے پتی کو نہیں چھوڑ سکی۔ خود رام چندر جی نے بھی بہت سمجھایا کہ طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا ہوگا جو حد برداشت سے باہر ہوں گی لیکن سیتاجی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا کہ "یہ سارے مصائب و آلام، درد و غم کا طوفان صرف آپ کی ایک نگاہِ لطف سے دور ہو جائے گا۔"

تاریخ کی یہ ایک مہتم بالشان حقیقت ہے کہ جو بات عوام میں مشہور ہو جاتی ہے اس کی تحقیق کرنے کی بہت کم لوگ زحمت اٹھاتے ہیں۔ ایک نے دوسرے سے سنا، دوسرے کو تیسرے سے معلوم ہوا، تھوڑے ہی دنوں میں وہ بات صحیفۂ آسمانی کے بمنزلہ سمجھی جانے لگی۔ حالانکہ ذرا سی کاوش کے بعد اصل واقعہ کا پتہ بہ آسانی چلایا جا سکتا ہے لیکن یہ زحمت کون برداشت کرتا ہے۔ سیتاجی کا وہ منظرِ زندگی بھی جب راجہ لنکا فریب دے کر ان کو اٹھا لے جاتا ہے اسی طرح کا ایک واقعہ ہے۔ اصل ماجرا

صرف اس قدر ہے کہ جب رام چندر جی دلفریب آہو کے پیچھے سراپا آرزو بنکر ہو لیتے ہیں تو تھوڑی ہی دور جاکر نالہ و فریاد کی صدا سے فضائے صحرا گونج اُٹھتی ہے۔ سیتاجی جو لچھمن جی کی زیر نگرانی کٹی میں بیٹھی ہوئی تھیں یہ آواز سنکر فرط محبت سے بے قرار ہو جاتی ہیں کہ شاید رام چندر جی پر کوئی آفت نہ آئی ہو۔ اور لکشمن جی سے تحقیق حال کے لئے جانے کو کہتی ہیں۔ لکشمن جی ان کو تنہا چھوڑ کر جانے سے انکار کرتے ہیں مگر بالآخر سیتاجی کے اصرار سے مجبور ہو کر ان کو جانا پڑتا ہے۔ تب کے بعد سفاک راجہ راون فقیر کے بھیس میں ظاہر ہوتا ہے۔ سیتاجی اس کو بھیک دینے باتی ہیں وہ زبردستی ان کو پکڑ لیتا ہے اور اس حال میں کہ وہ روتی جاتی ہیں اور اپنے زیورات نشان دہی کی غرض سے پھینکتی جاتی ہیں۔ وہ انھیں نکالے جاتا ہے۔ اور کچھ مدت کے بعد رام چندر جی اس سے جنگ کرکے سیتاجی کو پھر پا لیتے ہیں۔"

جنگ لنکا کے سلسلہ میں یہی مورخ لکھتا ہے کہ "جب رام چندر جی لچھمن جی کے ساتھ واپس آئے تو سیتاجی کو وہاں نہ دیکھکر سخت مضطرب و پریشان ہوئے۔ ادھر اُدھر تفتیش کی، کہیں پتہ نہ چلا۔ شدہ شدہ ہنومان جی سے جو انھیں کی طرح جلاوطن تھے تعارف ہوا۔ ہنومان جی نے رام چندر جی کی بڑی دلدہی کی اور فوراً وہ بلند مرتبہ پا ہیوں سگریوا در بلی کو تحقیق حال کے لئے بھیجا بعد کو خود بھی گئے اور ایک مدت تک اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد لنکا پہنچے اور بڑی دقت سے اس نے اس محل خاص میں جس میں بدذات راون نے سیتاجی کو نظربند کر رکھا تھا رسائی حاصل کی۔ اس نے دیکھا کہ چند سیاہ فام و زشت رو عورتیں سیتاجی کے گرد و پیش حلقہ کئے ہوئے بیٹھی ہوئی ہیں اور ان کو ترغیب و تحریص دے رہی ہیں، اور سیتاجی مغموم و خاموش بیٹھی ہوئی ہیں۔ اتنے میں سفاک راون محل میں داخل ہوا اور سیتاجی کو مخاطب کرکے کہنے لگا کہ "دیکھو ایک ماہ کا اور وقفہ دیتا ہوں، میری بات مان لو ورنہ مت ظالمانہ سلوک کرونگا۔" سیتاجی نے مردانہ وار جواب دیا کہ "اے ظالم تو مجھے قتل کردے۔ جلادے، جو چاہے سزا دے لیکن میں تیری طرف نظراً ٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی۔"

"اس کے بعد موقع پاکر ہنومان جی گنجان درختوں کی آڑ سے جہاں وہ چھپے ہوئے تھے نکلے اور سیتاجی کو رام چندر جی کی انگوٹھی دکھاکر اس بات کا یقین دلایا کہ وہ اُن کے قاصد ہیں اور اُن کی تسلی و تشفی کی۔ وہاں سے واپس آکر انھوں نے کل حالات رام چندر جی سے بیان کئے جس پر رام چندر جی نے ان کی امداد سے ایک بڑی فوج تیار کرکے لنکا کو روانہ ہوئے اور راون کو قتل کرکے سیتاجی کو واپس لے آئے۔"

"رام چندر جی معرکہ لنکا سر کرکے اور مدت جلاوطنی ختم کرکے واپس آئے اور بھرت جی کے تخت و تاج

سے انکار کرنے پر ان کی تاجپوشی کی رسم دھوم دھام اور شان و شوکت سے ادا کی گئی۔ اور خوشی میں ایک معتد بہ زمانہ گذر گیا اور سیتاجی کے آثار حمل نمودار ہوئے تو اجودھیا کی رعایا میں باہم سرگوشیاں ہونے لگیں اور رام چندر جی نے ظاہر ہیں جاہل طبقہ کے اس ہنگامۂ شک و اشتباہ کو دور کرنے کے لئے ایک عام مجمع کے سامنے سیتاجی کی عفت اور پاکدامنی کی آزمائش کی۔ دہکتے ہوئے انگارے زمین پر بچھائے گئے اور سیتاجی سے مطالبہ کیا گیا کہ اگر وہ باعصمت ہیں تو انگاروں پر سے برہنہ پا گذر جائیں سیتاجی بے خوف و خطر بغیر کسی پس و پیش کے ان انگاروں پر اس طرح گذر گئیں کہ ان کو آنچ تک نہ لگی۔ ہزارہا لوگوں نے اس کا مشاہدہ کیا لیکن بعض لوگوں کے دل صاف نہ ہوئے چنانچہ رام چندر جی نے رعایا کے پاس خاطر سے سیتاجی کو بالمیک جی کی کٹی پر پہونچا دیا۔ جہاں چند ماہ بعد ہی ان کے بطن سے توام لڑکے لو اور کش پیدا ہوئے۔ ان دونوں بچوں کے بشرے سے جلال شاہانہ اور تمکنت خسروانہ ہویدا تھی۔ اشومیدھ جگ کی تقریب میں یہ دونوں لڑکے بالمیک جی کے ہمراہ شریک ہوئے اور متفقہ طور پر یہ قرار دیا گیا کہ ان لڑکوں کو شاہی خاندان میں پرورش پانے کا حق ہے۔ اس جلسہ میں سیتاجی کو واپس بلا لینے کی تحریک بھی کی گئی لیکن چند بد باطن لوگوں نے اس کی مخالفت کی اور جب سیتاجی کو یہ حال معلوم ہوا تو وہ اس روح فرسا و جگر خراش واقعہ کی تاب نہ لا سکیں۔ بیہوش ہوکر فرش خاک پہ گر پڑیں اور پھر کبھی ہوش میں نہ آئیں۔"

غرض سیتاجی نے سوانح حیات میں عفت و عصمت، مروت و وفا، خودداری و ضبط نفس وغیرہ تمام صفات حسنہ کے ایسے اسباق موجود ہیں جن کے مطالعہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر کی عورتیں درس بصیرت لے سکتی ہیں اور اُن کے نقوش قدم پر چلکر عزت و ناموری حاصل کر سکتی ہیں۔

(نوٹ) صرف یہی بات نہ تھی بلکہ ان لڑکوں نے خود اشومیدھ گیہ کے گھوڑے کو باندھ کر مہاراجہ رام چندر وغیرہ سے جنگ بھی کی تھی اور اُن کو شکست دی تھی۔ ایسا زبردست کام بجز رامچندر جی کے لڑکوں کے اور کون کر سکتا تھا؟ یہاں اس قدر بتلا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اشومیدھ گیہ ہند کے زمانہ قدیم میں کسی راجہ کی جانب سے اپنے شہنشاہ ہونے کے اعلان میں کیجاتی تھی۔ ایک گھوڑا آزادانہ طور پر چھوڑ دیا جاتا تھا جس کی ہمراہی میں راجہ کی فوج ہوتی تھی۔ رواج تھا کہ اگر کوئی دوسرا راجہ اُس گھوڑے کو باندھ لے تو فوج سے جنگ کرکے یا تو اُسے ہزیمت دے یا گھوڑا واپس کرے۔ بہرحال جب تک گھوڑا اپنی حسب خواہش ملک بھر کا گشت لگا کر راجہ کے یہاں واپس نہ آجائے اُس وقت تک وہ راجہ گیہ کرنے کا اہل نہ سمجھا جاتا تھا۔ (اڈیٹر)

ایک غیر معروف مرثیہ گو

افسردہ

(از مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی بی-اے)

مجھے ایک قلمی کتاب دستیاب ہوئی ہے جس میں واقعہ خوانی کے طرز پر نثر عبارت کے ساتھ پرانے مرثیے بھی ہیں، کتاب کے ابتدائی اوراق غائب ہیں اور صفحوں پر ہندسے بھی نہیں پڑے ہیں، خاتمہ پر کاتب کا نام یا سن کتابت بھی درج نہیں ہے۔ البتہ ایک مرثیہ پر لکھا ہے "من کلام مرزا جعفر علی فصیح سلمہ اللہ" جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب مرزا فصیح کے دوران زندگی میں لکھی گئی۔ مرزا فصیح ناسخ اور میاں دلگیر کے شاگرد اور میر انیس کے والد میر مستحسن خلیق کے ہمعصر تھے۔ اس طرح زمانہ کا کچھ نہ کچھ تعین ہو جاتا ہے، کتاب کا خط پاکیزہ ہے مگر اغلاط املا بہت ہیں۔

واقعہ خوانی مرثیہ کی ایک قسم ہے، ایک زمانے میں اس کا خاص رواج تھا مگر اب یہ طرز خواندگی بہت کم ہو گیا ہے۔ واقعہ خوانی میں زیادہ حصہ نثر کا ہوتا ہے کہیں کہیں نظم کا جوڑ بھی لگا دیتے ہیں جس کی خوبی یہ ہونا چاہئیے کہ گویا اسی نثر کے سلسلے میں بیساختہ موزوں ہو گئی۔ نمونہ کے طور پر ایک حصہ اسی کتاب سے نقل کرتا ہوں، اس سے نثر کا انداز بھی معلوم ہو جائیگا۔

"حضرت ابراہیم باستماع واقعۂ کربلا زار زار روئے، بحدیکہ ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ خطاب آلہی پہونچا کہ اے خلیل میرے ثواب اس رونے کا زیادہ تر ہے ہزار درجہ قربانی اسمعیل سے جو ہماری راہ میں کرتا۔ (نظم)

شہر بانو سن کے یہ احوال گریاں ہو گئی　　صورت تصویر وہ سکتے میں حیراں ہو گئی
تھام کر پھر اپنے دل کو شہ سے رو رو عرض کی　　واقف راز الٰہی بات تم نے کیا کہی

حضرت نے فرمایا کہ یہ امر شدنی ہے کہ بعد شہادت جمیع اقربا نوبت علی اکبر کی پہونچے گی اور پھر میں یہ صدمہ جانکاہ اٹھا کر شہید ہونگا　　شہر بانو نے کہا کہ اے بادشاہ دو عالم یہ اندوہ اور مصیبت مجھ پر گزرے گی۔ (نظم)

ہائے کیا مجھ سے جدا ہوگا مرا اکبر علی ہائے اُس کے حلق پر آئیگی دشمن کی چھُری

ہائے رونا ہے مجھے یعقوب سال ہجران سے چھوٹ جاؤں گی گدا اپنے مہ کنعان سے

اسی کتاب میں کچھ رباعیاں اور ایک سلام ناتمام اور مکمل و ناتکمل مرثیے بھی ہیں۔ ایک رباعی لاجواب ہے۔ افسوس مصنف کا نام نہیں دریافت ہو سکا۔ ملاحظہ ہو:-

کس نے شبیر سا تعب دیکھا ہے اپنے کنبے کا قتل سب دیکھا ہے

عباس علی سا جہاں میں یارو سقا بھی کسی نے تشنہ لب دیکھا ہے

چونکہ دلگیر کے مرثیے کے پہلے درج ہے خیال ہوتا ہے کہ انہیں کی ہوگی۔

مرثیوں کی تفصیل یہ ہے:-

پہلے دو مرثیے افسردہ کے ہیں، تیسرا مرثیہ خلیق کا ہے، چوتھا فصیح کا، پانچواں عزا کا، چھٹا ضمیر یا تیق کا اور ساتواں دلگیر کا۔ گو مقطع میں "دلگو" ہے جو یقیناً کتابت کی غلطی ہے۔ دلگیر کا مرثیہ مکمل نہیں ہے بلکہ ایک جز جس میں ایک روایت نظم ہے۔ واقعہ خوانی کے سلسلہ میں آگیا ہے۔

افسردہ کے متعلق تذکرہ آب حیات سے اتنا معلوم ہوا کہ سودا و میر کے معاصر تھے اور سکندر و گدا و مسکین کی طرح صرف مرثیہ کہتے تھے۔ آزاد نے ان لوگوں کے کلام کے بارے میں من حیث المجموع یہ رائے قائم کی ہے:

"تصنیفات مذکورہ کو دیکھو تو فقط تبرک ہیں کیونکہ ان بزرگوں کو نظم مذکور سے فقط گریہ و بکا اور ثواب مقصود تھا اور اس میں شک نہیں کہ وہ نیک نیت لوگ حسن تاثیر سے اپنے مقصد دینی کامیاب تھے، شاعری اور صنائع انشا پردازی سے کچھ غرض نہ تھی۔"

جیسا آزاد نے لکھا ہے ان کے مرثیوں میں کوئی مرثیہ ایسا نہیں ہے جو پچاس بند سے زیادہ کا ہو۔ زیر نظر مرثیے ایسے ہی ہیں۔ صرف مرزا فصیح کے مرثیے میں ساٹھ بند ہیں۔

ان مرثیوں میں وہ دھوم دھام نہیں ہے جو انیس یا دبیر کے مرثیوں کا طغرائے امتیاز ہے۔ مگر جذبات نگاری اور تخئیل و محاکات کی خوبیاں نیز صنائع و بدائع کی کمی نہیں ہے۔ شکوہ و جزالت بھی جا بجا ہے، نادر و لطیف تشبیہیں اور استعارے بھی ہیں۔ افسردہ کا ایک پورا مرثیہ نقل کئے دیتا ہوں تاکہ ناظرین خود فیصلہ کر لیں مجھے اس امر کے اظہار میں مطلق تامل نہیں کہ اس مرثیے کی زبان سودا کے مرثیوں کی زبان سے کہیں بہتر ہے۔ اور ایسی روانی و سلاست و شیرینی ہے جو سودا کے مرثیوں میں نہیں پائی جاتی۔ مجھے معلوم نہیں کہ افسردہ کا کلام کہیں محفوظ ہے۔ اگر نہیں ہے تو شاید اس مرثیے کی اشاعت تاریخ ادب اردو میں قابل قدر اضافہ کرے گی کیونکہ سودا کے زمانے سے لیکر ضمیر تک ہمارے پاس بہت کم نمونے اس دور کے مرثیوں کے موجود ہیں کم سے کم

میری نظر سے نہیں گذرے نہ مجھے علم ہے۔

افسردہ کا یہ نظم مرثیہ حضرت عباس کے حال میں ہے اور اس طرح شروع ہوتا ہے:-

جب عباس کی ایما پہ سواری آئی (۱) بعد لشکر کے علمدار کی باری آئی
رو رو کے فرمایا کہ اب مرگ ہماری آئی قتل کرنے کو ہمیں فوج یہ ساری آئی
اپنے خالق سے دعا کی کہ مری بات رہے
جائے سر ہاتھ سے، میدان مرے ہات رہے

اس بند میں خاص طور پر جو بات پسند آئی یہ ہے کہ فطرت کے مطابق ہے، حضرت عباس شجاعوں کے شجاع تھے تاہم لشکرِ عظیم کے مقابل تنِ تنہا ہونے کے اپنی بیکسی پر بے اختیار دل بھر آیا، مگر فوراً ہی ہمت دستگیر ہوتی ہے غیرت جوش میں آتی ہے اور خدا سے توفیق چاہتے ہیں کہ سر جائے مگر بات رہ جائے۔ اسی بات رہنے کو میدان ہاتھ رہنا کہکر افسردہ نے بلاغت کا اعلیٰ نمونہ دکھایا ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ جنگ میں فتح وشکست کچھ اہمیت نہیں رکھتی، اصل فتح مردوں کا اپنی بات پر قائم رہنا اور امرِ حق کی حمایت میں جان تک قربان کر دینا ہے۔

بیت میں دو محاورے، بات رہنا اور میدان ہاتھ رہنا نظم ہیں۔ آج کل کی زبان کے اعتبار سے صرف سر جائے کہیں گے نہ کہ سر ہاتھ سے جائے

یا الٰہی میں ترے شیر کا بیٹا ہوں جواں (۲) مجھکو ماہِ بنی ہاشم بھی کہتے ہیں یہاں
ہے پیمبر کے نشاں کا یہ مرے ہاتھ نشاں مشک لے آیا ہوں اک پیاسی ہے دخترِ ناداں
فوج دشمن ہے کھڑی اپنی صف آرائی میں
آبرو پاؤں سکینہ کی تری سقائی میں

میں یہ سنتا ہوں مرا عم تھا علمدارِ رسول (۳) یا علمدار مرا باپ تھا غمخوارِ رسول
آج شبیر ہے سردار، یہ دلدارِ رسول اسکی خدمت جو کرے ہے وہ مددگارِ رسول
یا الٰہی مجھے عہدہ ہے جو غمخواری کا
حق ادا مجھ سے ہو سرور کی علمداری کا

جب ستم دستِ ستم سے یہ کریں اہلِ ستم (۴) ہے دعا اپنے مکاں سے نہ ہٹیں میرے قدم
جب تلک ہاتھ ہیں یہ ہاتھ سے چھوٹے نہ علم گرچہ بیکس ہوں پہ کافی ہے ترا فضل و کرم
آبرو پاؤں جو دریا کا کنارا پاؤں

پانی لیکر جو پھروں جان دوبارا پاؤں

مندرجہ بالا بندوں میں اُس دعا کی توضیح ہے جو حضرت عباس نے مانگی۔ چوتھے بند میں صنعت براعت، استہلال نہایت خوبی سے صرف ہوئی ہے۔ اس کے تیسرے مصرع میں دست مبارک قلم ہونے اور پانچویں مصرع میں کنار دریا شہید ہونے کی طرف اشارہ ہوگیا۔ چوتھے بند کے دوسرے مصرع میں لفظ سکان کی جگہ اب مقام آئیں گے۔ بعد کے چار بندوں میں حضرت عباس نے اپنے دل اور ہاتھوں اور گھوڑے اور تلوار کو مخاطب کیا ہے۔ یہ پیرایۂ بیان بہت دلکش ہے۔

یہ دعا کرکے کہا دل سے ارادہ کیا ہے (۵) دیکھ چشموں سے کہ دریا یہ پڑا بہتا ہے
شاہ بھی پیاسے ہیں ناموس نبی سب پیاسا ہے — خیمے تشنہ ہے، مروت، تو وہ تن تنہا ہے
میں شجاعت کا ذرا تجھ سے اشارا لے لوں
تیغ کی آب سے دریا کا کنارا لے لوں

دل لگا کہنے کہ تو چل، مری ہمت ہے بلند (۶) جو گوارا ہے تجھے بات، وہ ہے مجھکو پسند
آب منہ پر سے، پیاسا ہے نبی کا فرزند — علقمہ موج شقاوت سے نہو تو پابند
چشمۂ فیض شجاعت ہے علم کے نیچے
ایک حملے میں تو دریا ہے قدم کے نیچے

بیت کا زور ملاحظہ طلب ہے۔

اپنے ہاتھوں سے کہا تم سے بھی ہے یہ میرا کلام (۷) اب تلک حکم سے سب تم نے کئے میرے کام
یہ گھڑی وہ ہے کہ ہوتا ہے مرا کام تمام — جب تلک تن میں ہو مت چھوڑیو قبضۂ حسام
دو طرف دونوں میں تقسیم یہی کام رہے
ایک سے تیغ چلے، ایک علم تھام رہے

جب یہ بات ابن ید اللہ زباں پہ لایا (۸) زور ہاتھوں میں جو تھا اُسنے دو چنداں پایا
اپنے پھر تازیِ چالاک سے یوں فرمایا — وقت آخر ہے سواری کا یہ میری آیا
تو رفاقت مری اس وقت ذرا کر تازی
حق سواری کا مری آج ادا کر تازی

بات یہ سنتے ہی گھوڑے نے اُٹھائی گردن (۹) چست و چالاک کیا تازی نے سب اپنا بدن
جانا عباس نے ہے کام کا میرے توسن — قبضۂ تیغ سے فرمانے لگے پھر یہ سخن

میری نظر سے نہیں گذرے نہ مجھے علم ہے۔

افسردہ کا زیرِ نظر مرثیہ حضرت عباس کے حال میں ہے اور اس طرح شروع ہوتا ہے:-

جنگ عباس کی دریا پہ سواری آئی (۱) بعد لشکر کے علمدار کی باری آئی
رو کے فرمایا کہ اب مرگ ہماری آئی قتل کرنے کو ہمیں فوج یہ ساری آئی
اپنے خالق سے دعا کی کہ مری بات رہے
جائے سر ہاتھ سے، میدان مرے ہاتھ رہے

اس بند میں خاص طور پر جو بات پسند آئی یہ ہے کہ فطرت کے مطابق ہے۔ حضرت عباس شجاعوں کے شجاع تھے تاہم لشکرِ عظیم کے مقابل تن تنہا پہونچ کے اپنی بیکسی پر بے اختیار دل بھر آیا، مگر فوراً ہی ہمت دستگیر ہوتی ہے غیرت جوش میں آتی ہے اور خدا سے توفیق چاہتے ہیں کہ سر جائے مگر بات رہ جائے۔ اسی بات رہنے کو میدان ہاتھ رہنا کہکر افسردہ نے بلاغت کا اعلیٰ نمونہ دکھایا ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ جنگ میں فتح و شکست کچھ اہمیت نہیں رکھتی، اصل فتح مردوں کا اپنی بات پر قائم رہنا اور امرِ حق کی حمایت میں جان تک قربان کر دینا ہے۔

بیت میں دو محاورے، بات رہنا اور میدان ہاتھ رہنا نظم ہیں۔ آج کل کی زبان کے اعتبار سے صرف سر جائے کہیں گے نہ کہ سر ہاتھ سے جائے

یاالٰہی میں ترے شیر کا بیٹا ہوں جواں (۲) مجھکو ماہِ بنی ہاشم بھی کہتے ہیں یہاں
ہے پیمبر کے نشاں کا یہ مرے ہاتھ نشاں مشک لے آیا ہوں اک پیاسی ہے دخترِ نادان
فوج دشمن ہے کھڑی اپنی صف آرائی میں
آبرو پاؤں سکینہ کی میں سقائی میں

میں یہ سنتا ہوں مرا عم تھا علمدارِ رسول (۳) یا علمدار مرا باپ تھا غمخوارِ رسول
آج شبیر ہے سردار۔ یہ دلدارِ رسول اسکی خدمت جو کرے ہے وہ مددگارِ رسول
یاالٰہی مجھے عہدہ ہے جو غمخواری کا
حق ادا مجھ سے ہو سرور کی علمداری کا

جب ستم دستِ ستم سے یہ کریں اہلِ ستم (۴) ہے دعا اپنے مکاں سے نہ ہٹیں میرے قدم
جب تلک بازو ہیں یہ ہاتھ سے چھوٹے نہ علم گرچہ بیکس ہوں پہ کافی ہے ترا فضل و کرم
آبرو پاؤں جو دریا کا کنارا پاؤں

پانی لیکر جو پھروں جان دوبارا پاؤں

مندرجہ بالا بندوں میں اُس دعا کی توضیح ہے جو حضرت عباس نے مانگی۔ چوتھے بند میں صنعت براعت استہلال نہایت خوبی سے صرف ہوئی ہے۔ اس کے تیسرے مصرع میں دست مبارک قلم ہونے اور پانچویں مصرع میں کنارِ دریا شہید ہونے کی طرف اشارہ ہو گیا۔ چوتھے بند کے دوسرے مصرع میں لفظ کان کی جگہ اب مقام لائیں گے۔ بعد کے چار بندوں میں حضرت عباس نے اپنے دل اور ہاتھوں اور گھوڑے اور تلوار کو مخاطب کیا ہے۔ یہ پیرایۂ بیان بہت دلکش ہے۔

یہ دعا کرکے کہا دل سے ارادہ کیا ہے (۵) دیکھ چشموں سے کہ دریا یہ چڑھا بہتا ہے
شاہ بھی پیاسے ہیں ناموس بھی سب پیاسا ہے فوج ہے سو روشن تو وہ تن تنہا ہے
ہیں شجاعت کا ذرا تجھ سے اشارا لے لوں
تیغ کی آب سے دریا کا کنارا لے لوں

دل لگا کہنے کہ تو چل، مری ہمت ہے بلند (۶) جو گوارا ہے تجھے بات وہ ہے مجھکو پسند
آب سے بڑھ کے پیاسا ہے نبی کا فرزند علقمہ نوج تفاوت سے نہو تو پابند
چشمۂ فیض شجاعت ہے علم کے نیچے
ایک حملے میں تو دریا ہے قدم کے نیچے

بیت کا زور ملاحظہ طلب ہے۔

اپنے ہاتھوں سے کہا تم سے بھی ہو میرا کلام (۷) اب تلک عمر سے سب تم نے کئے میرے کام
یہ گھڑی وہ ہے کہ ہوتا ہے مرا کام تمام جب تلک تن میں ہو مت چھوڑیو قبضہ حسام
دو طرف دونوں میں تقسیم یہی کام رہے
ایک سے تیغ چلے، ایک سے علم تھام رہے

جب یہ بات ابن ید اللہ زباں پہ لایا (۸) زور ہاتھوں میں جو تھا اُسنے دو چنداں پایا
اپنے پھر تازی چالاک سے یوں فرمایا وقت آخر ہے سواری کا یہ میری آیا
تو رفاقت مری اس وقت ذرا کر تازی
حق سواری کا مری آج ادا کر تازی

بات یہ سنتے ہی گھوڑے نے اُٹھائی گردن (۹) چست و چالاک کیا تازی نے سب اپنا بدن
جانا عباس نے ہے کام کا میرے توسن قبضۂ تیغ سے فرمانے لگے پھر یہ سخن

سیفِ حیدر کے عمل شاہِ زماں سے ہونگے
جوہرے جوہر یہ عیاں تیری زباں سے ہونگے

اِن بندوں میں بھی فطرت کی مطابقت ہے، مابعد کے شعرا کی طرح گھوڑے یا تلوار کو انسانی قوت نطق و منطق نہیں کیا ہے۔ صرف دل تو ولولہ اٹھتا ہے کہ بڑھو میری ہمت بلند ہے، مگر ہاتھ اس طرح بہک سکتے ہیں کہ حضرتِ عباس اپنے ہاتھوں میں پہلے سے دوچند قوت محسوس کرتے ہیں۔ گھوڑا اپنے دل کی بات گردن اٹھانے اور چارست بھرنے سے ظاہر کر دیتا ہے اور تیغ خود زبانِ حال بن جاتی ہے۔

کہہ کے یہ ڈال دیا قبضۂ شمشیر پہ ہات (۱۰) نام اللہ کا لے کھینچ لی وہ برق صفات
یا علی کہہ کے چلا بر سبِ دریائے فرات شہ نے کی تب یہ دعا بس مجیب الدعوات
فوجِ اعدا پہ مظفر مرا گلفام رہے
سرخرو جنگ میں عباس علمدار رہے

کس معرکہ کا بند ہے اور کیسی لطیف و مربوط و بے ساختہ گریز ہے! افعال و حرکات کی ترتیب حقیقت سے اس قدر موافق ہے کہ محاکات کی بہترین مثال پیش کر دی ہے۔

شاہ کرتے تھے دعا، وہ تھا جھکا لشکر پہ (۱۱) فوج نے دیکھا کہ اک شیر نیستاں آیا ادھر
ہر طرف گھیر لیا فوج نے رستہ آکر وہ بہ صفِ لشکر سے چلے تیغ و تبر
ایک پر نیزے ہزاروں جھکے اور تیر چلے
دیکھ یہ حال کمک کے لئے شبیر چلے

روکا اکبر نے کہ حضرت شاہِ زماں جاتے ہو (۱۲) میں ابھی جیتا ہوں بابا جی کہاں جاتے ہو
چھوڑ اکبر کو شہ تشنہ لباں جاتے ہو جیتے کب آؤ گے تم ایسے مکاں جاتے ہو
مجھ کو فرمائیے تو میں جاؤں مددگاری کو
ایک اکبر ہی یہ کافی ہے سپہ داری کو

شہ نے فرمایا یہ کیا بات تو کرتا ہے قیاس (۱۳) تیری امداد گوارا نہ کرے گا عباس
قطع ہے اُسپہ شجاعت کا دلیری کا لباس تا کہ تلوار ہے کم نہ ذرا ہونگے حواس
کیا بہادر ہے وہ صفدر کوئی مجھ سے پوچھے
اُسکا جوہر ہے وہ جوہر کوئی مجھ سے پوچھے

حضرت عباس بے حد غیور تھے، اُن کے کیرکٹر کا یہ پہلو آفسردہ نے اس مصرع میں خوب نمایاں کیا ہے۔

نے تیری امداد گوارا نہ کیے گا عباس"۔ اور یہ مصرع تو قابلِ ناز ہے ع قطع ہے اُسپہ شجاعت کا دلیری کا لباس

میرا بھائی ہے شجاعانِ عرب میں مشہور (۱۴) آج ہے اُسکو شجاعت کا دکھانا منظور
میں تجھے بھیجوں اُدھر بات ہے انصاف سے دور　　خیر مجھکو بھی رکھا جانے سے تونے مجبور
میں نہیں جاؤں گا پر دیکھ وہ کیا کرتا ہے
کیا علمداری کا حق آج ادا کرتا ہے

پشتۂ خاک تھا اُس جا پہ نہایت جو بلند (۱۵) جا کھڑے اُس پہ ہوئے شاہِ زماں اور فرزند
حلقہ زن فوج تھی عباس پہ واں مثلِ کمند　　جا وے دریا میں وہ کس طور ہر اک راہ تھی بند
جس طرف نعرہ کناں تھام کے شمشیر جھکا
فوجِ روباہ پہ میداں میں گویا شیر جھکا

تیسرے مصرع میں تشبیہ کی ندرت اور مناسبت قابلِ داد ہے گویا کہ واقعہ دیکھ رہا ہے اور یہ آجکل ہو رہا ہے۔

سیکڑوں اس تنِ تنہا پہ چلے تیغ کے وار (۱۶) روکتا جاتا تھا تلوار پہ اُن کی تلوار
سب کو زخمی کیا زخمی نہ ہوا وہ زنہار　　فوجِ اعدا کی ہوئی دیکھ کے اُسکے فرار
شاہ نے دیکھا علم بر لبِ دریا پہونچا
بولے دریا پہ وہ سقائے حرم جا پہونچا

بیت میں صرف اتنا کہہ دینے سے کہ علم بر لبِ دریا پہونچا اور اس امر کو حذف کر دینے سے کہ حضرت عباس لڑتے ہوئے دریا تک پہونچ گئے، فوجِ مخالف کا ہجوم جس میں حضرت عباس گھرے ہوئے تھے کس خوبی سے ثابت ہوا۔ بیت کا آخری مصرع اپنی بے ساختگی میں حضرت امام حسین کی مسرت و فخر و ناز اور حضرت عباس کی شجاعت پر اعتماد کو عجب انوکھے طرز سے ادا کر رہا ہے۔ اس میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ حضرت علی اکبر کو بغیر تخاطب جواب مل گیا کیونکہ وہ اس سے پہلے حضرت عباس کی مدد کو جانے کے لئے کہہ رہے تھے۔

اہلبیتِ نبوی در پہ کھڑے تھے یک جا (۱۷) ماجرا جنگ کا عباس کی سب نے دیکھا
شہ کو آواز دی زینب نے بصد درد و بکا　　بھائی صاحب جو ادھر آؤ تو کچھ ہے کہنا
شاہ اکبر کو لئے خیمے کے در پر آئے
بولے عباس گیا، دیکھئے کیونکر آئے

آخری مصرع علم النفس کے مسئلہ ردِ عمل [illegible]) کی شرح ہے۔ پہلے وہ شادمانی تھی جس کا اظہار اس مصرع سے ہوا ع (بولے) دریا پہ وہ سقائے حرم جا پہونچا۔ اب یہ اس سے پریشانی ہے

انتشار ہے ع (بولے) عباس گیا دیکھیئے کیونکر آئے۔ ایک ایک لفظ سے کس قدر محبت ٹپکتی ہے۔

عرض زینب نے یہ کی میں نے لڑائی دیکھی (۱۸) بھائی جاں کیا ہی شجاعت ہو علمدار نے کی
تم نے فرمایا کہ تم دیکھ رکھو حال سبھی ایک دن تم کو گواہی یہی دینی ہوگی
اس کی مادر سے بیاں کیجیو جرأت اس کی
غمخوری، تشنہ لبی اور شجاعت اس کی

اس بند میں افسردہ نے شاعری کا معجزہ دکھا دیا ہے۔ یہ بند تعریف سے مستغنی ہے۔ ان چند شعروں میں تمام واقعات ماقبل و مابعد کربلا کی طرف اشارہ ہوگیا۔ نہایت مختصر الفاظ میں کچھ بیان کرتا ہوں۔

حضرت عباس کی والدہ حضرت ام البنین ایسے قبیلہ سے تھیں جو عرب میں بھی اشجع مانا جاتا تھا۔ حضرت علی نے آپ سے عقد اس لئے کیا تھا کہ ایسا فرزند پیدا ہو جو شجاعت میں بے نظیر ہو اور امام حسین علیہ السلام کے پسینے پر اپنا خون بہائے کیونکہ ان حضرات کو واقعات کربلا کا پہلے سے علم تھا۔ معرکۂ کربلا کے وقت حضرت ام البنین والدۂ حضرت عباس زندہ تھیں مگر ہمراہ نہیں گئی تھیں بلکہ مدینہ میں قیام تھا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جب میرے بعد سیدانیوں کا لٹا ہوا قافلہ مدینے واپس جائیگا اور حضرت ام البنین کو معلوم ہوگا کہ حضرت امام حسین شہید ہوگئے تو ممکن ہے یہ غیبہ پیدا ہو کہ عباس سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں اُس نے جاں نثاری کا حق اچھی طرح ادا نہیں کیا ورنہ یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ ہمراہ رکاب ہو اور حسین شہید ہو جائیں۔ اللہ اللہ کیا محبت تھی حضرت امام کو اپنے شیدائی عباس سے۔ یہ نہیں گوارا ہے کہ عباس کی وفاداری پر کسی قسم کا شبہ اُن کی والدہ حضرت ام البنین کو ہو لہٰذا حضرت زینب سے فرماتے ہیں کہ تم گواہ ہو کہ عباس نے کیسی دادِ شجاعت دی۔ اور کس جوانمردی سے تین دن کی بھوک پیاس میں دشمنوں سے مقابلہ کیا۔

ضمناً حضرت ام البنین کے کردار پر بھی کیسی اچھی روشنی پڑتی ہے اُن کو فرزند کے مرنے کا غم پیچھے ہوگا پہلے یہی خیال گزرے گا کہ عباس نے جوہر شجاعت دکھانے میں تو کمی نہیں کی۔ خاندان کی آن کو قائم رکھا کہ نہیں۔ حضرت عباس کا مقصد حیات ہی یہ تھا کہ امام حسین علیہ السلام کے قوت بازو ثابت ہوں۔ اس مقصد کی تکمیل میں تو کوئی فروگذاشت نہیں ہوئی۔

سب حرم رونے لگے شاہ کا سن فرمانا (۱۹) بولی زینب کہ مرا حیف وطن میں جانا
تم نہ ہو ساتھ تو دشوار ہے منہ دکھلانا لوگ پوچھیں گے تمہارا ہوا کیونکر آنا
کون سے منہ سے کہیں گے کہ وہ سب قتل ہوئے پیاس سے خستہ جگر جان بلب قتل ہوئے

یہ بند میرے بیان کردہ مطلب کی تصدیق کرتا ہے۔

ابھی کہتی تھی یہ زینب جو اُدھر شور اُٹھا (۲۰) کہتے اعدا تھے کرے آب علمدار پیا
سب خبردار رہو روک لو رستہ اس کا دو جوان اور بھی باقی ہیں میدانِ وغا
پانی پہونچے گا یہ پیاسوں کے اگر کام تلک
جنگ کا خاتمہ ہوویگا نہ پھر شام تلک

اس میں شام کا لفظ بہت پرمغز ہے۔ ایک تو یہی کہ آج شام تک لڑائی ختم نہ ہوگی اور دوسرے دن نہ معلوم کیا رنگ ہو۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اگر ان تین پیاسے شیروں کو پانی مل گیا تو پھر تازہ دم ہوکر ایسے حملے کریں گے کہ فوج کے قدم اُکھڑ جائیں گے اور یہ غازی سب کو بھگاتے ہوئے ملک شام تک لیجائیں گے اور ممکن ہے کہ یزید کے پایۂ تخت کی بنیادیں ہلادیں۔ پیاس ہی ہے جو اُن کو ہلاک کئے دیتی ہے، پانی نہ پائیں ورنہ ان پر فتح پانا محال ہے۔

شاہ نے دیکھا جو ہیں فوج میں دامانِ علم (۲۱) سمت دریا کے چلے لے کے لپیٹ کر باہم
تھے ابھی راہ میں شبیر ہوا یاں یہ ستم ہاتھ عباس کے دونوں ہوئے یکجا قلم
اب علم گرنے کو ہے اس نے یہ معلوم کیا
دامنِ خیمہ سے دامانِ علم چوم لیا

آخری مصرع کس قدر دلخراش ہے اور اُسی کے ساتھ اس علم یا نشان کی جو عظمت و وقعت حضرت عباس کی نگاہ میں تھی اُس کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

جنگ میں ہوگئے مصروف اُدھر سبطِ نبی (۲۲) اس طرف مشک تھی عباس نے دندان میں لی
نہر دریا سے چلا آتا تھا اُس دم زخمی شام کے ابر سے تیروں کی تھی بارش ہوتی
مشک پہ تیر لگا، اُس نے بہایا پانی
بولے عباس کہ پیاسوں نے نہ پایا پانی

معاذ اللہ اس مصرع سے کس قدر یاس اور حسرتوں اور امیدوں کا خون ٹپکتا ہے ع
بولے عباس کہ پیاسوں نے نہ پایا پانی

اگر میر انیس نے بھی یہ مصرع کہا ہوتا تو فخر کرتے

مشک کو چھوڑ دیا اُس نے دہاں سے اپنے (۲۳) دل کو بس توڑ دیا رشتۂ جاں سے اپنے
ہوش برجا کئے پھر تاب و تواں سے اپنے دیکے آواز کہا شاہِ زماں سے اپنے

ہو گئے ہاتھ قلم مشک و علم چھوٹ گئے
اب گرا میں کہ رکابوں سے قدم چھوٹ گئے

معلوم ہوتا ہے کہ افسردہ عالم نفسیات تھا، اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو اس مقام پر ہر مرثیہ گو نے یہی نظم کیا ہے کہ حضرت عباس جب گھوڑے سے گرنے لگے تو امام حسین کو آواز دی کہ آقا مدد کو تشریف لائیے، غلام آپ پر نثار ہوا۔ افسردہ نے ان تعلقات کو پیش نظر رکھا جو ان دونوں بھائیوں میں تھے۔ امام انام حضرت عباس کو نہ صرف اپنا قوت بازو سمجھتے تھے بلکہ اولاد کی طرح محبت کرتے تھے، ادھر حضرت عباس کو بھائی کی غلامی کا ادعا اور اس غلامی پر ناز تھا۔ ان باتوں پر غور کرتے ہوئے افسردہ نے بخلاف دوسرے شاعروں کے طلب امداد کے بجائے حضرت عباس کی زبان سے صرف یہ الفاظ کہلوائے ع اب گرا میں کہ رکابوں سے قدم چھوٹ گئے۔ آقا سے غلام کا طالب امداد ہونا سوء ادب تھا۔ بھائی کا بھائی سے مدد چاہنا استغنائے محبت کے منافی تھا، صرف واقعہ کا علم حضرت امام کو ہو جانا چاہیئے، غلام کی مدد کو آقا، بھائی کی مدد کو بھائی ضرور تشریف لائیں گے، درخواست کیسی؟

شہ نے آواز جو بھائی کی سنی بے پر جوش (۲۴) کیا ہی حملہ کیا اُس فوج میں با جوش و خروش
لاش پر لاش گرا خاک پہ دی دوش بدوش — روکے اب کون کہ اس فوج کے جاتے رہے ہوش
باپ بیٹے یہ وہاں دونوں ہی باہم پہونچے
دم تھا عباس میں تھوڑا سا یہ اُس دم پہونچے

فوج نے یہ کہا کہ لاشہ نہ اُٹھانے پاویں (۲۵) دو جواں اس تن زخمی کو نہ گھر لیجاویں
تیر برساؤ نہ گھوڑوں سے اُترنے پاویں — گھیر لو چار طرف بس میں ہمارے آویں
تیر برساتے تھے ہر ایک پیاسے کی طرف
تیر چلتے تھے محمدؐ کے نواسے کی طرف

باپ بیٹے نے جو پھر گھوڑے اُٹھائے اسدم (۲۶) ضرب شمشیر سے لشکر کو کیا برہم
جبکہ میدان وہ خالی ہوا از فوج ستم — اُترے گھوڑوں سے جواں دونوں بچشم پرنم
شہ نے عباس کو پایا تو سسکتا پایا
جوں چراغِ سحری دن کو چمکتا پایا

تشبیہ جس جگہ اور جس طرح صرف ہوئی ہے قابل تحسین ہے، لفظ "سسکتا" کے شمول نے اور چار چاند لگا دیئے چراغ سحری کا بھڑک بھڑک کر بجھنا سسکنے سے کس قدر مشابہ ہے۔

بیٹھ کر لاش کے نزدیک پکارے بھائی (۲۷) دیکھو ہم آئے ہیں ملنے کو تمہارے بھائی
میرے بازو، مرے ہمدم، مرے پیارے بھائی　　اے سپہر بنی ہاشم کے ستارے بھائی
عزم تم نے جو علمدار کیا کوثر کا
خاتمہ ہو گیا شبیر کے اب لشکر کا

اس بند کی روانی، زبان کی شستگی، جذبات کی گہرائی اور تدریجی ترقی آفسردہ کے سلیقہ مرثیہ گوئی کا آئینہ ہے۔

کہہ کے یہ زانو پہ اپنے لیا عباس کا سر (۲۸) دل کو زخمی کے ہوئی بھائی کے آنے کی خبر
آنکھ کو کھول کے بس دیکھ لیا ایک نظر　　اور تبسم بھی عیاں ہو گیا ہونٹوں پہ
شہ نے فرمایا شہادت کی خوشی کرتے ہو
حیف بیکس مجھے عباس ابھی کرتے ہو

دوسرے مصرع کے الفاظ کہ "زخمی کے دل کو خبر ہوئی" اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ زخموں کی کثرت سے حضرت عباس پر غشی طاری تھی۔ شاعر نے کوئی غیر مانوس وجہ دل کو خبر ہونے کی قائم نہیں کی بلکہ ایک مادی سبب تجویز کیا یعنی یہ کہ سر زانو پر اٹھایا گیا جو کافی وجہ بے خبری سے ہوش میں لانے کی ہو سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ بھائی کی محبت اور محبت کی کشش کے اظہار کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ خود بخود دل کو خبر ہو گئی۔ اس کی وضاحت مابعد کے مصرع سے ہوتی ہے کہ آنکھ بعد کو کھولی۔ "ایک نظر دیکھ لیا" یہ الفاظ ایسے ہیں جن سے ایک طرف تو غشی کی شدت کا اظہار ہوتا ہے اور ایک طرف افراطِ محبت کا جو حضرت عباس کو امام حسین سے تھی، یعنی جس قدر بھی طاقت باقی رہ گئی تھی اس سے مستفید ہو کر بھائی کو دیکھ کر خوش بھی ہوئے اور محبت کا بھی اظہار کیا۔ دیکھنا محبت کی اور مسکرانا دلی مسرت کی دلیل ہے۔ مسکرانا ایک اور بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ نزع میں وہ اطمینان قلب نصیب ہوا جس کے واسطے چند آخری لمحے محفوظ کر لئے گئے تھے۔ ان کی تعداد اتنی کم تھی کہ تمام و کمال صرف کر دینے پر بھی ایک نظر سے زیادہ نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ دوسری نظر چہ جائیکہ زبان سے کوئی لفظ ادا کرنا امکان سے باہر تھا۔

ممکن ہے یہ خیال پیدا ہو کہ دل کو بھائی کے آنے کی خبر ہونا یہاں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ بھائی کے سوا اور کون ہمدردی کرنے والا ہو سکتا تھا۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو دل کو خبر ہونا کوئی خاص بات قابل تذکرہ نہ ہوتی۔ مگر کم سے کم دو شخص ہمدردی کرنے والے ایسے تھے جو میدان میں جا کر ہمدردی

گر سکتے تھے۔ یعنی حضرت امام حسین اور حضرت علی اکبر۔ لہٰذا شاعر نے اُس احساس کی طرف توجہ دلائی جس کو تحت الشعور (Sub-Consciousness) کہتے ہیں۔ میں نے دائرۂ انتخاب کو دو اشخاص میں محدود کر دیا تاکہ شبہ کی گنجائش نہ رہے، ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ غشی کی حالت میں حضرت عباس کو خیمے میں اٹھا لے گئے ہوں اور اس حالت میں زانو پر سر لینے والوں کا دائرہ بہت وسیع ہو سکتا ہے۔ علاوہ اس کے غشی کے بعد جب پہلی خبر دل کو ہو وہ بھائی کی آمد کی ہو تو اس میں اس احساس کا کوئی لگاؤ نہیں ہے کہ زخمی کو یہ دیکھنے کا موقع تھا کہ ہمدردی کرنے والوں کی تعداد کم ہو کر بھائی اور بھتیجے میں محدود ہو گئی ہے بلکہ تحت الشعور یا نیم شعوریت نے بغیر کسی امداد کے بھائی کا علم حضوری پیدا کر دیا اور اس نتیجے پر پہونچا دیا کہ بھائی نے سر اٹھا کے زانو پر رکھا ہے۔ لفظ "ہوئی" اس بات پر دلیل ہے۔

آگے تم جاتے ہو اور پیچھے سے میں آتا ہوں (۲۹) اب نہیں دیر ہے سر اپنا میں لٹواتا ہوں
کوئی دم باقی ہے، کوثر پہ تمہیں پاتا ہوں　　غم تو کھایا ہے پر اب تیغ و تبر کھاتا ہوں
میں تو مر جاتا ابھی، تھامے ہے اکبر مجھ کو
داغ دو دو ابھی سہنے باقی ہیں برادر مجھ کو

بیت میں حضرت علی اکبر اور چھ مہینے کے علی اصغر کی شہادت کی طرف اشارہ ہے۔

اب مجھے خلق میں جینے کا نہیں ہے یارا (۳۰) تم کو مارا نہیں دشمن نے یہ مجھ کو مارا
ہو گیا صبر کا اب میرے گریباں پارا　　مجھ سا بیکس نہ کوئی ہو نہ کوئی بیچارا
قتل میں ہوں گا نہیں کوئی بچانے والا
رن سے لاشے کا نہیں کوئی اٹھانے والا

سر مرا جائیگا جب شام کو بر نوک سناں (۳۱) سر تمہارا بھی چلے گا مرے ہمراہ وہاں
ہے جدائی یہ کوئی دم کی تری بھائی جاں　　ورنہ ہم تم سے جدا ہو دیں یہ کیا ہے امکاں
ہر مکاں مونس و غمخوار ہمارے تم ہو
حشر کے دن بھی علمدار ہمارے تم ہو

یہ تو بتلاؤ سکینہ کو میں کیا دوں گا جواب (۳۲) جب کہے گی کہ چچا کو مرے لے آؤ شتاب
ہو گیا خیمے کے جلنے سے بھی اب مجھ کو حجاب　　زندگانی کہیں آخر ہو مری مثل حباب
تم چلے سبط نبی بیکس و بے یار ہوا
اب ہوں مشتاق اجل جینے سے بیزار ہوا

شہ ابھی کہتے تھے، عباس نے دی آنکھ پھرا (۳۳) ایک ہچکی جو آئی تو دم ٹوٹ گیا
شہ کے زانو پہ سر اُس کا جو ہیں یکبار جھکا 	سے شبیر علمدار کا اب کوچ ہوا
شاہ سے جیں گھڑی لے جان وہ، یکھا بھائی
یوں کہا ہم نے خدا کو تمہیں سونپا بھائی

سر جھکنے سے مراد منکا ڈھلنا ہے۔

ہوگیا چشموں سے شبیر کے دریا جاری (۳۴) آہ اک شور سے اکبر نے جو کی یکباری
سُن کے آواز حرم بولے یہ باصد زاری 	اب علمدار کے ماتم کی کرو تیاری
ہو گیا ہم کو یقیں شاہ کا غمخوار گیا
خلق سے سید شہدا کا علمدار گیا

شُہدا میں (ہ) ساکن پڑھنے سے مصرع موزوں ہوگا۔ یہ تلفظ مرثیہ کی قدامت پر دلیل ہے۔

لے لیا ساتھ سکینہ کو حرم نے جلدی (۳۵) پیٹتے روتے ہوئے آگئے جو ڈیوڑھی پہ سبھی
دیکھا دریا سے تو آتی ہے سواری شہ کی 	غیر اکبر کے نہیں آتا ہے ہمراہ کوئی
نہ علمدار ہے نہ شہ کا علم آتا ہے
شاہ کے ساتھ فقط لشکر غم آتا ہے

دیکھتے آواز پکارے یہ سبھی گریہ کناں (۳۶) کیا کیا تم نے علمدار امام دو جہاں
تم چلے آتے ہو عباس دلاور ہے کہاں 	چھوڑ دریا پہ اُنھیں آئے شہ تشنہ وہاں
سرنگوں شرم سے شبیر چلے آتے تھے
صبر سے تابع تقدیر چلے آتے تھے

پہونچے خیمے کے جو نزدیک امام دوسرا (۳۷) اُس گھڑی زوجہ عباس کی جانب دیکھا
اتنا فرمایا کہ اللہ کرے صبر عطا 	جوش زاری جو ہوا پھر کوئی کلمہ نہ کہا
. اوں ہاتھوں سے لیا چشموں پہ اپنا دامن
اس قدر روئے ہوا دامن دریا دامن

شہ کا یہ حال جو دیکھا تو حرم روئے پکار (۳۸) کون لے کس کی خبر حشر کے داں تھے آثار
گر پڑی خاک پہ غش کھا کے سکینہ یکبار 	بیچ میں اُس کو لیا گرد ہے ماتم دار
آگئے افسردہ کیسے نا بہ یار باقی ہے 	تب تک غم ہے یہ جبتک کہ جہاں باقی ہے

مرثیے میں صرف اڑتیس بند ہیں مگر انہیں میں سب کچھ ہے۔ وجدان گواہی دیتا ہے کہ ان میں کمی یا بیشی کی گنجائش نہیں۔ ہر شے اپنی جگہ پر اور اتنی ہی ہے جتنی ہونی چاہئیے۔ اثر آفرینی کے علاوہ واقعہ نگاری اس پایہ کی ہے کہ ہر چیز کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، ترتیب ایسی ہے کہ معلوم ہوتا ہے ایک بند دوسرے سے بغیر کسی کاوش کے بیساختہ نکلتا آتا ہے۔ شکوہ ورد و خستگی اپنے اپنے محل پر ہیں اور حشو و زوائد کو مطلق دخل نہیں نہ بیکار کی لفاظی ہے۔

آئندہ کسی نمبر میں افسردہ کا دوسرا مرثیہ ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا۔

علمی نثر کی خوبی

شعر کی مخصوص بنیادی خوبی اگر جبت کی جاتی ہے تو نثر اور علمی و عقلی نثر کی عمدگی اس کے انصاف پر منحصر ہے۔ جبت اگر والہانہ و بے اختیارانہ اظہار چاہتی ہے تو انصاف کا تقاضا احتیاط اور صبر و استقلال ہے۔ انصاف کسی شخص یا کسی خاص واقعے کے متعلق نہیں بلکہ اس سے مراد عام عادت انصاف سے ہے جو ہر تخیل اور ہر بیان سے متعلق ہو۔ علمی و تحقیقی بیان کے لئے نثر نگار کا ذہن غیر مطمئن مگر اسی کے ساتھ غیر عاجل بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے تخیل اور طرز بیان کے ان تمام محاسن اور خوشنمائیوں سے بچتا ہوا چلتا ہے جو اصل موضوع سے متعلق نہیں ہوتے اور اس طرح اس کے تکملہ کے بعد اپنی خود ایک خوشنمائی اور خوبصورتی تیار کر لیتا ہے۔

ایک عمدہ علمی نثر کی خوبی یہ ہے کہ اس کے مطالعہ کے دوران میں ہم لکھنے والے کی تحسین و ستائش میں مبتلا نہیں ہوتے اور نہ اس کے متعلق ہمارے ذہن میں کوئی خاص سوال پیدا ہوتا ہے۔ بیان کی اہمیت اس کی سنجیدگی اور اس کی خیالی ترتیب ہماری توجہ کو اس درجہ مصروف رکھتی ہے کہ ہمیں ان امور کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

(ہندوستانی)

یورپ اور امریکا کے کتب خانے

(از جناب ابوالفاضل راز چاند پوری)

برطانیہ | موجودہ زمانہ میں دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں میں برٹش میوزیم یعنی انگلستان کا قومی کتب خانہ اعلیٰ درجہ کا شمار ہوتا ہے اگرچہ پیرس کے قومی کتب خانہ میں مطبوعہ و قلمی کتابوں کی تعداد بہت ہے لیکن جہاں تک کتب خانہ کی تنظیم و ترتیب کا تعلق ہے برٹش میوزیم کے مقابلہ میں دنیا کا کوئی کتب خانہ پیش نہیں کیا جا سکتا، اس میں تینتیس لاکھ پچاس ہزار مطبوعہ کتابیں ہیں، ستر ہزار قلمی کتابیں اور چوراسی ہزار چارٹ اور نقشے وغیرہ ہیں۔ اس کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست ساٹھ جلدوں میں ہے اور سنہ ۱۹۰۰ عیسوی کی قبل چھپی ہوئی کتابوں کی فہرست چھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

برٹش میوزیم کی بنیاد ۱۷۵۳ء میں سر ہینس اسلون کے ذخیرہ کتب عطا کرنے پر رکھی گئی تھی اور اس وقت یہ کتب خانہ مانٹیگو ہاؤس میں قائم کیا گیا تھا جس کا افتتاح ۱۷۵۹ء میں ہوا تھا۔ موجودہ عمارت ۱۸۵۰ء میں تیار ہوئی تھی، مگر یہ عمارت ناکافی ثابت ہوئی اور وقتاً فوقتاً اس میں اضافہ ہوتا رہا ۱۹۱۱ء سے اس کتب خانہ کو قانوناً یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ انگلستان کی ہر مطبوعہ کتاب کی ایک جلد اس کو مفت ملتی ہے۔

انگلستان میں برٹش میوزیم کے بعد دوسرے درجہ کا کتب خانہ آکسفورڈ یونیورسٹی کا کتب خانہ ہے جس کی بنیاد ۱۴۴۵ء میں ڈیوک ہمفریز کی امداد سے رکھی گئی تھی۔ بعد میں یہ لائبریری آکسفورڈ یونیورسٹی کو دیدی گئی۔ اس وقت اس میں تیرہ لاکھ اٹھتر ہزار پانچ سو مطبوعہ کتابیں ہیں، جن میں ایک کثیر تعداد قدیم زمانہ کی کھابوں کی بھی ہے۔ علاوہ ازیں پچیس لاکھ متفرق ادبی مسودے اور چالیس ہزار قلمی کتابیں ہیں، نقشے وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔

کیمبرج یونیورسٹی کا کتب خانہ بھی بہت بڑا ہے، اس کی بنیاد ٹامس اسکاٹ آرچ بشپ آف یارک نے ۱۴۷۵ء میں ڈالی تھی۔ بعد ازاں رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی رہی۔ ۱۷۱۵ء میں بادشاہ جارج اول نے بشپ مور کا کتب خانہ اس کو عطا کیا تھا۔ آج کل اس میں ایک کروڑ سے زیادہ مطبوعہ اور

دس ہزار قلمی کتابیں ہیں۔ ان میں انجیل مقدس کا ایک قلمی نسخہ سولھویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا ہے یہ یونانی اور اطالوی زبانوں میں ہے اور ان زبانوں میں سب سے قدیم نسخہ مانا جاتا ہے۔

اسکاٹ لینڈ کا قومی کتب خانہ سنہ ۱۹۲۵ء میں قائم ہوا ہے۔ اس میں ستر لاکھ مطبوعہ اور بہت سی قلمی کتابیں جمع کی گئی ہیں

ویلس کے قومی کتب خانہ کی بنیاد سنہ ۱۹۰۷ء میں رکھی گئی تھی، اس میں پچاس ہزار مطبوعہ کتابیں ہیں اور پانچ ہزار قلمی۔

آئرلینڈ میں ٹرینٹی کالج (ڈبلن) کا کتب خانہ بھی کافی بڑا ہے۔ اس میں مطبوعہ و قلمی کتابوں کی تعداد چالیس ہزار ہے۔

ویلس اور آئرلینڈ کے کتب خانوں کو ہر مطبوعہ کتاب کی ایک ایک جلد قانوناً مفت ملتی ہے۔

فرانس | فرانس میں پیرس کا قومی کتب خانہ بہت قدیم ہے۔ سنہ ۱۶۱۷ء سے اس کو یہ حق حاصل ہے کہ حدود مملکت میں جو کتاب شائع ہو اس کی دو جلدیں اس کو بلاقیمت ملتی ہیں انیسویں صدی کے شروع میں اس میں چھبیس لاکھ مطبوعہ اور تراسی ہزار قلمی کتابیں تھیں۔ مگر انقلاب فرانس کے زمانہ میں اس میں کتابوں کا بہت اضافہ ہوا اور اکثر اصحاب کے ذاتی کتب خانوں کی کتابیں اس میں داخل کی گئیں، آج کل اس میں چالیس لاکھ مطبوعہ اور ایک لاکھ پچیس ہزار قلمی کتابیں ہیں اور پانچ لاکھ اخبار اور تیس لاکھ نقشے وغیرہ ہیں

روس | روس میں مشہور کتب خانہ لینن گراڈ کا قومی کتب خانہ ہے۔ اس کی بنیاد سنہ ۱۷۹۵ء میں رکھی گئی تھی، آجکل اس میں مطبوعہ کتابوں اور رسالوں کی تعداد چوراسی لاکھ بتیس ہزار ہے اور تین لاکھ اکتیس ہزار ایک سو قلمی کتابیں ہیں۔ اس کو ہر مطبوعہ کتاب کی ایک جلد مفت ملتی ہے۔ اس کتب خانہ کی مکمل فہرست تیار کی جارہی ہے۔

امریکہ | امریکہ میں انیسویں صدی کے نصف تک کتب خانوں کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی تھی مگر اس کے بعد اس طرف بہت دلچسپی کا اظہار کیا گیا۔ گزشتہ نصف صدی میں کتابیں جمع کرنے میں بے انتہا ترقی ہوئی اور ملک میں متعدد کتب خانے قائم ہوگئے جن میں ایک کروڑ سے زیادہ کتابیں ہیں۔ واشنگٹن کے کانگریس کے کتب خانہ میں اکتالیس لاکھ کتابیں اور ایک کروڑ سے زیادہ نقشے وغیرہ ہیں۔ اس کو بھی ہر مطبوعہ کتاب کی دو جلدیں مفت ملنے کا حق حاصل ہے

واشنگٹن کا دوسرا مشہور کتب خانہ سرجن جنرل کا کتب خانہ ہے جو غالباً دنیا کے تمام طبی کتب خانوں میں سب سے اعلیٰ ہے۔ اس میں سات لاکھ پچاس ہزار طب کی کتابیں ہیں۔

جرمنی | جرمنی میں سب سے اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ پروشین اسٹیٹ لائبریری ہے جو برلن میں واقع ہے۔ یہ ۱۶۵۹ء میں قائم ہوئی تھی۔ ۱۶۹۹ء سے اس کو ہر مطبوعہ کتاب کی ایک جلد مفت حاصل ہوتی ہے۔ آج کل اس میں تین کروڑ مطبوعہ اور اٹھتر ہزار ایک سو سینتالیس قلمی کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ دو لاکھ دس ہزار متفرق مسودات و نقشہ جات وغیرہ ہیں۔

جرمنی کا دوسرا قابل ذکر کتب خانہ مونک کی بویرین اسٹیٹ لائبریری ہے جس کی بنیاد سولھویں صدی کے وسط میں رکھی گئی تھی۔ اس میں سولہ لاکھ ستر ہزار مطبوعہ، پچاس ہزار قلمی کتابیں اور سولہ ہزار کتابیں ۱۵۰۰ء سے قبل کی تصنیف کردہ ہیں۔

اٹلی | اطالیہ میں بہت سے قدیم کتب خانے ہیں۔ مثلاً فلارنس کا کتب خانہ لارینشین۔ وینس کا کتب خانہ لائبریری آف سینٹ مارک ۱۳۶۲ء میں قائم ہوا تھا۔ امبروشین لائبریری (میلان) ۱۶۰۹ء میں۔ نیشنل لائبریری (نیپلز) ۱۸۰۴ء میں قائم ہوئے تھے۔ سنٹرل نیشنل لائبریری (فلورنس) موجودہ زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے اٹلی کا بہترین کتب خانہ ہے۔

لیکن اٹلی کے تمام کتب خانے وٹیکین لائبریری کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ جو غالباً یورپ میں سب سے قدیم کتب خانہ ہے۔ یہ پاپائے روم کا ذاتی کتب خانہ ہے جس کی بنیاد پوپ نکولس پنجم نے ۱۴۴۷ء میں رکھی تھی۔ اس وقت سے اب تک اس میں برابر ترقی ہوتی رہی ہے۔ اس کی موجودہ عمارت ۱۵۸۸ء میں تیار ہوئی تھی۔ ۱۶۵۸ء میں اُربنو لائبریری اس میں شامل کردی گئی تھی۔ آج کل اس میں چار لاکھ مطبوعہ کتابیں اور سات ہزار قدیم نسخے ہیں۔ اس کی قلمی کتابوں کا ذخیرہ ترپن ہزار ہے جن میں انجیل مقدس کا یونانی زبان کا ایک قدیم نسخہ بھی ہے جو چودھویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا ہے اور بھی بعض نادر نسخے اس کتب خانہ میں ہیں۔

اس عظیم الشان لائبریری کی ابتک کوئی فہرست تیار نہ ہوئی تھی لیکن ۱۹۲۶ء میں یہ خدمت چار اطالین اور چار امریکن ماہرین فن کے سپرد کی گئی تھی اور ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔

(ماخوذ)

تمنائے مہجور[1]

(مترجمہ مسٹر جان محمد عاطف ۔ وٹ کوی)

(۱)

اے خدا میری آنکھوں کو وہ قوت بینائی، وہ لمعات نور عطا فرما جس سے میں اپنی "محبوبہ مرحوم" کے حسن معصوم کو بے نقاب دیکھ سکوں، ورنہ مجھے بھی اُسی راستہ پر چلنے کی اجازت دے جس راستے سے وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔

(۲)

پیاری محبوبہ! آہ!! تجھے نہیں معلوم کہ میں تیری جدائی میں کس کرب و بے چینی کی حالت میں آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہوں، کیوں ؟ اس لئے کہ اب نہ تو میں تیری سحر طراز آنکھوں سے مسحور ہو سکتا ہوں نہ لبہائے معجز نما سے بہرہ اندوز۔ اور نہ تیرے چاہ زنخدان میں غرقاب ہو سکتا ہوں۔ ہاں! اور تیری اُن سنہری زلفوں کی دید سے بھی محروم ہو چکا ہوں جو باد نسیم کے سرد جھونکوں سے تیرے خوبصورت اور نرم و نازک شانوں پر منتشر ہو جایا کرتی تھیں۔

(۳)

لعبتِ حسن و جمال اے مجسمۂ حیا و تصویر وفا اور اے محبت کی پتلی! آہ! تیری وفات حسرت آیات کے بعد اب مجھے کسی دوسری رفیقۂ حیات اور مونسِ غم کی تلاش و جستجو کی مطلق آرزو اور قطعاً ضرورت نہیں! اب بستر مرگ ہے اور میں۔ دل ہے اور تیرا خیال۔ میرے جسد خاکی میں میری غیر فانی روح تیری روح سے ملنے کے لئے بےچین اور بے قرار ہے! "ارواح فرشتے ہیں" روح، روح کو دیکھ سکتی ہے! مگر اس وقت جبکہ آنکھوں کی پتلیوں کا نور زائل ہو کر آنکھ سکوت دائمی حاصل ہو جاتا ہے

(۴)

اے دنیا کے رہنے والو! ذرا خاموش رہو!! وہ آ رہی ہے۔ کون ؟ موت، پیاری محبوبہ کا پیارا

---

[1] انگلستان کے مشہور شاعر ایرک میکے کی ایک نظم کا آزاد ترجمہ۔ (عاطف)

قاصد۔ وہ قریب ہے اور میں اُسے دیکھ رہا ہوں، وہ میرے لئے پیغام حیات لا رہی ہے۔ اور حیات بھی کیسی؟ دائمی، وہ حُسن کی دیوی پیالۂ دل میں شرابِ محبت بھر کر اپنے قاصد سے کہتی ہے کہ جا اور جلد جا اور اُس تشنہ کامِ محبت کی تشنگی کو بجھا جو مجھ سے ملنے کے لئے اپنی فانی زندگی کے آخری لمحے بسترِ مرگ پر نہایت بے چینی سے کاٹ رہا ہے۔

(۵)

پیارے قاصد! اے موت، آ اور جلد آ اور مجھے اس آفتاب عالم تاب سے دور، عالم ارواح میں جہاں میری منظورِ نظر، الفت حقیقی اور حیات دائمی کے لطف اُٹھا رہی ہے لے چل، میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے اور اُس منزل کا راستہ پکڑ جہاں میری دلربا مہمان نواز میرے آنے کی راہ دیکھ رہی ہے۔
قاصد نے اپنی مفوضہ خدمت سے فراغت پائی اور میں یہ کہتا ہوا اُس کے ساتھ ہو لیا ؎

مدت سے آسیر اُن کے ملنے کی تمنا تھی
آج اُس نے بلایا ہے لینے کو قضا آئی

مختلف اقوام میں سلام اور مزاج پرسی کا طریقہ

(۱) امریکہ والے پوچھتے ہیں، آپ کا مزاج کیسا ہے؟
(۲) چین والے دریافت کرتے ہیں، آپ کے معدہ کا کیا حال ہے، کیا آپ نے اپنے چاول کھائے ہیں؛
(۳) ڈچ یعنی ملک ہالینڈ والے دریافت کرتے ہیں، آپ کا کیا حال ہے، کس طرح گذر رہا ہے؟
(۴) اہل مصر میں مزاج پرسی کا یہ طریقہ ہے کہ وہ دریافت کرتے ہیں کہ آپ کو پسینہ کس طرح آتا ہے؟
(۵) عرب والے دریافت کرتے ہیں، تمہارا مزاج کیسا ہے؟
(۶) انگریز دریافت کرتے ہیں، آپ کے مزاج کیسے ہیں؟
(۷) فرانس والے دریافت کرتے ہیں، آپ اپنے آپ کو کس طرح لئے جا رہے ہیں؟
(۸) جرمنی والے دریافت کرتے ہیں، آپ اپنے آپ کو کس طرح پاتے ہیں؟
(۹) اٹلی والے دریافت کرتے ہیں آپ کس طرح ایستادہ ہوتے ہیں؟

تنقید کتب

افادات مہدی

از ایم. مہدی حسن مرحوم، رائل سائز، ۳۲۵ صفحات
قیمت ہے، مطبوعہ معارف پریس، اعظم گڈھ۔

اردو خواں جماعت سے ایم. مہدی حسن مرحوم (افادی الاقتصادی) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، وہ ایک مشہور انشا پرداز تھے اور اُن کے مضامین کا مجموعہ شائع ہوکر مقبول عام ہو چکا ہے اب وہی مجموعہ کچھ اضافہ کے ساتھ دوبارہ چھپا ہے اور اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس میں تیس مضامین ہیں، شروع میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی. بی. اے کا لکھا ہوا ہے ایک مختصر دیباچہ اور مہدی بیگم (مرتب مجموعۂ ہذا) کے نوشتہ مہدی مرحوم کے سوانح حیات ہیں۔ مضامین کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے کیونکہ یہ مجموعہ عام طور پر مقبول ہے اور جن حضرات نے اس کا مطالعہ کیا ہے وہ مہدی مرحوم کی مخصوص طرز انشا سے بخوبی واقف ہیں۔

الہام منظوم

(دفتر چہارم و پنجم) کراؤن سائز۔ مجلد۔ قیمت ہر دفتر ہے۔
مطبوعہ فیروز پرنٹنگ ورکس، سرکلر روڈ، لاہور

یہ مثنوی مولانا روم کا اردو منظوم ترجمہ ہے جس کے تین دفتر پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ ترجمہ قریب قریب لفظی ہے، مگر اصل منشا بھی ہاتھ سے جانے نہیں پایا ہے۔ فیروز پرنٹنگ ورکس نے اس منظوم ترجمہ کو شائع کرکے اردو زبان کے سرمایہ میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ اس سے پیشتر ہم الہام منظوم کے اول تین دفتروں کا ریویو شائع کر چکے ہیں۔ ہم خوش ہیں کہ اب یہ مہتم بالشان ترجمہ مکمل ہوکر پانچ جلدوں میں ختم ہوگیا ہے جس پر ہم اس کے اولوالعزم پبلشر فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اس کی لکھائی چھپائی صاف و پسندیدہ اور جلد خوشنما ہے۔ ترجمہ کا نمونہ درج ذیل ہے۔

عاشقاں را شادمانی و غم اوست — دست مزد و اجرت خدمت ہم اوست
عاشقوں کا ہے وہی رنج اور خوشی — ان کی مزدوری و خدمت بھی وہی

غیر معشوق ار تماشائے بود　　عشق نبود ہرزہ سودائے بود

غیر کو دیکھے سوا معشوق کے　　عشق بیہودہ ہے اُس کا جان لے

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت　　ہر کہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

عشق وہ شعلہ ہے جب روشن ہوا　　ماسوا معشوق کے پھونکا تو تھا

میر عالم

مؤلفہ محمد سراج الدین طالب سائز سائز ۲۲۰ صفحات۔ قیمت ۲

ملنے کا پتہ: مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

سید ابو القاسم المخاطب بہ میر عالم ریاست حیدرآباد دکن کے ایک نامور وزیر گذرے ہیں اس کتاب میں ان کے سوانح حیات بالتفصیل درج کئے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ریاست حیدرآباد دکن کی کس قدر خدمات انجام دیں اور ریاست کے معاملات انگریزوں کے ساتھ کس قدر حسن تدبیر سے طے کرائے۔ درحقیقت یہ کتاب صرف میر عالم کی سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ اس زمانہ کے سیاسی واقعات کا بھی یہ ایک دلچسپ مرقع ہے۔ خصوصاً انگریزوں کے ساتھ جو مراسلات و معاہدات ہوئے اُن پر اس کتاب میں بڑی حد تک روشنی ڈالی گئی ہے۔ متعدد تصاویر سے بھی کتاب مزین ہے

حُسن کی چنگاری

مرتبہ ڈاکٹر بلٹن بہادر سکسینہ۔ کراؤن سائز۔ ۸۰ صفحات۔ قیمت ۲ر

ملنے کا پتہ:- آتش بانی آفس۔ بریلی

یہ جناب برق دہلوی، آغا حشر کاشمیری، مسٹر بیتاب بریلوی کی چند غزلیات کا مختصر مجموعہ ہے۔ غزلیات مختلف عنوانات کے تحت میں ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ حضرت امیر مینائی مرحوم کی تین غزلوں کے منتخب اشعار بھی ہیں جن کے مطالع یہ ہیں:-

گور میں تم نے جو لاشہ کو اُتارا ہوتا　　لے کے خاتمہ بالخیر ہمارا ہوتا

پھڑک کر مرغ بسمل کی طرح عاشق جو مرتے ہیں　　یہ مقتل میں عروس تیغ کے صدقے اُترتے ہیں

یہ گالی جو لبِ دلربا مل رہی ہے　　دُعا دی تھی اُسکی سزا مل رہی ہے

اس مجموعہ کے سرورق پر ایک خوشنما تصویر بھی دی گئی ہے۔

مباحثہ

"ایک تنقیدی نظر"

از سید اعظم حسین صاحب مدیر ادب لکھنؤ

"زمانہ" ماہ جون سنہ ۳۱ء میں نقادِ زمانہ نے بعض اُردو رسالوں پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے ہم جناب نقاد کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اس سلسلہ میں "ادب" کا ذکر سب سے پہلے کیا ہے لیکن ہمیں اُن سے کچھ دوستانہ شکایت بھی ہے، انھوں نے "ادب" کے مئی نمبر کو تو اُٹھایا لیکن اس میں سے صرف حضرت آرزو مدظلہ کے کلام کو چن لیا اور اُسی سے بحث کی، دوسرے مضامین کا قطعاً ذکر نہ کیا۔ ہم اتنے پر بھی خوش رہتے اگر جناب نقاد نے اس نقد کے دوران میں شاعرِ بزرگ کے کلام کے بہترین حصوں پر روشنی ڈالی ہوتی لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا جس سے غلط فہمی پھیلنے کا اندیشہ ہے اس لئے اُن کے اعتراضات کے جوابات لکھے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ انھیں دیکھ لینے کے بعد ناظرینِ زمانہ اور خود جناب نقاد غلط فہمی سے بچ کر شاعرِ بزرگ کے کلام کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کا موقع پا سکیں گے۔

حضرتِ آرزو کا مطلع ہے ؎

تپتے بن میں رہے پیاسے تو یہ سوکھا پانی — بچے روئے بھی تو آنکھوں سے نہ نکلا پانی

جناب نقاد فرماتے ہیں "اس مطلع کے قوافی میں ایطا ہے" درانحالیکہ ایطا نہیں ہے۔ اُردو میں امر کے جتنے ایسے صیغے ہیں جو انفرادی صلاحیت استعمال نہیں رکھتے وہ مہمل سمجھے جاتے ہیں اُن سے الف ماضی الگ نہیں کیا جاسکتا ہے اور قائم مقام اصلی مانا جاتا ہے۔ اس صورت میں حرف روی کا ایک جگہ اصلی یا قائم مقام اصلی ہونا کافی ہے "سوکھا" اسی قبیل سے ہے۔ یہ بحث اکثر چھڑ چکی ہے اور مسکت جوابات دیئے جا چکے ہیں۔ اسی طرح کے قافیے حضرت امیر مینائی اور حضرت جلال کے یہاں اکثر جگہ موجود ہیں اور دوسرے شعراء کے یہاں بھی ملتے ہیں۔

اسی شعر سے متعلق جناب نقاد کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ پہلے مصرع میں "پانی" کا مفہوم واضح

نہیں ہوتا۔ احتمال کہ اس مصرع میں پانی سے مراد وہ رطوبات ہیں جو آنکھ میں آکر آنسو بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جب تپتے ہوئے بن کی تپش نے ان رطوبات ہی کو خشک کر دیا جو آنسو بنکے نکلتے ہیں تو آنسو کہاں سے نکلیں۔ یہاں مینھ اور پسینے کے ذکر کا کیا موقع ہے۔ قرینہ جو معنی دیتا ہے وہی لئے جاتے ہیں۔

اس کے بعد جناب نقاد نے اس شعر پر اعتراض کئے ہیں سے

پیاسی بچی نے جو منھ پھوڑ کے مانگا پانی
بے کسی دیکھ کے عباس کا جی بیٹھ گیا

اُن کے خیال میں یہاں جی بیٹھ جانا بے محل ہے، جی بھر آنا اس سے بہتر اور برمحل ہے۔ جی بھر آنا اس موقع پر مناسبت ظاہری میں بہتر ضرور معلوم ہوتا ہے اور ہم اسے بھی پسند کرتے ہیں مگر جی بیٹھ جانے کو اس جگہ بے محل کہنا مناسب نہیں۔ جناب نقاد نے جی بیٹھنے کی دو حالتیں خود بیان کی ہیں ۱۔ ضعف ۲۔ مایوسی ضعف کو تین روز کی بھوک پیاس واضح کر رہی ہے اور مایوسی کو امام سے اجازت نہ ملنے کی بے بسی ایسے عالم میں لاڈلی بھتیجی کی حسرت بھری درخواست سُنکر حضرت عباس کی جو فوری حالت ہوئی ہوگی وہ جی بیٹھ جانے کے علاوہ اور کن لفظوں میں ظاہر کی جاسکتی ہے اس وقتی کیفیت کے اظہار سے حضرت عباس کی شجاعت پر حرف نہیں آتا۔ جب ہی پانی لانے کی استدعا پر اجازت مل گئی تو جو کچھ ہمت و شجاعت حضرت کے شایانِ شان تھی اُسے شاعر بزرگ نے آگے چل کر دکھا دیا ہے۔ مسلسل نظم کے صرف ایک شعر سے نتیجہ نکالنا صحیح نہیں۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ نظم اپنے موضوع کے اعتبار سے بحیثیت مجموعی کہاں تک کامیاب ہے۔ یہاں شاعر نے اپنا موضوع "پیاسے ساونت کی لڑائی" قرار دیا ہے، محض "ساونت کی لڑائی نہیں" ایسی صورت میں تشنگی اور اس کے متعلقات کے اثرات کا اظہار دلیری کے منافی نہیں ہے بلکہ نہایت ضروری ہے۔ البتہ قابل اعتراض وہ محل ہوتا جب شاعر ان اثرات کو اس طرح پائدار ثابت کر دیتا کہ پھر پیاسے ساونت سے شجاعت ظاہر نہ ہوتی، لیکن یہاں شاعر نے ایسا نہیں کیا، اُس نے دکھایا ہے کہ اس وقتی اضمحلال قلب کا ردِّ عمل فوراً ہوا اور بہت سخت ہوا۔ پیاسی بچی کی حالت کے مشاہدے نے گویا سمندِ ناز پر ایک تازیانہ کا کام کیا۔ شیر بیشۂ شجاعت غیظ میں آیا اور جہاد نہیں صرف پانی لانے کی اجازت پر ایسی تلوار کہ مخالفین کا ٹڈی دل لشکر تتر بتر ہوگیا۔ ان تمام باتوں کی موجودگی میں شاعر پر یہ اعتراض کیونکر کیا جاسکتا ہے کہ اس نے غازی کو بزدل بنا دیا

اسی شعر کے دوسرے مصرع پر اعتراض ہے کہ یہاں منھ پھوڑ کے مانگنا درست نہیں ہے۔ در انحالیکہ منھ پھوڑ کے مانگنے کے معنی ہیں " مانگنے کی عادت نہ ہونے کے باوجود مانگ بیٹھنا " یہاں خلاف عادت

کرنے کی قوی وجہ ظاہر ہے۔ تین دن کی پیاس ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی، ایسی حالت میں ایک شفیق بزرگ سامنے آ گیا۔ اگرچہ خاندانی تہذیب اور قحطِ آب کا علم مانعِ لب کشائی تھا لیکن پیاس کی شدت نے منہ کھلوا ہی دیا اور حالتِ اضطرار میں حضرت سکینہ پانی مانگ ہی بیٹھیں۔

جناب نقاد نے اس مصرع کو یوں صحیح کیا ہے ع "منہ پہ منہ رکھ کے سکینہ نے جو مانگا پانی" اس تبدیلی سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عباس خیمے میں کسی جگہ اطمینان سے لیٹے ہوئے تھے اُن سے یہ تین برس کی بچی لپٹی ہوئی تھی اور لاڈ پیار ہو رہا تھا۔ درانحالیکہ یہ واقعہ نہیں ہے۔ وہاں تو ایک قیامت برپا تھی، میدانِ قتال گرم تھا، انصار و اعزہ جدا ہو رہے تھے، لاشوں پر لاشیں آ رہی تھیں۔ حضرت عباس کا ساجری یہ تمام خون آشامیاں دیکھ رہا تھا۔ میدان کی اجازت نہیں مل رہی تھی اور اُس کا خون کھول رہا تھا۔ ایسے موقع پر "منہ پہ منہ رکھنا" کہاں تک مطابقِ فطرت ہے؟

تیسرا شعر جس پر اعتراض ہوا ہے یہ ہے ؎

اس لڑائی میں یہی جیت کی اک کنجی ہے　　مرتے مرتے کسی پیاسے کو نہ دینا پانی

جناب نقاد نے "کی اک کنجی" میں تین کافوں کا اجتماع معلوم نہیں کس قاعدے سے غلط یا غیر فصیح قرار دیا ہے۔ تنافر بھی اس وقت کہا جا سکتا تھا جب مصرع کے پڑھنے میں زبان اُلجھتی۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف موصوف نے اس میں تبدیلی نہیں کی۔ ورنہ "جیت کی ہے اک کنجی" یا "جیت کی اک ہے کنجی" کہنے میں حروف کی یکجائی نہ رہتی اور خالص اُردو کی قید بھی نہ ٹوٹتی۔ جناب نقاد نے اصلاح کی ہے "فتح کی اک صورت ہے" لیکن اس اصلاح سے دو دو لفظ عربی کے آ گئے اور اس تصرف نے مصنف کو اس کے مسلک ہی سے ہٹا دیا۔ اگر یہ مصرع مصنف کی رائے میں فصیح نہ ہوتا تو وہ اسے "خالص اُردو" کی قید کے ساتھ متعدد طرح کہہ سکتے تھے۔ مثلاً "جیتنا ہے یہ لڑائی تو ابھی سے سن لو"۔ "جیت اپنی ہے اسی میں کہ لہو تک بہ جائے" وغیرہ وغیرہ بیسیوں مصرعے ہو سکتے تھے لیکن مصرع پر ایک ہی مصرع لگایا جا سکتا ہے۔ جناب نقاد نے دوسرے مصرع میں بھی تبدیلی کی ہے۔ اس تبدیلی نے اس مصرع کے زور کو بھی خاک میں ملا دیا ہے۔ کہاں یہ شان کہ ایک دوسرے سے کہہ رہا ہے "مرتے مرتے کسی پیاسے کو نہ دینا پانی" اور کہاں یہ خیال کہ "مرتے مرتے بھی نہ پائے کوئی پیاسا پانی"۔

چوتھا شعر جو معرضِ بحث میں ہے یہ ہے ؎

گھات سے ہاتھ چلیں ایسی منجی چوٹوں کے　　مانگتا ہی نہ ہو جن چوٹوں کا مارا پانی

جناب نقاد فرماتے ہیں کہ یہاں ہاتھ اور چوٹ دونوں میں سے ایک حشو ہے۔ فنِ سپہگری اور اس کے

مصطلحات پر عبور رکھنے والے جانتے ہیں کہ پالٹ، جنیئو، طمانچہ وغیرہ ان مقامات کا نام ہے جن پر وار کرنے کی مشق کی جاتی ہے اور چوٹ کا اطلاق ہمیشہ اس جگہ کے لحاظ سے ہوتا ہے جو زد میں ہوتی ہے۔ (اسی لئے کہتے ہیں سر کی چوٹ، کمر کی چوٹ) لہٰذا "منجھی چوٹ" کا مفہوم ہوا وہ تکی ہوئی جگہ جس پر ہاتھ ایسا صاف ہے کہ خالی نہیں جاتا۔" اس مصرع سے "گھات سے ہاتھ چلیں ایسی منجھی چوٹوں کے" مطلب یہ ہے کہ ایسے ہاتھ چلیں (وار چلیں) جو تکی ہوئی جگہوں میں مشق سے صاف ہو چکے ہیں۔ صرف "چوٹیں چلنے" کے معنی "ردو بدل" کے ہیں اور صرف "ہاتھ چلنے" میں "ضرب" کا مفہوم نہیں ادا ہوتا۔ اگر ہو سکتا تو جناب نقاد اپنی عادت کے موافق اس مصرع میں بھی اصلاح فرماتے۔

پانچواں شعر جس کی تنقید کی گئی یہ ہے ؎

بیدھڑک باگیں اٹھا دیں جو یہ کہکر سب نے　　دیکھا اب سر سے ہوا جاتا ہے اونچا پانی

اس پر اعتراض ہے کہ دوسرے مصرع میں لفظ "دیکھا" کا فاعل مقدر ہے اور باعتبار محاسنِ شعر عیب یا کمزوری ہے، توضیح و تشریح کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب غلط فہمی کا اندیشہ ہو، یہاں وہ اندیشہ نہیں تھا۔ ایسے کس کی عقل پر پتھر پڑے ہیں جو قرینہ دیکھ کے بھی نہ سمجھے کہ پانی کس کے سر سے اونچا ہوا جاتا ہے۔ تمام مضمون سامنے ہیں، ایک نے جملے کی ابتدا کی تو جملے سے مقصد کا اندیشہ کس کے دل میں پیدا ہوگا۔ یہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور جو اتنا بھی نہ سمجھے وہ کیا سمجھ سکتا ہے۔ یہاں فاعل کا مقدر ہونا عین بلاغت ہے جس کے راز کو جناب نقاد نے شعر میں تبدیلیاں کر کے خود ظاہر کر دیا ہے،

ملاحظہ ہو ؎

باگیں اک ساتھ اٹھا دیں جو یہ کہکر سب نے　　دیکھا غازی (عباس نے) لئے کہ سر سے ہوا اونچا پانی

"بیدھڑک باگیں اٹھا دیں" اور "اک ساتھ باگیں اٹھا دیں" کا فرق اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں "اک ساتھ باگیں اٹھا دیں" آرزو کی اردو نہیں ہو سکتی دوسرے مصرع کے پہلے تصرف نے لفظ غازی استعمال کر کے آپ نے خالص اردو کو داغدار بنا دیا دوسرے مصرعہ کو ٹھس پھسا کر دیا۔ کہاں "پانی سر سے اونچا ہوا جاتا ہے" اور کہاں "پانی سر سے ہوا اونچا" مصرع کا زور بھی گھٹا اور تعقید معیوب بھی ظاہر ہوئی۔ اور دوسرے تصرف میں "عباس" لانے سے قید تو نہیں ٹوٹی لیکن مصرع اور بھی بجھ کے رہ گیا۔

چھٹا شعر جس پر اعتراضات وارد کئے گئے ہیں ؎

بل پڑے تیوریوں پر ہو گئی چتون کچھ اور　　تمتمانے لگا منہ ماتھے سے ٹپکا پانی

کتابت کی غلطی سے "تیوریوں" کی جگہ "تیوروں" چھپ گیا۔ جناب نقاد نے اسے مصنف کی غلطی

قرار دیدی۔ ایسی لغزش کسی ادنیٰ ترین اہل زبان سے بھی ممکن نہیں چہ جائیکہ اس شخص سے جس کی زبان دانی طبقۂ اعلیٰ میں مسلم ہے۔ ہمارے پاس نظم کا مسودہ موجود ہے۔ اگر جناب نقاد کو یوں اعتبار نہ ہو تو ہم اُنھیں دکھا سکتے ہیں۔

"دوسرے مصرع میں ماتھے سے پانی ٹپکنے پر اعتراض ہے، ماتھے سے پانی ٹپکنا جہاں شرم وسکرات کی علامت ہے وہاں گرمی بھی اس کا سبب ہوتی ہے میدان کی دھوپ اور گھوڑا دوڑاتے ہوئے آنا محتاجِ تشریح نہیں۔ پسینے کی علت غصہ کو قرار دینا جناب نقاد کا انتقالِ ذہنی "منھ تمتمانے" کی بنا پر ہے ورنہ ہے یہ کہ پسینہ شدت حرارت سے موجود تھا۔ غصہ میں چہرے کے آثار چڑھاؤ سے حرکت پیدا ہوئی اور اُس نے پسینے کو ٹپکا دیا۔ دو کیفیتوں کی دو علتیں بھی موجود ہیں، یہ واقعہ نگاری ہے غزل کا شعر نہیں کہ خیال کا دائرہ محدود ہو۔

'خالص اردو' کا آخری شعر جس پر اعتراض کئے گئے یہ ہے ؎

آرزو ڈوب کے جب تھاہ لگائے تو کھلے
اتھلی ندی میں نہ ہونے پہ ہے کتنا پانی

پہلا اعتراض یہ ہے کہ 'تھاہ لگانا' محاورہ نہیں ہے 'تھاہ لینا' ہے۔ جہاں تک معلوم ہوا ہے لکھنؤ میں یہ محاورہ دونوں طرح ہے، معلوم نہیں جناب نقاد نے کس اسکول کو مد نظر رکھکر یہ اعتراض کیا ہے۔

دوسرا اعتراض کیا ہے اچھا خاصہ مذاق ہے۔ جناب نقاد کے نزدیک اتھلی ندی میں غوطہ لگانے سے کیچڑ میں لت پت ہونا پڑتا ہے اور خذف ریزے ملتے ہیں اور بحر زخار میں غوطہ لگانے سے دُرِ شاہوار ہاتھ آتے ہیں، مراد اس سے یہ ہے کہ "خالص اُردو" کی قید کیوں اختیار کی، لیکن یہ عجیب منطق ہے، اس کی بنا پر تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شعر ہی کیوں کہا، نثر میں ہر مطلب بآسانی ادا ہو سکتا ہے۔

جناب آرزو نے خالص اُردو کی قید اختیار کر کے اس صفائی سے طرح طرح کے خیالات ادا کئے ہیں کہ اگر ظاہر نہ کر دیا جاتا تو سمجھنا ہی دشوار تھا کہ کوئی خاص پابندی اختیار کی گئی ہے۔ انھوں نے جن جن لفظوں کو حسن استعمال سے فصاحت وبلاغت کی جان بنا دیا ہے ان لفظوں سے آج سیکڑوں بے خبر ہیں اور جو جانتے ہیں ان میں سے اکثر ان کے استعمال میں دقت محسوس کرتے ہیں حضرت آرزو کی اس قادر الکلامی کو دنیا مان چکی ہے۔ افسوس ہے کہ جناب نقاد اس کا اندازہ نہ کر سکے۔ آپ "خالص اُردو" کے متعلق آخر میں لکھتے ہیں 'چند متروک الفاظ یا عامیانہ محاورات و اصطلاحات کو نظم کر دینا کوئی خدمتِ زبان نہیں ہے۔' ہم اس کا جواب تفصیل سے دیتے لیکن مشکل

یہ ہے کہ جناب نقاد کے بیان ہی میں اختلاف ہے۔ آپ نے شروع میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس قول کی بالکل ضد ہے۔ ابتدائے مضمون میں آپ لکھتے ہیں "جناب آرزو خالص اردو کی ترویج کے حامی ہیں اور یہ وہ مقصد ہے جس سے ہر بہی خواہ اردو کو ہمدردی ہوگی" جناب نقاد کو بہی خواہ اردو مانتے ہوئے یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ اُن کا کونسا خیال صحیح ہے۔ اس لئے اب غیر نقید کلام کے اعتراضات کے متعلق کچھ عرض کر کے مضمون ختم کیا جاتا ہے۔

جناب نقاد فرماتے ہیں کہ "اسی نمبر میں جناب آرزو کی ایک غزل اور چند رباعیاں بھی شائع ہوئی ہیں۔ غزل میں دو تین اشعار ایسے ہیں کہ اگرچہ ان میں کوئی خاص بات نہیں تاہم غنیمت ہیں مگر باقی اشعار شک وشبہ سے خالی نظر نہیں آتے۔" ادب کے معرض بحث نمبر میں کوئی غزل شائع نہیں ہوئی ہے۔ ایام عزا کے لحاظ سے یہ اہتمام کیا گیا تھا۔ البتہ اس میں حضرت آرزو کی ایک نظم شائع ہوئی ہے جسے جناب نقاد نے اپنی طرف سے غزل لکھکر اعتراضات شروع کردئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب انسان ہاتھی کو گھوڑا۔ طاؤس کو عنقا سمجھکر ان پر خیال آرائی کریگا تو کہاں تک نہ بہکے گا۔ نظم بلفظ غزل تحریر بھی نہیں ہے اور اس کے بعض اشعار صاف صاف بتا رہے ہیں کہ یہ غزل نہیں ہے نظم ہے اور وہ بھی واقعات کربلا سے متعلق ہماری فروگذاشت آتنی ضرور ہے کہ ہم نے جلدی میں اس غیر معمولی نظم پر نوٹ نہیں لکھا، لیکن وہ نوٹ صرف عوام کے سمجھانے کے لئے ہوتا۔ مبصرین کے لئے تو اتنے قرائن موجود ہیں کہ کسی خاص اشارہ کی ضرورت نہیں۔ اس نظم کے تین شعروں پر اعتراضات کئے گئے ہیں، پہلا شعر یہ ہے ؎

کتنے آئے ہیں یہ اک بیمار غم سے کل مریض　　کر چکے سب کچھ مسیحا اور شفا ہوتی نہیں

یہاں بیمار غم سے مراد ذات حضرت سجاد ہے، اور کل مریض سے مراد مریضان عصیاں، گنہگاران امت ہیں۔ تعلق اس شعر کے مفہوم کا عقائد اہل تشیع سے ہے۔ غزل کا شعر مان لیا جائے تو کیونکر سمجھ میں آئے۔

دوسرا شعر ؎

بے مرے زندہ نہ ہونگی یہ سسکتی حسرتیں　　انتہا جب تک نہ ہولے ابتدا ہوتی نہیں

اس کے متعلق جناب نقاد فرماتے ہیں کہ "عجیب نظریہ ہے، مرنے کے بعد کس کا زندہ ہونا ممکن ہے"۔ لیکن ہمیں اس میں کوئی بات قابل تعجب نہیں معلوم ہوتی۔ انبیا و اولیا نے حکم خدا سے ہزاروں مردے زندہ کئے ہیں، ہر بہار خزاں کے بعد آتی ہے، ہر صبح رات تمام ہونے کے بعد ہوتی ہے۔ ہزاروں امیدیں کامل مایوسی کے بعد پھر پیدا ہوتی ہیں۔

تیسرا شعر ؎

کیا کرامت ہے ترے بیمارِ غم کی زندگی ضعف سے نوبت بجاں ہے اور غذا ہوتی نہیں

اس شعر میں جناب نقاد نے "غذا ہوتے" کو خاص اصطلاح بتایا ہے۔ جس کا تعلق اطبا و مرضا تک محدود ہے۔ اور پھر یہ اعتراض فرمایا ہے کہ مخصوص اصطلاح کو اُردو ادبیات میں کیوں داخل کیا گیا معلوم نہیں جناب نقاد نے یہ اعتراض کیونکر کر دیا۔ بیمار کے ذکر میں بھی اگر اطبا و مرضا کی مخصوص اصطلاح نہ استعمال کی جائے، تو پھر اس کے استعمال کا اور کونسا محل ہوگا۔ زبان کے مخصوص مصطلحات و محاورات کا برمحل استعمال وہ شخص ضرور کریگا جو ان پر عبور رکھتا ہے، یہ کیا زبردستی ہے کہ تیر کا پلہ، تلوار کا گھاٹ کمان کا چلہ، جنگی اصطلاحیں ہیں اس لئے لڑائی کے ذکر میں انھیں استعمال نہ کیا جائے!

رباعیوں میں سے ذیل کی رباعی پر اعتراض ہے ؎

پہلے سوچ، اہتمام کر اس کے بعد تا پھر نہ ہو خواہش دگر اس کے بعد
فانی دنیا کی ہے ہر شے فانی چاہا جو کچھ ہوا، مگر اس کے بعد

اس رباعی کا چوتھا مصرع جناب نقاد کے نزدیک پیچیدہ و بے ربط ہے، جس کی وجہ سے اُن پر رباعی کا مطلب واضح نہیں ہوا، لیکن ہمیں اس میں کوئی پیچیدگی اور بے ربطی نہیں معلوم ہوتی بلکہ وہ سلاست و تسلسل نظر آتا ہے جس سے زبان پر غیر معمولی قدرت ظاہر ہوتی ہے۔ آخری مصرع کا دوسرا ٹکڑا (مگر اس کے بعد؟) ایسا سوالیہ فقرہ ہے جو حسنِ بیان کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے شاعر صاف صاف کہہ رہا ہے کہ جب دنیا اور اُس کی ہر شے فانی ہے تو پھر اسے طلب کرنے سے فائدہ؟ اگر تمہارے حسب طلب فانی چیز مل بھی گئی تو وہ تمہارے پاس کب تک رہ سکتی ہے۔ اس کا تو ملنا اور نہ ملنا دونوں برابر ہے۔ لہٰذا جو کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرو وہ باقی ہو فانی نہو یہ رباعی تو قابل تعریف ہے، قابل مذمت کیونکر ٹھہری؟ جناب نقاد سے استدعا ہے کہ حضرت آرزو کے کلام کو وہ ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیں۔

آخر میں ناظرین "زمانہ" کے ملاحظہ کیلئے حضرت آرزو کی اُسی نظم کے چند شعر پیش کرتا ہوں جس کے ایک حصے کو جناب نقاد نے تنقید کے سلسلے میں پیش کیا ہے۔

جنگ جوئی مایۂ صبر و رضا ہوتی نہیں ہر زمیں بننے سے مقتل کربلا ہوتی نہیں
درد کا کیا ذکر جو گھٹتا بھی ہے بڑھتا بھی ہے دیکھنا یہ ہے کہ بیچینی سوا ہوتی نہیں
زیر خنجر بندگی ہے نیت ادائے فرض کی یہ نماز عاشقی ہے جو قضا ہوتی نہیں
اُف رے پاس نازبرداری گلا کٹنا قبول دُور ہو سر سے مصیبت یہ دعا ہوتی نہیں

یادِ ایام

(از جناب جوشؔ ملیح آبادی)

ہنوز یاد ہے وہ رنگِ اضطراب ترا　　بھرا تھا درد کے نغموں سے جیبِ رباب ترا
عجیب دور تھا وہ دور بھی عجب او ظالم　　لباسِ عشق میں تھا حسنِ لاجواب ترا
جو شب کو روپ میں پروانے کے تھی شمع تری　　سحر کو بھیس میں بلبل کے تھا گلاب ترا
وہ تیری پہلی ملاقات کی روپہلی رات　　اُدھر تھا چاند، اِدھر دیدۂ پُر آب ترا
کبھی خدا کی مشیت پہ برہمی تیری　　کبھی خود اپنی تمناؤں پر عتاب ترا
وہ میری بزمِ محبت وہ تیری شمعِ جمال　　وہ دامِ ذرۂ خاکی میں آفتاب ترا
وہ ماہتاب کے طوفاں میں الجھنیں تیری　　وہ ابر و باد کی ہلچل میں اضطراب ترا
وہ ابتدائے محبت کی تند راتوں میں　　بساطِ غم پہ مچلتا ہوا شباب ترا
وہ آنسوؤں کے دھندلکے میں چشمِ ناز تری　　وہ کروٹوں کے تلاطم میں فرشِ خواب ترا
ہر ایک بات میں چھالا سا وہ تپک اٹھنا　　نظر جھکا کے وہ لہجہ دمِ خطاب ترا
وہ تیری زلف کے خم سے مری پریشانی　　وہ اپنی سانس کی خوشبو پہ پیچ و تاب ترا
وہ اضطراب کا روندا ہوا سکون مرا　　وہ ولولوں کا ستایا ہوا حجاب ترا
مژہ کی طرح جھپکتا ہوا وہ میرا سوال　　وہ دل کی طرح دھڑکتا ہوا جواب ترا

نہ پوچھ جوشؔ سے دونوں میں کون بہتر تھا
وہ التفات ترا، یا یہ اجتناب ترا

سایۂ ابر

باغ پر ہیں جھکے ہوئے بادل　　بو ہے جھونکوں میں سرد پانی کی
کُنج پر چھائی ہے وہ کیفیت　　نیند جیسے ہو نوجوانی کی

آنسو

از مسٹر گوبند لال ادیب بی۔ اے۔ لکھنوی

دل سے اب میں دور ہوں مجھ سے مرا دل دور ہے — رونقِ محفل تھا میں اب مجھ سے محفل دور ہے
آنکھ میں ٹھہرا ہوں لیکن میری منزل دور ہے — قطرۂ برخار افتادہ ہوں ساحل دور ہے

ساز و ساماں کچھ نہیں جز خانہ بربادی مرا
چند لمحے کو مکاں ہے چشمِ فریادی مرا

گو کہ ہوں خاموش لیکن کیوں کرے کوئی سوال — میری صورت پر لکھا ہے میرے دردِ دل کا حال
دیکھ کر مجھکو ہر اک کے دل کو ہوتا ہے ملال — زندگی میری ہے میرے واسطے خود ہی وبال

اہلِ دل ہوتے ہیں مجھکو دیکھ کر اندوہگیں
دل میں کہتے ہیں کہ پاسِ آبرو اس کو نہیں

دل جو تھا پہلے کبھی اپنا اب اپنا دل نہیں — آشنائے بحرِ غم ہوں اور کوئی ساحل نہیں
ہائے وہ رہرو ہوں میں جس کی کوئی منزل نہیں — دل پہ سب کے بار ہوں اب زیست کے قابل نہیں

وہ خوشی جس سے کسی کو وہ مری ہستی نہیں
ساغرِ لبریز ہوں وہ جس میں کچھ مستی نہیں

میں نے نادانی سے رازِ عشق افشا کر دیا — خود بھی رسوا ہو گیا دل کو بھی رسوا کر دیا
اپنے ہاتھوں آپ ہی خونِ تمنا کر دیا — اب کفِ افسوس ملتا ہوں کہ یہ کیا کر دیا

قطرۂ ناچیز ہوں اور ایک دریا دل میں ہے
کیا کہوں کس سے کہوں کیونکر کہوں کیا دل میں ہے

نوائے محوی

(از مولوی محوی صدیقی لکھنوی)

کوئی محفل ہو، فدائے شمع ہر پروانہ ہے
کیا جنونِ عشق ہے، کیا جرأتِ رندانہ ہے

کچھ وہی لذت شناسِ جلوۂ جانانہ ہے
کائناتِ دوجہاں سے جو نظر بیگانہ ہے

فیضِ فطرت عام ہے، ہو حوصلہ اور ظرف بھی
نعمتِ عرفاں سے زاہد آج بھی بیگانہ ہے

ہیں پرستارِ محبت ہی یہاں رسوائے خلق
حُسن کی تاثیر سے دنیا مگر بیگانہ ہے

ہوگئی برباد کتنے بیکسوں کی زندگی
وقفِ مشقِ ناز ابھی تک نرگسِ مستانہ ہے

شمع سے سیکھے کوئی جل جل کے گھلنا عشق میں
جلکے مرجانا بھی کوئی ہمتِ مردانہ ہے

ہے کوئی بے ہوشِ عشرت، ہر کوئی سرشارِ غم
یہ تماشا گاہِ دنیا بھی عجب میخانہ ہے

طور کی سو بجلیاں اُس دل کی قسمت پر نثار
جو ترا جلوت کدہ، جو تیرا خلوت خانہ ہے

ہم تو ہی جو زینتِ بازارِ رسوائی رہا
عشق کا افسانہ ہے یا حسن کا افسانہ ہے!

عشق کی دشوار منزل ہو اگر ہے جاں گسل
ہمقدم راہِ وفا میں ہمتِ مردانہ ہے

شکوۂ بے التفاتی اور نگاہِ ناز سے!
بارگاہِ حسن میں یہ عزم گستاخانہ ہے

بیکسی و یاس کا بھی جی نہیں لگتا جہاں
وہ مرا ویرانۂ دل، وہ مرا غم خانہ ہے

کوئی پوچھے اُن سے حاصل ہے جنھیں معراجِ عشق
یہ دلِ دیوانہ، دیوانہ ہے یا فرزانہ ہے

کیا کروں ساقی! پیا جاتا نہیں اک گھونٹ بھی
دل میں یادِ یار ہے گو ہاتھ میں پیمانہ ہے

بزم میں دیکھیں تو کس کو آج ہے دعوائے ہوش
بے تکلف التفاتِ نرگسِ مستانہ ہے

دورِ عشرت کی تمنائیں ہوں کیونکر دل سے دور
اِن بتوں ہی سے تو یارب زینتِ بتخانہ ہے

اپنی بربادی پہ دو آنسو بہا لوں، کیا مجال!
ناشکیبائی بھی ننگِ ہمتِ مردانہ ہے

میری اُمیدیں بھی اب مجھ سے چُرا جاتی ہیں آنکھ
یہ بھی کیا تعلیم تیری عشوۂ جانانہ ہے

جو بلا آتی ہے محوی ڈھونڈتی ہے گھر مرا
اس دلِ ایذا طلب سے غم کا دو یارانہ ہے

ہنگامۂ کانپور

(از جناب اقبال ورما سحرؔ ہتگامی)

مارچ سنہ اکتیس کی چوبیسویں تاریخ بھی … آہ کتنی نحس تھی تیرے لئے اے کانپور!
ہر طرف اک فتنہ تھا، ہر سمت اک ہنگامہ تھا … یعنی تجھ میں ہوگیا تھا روزِ محشر کا ظہور
ہندو و مسلم بہم یوں مائلِ پیکار سے تھے … جس پہ نفریں کر رہی تھی ہر نفس طبعِ غیور
مرد تو مرد، آہ کیسا ہو رہا تھا اُن دنوں … عورتوں بچوں کے حق میں بھی مصائب کا صدور
کتنی مشتاق سرد مہری تھی کہ جس کی یاد سے … دمبدم سکتے میں آجاتا ہے قلبِ ناصبور
آہ وہ قتل اور وہ غارتگری کی کوششیں … آہ وہ آتش زنی کے بھی مساعی کا وفور
مندر و مسجد پہ وہ ناپاک حملے بار بار … اور مکانوں کا بھی وہ ڈھا ڈھا کے کرنا چور چور
نالہ و شیون کی وہ پیہم صدائے دل خراش … جس کے آگے دفعتاً دب کر رہے شورِ نشور
کس قدر انسانیت سے تھا بشر کو احتراز … کس قدر حیوانیت سے اُسکو ملتا تھا سرور

پھر غضب ہے یہ کہ تھا جو کچھ وہ مذہب کے لئے
تھا جو کچھ وہ نام پر تیرے ہی اے ربِ غفور!

اپنی بربادی سے لے اب درسِ عبرت بھی ذرا … اپنی آبادی پہ تو اے شہر، تھا تجھ کو غرور
اپنے اشکوں سے ذرا دھو کر بہا او بدنصیب … یہ نمایاں ہیں جو تیری لوحِ پرخوں میں سطور
شرم کر اس پر کہ تو بنکر رہا کتنا اچھوت … جبکہ تیری چھوت پھیلی ملک بھر میں دور دور
یہ نہ سوچ اصلاً کہ تھی حکام کی ساری خطا … پھر بھی تھا سب سے زیادہ آہ تیرا ہی قصور
ہے حکومت کا جو تفریق آفریں طرزِ عمل … ہندو و مسلم کو حیف اُس سے نہ کچھ آیا شعور
جبکہ دونوں کو بہم رہنا ہی ہے اس ملک میں … کیا مناسب ہے اُنھیں رہنا بہم ہو کر نفور؟
کچھ اُنھیں واجب ہے دیرینہ تعلق کا لحاظ … اور ہے کچھ ہمسائیگی کا پاس بھی ہونا ضرور
ورنہ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ کر دے گی فنا … آخرش دونوں کو اُن کی رغبتِ فسق و فجور
دین و دنیا کا مٹانا ہے، عمل کرنا حرام … نشۂ خمرِ تعصب سے سراپا ہوکے چور
دیکھیں کب تک سحرؔ اپنی شومیِ تقدیر سے … قائم اِن دونوں کا رہتا ہے یہی عقلی فتور
دیکھیں کبتک رہتی ہے یہ بند شوخی تیرگی … دیکھیں کب دکھلائی دینے کو ہے آزادی کا نور

لطفِ سخن

(جناب برق دہلوی)

لذتِ گویائی مستور خاموشی میں ہے
ایک محویت کا عالم خود فراموشی میں ہے

پوچھ رندوں سے اسے زاہد یہ مئے نوشی میں ہے
مستیٔ وجد آفریں کا لطف مدہوشی میں ہے

کھیل قسمت کے زمانے کی دورنگی دیکھئے
کوئی صرفِ غم ہے، کوئی شغلِ مئے نوشی میں ہے

خود حجابوں سے نہاں ہو اور جلوے بے حجاب
حسنِ مطلق! تیری روپوشی بھی روپوشی میں ہے

مبتلائے یاس کیوں ہے اے دلِ عصیاں شعار
رحمتِ غفار خود فکرِ خطا پوشی میں ہے

زندگی کی کشمکش کا راز ہے مفہومِ سکوں
دن کے ہنگاموں میں ہے، راتوں کی خاموشی میں ہے

شاہدِ معنی تصور میں بھی آسکتا نہیں،
ایک عالم ہے کہ ارمان ہم آغوشی میں ہے

حسرت آلودہ نگاہیں لب پہ ہے مہرِ سکوت
برقؔ دردِ عشق کی تصویر خاموشی میں ہے

(قاضی اختر جوناگڈھی)

نکلے وہ بزمِ ناز سے منہ اپنا پھیر کر
گردن پہ اپنی خونِ تمنا لئے ہوئے

آغازِ عشق سے ہوئی اپنی نمود و بود
آئے ازل سے ہم دلِ بیتاب لئے ہوئے

یہ دل جلوں کی آہ شرربار کا اثر
ہے داغ دل پہ لالۂ صحرا لئے ہوئے

موسیٰ کی طرح محوِ نظارہ ہوں میں ادھر
وہ ناز سے ادھر یدِ بیضا لئے ہوئے

ایمن کی وادیوں میں ابھی ہے شرارِ برق
آئے تو کوئی شوقِ تماشا لئے ہوئے

اسرارِ کائنات کو اخترؔ وہ پا سکے
آئے یہاں جو دیدۂ بینا لئے ہوئے

(جناب منورؔ لکھنوی)

اگر محوِ صدائے جرسِ دل ہو جائے
نہیں ممکن کہ پھر آوارۂ منزل ہو جائے

جو مری بزم ہے وہ اُن کی ہی محفل ہو جائے
بیٹھیں اس طرح کہ اُٹھنا انھیں مشکل ہو جائے

شعلۂ غم سے اگر خاک مرا دل ہو جائے — سرمۂ طور کا رتبہ اُسے حاصل ہو جائے
ہوشمندوں کے لئے قید سزاوار نہیں — جو ہو دیوانہ وہ پابندِ سلاسل ہو جائے
میرا دل آپکا ہے اور رہے گا لیکن — آپ اپنا جسے کہتے ہیں مرا دل ہو جائے
شعر کہتے ہو تو محتاط منوّر رہنا — وہ ہنر ہی نہیں جو عیب میں داخل ہو جائے

منتخبات

سو حسرتیں لئے دلِ حسرت مآب میں — آباد ہو رہا ہوں جہانِ خراب میں
ہر روز آدمی کو جہانِ خراب میں — انجامِ زندگی نظر آتا ہے خواب میں
اب سیرِ گل کہاں دلِ رنگیں نظر کہاں — اک خواب تھا جو دیکھ لیا تھا شباب میں
دیکھو شعاعِ حسن کی یہ جلوہ ریزیاں — یوں ہیں نقاب میں کہ نہیں وہ نقاب میں

(احسن مارہروی)

ملتا رہا سکوں کا مزا اضطراب میں — یادش بخیر وقت جو گزرا شباب میں
منزل بھی پیچھے رہ گئی ساقی بھی چھٹ گئے — پہنچا ہوں میں کہاں سے کہاں اضطراب میں

(نوح ناروی)

بے پردہ کہہ رہی ہیں اداؤں کی شوخیاں — پنہاں ہے ایک ناز کی دنیا نقاب میں
وارفتہ بجا نہ ہو اسے نگاہِ شوق — ناداں ہے آفتاب کہاں طشتِ آب میں

(عاشق ڈبائیوی)

پھر کچھ سکون سا ہے مرے اضطراب میں — لے برقِ بے پناہ چمک جا نقاب میں
آدابِ عاشقی کا کچھ ایسا لحاظ تھا — جی کھول کر تڑپ نہ سکے اضطراب میں

(ضیا اکبرآبادی)

اک موجِ انقلاب بہا لے گئی اُسے — جتنی ہوا بھری تھی دماغِ حباب میں
کیف آشنا ہو جس سے مرا نغمۂ حیات — مضطرب وہ تار جوڑ دے اپنے رباب میں

(منقول) (آرزو ڈبائیوی)

یادِ رفتگاں

مہاراجہ سر پربھو نرائن سنگھ مرحوم

ہز ہائینس مہاراجہ سر پربھو نرائن سنگھ صاحب بہادر جی سی ایس آئی والیٔ بنارس جن کا انتقال تقریباً چھہتر سال کی عمر میں حال میں ہوا ہے بھومیہار برہمن تھے۔ اس خاندان کی بنیاد راجہ منسا رام نے ڈالی تھی جو نواب شجاع الدولہ کے زمانہ میں بنارس کے ناظم تھے۔ ۱۷۳۸ء میں ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند راجہ بلونت سنگھ ان کے جانشین ہوئے اور اپنے قوت بازو سے گرد و نواح کا بہت سا علاقہ فتح کرلیا۔ انگریزوں کو فوجی مدد دینے کے صلہ میں بکسر کی لڑائی کے بعد ان کا مفتوحہ علاقہ ان کے پاس رہنے دیا گیا۔ ۱۷۷۰ء میں راجہ بلونت سنگھ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے چیت سنگھ گدی پر بیٹھے مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی مخالفت کی وجہ سے گورنر جنرل ہسٹنگز نے ان کو معزول کرکے راجہ بلونت سنگھ کے نواسے راجہ مہیپ نرائن کو تخت نشین کیا۔ لیکن صوبہ و شہر کا انتظام خود سرکار نے اپنے ہی قبضہ میں رکھا۔ ۱۷۹۴ء میں راجہ مہیپ نرائن نے اپنے علاقہ کا بہت سا حصہ جس میں اضلاع بنارس، غازی پور، بلیا اور جونپور شامل تھے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس شرط کے ساتھ حوالہ کر دیا کہ ضروری مصارف کے بعد جو رقم بچے ان کو دی جائے۔ باقی علاقہ ابھی تک خاندانی علاقہ کے طور پر مہاراجہ کے قبضہ میں ہے۔ ۱۷۹۵ء میں راجہ مہیپ نرائن کا انتقال ہوا اور ان کے فرزند راجہ اودت نرائن سنگھ ان کے جانشین ہوئے جو ۱۸۳۵ء تک زندہ رہے جس کے بعد ان کے بھتیجے و متبنیٰ راجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ بہادر مسند نشین ہوئے۔ انھوں نے غدر کے زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو قابل قدر امداد دی جس کے صلہ میں مہاراجہ بہادر کا خطاب پایا اور سلامی میں دو توپوں کا اضافہ ہوا۔ پھر ۱۸۷۷ء میں ان کو جی سی ایس آئی کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۸۸۹ء میں وہ بھی رہگرائے عالم جاودانی ہو گئے اور ان کے بعد ان کے بھتیجے اور پسر متبنیٰ مہاراجہ سر پربھو نرائن سنگھ بہادر تخت نشین ہوئے۔

آپ ۲۶ نومبر ۱۸۵۵ء کو پیدا ہوئے تھے اور ۱۲ جون ۱۸۸۹ء کو جب آپ کو گدی ملی تو مہاراجہ بہادر کا خطاب بطور ذاتی اعزاز اور ہز ہائینس کا لقب جو آپ کے چچا کو حاصل تھا آپ کو بھی عطا ہوا۔ ۱۸۹۷ء

کے قحط میں آپ نے اپنی رعایا کی نہایت فیاضی سے امداد کی جس کے صلہ میں آپ کو جی۔سی۔آئی۔ای کا خطاب ملا۔ مہاراجہ مرحوم کو رفاہ عام کے کاموں سے خاص طور پر دلچسپی تھی اور اُن کی پبلک خدمات کی داد برٹش گورنمنٹ وقتاً فوقتاً دیتی رہی ہے۔

آپ ایک عالم باعمل نہیں تھے۔ آپ کی فیاضی، رعایا پروری، نیک نفسی اور رحمدلی کے اکثر واقعات زبان زد خاص و عام ہیں۔ قابل لوگوں اور مستحق حاجتمندوں کی حاجت روائی میں آپ کو بہت مسرت حاصل ہوتی تھی۔ آپ اپنی رعایا کے رنج و خوشی میں شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ کی رعایا میں جب کسی خاندان میں موت ہوتی تھی تو مہاراجہ مرحوم اس کے جانشین کو دسویں کے روز ایک پگڑی بھیجتے تھے اور جب کسی کے یہاں شادی یا جنیئو ہوتا تھا تو نوشہ کے لئے مبارکباد دیجاتی تھی۔ آپ کی ریاست کے دولتمند لوگ ہر اصلاح و خیر کے کام میں آپ کی رہنمائی کے خواہشمند ہوتے تھے۔ غربا مصیبت کے وقت آپ کی امداد چاہتے تھے اور آپ کی ذات سے سب کی مرادیں پوری ہوتی تھیں۔

مہاراجہ مرحوم طبعاً بہت زندہ دل واقع ہوئے تھے وہ دنیاوی معاملات اور معمولی آدمیوں کی مشکلات کو خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ اپنی ریاست میں آپ نے حاکم و محکوم کے مابین کسی قسم کی کوئی رکاوٹ باقی نہیں رکھی تھی اور رعایا کی درخواستوں کی خود بنفس نفیس سماعت فرماتے تھے

درحقیقت مہاراجہ مرحوم بنارس کے روح رواں تھے۔ کاشی کی ہر مفید عام تحریک میں آپ کا قدم آگے رہتا تھا۔ میلوں اور تہواروں کے موقعوں پر آپ عوام کی رہنمائی کرتے تھے۔ بنارس میں موسم بہار میں بوڑھوا منگل کا تہوار جس تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے اس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے، پانچ دن تک لوگ دریا میں کشتیوں پر لہو و لعب میں مشغول رہتے ہیں دریا بھی اُن کی خوشی میں شرکت کرکے کاشی کے مشرقی کنارے پر کلیلیں کرتا نظر آتا ہے۔ آسمان ترانوں سے گونج اٹھتا ہے۔ طرح طرح کے پھول پنکھڑیوں سے گنگا کا کنارہ معطر ہوجاتا ہے۔ مہاراجہ کی کشتی گھوڑوں اور طاؤسوں سے آراستہ ہوکر اور خاندانی دیوتاؤں کو لیکر رام نگر کی جانب سے روانہ ہوتی ہے اور اُن یاتریوں سے ملاقات کے واسطے جو بیچ گنگا سے اسی گھاٹ آتے ہیں آگے بڑھتی ہے۔ اس وقت ہر خاص و عام کی زبان پر یہی کلمہ ہوتا ہے کہ "مہاراجہ صاحب تشریف لا رہے ہیں" پھر رام لیلا کا موقع موسم خزاں کا پیغام لاتا ہے، یہ رام نگر کا سب سے بڑا تیوہار ہے، مہاراجہ صاحب اس موقعہ پر بلاناغہ میلہ میں شریک ہوتے ہیں۔ اہل بنارس دریا کو عبور کرکے شری رام چندر جی کے درشنوں کو ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں آکر جمع ہوتے ہیں۔ بنارس کا عبرت طلب بھی ہندوستان کے بہت بڑے میلوں میں شمار ہوتا ہے کیونکہ اس

موقعہ پر رعایا مہاراجہ کے ساتھ اپنے جذبات دلی کا اظہار کرتی ہے جس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اب بھی ہندوستان میں مذہب میں کس قدر زور اور اثر ہے۔ مہاراجہ مرحوم حسبِ دستور ان موقعوں پر رونق افروز ہوتے اور اہل بنارس سے خراجِ تحسین لیتے تھے۔

آپ پکے سناتن دھرمی تھے۔ وہ قدیم ہندو دھرم کے مخزن خیال کئے جاتے تھے، لیکن آپ اُن سناتن دھرمیوں میں نہیں تھے جو اصلاح کے سخت مخالف ہوتے ہیں، چنانچہ جب کبھی بنارس کے رجعت پسند پنڈت کسی اصلاحی تحریک میں روڑے اٹکانے کی فکر کرتے تو مہاراجہ صاحب کمال دانشمندی سے اعتدال کا درمیانی راستہ اختیار کرتے تھے جس سے تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی آپ ہر دلعزیز ہو گئے تھے۔ آپ قدردانِ علوم و فنون اور ہندو یونیورسٹی کے بہت بڑے سرپرست تھے۔ سنسکرت کالج میں مذہبی عنصر آپ ہی کی بدولت قائم ہوا۔ اُن کا قول تھا کہ جو شخص برہمن نہیں ہے اس کو مذہبی تعلیم دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن اُن کے خیال میں منوجی کے قول کے مطابق ہر شخص تعلیم اور طریقہ زندگی کے لحاظ سے برہمن کا درجہ پانے کا حقدار تھا۔ اس مسئلہ پر اکثر بحث و مباحثہ ہوا مگر مہاراجہ مرحوم اپنے عقیدہ پر برابر قائم رہے اسی رواداری اور وسیع الخیالی کی بدولت آج آپ کی وفات پر ہر طبقہ کے لوگوں کو دلی افسوس ہے۔

آپ کے بعد آپ کے ولیعہد کنور اُدت نراین سنگھ صاحب گدی پر بیٹھے ہیں آپ کی تاریخ پیدائش ۶ نومبر ۱۸۷۵ء ہے اور آپ مہاراجہ مرحوم کے زیر سایہ تعلیم و تربیت نیز کافی تجربہ حاصل کر چکے ہیں اُمید ہے کہ آپ اپنے والد مرحوم کے قدم بقدم چلکر اپنے خاندان کا نام بدستور روشن رکھیں گے۔

ریاست بنارس کا رقبہ نو سو پچاسی مربع میل اور آبادی تقریباً پانچ لاکھ ہے۔ ریاست کی سالانہ آمدنی قریب پندرہ لاکھ روپیہ ہے۔ ریاست کی فوجی طاقت ایک سو پچاس سوار، پانچسو پیدل اور پچاس توپچی پر مشتمل ہے اور تیرہ ضرب توپ سلامی مقرر ہے۔

مسٹر ایس۔ خدابخش مرحوم

مسٹر ایس۔ خدابخش مرحوم جن کا انتقال اگست ۱۹۳۱ء کے پہلے ہفتہ میں ہوا ہے ایک غیر معمولی قابلیت کے شخص تھے۔ قدرت نے اُن کو بڑی فیاضی کے ساتھ ذہنی و دماغی قوتیں عنایت کی تھیں۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہی مرحوم کو انگلستان بھیجدیا گیا تھا جہاں وہ سات سال تک متواتر آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم پانے کے بعد ایم۔ اے اور بیرسٹری کی سندیں حاصل کر کے ۱۸۸۹ء میں ہندوستان واپس آئے

اور ڈھاکہ میں بیرسٹری شروع کی، پھر ۱۹۰۱ء میں کلکتہ چلے گئے جہاں تھوڑی ہی مدت میں آپ کی قانونی قابلیت کا شہرہ ہوگیا اور فوجداری عدالتوں میں آپ خاص وقعت کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ بہرحال اسی سال آپ کلکتہ یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوگئے اور بعدازاں قانونی کالج کے پروفیسر اور یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے۔

مسٹر خدابخش مرحوم اردو۔ فارسی۔ عربی اور انگریزی زبانوں کے ماہر ہونے کے علاوہ قدیم یونانی و رومی زبانوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ انگریزی زبان پر تو غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ آپ کے علمی و ادبی انہماک کا بہترین ثبوت آپ کی متعدد تصانیف ہیں جن میں سے بعض کے نام درج ذیل ہیں اور جو سب کی سب انگریزی میں ہیں

(۱) تاریخ تہذیب اسلام مطبوعہ	۱۹۰۵ء	(۵) عہد خلفا کی تہذیب	۱۹۲۰ء
(۲) ہندوستانی اور مسلم مضمون	۱۹۱۲ء	(۶) سیاست اور اسلام	۱۹۲۰ء
(۳) مسلمانوں کی تاریخ	۱۹۱۴ء	(۷) تحفۂ محبت	۱۹۲۳ء
(۴) روایتیں اور کہاوتیں	۱۹۱۹ء	(۸) تہذیب عرب	۱۹۲۶ء

(۹) ہندوستانی اور اسلامی مطالعہ ۱۹۲۷ء۔ یہ آخری رسالہ ہے جو مرحوم نے تالیف کیا تھا۔ اس میں مہاتما گاندھی، سر آشوتوش، سی۔ آر۔ داس وغیرہ کے طرزِ معاشرت وغیرہ کا قابل قدر ذکر ہے۔

مرحوم ایک مدت سے ایک مبسوط کتاب "روشنیِ اسلام" کے نام سے لکھ رہے تھے۔ اس کی تکمیل کے ساتھ ان کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں مگر افسوس یہ کارِ عظیم تکمیل کو نہ پہونچ سکا۔

مستقل تصانیف کے علاوہ آپ اکثر ملکی۔ قومی اور ادبی مسائل پر قابل قدر مضامین بھی لکھتے تھے آپ کی علمی دلچسپی کی بہترین یادگار پٹنہ کی مشہور و معروف "خدابخش لائبریری" ہے جس میں نادر و نایاب کتابوں کا نہایت قابل قدر ذخیرہ موجود ہے۔

آپ نہایت بااخلاق اور ملنسار، صاف باطن و صاف گو واقع ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے ہر مذہب و ملت کے افراد سے آپ کے تعلقات دوستانہ تھے اور سب ان کی عزت کرتے تھے۔ ان کے انتقال سے محفل علم و ادب میں ایک ایسے فرد کی کمی ہوگئی ہے جس کا جانشین ذرا مشکل سے پیدا ہوگا۔ ہم مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں اور پسماندگان سے ہمدردی رکھتے ہیں۔

علمی خبریں اور نوٹ

خوشی کی بات ہے کہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد اپنے اولوالعزم سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب کی حسن کوشش سے برابر ترقی کر رہی ہے جس کا ثبوت سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء کی رپورٹ کارگزاری سے ملتا ہے۔ جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس انجمن کو اعلیحضرت نظام دکن کے علاوہ سو سے زیادہ اہل علم حضرات کی اعانت و سرپرستی حاصل ہے۔ اس کے اراکین کی تعداد ایک سو [illegible] ہے اس کی شاخیں اور کمیٹیاں ملک کے ہر گوشہ میں قائم ہیں۔ پچھلے دو سال کی مدت میں بارہ کتابیں انجمن کے اہتمام سے شائع ہوئی ہیں اس وقت گیارہ زیر طبع اور سات اور کتابیں تیار ہیں۔ "اردو" اور "سائنس" نام سے اس کے دو سہ ماہی رسالے برابر آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ انجمن نے اپنا ذاتی ٹائپ کا پریس بھی قائم کر لیا ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب کی سعی بلیغ سے اس کی مالی حالت بھی قابل اطمینان ہے۔ اس وقت چھبیس ہزار روپیہ کا "محفوظ سرمایہ" اس کے پاس موجود ہے۔ آمدنی و خرچ کی یہ کیفیت ہے کہ سنہ ۱۹۳۰ء میں عطیات و فروخت کتب وغیرہ سے تینتالیس (۴۳) ہزار پانسو باسٹھ روپیہ وصول ہوا اور چالیس ہزار نو سو ستتر روپے خرچ ہوئے۔ سنہ ۱۹۳۱ء کے مصارف کا تخمینہ بیالیس (۴۲) ہزار چار سو روپیہ کیا گیا ہے۔ ہم اس قابل قدر کارگزاری پر انجمن کے پرجوش اسٹاف کو دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ سکریٹری کے علاوہ منشی [illegible] صاحب اسسٹنٹ سکریٹری انجمن و منیجر مطبع ترقی اردو بھی جس شوق و انہماک سے اپنے فرائض منصبی انجام دیتے ہیں وہ بہت قابل قدر ہے۔

امپیریل لائبریری کلکتہ میں اس وقت تقریباً تین لاکھ کتابیں موجود ہیں اور اس کے دارالمطالعہ سے روزانہ ایک سو پچیس آدمی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اب اس لائبریری کو وہ حق عطا کئے جانے کی کوشش ہو رہی ہے جس کی رو سے حدود ہند میں شائع ہونے والی ہر کتاب کی ایک ایک جلد اس کو مفت

ملا کرے گی۔ اب تک ہندوستان میں کسی لائبریری کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ اگر اس لائبریری کو یہ حق حاصل ہوگیا جس کی امید قوی ہے تو اس میں رفتہ رفتہ ہر قسم کے علوم و فنون کی کتابوں کا ذخیرہ ہو جائیگا اور اہل علم کی بہت سی مشکلات دور ہو جائیں گی۔ ہماری رائے میں ہندوستان کے ہر صوبہ میں کم سے کم ایک لائبریری کو حکومت کی طرف سے یہ حق حاصل ہونا چاہیئے۔

مہاتما گاندھی کے اخبارات ینگ انڈیا اور نوجیون کا ترجمہ ہندوستان کی اکثر زبانوں میں شائع ہوا کرتا ہے۔ حال ہی سے اردو نوجیون کے نام سے ان پرچوں کا اردو ترجمہ بھی دہلی میں طبع ہونے لگا ہے۔ شائقین تین روپیہ سالانہ میں نوجیون پریس دہلی سے اس رسالہ کو منگا سکتے ہیں۔

نول کشور پریس لکھنؤ صوبہ کا ایک قدیم و مشہور مطبع ہے جس کو مرحوم منشی نولکشور صاحب سی۔ آئی۔ ای نے ۱۸۵۸ء میں قائم کیا تھا۔ ابتک اس مطبع میں تقریباً چالیس ہزار کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ عربی اور سنسکرت کی پرانی مذہبی کتابوں کی ایک بہت بڑی تعداد محض اسی مطبع کی اُولوالعزمی کی بدولت لوگوں کو دستیاب ہو رہی ہے۔ کسی وقت یہ مطبع ایشیا کا سب سے بڑا مطبع سمجھا جاتا تھا اب بھی یہ صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کا سب سے بڑا پریس ہے اور اردو کا اہم روزانہ "اودھ اخبار" پچھتر سال سے اسی مطبع سے شائع ہو رہا ہے منشی نولکشور مرحوم نے اپنے وقت میں اس مطبع میں بڑے بڑے اہل علم و اہل فن یکجا کئے تھے۔ اب بھی صوبہ کے بعض نامور اہل قلم اس مطبع کی علمی خدمت کر رہے ہیں۔ کئی سال سے ہندی کا مشہور رسالہ "مادھری" بھی غیر معمولی اہتمام سے شائع ہو رہا ہے۔ جنوری گذشتہ میں منشی بشن نراین صاحب بھارگو مالک مطبع کے بے وقت انتقال کی وجہ سے اب اس مطبع کا انتظام محکمہ کورٹ آف وارڈس کے سپرد ہوا ہے۔ ہم کو امید ہے کہ نئے انتظام میں بھی اس نامور کارخانہ کی قدیم روایات اور شاندار خصوصیات قائم رہیں گی۔

انگریزی زبان کے نامور شاعر براؤننگ کی نظموں کا دنیا کی چھبیس زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور اب امریکہ کے پروفیسر آرم اسٹرانگ ان نظموں کا چینی زبان میں ترجمہ کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر شریدھر وینکٹیش کیتکر ایم۔اے۔پی ایچ۔ڈی ملک کی مختلف زبانوں میں انسائیکلوپیڈیا کی تالیف میں مہارت تامہ حاصل کر چکے ہیں، چنانچہ آپ مرہٹی زبان میں ایک انسائیکلوپیڈیا بیس جلدوں

میں مکمل کر چکے ہیں۔ آجکل اس کو گجراتی زبان میں شائع کرنے کا انتظام ہو رہا ہے بلکہ اس کی پہلی جلد طبع ہو چکی ہے اور دوسری زیر طبع ہے۔ اب موصوف کا ارادہ ہے کہ گیان کوش کے نام سے ہندی میں بھی سائیکلوپیڈیا مکمل ہو جائے۔ چنانچہ ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی سرپرستی میں اس کے متعلق ایک علٰحدہ کمپنی قائم ہو گئی ہے جس کا نام ہندی گیان کوش منڈل لمیٹیڈ قرار دیا گیا ہے۔ ضروری سرمایہ کی فراہمی اور اڈیٹروں، نامہ نگاروں وغیرہ کی تقرری اسی کمپنی کے ذمہ ہوگی۔ یہ انسائیکلوپیڈیا تئیس جلدوں میں تمام ہوگی اور ہر جلد میں سوا تین سو صفحات ہونگے۔ خیال ہے کہ چار سال میں پوری کتاب شائع ہو جائیگی

حیدرآباد دکن کے مسٹر محمد فتح اللہ خاں حضرت عمر فاروق کے زمانۂ خلافت کے آئین و قوانین کے متعلق انگریزی زبان میں ایک بسوط کتاب لکھ رہے ہیں۔ مولانا شبلی مرحوم نے اس موضوع پر اپنی مشہور و معروف تصنیف "الفاروق" میں سیر حاصل بحث کی ہے جس کا ترجمہ ترکی زبان میں بھی ہو گیا ہے مگر انگریزی میں اس مضمون پر کوئی اعلیٰ پایہ کی کتاب موجود نہیں ہے۔ امید ہے کہ مسٹر محمد فتح اللہ خاں کی کوشش سے یہ کمی پوری ہو جائیگی۔

بنگال کے شری یت کمود ملک نے فن تحریر کا ایک نادر نمونہ پیش کیا ہے۔ آپ نے ایک پوسٹ کارڈ پر ۵½ × ۳½ انچہ کی محدود گنجائش میں تین سو تینتیس ۳۳۳ سطریں جن میں بارہ ہزار الفاظ ہیں صاف و خوشخط لکھی ہیں یہ کارڈ شری یت اسونی پال کے تصویر خانہ میں رکھدیا گیا ہے اور کمود بابو نے چیلنج دیا ہے کہ کوئی باہنر اتنی مختصر جگہ میں اس سے زیادہ الفاظ لکھکر پیش کرے۔

صوبۂ دہلی کے بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کے اجلاس منعقدہ مئی ۱۹۳۱ء میں ایک ریزولیوشن اس مضمون کا پیش کیا گیا تھا کہ ہائی اسکول کے طلبا کو کوئی نہ کوئی ہندوستانی زبان لازمی مضمون کے طور پر پڑھنا چاہئے بحث و مباحثہ کے بعد اور بعض حضرات کی مخالفت کے باوجود یہ تجویز کثرت رائے سے منظور ہو گئی۔

تہذیب النسواں (لاہور) مشہور ہفتہ وار اخبار ہے جو چونتیس ۳۴ سال سے برابر نسوانی دنیا کی ادبی خدمات انجام دے رہا ہے۔ جولائی ۱۹۳۱ء میں اس اخبار کا سالگرہ نمبر نہایت آب و تاب کے ساتھ باتصویر شائع ہوا ہے اس کا حجم نوے صفحات ہے اور اس میں نظم و نثر کے تقریباً

چالیس مضامین ہیں۔ مضامین عموماً مفید و دلچسپ ہیں جن کے مطالعہ سے تعلیم یافتہ خواتین نیز اوسط درجہ کی قابلیت کی لڑکیاں بہت کچھ فائدہ حاصل کر سکتی ہیں۔ مضامین کے علاوہ مختلف قسم کے کھانے پکانے، اچار اور مربے بنانے نیز کشیدہ کاری وغیرہ کے متعلق ضروری باتیں درج ہیں اور آخر میں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے سیاسی معاملات کے متعلق بھی مختصر نوٹ ہیں۔ غرض مجموعی حیثیت سے یہ نمبر کامیاب و لائق مطالعہ ہے۔ تہذیب نسواں کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ہے۔ شائقین دارالاشاعت پنجاب لاہور سے طلب فرمائیں۔

تصاویر آنریبل سر پی۔ سی۔ راماسوامی آئر حال ہی میں قائم مقام مشیر قانون گورنمنٹ ہند مقرر ہوئے ہیں۔ آپ صوبہ مدراس کے مشہور کانگریس لیڈر اور قابل ترین ماہر قانون ہیں جن کی قابلیت کا بارہا امتحان ہو چکا ہے۔ سیاسی میدان میں آپ ایک عرصہ سے اہل ملک کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ چنانچہ آپ نے مسز بیسنٹ کے ہوم رول ایجی ٹیشن میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ مسٹر مانٹیگو سابق وزیر ہند اپنے دورۂ ہند میں آپ کی اعلیٰ ذہانت و قابلیت سے بہت متاثر ہوئے تھے چنانچہ اس کا مفصل ذکر انھوں نے اپنی ڈائری میں بھی درج کیا ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے سر راماسوامی ۱۹۱۹ء میں کانگریس کے سکرٹری تھے اور اسی حیثیت سے جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی ساؤتھ برو کمیٹی اور میسٹن کمیٹی کے روبرو آپ کی شہادتیں ہوئی تھیں جن کی وجہ سے آپ کی نکتہ دانی اور معاملہ فہمی کی شہرت دُور دُور پھیل گئی اور گورنمنٹ نے آپ کو ۱۹۲ء میں مدراس کا ایڈووکیٹ جنرل مقرر کر کے اپنی قدردانی کا ثبوت دیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد آپ کو لارڈ ولنگڈن نے (جو اُس وقت گورنر مدراس تھے) مدراس گورنمنٹ کا مشیر قانون مقرر فرمایا چنانچہ آپ کے زمانۂ ممبری میں مدراس گورنمنٹ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کا قابل قدر نمونہ بن گئی تھی۔ ۲۷-۱۹۲۶ء میں آپ کو لیگ آف نیشنز جنیوا کے اجلاسوں میں ہندوستان کے قائم مقام کی حیثیت سے شریک ہونے کا موقعہ دیا گیا۔ یہاں بھی آپ نے اپنی معاملہ فہمی و حب الوطنی کا سکّہ دلوں پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۸ء میں آپ نے بٹلر کمیٹی کے روبرو بعض ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے وکالت کا حق اس خوبی سے ادا کیا کہ والیان ریاست نے بالآخر اپنی تمام آئینی گتھیوں کے سلجھانے کا کام آپ ہی کے سپرد کر دیا۔ پچھلے سال کی گول میز کانفرنس کی فیڈرل کمیٹی میں بھی آپ کی قابلیت و فصاحت و بلاغت اہل ملک کے کام آئی تھی۔ بہرحال ایسے لائق محب وطن کو اپنا مشیر قانون منتخب کر کے ہز ایکسیلنسی لارڈ ولنگڈن نے ہندوستان پر احسان عظیم کیا ہے۔ ہم کو امید ہے کہ سابق کی طرح آپ اس نازک وقت میں بھی ملک کی اہم سیاسی خدمات انجام دے سکیں گے۔

اعلیحضرت نظام اور لارڈ اِرون کا گروپ سابق وائسرائے ہند کے دورہ حیدرآباد کے موقعہ کا مرقع ہے۔ اعلیٰ حضرت کے پشت پر شاہزادگان ... کھڑے ہیں

زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم، بی۔ اے،

جلد ۵۷	اکتوبر ۱۹۳۱ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

تصاویر عبدالرحیم خانخاناں (عہد اکبری) مہاتما [illegible] ۔ مسٹر کے۔ سی۔ رائے مرحوم
پنڈت وشنو دگمبر گائن آچاریہ

قیمت فی پرچہ ۸ ... سالانہ ...

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت ملک غیر سے سالانہ ... ششماہی ... ہندوستان کے لئے سالانہ ...



نواب عبدالرحیم خان خانخانان (عہد اکبری)

زمانہ

جلد ۵۷ — اکتوبر ۱۹۳۱ء — نمبر ۴

ادب الکاتب و الشاعر

(ہائے مختفی)

(از مولانا علی حیدر صاحب طباطبائی مخاطب بہ نواب حیدر نواز جنگ)

الف بے میں ہائے مختفی کا سمجھنا شاعر کے لئے ضرور ہے۔ فارسی والے قافیہ میں اسے حرف روی نہیں کرتے۔ وہ اسے حرف ہی نہیں سمجھتے۔ مختفی کا لفظ دھوکا دیتا ہے کہ یہ چھپا ہوا حرف ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ ہائے مختفی محض کتابت میں حرف ہے اور تلفظ میں اس کی کچھ آواز نہیں۔ حرف بے صوت ہے۔ ہاں جمع بنانے یا نسبت دینے کی صورت میں ہائے مختفی گاف سے بدل جاتا ہے۔ جیسے رفتگاں۔ مژگاں زندگی۔ ہمیشگی۔ ہائے مختفی فارسی و اردو کا حرف ہے، عربی کی الف بے میں ہائے مختفی کوئی حرف نہیں مثلاً کعبہ وسجدہ وقطرہ وذرہ کی (ہ) ہائے مختفی نہیں ہے۔ عرب اس (ہ) کو مظہرہ سمجھتے ہیں۔ ان کی اصطلاح میں یہ (ۃ) ہے کہ حالتِ وقف میں (ہ) کی آواز دیتی ہے۔ فارس والوں نے تصرف کر کے ہائے مظہرہ کو مختفی بنا لیا ہے۔

ہائے مختفی لکھی اس لئے جاتی ہے کہ حرف ماقبل کے متحرک ہونے پر دلالت کرے۔ یہی سبب ہے کہ جب "کہ" اور "چہ" کے ساتھ است کو ملاتے ہیں تو ی سے بدل جاتی ہے مثلاً کیست و چیست کی ی وہی ہائے مختفی ہے جس کا حرف روی کرنا فارسی میں جائز نہیں مگر کیست کا قافیہ چیست درست ہے اگر کہ اور چہ میں ہائے مختفی نہ لگائی جاتی تو اس طرح لکھتے، ک رفت و چ گفت و ن شد اور اس طرح لکھنے میں اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح کہ اور چہ کے اشباع سے ہائے مختفی ی سے

بدل گئی اور اب اس کا حرف روی کرنا درست ہوگیا۔ اسی قیاس پر چاہیئے تھا کہ لفظ گلہ و مژہ کی ہائے مختفی الف سے بدل جاتی اور گلہ کا قافیہ مژہ درست ہو جاتا۔

اسی قیاس پر اُردو کہنے والے اکثر شعرا ہائے مختفی کو الف سمجھتے ہیں اور بے تامل حرف روی کر دیتے ہیں۔ ع

اِک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

مگر اہلِ ایران اور ہندوستان کے شعرائے فارسی گو قطعاً ہائے مختفی کو الف کے قافیے میں نہیں لاتے لیکن ہائے مختفی کو الف بنا کر قافیہ نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس (ہ) کو الف کہ کے تقطیع میں اُسے شمار بھی نہ کریں۔

ہاں اس بات کا توہم ہوتا ہے کہ جب لفظ گلہ و مژہ میں ہائے مختفی محض اس بات کی علامت ہے کہ اس کے ماقبل لام اور ژ سے متحرک ہیں تو پھر اُسے الف بنا کر وزن میں محسوب کرنا مناسب نہ ہوگا۔ چنانچہ جلال اسیر نے اور اُن کی تقلید میں مرزا بیدل و ناصر علی نے اور اُن کی تقلید میں مرزا غالب نے یہ التزام کیا ہے کہ مصرع کے درمیان ایسا نہیں کرتے۔ اسیر ؎

مژہ وا سے قدم از دیدہ بروں نگزاری گریہ ائی بہ قدر پاسِ نظر واشتہ ایم

بیدل

اگر اندیشہ کند طرزِ نگاہِ او را جوشش حیرت مژہ سازد نگہِ آہو را

اب یہاں تک نوبت پہنچی کہ اگر کوئی چشمہ یا جلوہ یا رفتہ و گذشتہ کی (ہ) کو الف بنا کر وزن میں شمار کرے تو لوگ اُسے غلط سمجھتے ہیں۔

مرزا غالب نے قیامت کی اُردو میں بھی لفظ مژہ کی (ہ) کو بڑی زحمت و کوشش سے گرا دیا ؎

بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

شاید فردوسی کا یہ مصرع ع

مژہ تیرگی بردہ از پرِ زاغ

مرزا صاحب کے نزدیک ناموزوں ہے۔

اس مسئلہ میں تقلید سے کام نہ لینا چاہیئے تقلید میں آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ ہم ناصر علی و بیدل کے تتبع سے بری ہیں، ہم نے زبان سعدی سے سیکھی ہے۔ بوستاں میں سے چند شعر لکھتا ہوں، جہاں ہائے مختفی کو وزن میں لیا ہے اُن الفاظ پر خط کھینچ دیا ہے ؎

بدرگاہ لطف و بزرگیش بر — بزرگاں نہادہ بزرگی ز سر
ہمہ طاعت آرند و مسکیں نیاز — بیا تا بدرگاہ مسکیں نواز
چو شاخ برہنہ بر آریم دست — کہ بے برگ زیں بیش نتواں نشست
بمایہ تواں اے پسر سود کرد — چہ سود افتد آں را کہ سرمایہ خورد
بدر می کند آبگینہ ز سنگ — کجا ماند آئینہ در زیر زنگ
کہ حاصل کند نیک بختی بزور — بسرمہ کہ بینا کند چشم کور
ز تدبیر پیر کہن بر مگرد — کہ کار آزمودہ بود سالخورد
دو رستہ درم در دہاں داشت جائے — چو دیوارۂ از خشت سیمیں بپائے
دو صورت کہ گفتی کسے نیست پیش — نمودہ در آئینہ ہمتائے خویش
نبودے بجز آہ بیوہ زنے — اگر بر شدے دودے از روزنے
سوار نگوں بخت بے راہ رو — پیادہ برو زو برفتن گرو

سعدی کے ان اشعار میں افعال بھی ہیں جیسے نہادہ ۔ نمودہ ۔ آزمودہ ۔ اسما بھی ہیں مایہ آبگینہ ۔ سرمہ ۔ رستہ ۔ صفات بھی ہیں ، ہمہ ۔ برہنہ ۔ بیوہ ۔ پیادہ ۔ ان سب الفاظ میں ہائے مختفی وزن شعر میں داخل ہے ۔

انوری کہتا ہے ؎

رنجور بادیہ بفضائے ارم گریخت — مقہور ہاویہ بہوائے جناں رسید
توی کز فتح باب دست تو ہست — ہمیشہ خشک سال آز را نم
کمینہ پاسبانت بخت بیدار — فروتر پایگاہت چرخ اعظم

ع کجا دیدہ ست بیچارہ چنیں حال
صدف بگوہر و نافہ بمشک و نے بشکر

حکیم سنائی کا یہ مصرعہ مشہور ہے ع

چو دزدے با چراغ آید گزیدہ تر برد کالا
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

بند گیرید اے سیاہی تاں گرفتہ جائے پند — عذر آید اے سپیدی تاں دمیدہ بر عذار
حرص و شہوت از تو بیدار و تو خفتہ خوش مخسپ — چوں پلنگے بر یمیں داری و موشے بر یسار

عمر خیام کا یہ مصرعہ مشہور ہے ع

کعبہ چو روی برد دلے را دریاب

این چرخ کہ باکسے نمیگوید راز　　　کشتہ بستم ہزار محمود و ایاز

از آب و گل آفریدہ صانع مارا　　　کردہ بہ غم زمانہ قانع مارا

جب نصیر بن احمد کا انتقال ہوا اور اُس کی جگہ نوح بن نصر تخت نشین ہوا تو اُس زمانہ کے شاعر شیخ الوالعباس نے یہ قطعہ جو تعزیت و تہنیت پر مشتمل ہے پیش کیا تھا ؎

بادشاہے گذشت خواب نژاد　　　بادشاہے نشستہ فرخ زاد

زاں گذشتہ جہانیاں غمگیں　　　زیں نشستہ زمانیاں دل شاد

فرخی کہتا ہے ع

باد گوئی مشک سودہ دارد اندر آستیں

عبدالواسع جبلی ع

بستہ میاں چو رمح و کشادہ دہاں چو تیر

رشید الدین وطواط ؎

ز بہر رزم تو غنچہ بباغ چوں پیکاں　　　ز بہر بزم تو لالہ براغ چوں ساغر

عنصری ہاتھیوں کی مدح میں کہتا ہے ؎

چو زنجیر داؤد خرطوم ایشاں　　　کہ آویختہ بد ز چرخ مدور

بگردون گرندہ ونندہ دندانشاں　　　جہاں را ہم از خیر بہرہ ہم از شر

منوچہری شصت کلہ شمع سے خطاب کرتا ہے ؎

گرنہ کوکب چرا زندہ نگردی جز بہ شب　　　ورنہ عاشق چرا گریی ہمی بر خویشتن

روئے تو چوں شنبلید بر شگفتہ بامداد　　　دل من چوں شنبلید نا شگفتہ در چمن

سلطان مسعود کے زمانہ کا شاعر مسعود سعد فتح ہندوستان کی تہنیت میں کہتا ہے ؎

یک شب از وبکاں بوالندر کشیدی لشکرے　　　چوں زمانہ زور مند و چوں قضا کینہ گذار

کوہہا درہم شکستہ آبہا برہم زدند　　　تازیاں اندر عناں و بختیاں اندر مہار

پر ستارہ آسمانے کردی از دود و شرار

کنوں بینی تو از سبزہ ہزاراں فرش مینا گوں

کمال اسمٰعیل کشتی کی پہیلی میں کہتا ہے ؎

وازگونہ خانۂ دیوار و در ماندہم   سقف او در زیر پایست و ستونش بر سر
باد او را تازیانہ خاک او را ساخت   آتش او را خصم جان و آب او را یاور
در ہمہ بحرے بود جا یش مگر اندر دو بحر   بحر شعر و بحر جود بادشاہ بحر و بر
اے فتنہ شدہ ز طبع سیتت بیدار   تو خفتہ و عالمے ز وحشت بیدار

خسرو کی مثنوی کا شعر ہے ؎

نبود آگہ کہ شاہاں جامۂ راہ   دگرگونہ کنند از خوف بدخواہ

نظامی   شکستہ پناں گشتہ ام بلکہ خرد

ع   ستارہ عقیقی کند بر سپہر

یہ سب لوگ تو اساطین فن شعر تھے جن کے کلام سے چند شواہد جو پیش نظر تھے یہاں نکھ دیے۔ متقدمین میں بھی اکثر شعرا کے کلام میں ہا ے مختفی کا اشباع بکثرت نظر آتا ہے۔

طغرا شفتالو کے ذکر میں کہتا ہے ؎

شگوفہ ازیں نو سفر چوں شگفت   کہن شاخ او بارک اللہ گفت

صنم خانہ کے وصف میں کہتا ہے ؎

درد بسکہ ہندو زدہ رام رام   پدیدہ رم از طبع غافل بام

عصمت بخاری گھوڑے کی ہجو میں کہتا ہے ؎

اسپے کہ چوں کمان شکستہ وجہ داد   سر تا قدم بغیر پے و استخواں نبود

ظہوری ؎

نزدہ سکہ از تو بالا تر   ہیچ کس بہ تجمل جاہ و جلال

زلالی ع   شہ غزنی ازاں نامہ برآشفت

میرزا محتشم ؎

مبتلائے رنج باریک است از دوران چرخ   ہر کہ چوں رشتہ دلے بر جمع گوہر بستہ است

میرزا عبد اللہ قبول ع   ہر کہ در عمر نخوردہ تن تنہا ناں راہ

مرزا بیدل ؎

گذشت از چرخ و بگرفت آبلہ چشم ترا بارا   ہوایت تا کجا از پا نشاند نکہ را۔

ع بپائے جستجو چوں آبلہ خوں گشت منزلہا

ع ترسم نہ فشاری بہ مژہ دامنِ تر را

پھر اس بات کا لحاظ کرنا چاہیئے کہ آخر مصرع میں قدما و متاخرین، اساتذہ و مقلدین باتفاق ہاے مختفی کو الف کر دینے میں ذرا احتیاط نہیں کرتے۔ اس کے کیا معنی ہیں کہ درمیان مصرع میں جو بات عیب سمجھی جائے آخر مصرع میں وہ جائز ہو جائے

بلکہ شعرا کے دیوانوں میں ہاے مختفی کی ردیف موجود ہے۔ انداختہ۔ برداشتہ۔ رفتہ۔ کردہ وغیرہ بکثرت ردیف ہوا ہے۔ ان سب میں ہاے مختفی الف ہو گئی ہے۔

جلال اسیر کی ایک غزل بے ردیف کی ہے ؎

مانند قمری سر بہ کردیم بے حلقہ دام از آشیانہ

بہانہ و ترانہ و فسانہ اس کے قافیے ہیں۔

مرزا بیدل نے انہیں قافیوں میں وزن بدل کر غزل لکھی ہے ع

جنوں دارد از بوئے گل تازیانہ

غرض کہ ہاے مختفی کے اشباع کرنے نہ کرنے کا ایک توہم سا مدت سے چلا آتا ہے اور حقیقت اس کی کچھ بھی نہیں۔ نہ اس کا گرانا منع ہے نہ اشباع۔

نکات

جس طرح تم لوگوں کو اپنا دوست نہیں بنانا چاہتے، ہر شخص سے دشمنی بھی نہ برتو۔ اس کی سخت ضرورت ہے کہ دوستوں کی طرح دشمن بھی منتخب کئے جائیں، کیوں؟ اس لئے کہ در اصل دشمن بھی دوست ہے، صرف طریقہ اور روش بدلی ہوئی ہے۔

اگر مجھ سے کہا جائے کہ زمانہ کے حوادث سے امن و امان تلاش کرلے تو میں صرف عزیز دل سے کنارہ کر لوں گا۔

بڑھاپے کے باعث رنجیدہ اور ملول ہونا کیسا؟ یہ راستی سے منہ موڑنا ہے۔ اگر دنیا میں وفاداری کا پاس ضروری ہے تو نادان! بڑھاپا جوانی سے زائد وفادار ہے۔

(ادبی دنیا)

ہندو مذہب میں خدا کا تصوّر

(پروفیسر سر رادھا کرشن کے ایک فلسفیانہ مضمون کا ترجمہ)

(از خانصاحب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی بی۔ اے۔ پی۔ سی۔ ایس)

انسان کی اجتماعی حیثیت سے مذہب بھی ایک زندہ عضو ہے۔ اس میں وہی اتحاد اور استعداد نمو پائی جاتی ہے جو دوسری قابل نمو چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ نہ بدلنے والے عقائد کے بر خلاف یہ اتحاد پے در پے متغیر ہونے والی زندگی کا اتحاد ہے۔ اس مذہب کا جوہر واقعات ماضی یا حال میں نہیں مل سکتا۔ ضرورت ہے کہ مذہب کی ترجمانی اس کے معانی کے لحاظ سے کی جائے نہ کہ اس کے حروف نیم گفتہ کے اعتبار سے یعنی اس میں بھی وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے جو ارسطو نے امپیدوقلیس کی توجیہ میں اختیار کیا ہے (مابعد الطبیعات، جلد ۱ صفحات ۵۸۹ الف۔۴)

اگر ہم کسی مذہب کے نشو و نما کی تاریخ کا جائزہ لیں تو ہمیں ایک عمیق مذہبی حقیقت کا علم ہوگا۔ یہ حقیقت اپنے کو نو بنو ہیئت میں نمایاں کرتی رہتی ہے، مگر اس کا کامل ظہور کبھی نہیں ہوتا۔ یہ ترقی پذیر تصور، یہ سرگرم کار حقیقت جو کسی متعینہ حالت میں ناکافی طور سے رونما ہوتی ہے۔ وہ حقیقی جوہر یا معنی یا الفکر ہے جس کی لہر تاریخی مذہب کی ہر تحریک میں دوڑی ہوئی ہے۔

روحانی تجربہ حقیقت پر مبنی ہے

ہندو مذہب کا جوہر اس تاکید میں مضمر ہے کہ روحانی تجربہ ایک حقیقی شے ہے اور ہم اس حقیقت سے روح کی گہرائیوں میں دوچار ہوتے ہیں۔ ہندو دھرم اپنے آغاز تاریخ سے اب تک مذہب کے اسی داخلی اور خارجی یا آزمائشی پہلو پر اصرار کرتا رہا ہے۔ ہندو جب ویدک زمانہ کو اپنا سنگ بنیاد قرار دیتے ہیں تو اُنکا مطلب صرف یہی ہوتا ہے کہ ویدک رشی ان کے روحانی پیشوا تھے جنھوں نے روحانی مملکت میں سب سے پہلے شدید تحقیق کو جولان کیا جو حقائق رشیوں نے بیان کئے وہ منطقی استدلال یا منظم فلسفہ کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ روحانی وجدان یا مکاشفہ ہیں، ہندو رشیوں کو اُن حقائق کا موجد نہیں سمجھتے ہیں جو ویدوں میں درج ہیں وہ لوگ

ایسے گیانی سمجھے جاتے ہیں جنھوں نے اپنی روح مثالی کو بلند کرکے روح عالم کے سطح پر پہونچا دیا اور اس طرح ابدی حقائق سے آگاہ ہوئے۔ اُن کے اقوال عارضی مشاہدہ پر مبنی نہیں ہیں بلکہ زندگی اور قدرت کے مسلسل تجربات کے نتائج ہیں۔ وید کو سب سے زیادہ مستند اس لئے مانا جاتا ہے کہ واقعات کی سند ہمیشہ زیادہ قابل اعتبار ہوتی ہے۔ خدا وہ ذہنی کیفیت نہیں ہے جس کی ہم نگہداشت کرتے ہیں بلکہ وہ حقیقت ہے جس کا ہمیں ادراک ہوتا ہے۔ روحانی تجربہ کسی قسم کا تخلیقی تصور نہیں ہے بلکہ حقیقت کا ہمراز ہو کر حقیقت سے ہم کلام ہونا ہی روحانی تجربہ ہے۔

تصور خدا کی ترجمانی

عارف کو، جو خدا کو دیکھکر پہچانتا ہے اور سنی سنائی باتوں کا یقین نہیں کرتا، اس کی ضرورت نہیں کہ خدا کی تعریف دریافت کرے۔ اس کے لئے شبہ و تذبذب ناممکن ہے۔ اُس کے صاف و واضح یقین میں کوئی شئے در انداز نہیں ہو سکتی۔ لیکن عامۃ الناس کے مذہبی عقائد کی بنیاد محض اعتماد پر ہوتی ہے، وہ مذہب سے اطمینان قلب حاصل کرنے کے متمنی ہوتے ہیں لیکن مذہب کی خاطر تحقیق و تجسس کی محنت و مشقت برداشت نہیں کر سکتے ہیں، وہ قصہ، کہانی اور رسمیات سے دل بہلانا چاہتے ہیں لہذا اُن کے لئے مشاہدہ کو لباس سے آراستہ کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں اپنے تجربہ کو دوسروں تک پہونچانے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اس کے نکات کو عام فہم الفاظ میں بیان کر دیا جائے اور اسکی راستی کے متعلق جو اعتراضات ہوں ان کا مدلل جواب دیا جائے۔ ہندو مذہب میں اس قسم کی ترجمانی کے اعلیٰ ترین غیر متعین شخصیت سے لیکر ادنیٰ و مجہول شخصیت تک متعدد مدارج ہیں

جب کوئی واقف کار اپنے تجربہ کو عقل و منطق کی روشنی میں بیان کرنا چاہتا ہے تو عقیدتمندانہ طرز اختیار کرتا ہے کیونکہ ماورائے فہم حقیقت کا انکشاف اسی کا متقاضی ہے وہ جانتا ہے کہ روح کے پُر خلوص وور خشاں تعلقات براہ راست ایک ایسی ذات سے ہیں جو اُن تمام اشیا سے جداگانہ ہے جن سے حواس کو سابقہ رہتا ہے۔ یہ ذات اُس ذات سے زیادہ پُر نور ہے اور اُس سے کم حقیقی نہیں ہے جس کو رسم و رواج ذہن کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ادراک و الہام و تجربۂ روحانی یکساں ایک ایسی ذات کی شہادت دیتے ہیں جو حقیقی ہے۔ جس کا جوہر روحانیت ہے اور جو سرچشمۂ حیات ہے جس کا سایہ ابدا و موت ہے۔" [1]

[1] رگ وید۔ دہم ۱۲۔

انمسٹ ہونا روحانی تجربہ کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔

حقیقت کی تعریف | جب ہم حقیقت کی تعریف کرنا چاہتے ہیں تو ہم الفاظ و امثال استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، لیکن حقیقت جامع ترین الفاظ و امثال سے بالا ہے۔ گو تم بودھ کو روحانی تجربہ کا وجود تسلیم ہے لیکن اس سے انکار ہے کہ روحانی تجربہ اپنے ماسوا کسی اور حقیقت کا انکشاف کرتا ہے ان کے نزدیک یہ خیال کہ روحانی تجربہ براہ راست خدا سے دوچار کر دیتا ہے محض توجیہ ہے۔ خود تجربہ ایسے وجود کا مؤید نہیں ہے۔ بودھ موجودات سے علیحدہ ہونا نہیں چاہتے اور صرف اس قدر کہنے پر قانع ہیں کہ ایک گہری روحانیت اس ظاہری اور مرئی عالم میں جاری و ساری ہے۔ مشہور و معروف ہندو فلسفی و فقیہ شنکر اچاریہ کہتے ہیں کہ ہر شے میں جو تشکل ہے ایک جزو عدم راستی کا ہوتا ہے اور حقیقت تمام اشکال سے مبرا ہے۔ اپنشد، بودھ، شنکر، اور شنکر کے متبعین متفق ہیں کہ وہ خالص روحانی روح ہو بغیر تقسیم و دوئی و شریک وہیتا، دنیائے تغیر و کثرت اور اس کے ماوراء میں موجود ہے اس کی ہستی مطلق ہے اور نطق و تخیل انسانی کو اس کے کما حقہٗ بیان کرنے کا امکان و یارا نہیں ہے۔ درحقیقت ہم کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ خدا کی عظمت احاطۂ زبان و ادراک سے باہر ہے۔ وہ ہمارے علم اور لاعلمی دونوں سے دور اور بالاتر ہے (کین اپنشد ۱-۳) آنکھ اور زبان اور دماغ کی اس تک رسائی نہیں (برہدرنک اپنشد ۳-۰۰۰) لیکن اس ذہنی انکسار اور روحانی خاکساری میں خطرہ ہے خدائے مطلق کے بارے میں بودھ کے سکوت نے ان کو الحاد کا ملزم ٹھہرایا، اگر ہم تمام صفات و متعلقات سے انکار کرتے ہیں تو حقیقت اولین محض ہستی کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہ جاتی اور ہستی محض خلوئے مطلق کی مرادف ہے۔ شنکر کا قول ہے کہ کمزور ذہنیت کے انسان تجرباتی اوصاف کے انکار کو وجود سے تعبیر کرتے ہیں۔ دراصل انکار صفات کا مقصد واحد مطلق کی اس ناقابل فہم شان کا اظہار ہے جس کا اندازہ روح کو ہے یعنی یہ ذات بالکل غیر متجانس ہے جسے بجز منفیات ہم کسی صفت سے متصف نہیں کر سکتے۔

تین خصوصیتیں | ہندو مذہب اس مذاکرہ تنکیر پر قانع نہیں ہے۔ روحانی تجربہ کے تین نمایاں خصوصیات حقیقت و علم و مسرت ہیں۔ اگر ہمارے تجربہ کا کوئی جزو ان خصوصیات کا حامل ہے تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ تمام تجربہ اسی طریق کا تابع ہو سکتا ہے۔ شعور الوہیت ایسا شعور ہے جس میں تمام تجربہ بغیر کسی وسیلہ کے الہامی اور آزاد طور پر بلا کسی ایسی چیز کی آمیزش کے جو تجربہ سے متغائر ہے موجود ہو، اور یہی ہمارا نصب العین ہے۔ الوہیت وہ حالت ہے جس میں حقیقت خود اپنی شاہد، خود اپنا عالم، اور خود اپنی بے کیف و کم ہستی کا حامل ہے۔ کوئی شے ایسی نہیں ہے جو اس کی ہستی میں مجتمع نہ ہو یا جس کا

اس میں ظہور نہ ہو۔ اس میں کسی اختلاف رونما ہونے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ یہ کامل ہستی ہے، کامل شعور ہے، کامل آزادی ہے "ست، چت، آنند" اسی کو کہتے ہیں، خیال اور اس کے مختلف اشکال، ارادہ اور اس کے مظاہر، محبت اور اُسکی مترنم ترتیب، سب کی بنا یہی ہے لیکن ان انسانی متقابلوں میں دوئی ہے، اُلجھن ہے، تھکن ہے۔ اسی وجہ سے محدود شخصیت کا انسان کمال الوہیت کے احصا کا درخور نہیں ہے۔ ذات اعلیٰ حقیقی ہے، مگر راستی نہیں ہے، کامل ہے مگر نیک نہیں ہے، اس کی آزادی اس کی ہستی اور اس کی ناگزیر خودی و خود مختاری ہے۔ باوصف اس کے کہ روحانی ہستی کی تکمیل ہماری دنیا کے معلومات سے برتر ہے اس کی فطرت ہم میں جو سب سے زیادہ برگزیدہ شخصیت ہو سکتی ہے اُس سے مشابہ ہے۔ اگر حقیقت یک لخت ہماری دسترس سے باہر ہو تو ہمیں اُس کے وجود کا دھندلا سا علم بھی ناممکن ہو جائے اور ہم یہ بھی نہ کہہ سکیں کہ ذات اعلیٰ ہم سے بالکل مختلف ہے۔ انسان کی خودی اُس کی ہستی کا مرکز ہے اور اُس کے ذہن سے عمیق تر ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو خدا سے مماثل ہے۔ انسانی ہستی کی گہرائیوں میں حقیقت کے تجربہ کا سامان موجود و مہیا ہے۔

ایک واقعہ کے دو رُخ

خدا کا ظہور اور انسان کا استغراق بظاہر ایک ہی واقعہ کے دو رُخ ہیں۔ خدا اور انسان دونوں میں روح کا موجود ہونا ایسا اتفاق ہے جس کو روحانیت میں بدیہیات کا درجہ حاصل ہے یہ محض استنباط نہیں ہے۔ روحانی تجربہ میں وہ حجابات جو خودی اور روح عالم کے درمیان حائل ہوتے ہیں خود بخود اُٹھ جاتے ہیں۔ ہم حقیقت کے جزو ہو جاتے ہیں اور حقیقت ہم میں یہ توگنس ہوتی ہے وہ عظیم الشان قول (Tat Team asi) وہ تو ہے "تجربہ کئے ہوئے واقعہ کا صاف و سادہ بیان ہے۔ انجیل کا قول کہ خدا نے انسان کو اپنے مشابہ پیدا کیا اسی واقعہ کا اعادہ ہے کہ خدا کا سچا ظہور انسان کی روح میں ہے، یہ قول بھی کہ انسان کی روح خداوندی تجلی کی شمع ہے اسی کی تصدیق کرتا ہے۔ بقول افلاطون انسان دائمی دورِ حیات میں شریکِ غالب ہے اور دنیا کی چلتی پھرتی چھاؤں سے الگ زندگی بسر کر کے حیات ابدی کو اپنا بنا سکتا ہے۔ اِسی عظیم الشان سچائی کو یسوع مسیح نے اس طرح بیان کیا ہے کہ "میں اور میرا باپ ایک ہیں"

خدا وہ نامحدود روح ہے جو ہم میں بھی ہے اور ہم سے باہر بھی موجود ہے، اگر خدا ہم میں نہ ہوتا تو احتیاج کا درک ہی نہ ہوتا۔ اگر خدا ہم سے باہر نہ ہوتا تو پرستش کا جذبہ پیدا ہی نہ ہو سکتا جب ہم ذات برتر کے ناقابل فہم ہونے پر زور دیتے ہیں تو ہمارا مذہب سراسر عبودیت ہو جاتا ہے۔ بہر حال خدا کے متعلق ہمارا وسیع ترین علم ناکمل ہے کیونکہ اس کا کوئی نہ کوئی جزو ایسا باقی رہ جاتا ہے جو ہمارے

دائرۂ معلومات سے بالا اور حد بیان سے برتر ہے۔

شخصی خدا ہمارے مختص مذہبی شعور کا یہ تقاضا ہے کہ ہم اپنے سے بالاتر ذات سے ربط پیدا کرنے کے آرزومند ہوں جس میں افراد کا جذب یا منضم ہو جانا ممکن نہ ہو۔ اس شخصی ربط یا ذاتی تعلق کے مختلف مدارج ہیں۔ اس کا ابتدائی درجہ یہ ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کے حضور میں افراد واحد اپنے انتہائی عجز و انکسار کا اعتراف کریں، اس کا آخری درجہ یہ ہے کہ "محبت کامل" سے راز و نیاز ہو جس کے فضل و کرم پر بدترین گناہگار بھی بھروسہ کر سکتا ہے۔

اُس ذات اعلیٰ کا انی معلومات کے مطابق بلند ترین مخلوق سے موازنہ کرنا راستی سے زیادہ قریب ہے بہ نسبت اس کے کہ ہم کسی پست مخلوق سے اس کا موازنہ کریں فدائیان مذہب اس اعلیٰ ترین حقیقت کو شخصیت سے متصف کر کے پرستش کرتے ہیں، وہ اُسے اس دنیا کا سرچشمہ ہادی و رہنما اور اس کی قسمت و تقدیر جانتے ہیں ذات اعلیٰ کو روح مطلق سمجھنا یا شخصی خدا ماننا صرف زاویہ خیال کا فرق ہے، کیونکہ اصلی یا بنیادی تناقض نہیں ہے صرف اتنا امتیاز ہے کہ خدا واقعی کیسا ہے اور ہمیں نظر کیسا آتا ہے۔ شخصیت صرف ایک نشان یا علامت ہے اور جو لوگ اس کی اس حیثیت کو فراموش کر دیتے ہیں وہ راستی سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔

اقوال زریں

(۱) دنیا کی دوستی تمام فتنوں کی جڑ اور تمام محنتوں کی بنیاد ہے۔

(۲) مال کی محبت فتنوں کا سبب ہے اور سرداری کی تمنا تمام تکلیفوں کا سرچشمہ ہے۔

(۳) زبان سنان سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔

(۴) ترک دنیا سے آخرت کو حاصل کرو۔ ترک آخرت سے دنیا حاصل نہ کرو۔

(۵) نتیجۂ گناہ ہلاکت ہے اور نتیجۂ آرزو حسرت و افسوس۔

(۶) بہترین بخشش عقل ہے، اور بہترین علم وہ ہے جو مفید ہو۔

(۷) مال میں سے بہتر وہ مال ہے جو عزت و آبرو بچائے۔

(۸) بہترین کلام راستی اور سچ ہے

(۹) بہترین ہنسی خندۂ زیرلب ہے۔ (سید اظہر حیدر سہارنپوری)

جنگ فلسفہ و نفسیات

(از مسٹر سلیم جعفر)

علماء نے فلسفہ کی مختلف تعریفیں کی ہیں، ان تمام سے ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فلسفہ اپنی تاثیر کے لئے اعلیٰ درجہ کی تعلیم اور دماغی تربیت کا محتاج ہے۔ جب تک یہ دونوں باتیں موجود نہ ہونگی وہ عملی زندگی میں کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا۔ کم سے کم جب تک منطق آکر اس کے اصولوں کا نفع و نقصان نہ سمجھائے، اخلاقیات ان کی تائید نہ کرے اور الٰہیات ابدی منفعت کا یقین نہ دلائے کوئی فلسفہ کو اپنی زندگی کی شمع ہدایت بنانے کے لئے آمادہ نہ ہوگا۔

نفسیات کیفیات دماغ انسانی کا مطالعہ ہے، اس کا طالب علم صرف یہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے کہ کن کن صورتوں میں دماغ انسانی کی کیا کیا حالتیں ہوتی ہیں۔ ماہر نفسیات جب اپنے علم سے عملی زندگی میں کام لیتا ہے تو اس کا اثر دیرپا اور وسیع ہوتا ہے، کیونکہ موضوع نفسیات کسی خاص نوع کے بشر نہیں ہیں بلکہ عالم و جاہل سب کی دماغی کیفیتیں اس کے دائرۂ تحقیقات میں داخل ہیں یعنی نفسیات جن باتوں سے بحث کرتا اور جو کچھ سکھاتا ہے وہ باتیں اعلیٰ و ادنیٰ ہر قسم کے طبقہ میں پائی جاتی ہیں۔ وہ دنیا بھر کے دماغوں کو دماغ واحد تصور کر کے اس کا مطالعہ کرتا اور افراد کو بھول جاتا ہے بطور مثال فارسی کا یہ مصرعہ ع خوشامد ہر کہ را گفتی خوش آمد پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہاں شاعر نے اپنا وہ تجربہ و مشاہدہ چند لفظوں میں بیان کیا ہے جو جملہ افراد پر حاوی اور غالباً اس کا حاصل عمر ہے وہ ہرگز "ہر کہ را گفتی" نہ کہہ سکتا تھا اگر وہ نفسیاتی مسئلہ جو اس کے کلام کی بنیاد ہے اس کا تعلق چند افراد سے ہوتا۔ اسی لئے جب ماہر نفسیات اپنے مخاطب کے دماغ کا صحیح صحیح اندازہ کر کے گفتگو کرتا ہے تو جو لفظ اس کے منہ سے نکلتے ہیں دل میں گھر کر لیتے ہیں اور وہ بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے[1]۔

---

[1] فلسفہ اور نفسیات کا یہی صریح فرق و امتیاز ہے جس نے مہاتما گاندھی کو بہت سے لیڈروں پر فوقیت عطا کی دیگر لیڈر جب تقریر کرتے ہیں تو اکثر معقول ،، عام کے لئے نفسیات سے اس قدر کام نہیں لے سکتے جتنا کہ مہاتما جی۔ انھوں نے مطلب برآری کے واسطے وہ پہلو اختیار کیا ہے جس کی بنیادیں خیال مشترک پر رکھی گئی ہیں۔ ممدوح نے اپنی

چونکہ موجودہ شخصیتوں کی بحث سے دامن بچانا مقصود ہے اس لئے ہندوستان چھوڑ کر انگلستان کی طرف رخ کیا جاتا اور شیکسپیئر کے ڈرامے جولیس قیصر کے دو اشخاص لیکر دکھایا جاتا ہے کہ فلسفہ جب نفسیات کے مقابلے میں صف آرا ہوا تو اُسے مات کھانی پڑی۔ شیکسپیئر کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ماہر نفسیات تھا لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے ناٹک اس کے نباض طبائع ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں اور نفسیات سے لبریز ہیں۔

جولیس قیصر کے قتل کا باعث کیسی اس کا حسد ہوا۔ اپنی کامیابی کے لئے اس نے ایک فلسفی بروٹس کے جاہ و وقار سے فائدہ اُٹھانا چاہا، وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا لیکن بروٹس عام الناس کو محض اس وجہ سے قابو میں نہ رکھ سکا کہ قیصر کے دوست انٹونی نے نفسیات سے کام لیکر اس کی تقریر کا اثر زائل کردیا۔

روم کا فرد فرد قیصر کی پرستش کرتا تھا، رعایا نے اس کے سر پر تاج رکھنا چاہا، اس نے شاہی پرلا ماری اور تاج قبول نہ کیا، ایک دفعہ نہیں تین دفعہ۔ کیسی اس کے حسد نے اسے تصنع پر محمول کیا۔ وہ اپنے تئیں قیصر کا ہم پلہ بلکہ اس سے بھی افضل سمجھتا تھا۔ بروٹس سے ذرا سا اشارہ پاکر کہ وہ شاہی کا مخالف اور جمہوریہ کا حامی ہے اس نے اس پر ڈورے ڈالنا اور کہنا شروع کیا۔

"میں بھی ویسا ہی آزاد پیدا ہوا ہوں جیسا کہ قیصر اور تم بھی ویسے ہی آزاد پیدا ہوئے ہو ہماری اُس کی پرورش میں کوئی فرق نہیں، ہم بھی ویسی ہی سختیاں جھیل سکتے ہیں جیسی کہ وہ۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ موسم خراب تھا، تند و تیز ہوائیں چل رہی تھیں، دریائے ٹائبر طغیانی پر تھا کہ قیصر نے کہا، کہو تم اس موجیں مارتے ہوئے دریا میں میرے ساتھ کود کر اُس پار جاسکتے ہو؟ بخدا اگرچہ میں ہتھیار لگائے تھا فوراً اسی طرح کود پڑا اور بولا۔ لو آؤ۔ اس پر وہ بھی کود پڑا موجوں سے شور بپا تھا مگر ہم نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے ہمارے مضبوط اعضا پانی چیرتے اور ہم دلیرانہ اس کو روکتے ہوئے بڑھے چلے جاتے تھے۔ لیکن اس پار پہنچنے نہ پائے تھے کہ قیصر چلایا، کیسی اس مجھے بچانا، میں ڈوبا، میں تھکے قیصر کو پانی میں سے اسی طرح لے کر نکلا جس طرح ہمارا واجب التعظیم بزرگ ای نی اس انکائیسز کو کندھے پر ڈال جنگ ٹرائے کے شعلوں میں سے لے کر نکلا تھا۔ غضب ہے کہ وہی آدمی آج دیوتا مانا جاتا ہے۔ اور اس کی نظر غلط انداز

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۴) زندگی اور نصائح میں مذہبیت پر زور دیکر عالم و جاہل سب کے دل مٹھی میں لے لئے اور اس طرح عملی زندگی کو ترقی دینے کے لئے جو کچھ ان کے منہ سے نکلا اثر میں ڈوبا ہوا نکلا اور عوام و خواص نے ان کی صدا کو لبیک کہا۔

کے اشارہ پر مجھے سرخم کرنا پڑتا ہے۔ جب اسپین میں تھا بخار آیا، ایک روز بڑا تپ میں جل رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ کانپ رہا ہے۔ خدا کی قسم اس وقت یہ دیوتا کانپ رہا تھا، ہونٹوں پر سرخی کا نام نہ تھا اور ان آنکھوں کی چمک مدھم پڑگئی تھی جن کے ڈر سے دنیا کانپ جاتی ہے میں نے اس کو کراہتے اور واویلا مچاتے سنا اور اس کی وہ زبان جو رومیوں کو حکم دیتی ہے کہ مجھے ایک ہستیٔ عظیم سمجھو اور میری تقریریں اپنی کتابوں میں لکھو۔ افسوس صد افسوس وہی زبان چھوکریوں کی طرح کہہ رہی تھی "ٹی ٹی نس ذرا مجھے پانی پلانا۔" دیوتاؤ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کیوں کر ایسی کمزور طبیعت والا دنیا بھر پر سبقت لے گیا اور عزت وشہرت کا مالک بن بیٹھا۔"

کیسی اس اس تقریر سے بروٹس کے دل پر نقش کرنا چاہتا ہے کہ قیصر اس تمام عزت و شہرت کا مستحق نہیں جو اسے حاصل ہے۔ یہ بھی ایک نفسیاتی چال ہے جس سے وہ بروٹس کے دل سے اس کی وقعت دور کرنا چاہتا ہے۔

بروٹس کی فکر فلسفیانہ بہت جلد کیسی اس کے دام نفسیات کا شکار ہوگئی اور وہ دشمنان قیصر کا سرغنہ بن گیا۔ قیصر کیپی ٹول میں شکار حسد ورقابت ہوکر مردہ پڑا ہے۔ تن بے جان سے خون کے فوارے چل رہے ہیں۔ قاتلوں کے خنجر ہی خون آلود نہیں بلکہ حسب ایمائے بروٹس ان کے ہاتھ اس کے خون سے کہنیوں تک رنگے ہوئے ہیں۔ بغاوت کا خطرہ ہے اور انسداد شورش کے لئے طے پا چکا ہے کہ فورم پر چڑھکر بروٹس اس کی وجہ بیان کرکے کہ کیوں ان کے پیارے جنرل کا خون بہایا گیا جوش انتقام کو ٹھنڈا کردے کہ اتنے میں انٹونی جو قتل کے وقت موجود نہ تھا اپنے نوکر کے ذریعہ پناہ مانگ کر وہاں آجاتا اور قیصر کی لاش دیکھکر اس کا دل بے قابو ہوجاتا ہے۔ بے باکانہ دلی جذبات ظاہر کرتا اور عواقب سے بچنے کے لئے الزام سے گریز کرتا ہے۔ کبھی کبھی بہک بھی جاتا ہے مگر اپنے تئیں سنبھال لیتا ہے۔ دانائی سے اس نے قاتلوں سے اجازت لے لی ہے کہ قیصر کی لاش لے جاکر سب کے سامنے رجز خوانی کرے۔ اسے اس شرط پر اجازت ملی ہے کہ بروٹس کی تقریر کے بعد رجز خواں ہو اور کسی پر کسی نوع کا الزام نہ لگائے۔

بروٹس اس قرارداد کے بعد فورم پر چڑھ کر جو تقریر کرتا ہے وہ یہ ہے :-

"میری تقریر صبر سے آخر تک سنو۔

"رومیو، ہم وطنو، دوستو، میری تقریر اس فعل کی خاطر سنو جو ظہور میں آیا ہے، خاموش رہو تاکہ اچھی طرح سن سکو۔ میری عزت کی خاطر میرا یقین کرو اور میری عزت کو حقیر نہ سمجھو تاکہ یقین آجائے

جو کچھ میں کہتا ہوں اسے میزانِ عقل میں تولو اور ہوش و حواس بیدار رکھو تاکہ اس معاملہ کی نسبت اچھی طرح رائے قائم کر سکو۔ اگر اس مجمع میں کوئی شخص ہے، کوئی ایسا شخص جو قیصر کی محبت کا دم بھرتا ہے تو میں اسے بتاتا ہوں کہ بروٹس قیصر کا ویسا ہی جاں نثار ہے جیسا وہ خود۔ اب اگر وہ پوچھے کہ بروٹس کیوں قیصر کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تو میں جواب دونگا کہ اس کا باعث یہ نہیں کہ بروٹس قیصر کو اس سے کم چاہتا ہے بلکہ وہ قیصر سے زیادہ روم پر شیدا ہوا ہے۔ تم کیا چاہتے ہو، یہ کہ قیصر زندہ رہتا اور سارا روم اس کا غلام ہو کر جیتا یا یہ کہ وہ مر جاتا اور تم آزاد ہو کر رہتے۔ قیصر مجھے چاہتا تھا اس لئے اس کے غم میں میری آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، وہ خوش قسمت تھا مجھے اس کی خوشی ہے، وہ بہادر تھا میں اس کی عزت کرتا ہوں، مگر وہ طالب سلطنت تھا اس لئے میرا خنجر اس کے جگر کے پار ہو گیا۔ تم میں سے کوئی اتنا ذلیل نہیں کہ غلامی پسند کرے، اگر کوئی ہے تو بولے کیونکہ میں اس کا خطاوار ہوں۔ تم میں سے کون ایسا کمینہ ہے جو اپنے وطن سے محبت نہیں رکھتا، اگر کوئی ہے تو بولے کیونکہ میں اس کا خطاوار ہوں۔ مجھے جواب کا انتظار ہے"

حاضرین: کوئی بھی نہیں۔ بروٹس: کوئی بھی نہیں۔

بروٹس: "تو میں کسی کا خطاوار نہیں، میں نے قیصر کے ساتھ وہی سلوک کیا جو تم میرے ساتھ کرو گے۔ اس کی موت کا مسئلہ کیپی ٹول میں طے پایا اور درج کاغذات ہے، وہ قابل تعظیم تھا اس لئے اس کی عزت و شوکت سے چشم پوشی نہیں کی گئی مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کی بڑی بڑی غلطیاں ہیچ سمجھی گئیں، اور نہ یہ کہ جن خطاؤں کی پاداش میں اسے موت کے گھاٹ اترنا پڑا وہ تمہیں تو چھوٹی چھوٹی مگر سمجھی گئیں بڑی بڑی۔

"مارک انٹونی قیصر کا جنازہ لئے آ رہے ہیں، یہ اس کے قتل میں تو شریک نہ تھے لیکن اس کی موت سے انھیں بھی فائدہ پہنچے گا۔ انھیں بھی جمہوریت میں عہدہ ملے گا، اور انھیں کیا تم میں سے ہر شخص اس کا مستحق ہے۔ لو میں رخصت ہوتا ہوں، چونکہ میں نے اپنے سب سے بڑے چاہنے والے کو روم کے فائدے کی خاطر قتل کیا اس لئے یہی خنجر اس وقت میرے حلق پر پھیر دیا جائے جب میرے ہموطنوں کو میرا مرنا میرے جینے سے بہتر نظر آئے۔"

شہر والے اظہار عقیدت اور شکر کے لئے صدائیں کر رہے تھے کہ بروٹس نے پھر تقریر کی "جو کچھ انٹونی کہتے ہیں اسے بھی سن لو۔ ہم نے انھیں تقریر کی اجازت دی ہے"

لیجئے انٹونی میدان میں آ گئے، دیکھئے کیسے کیسے گل کھلاتے ہیں۔

(۱) "دوستو، رومیو، ہم وطنو، ذرا توجہ فرمائیے، میں قیصر کو دفنانے آیا ہوں، اس کی تعریف کا راگ الاپنے نہیں آیا۔ انسان برائیاں کرتا اور مرجاتا ہے لیکن اس کی برائیاں اس کے بعد بھی زندہ رہتی ہیں، حالانکہ اس کی بھلائیاں اکثر اس کے ساتھ ہی دفن کردی جاتی ہیں، بس قیصر کا بھی یہی حال سمجھئے۔ شریف النفس بروٹس نے آپ سے کہا ہے کہ قیصر طالب رفعت تھا۔ اگر یہ بات تھی تو یہ بہت بڑا گناہ تھا اور اس گناہ کی سزا بھی اسے خوب ملی۔ میں یہاں بروٹس اور اس کے رفیقوں کی اجازت سے کیونکہ بروٹس قابل تعظیم ہے، اور اکیلا وہی کیوں وہ تو بھی واجب التعظیم ہیں، قیصر کی تجہیز و تکفین کے لئے آیا ہوں۔ قیصر میرا وفادار دوست تھا، اور میرے ساتھ راستی کا برتاؤ کرتا تھا لیکن بقول بروٹس وہ طالب رفعت تھا اور بروٹس واجب التعظیم ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ روم میں جنگی قیدی لاتا رہا اور ان کے فدیہ سے خزانۂ شاہی معمور ہو گیا۔ کیا طلب رفعت اسی کا نام ہے جب کسی غریب و بیکس نے آہ کی ہے تو قیصر دھاڑیں مار مار کے رویا ہے۔ طالب رفعت ایسا موم دل نہیں ہوسکتا مگر بقول بروٹس وہ طالب رفعت تھا اور بروٹس واجب التعظیم ہے۔ آپ سبھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ لیوپرکل کے دن میں نے تین دفعہ تاج پیش کیا اور اس نے ہر بار لینے سے انکار کیا، کیا طلب رفعت اسی کا نام ہے لیکن بقول بروٹس وہ طالب رفعت تھا اور بروٹس واجب التعظیم ہے۔ میں یہاں اسلئے نہیں آیا کہ بروٹس کی تردید کروں میں تو صرف قیصر کی وہ باتیں بیان کر رہا ہوں جو مجھے معلوم ہیں۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب آپ سب اس پر جان نثار کرتے تھے پھر آج کیا ہو گیا کہ اس کے ماتم میں آپ کی آنکھوں سے دو قطرے بھی نہیں ٹپکتے؟ اے انصاف تو نے بھاگ کر حیوانوں میں پناہ لی اور انسانوں کی عقل پر پتھر پڑ گئے۔ مجھے معاف کیجئے اور کچھ نہ کہیے۔ میرا دل اس جنازہ میں قیصر کے ساتھ ہے۔ ہائے مجھ سے بولا نہیں جاتا۔ جب واپس آجائیگا بولوں گا۔"

شہر والے آپس میں انٹونی کی تقریر کی نسبت گفتگو کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قیصر کی خطا کے بارہ میں شک پیدا ہو گیا اور ایک آدھ نے انٹونی کی تعریف کی۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا:-

(ب) کل ہی کی تو بات ہے کہ قیصر کے حکم کے سامنے دنیا سر تسلیم خم کرتی تھی آج اس کا جنازہ وہ پڑا ہے اور کوئی اتنا بھی نہیں کہ اس کا ادب کرے۔ حاضرین اگر میں آپ کے دل و دماغ میں ہیجان پیدا کرکے آپ کو بغاوت و نفرت کی جانب مائل کردوں تو میں بروٹس کا خطاوار کہنے ہی اس کا خطاوار ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ سب واجب التعظیم ہیں، بجائے اس کے کہ میں ان کی شان میں گستاخی کروں، میں اس مردہ کی آپ کی اور اپنی شان میں گستاخی کرنا اچھا سمجھتا ہوں۔ لیکن دیکھئے یہ کاغذ کا ایک

پُلندہ ہے جس پر قیصر کی مہر لگی ہوئی ہے۔ یہ مجھے اس کمرہ میں ملا تھا، یہ اس کی وصیت ہے، میری نیت نہیں کہ میں اسے پڑھوں کیونکہ اگر اس کے مضمون کی بھنک بھی آپ لوگوں کے کانوں تک پہنچ گئی تو آپ قیصر کے زخم چومیں گے، اپنے رومال اس کے خون میں تر کریں گے، خوشامد کر کے اس کا ایک ایک بال مانگ کر بطور نشانی پاس رکھیں گے اور اس کو بیش بہا تصور کر کے مرتے وقت اپنی اپنی وصیتوں میں لکھکر اپنی اولاد کے سپرد کر جائیں گے:

شہر والوں نے شور بپا کیا کہ ہم وصیت سنیں گے اور اُن کے اصرار پر انٹونی نے تقریر شروع کی:-

(ج) "پیارے دوستو صبر کرو، میں ہرگز وصیت نہ سناؤں گا۔ اگر آپ کو یہ معلوم ہو کہ قیصر کو آپ سے کتنی محبت تھی تو اچھا ہے۔ آپ لکڑی نہیں، پتھر نہیں، آخر انسان ہیں، اور انسان ہونے کی وجہ سے ممکن ہے کہ وصیت سنیں، سینے میں آتش غضب مشتعل ہو اور یارائے ضبط نہ رہے یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آپ نہیں جانتے کہ قیصر کے وارث آپ ہی ہیں کیونکہ علم ہوتا تو اُف خدا جانے اب تک کیا سے کیا ہو گیا ہوتا۔"

شہریوں میں سے ایک نے چلا کر کہا، ہم وصیت ضرور سنیں گے، انٹونی نے پھر افسوں پھونکنا شروع کیا:-

"ذرا صبر کیجئے، ذرا ٹھہریئے، لو میں کہاں سے کہاں نکل گیا، میں نے کیوں وصیت کا ذکر کیا کہیں اُن لوگوں کی شان میں کوئی گستاخی تو نہیں ہوئی جن کے خنجر قیصر کے خون سے آلودہ ہیں۔ ہائے غضب ہو گیا:"

اب شہر والوں کے ہاتھ سے دامنِ صبر چھوٹ گیا۔ برملا بروٹس وغیرہ کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ وصیت کے سُنانے پر اصرار کیا اور انٹونی کی جادو بیانی مصروفِ ساحری ہو گئی۔

(د) "آپ تو مجھے وصیت سنانے کے لئے مجبور کرتے ہیں، اچھا تو قیصر کی لاش کے ارد گرد حلقہ باندھکر کھڑے ہو جائیے تاکہ میں آپ کو وہ شخص دکھاؤں جس نے یہ وصیت لکھی ہے، اُتروں؟ اجازت ہے؟

اجازت پا کر انٹونی فورم پر سے اُترا، قیصر کی لاش کے پاس آیا، لوگ چاروں طرف حلقہ باندھکر کھڑے ہو گئے، اور اس نے یوں آگ لگائی:-

(ہ) "اگر آپ کی آنکھوں میں آنسو ہیں تو تیار ہو جائیے کہ اب ان کے بہانے کا وقت آتا ہے بے شبہ آپ میں سے ہر شخص اس عبا کو پہچانتا ہے، مجھے یاد ہے کہ قیصر نے پہلے پہل اسے کب پہنا تھا۔ گرمی کا موسم تھا، وہ خیمے میں تھا اور نروائی کا یوم فتح تھا۔ دیکھئے یہاں کیسی اس کا خنجر گھسا

یہاں کاسکا نے چرکا دیا، اس جگہ سے اس کے پیارے بروٹس کا خنجر پار ہوا، اور جب اس نے اسے نکالا تو قیصر کا خون اس کے پیچھے پیچھے بیتابی سے نکلا، گویا دیکھنے آیا ہے کہ یہ بروٹس ہی ہے یا کوئی اور جس نے پیمان وفا کا خون کیا، کیونکہ بروٹس قیصر کی روح رواں تھا۔ دیوتاؤ، تمہیں انصاف کرو کہ قیصر بروٹس کو کتنا چاہتا تھا، تاریخ جدال و قتال اس سے بڑھکر بے رحمی کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے کیونکہ جب شریف النفس قیصر نے بروٹس کو خنجر مارتے دیکھا تو احسان فراموشی کے سامنے جس کے بازو دغا کے بازوؤں سے بھی قوی ہیں، ہتھیار ڈال دیئے، اس کا طاقتور دل بیٹھ گیا اور اپنی ہی عبا میں سر لپیٹ کر مجسمۂ پامپی کے قدموں پر گر پڑا جس سے خون کے فوارے نکل رہے تھے۔"

اے میرے ہم وطنو۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا گرنا کیسا گرنا تھا، اس وقت تم میں اور ہم میں سے ہر شخص قعر مذلت میں گر گیا۔ اور دغا و فریب کا بول بالا ہو گیا، تو تم تو رونے لگے، رحم سے دل بھر آیا، آنسو امنڈ آئے، ہر قطرہ جو تمہاری چشم پرنم سے گرتا ہے، ایک گوہر بے بہا ہے، صاحبو رونے سے کیا فائدہ جب کہ قیصر کا جسم زخموں سے چور چور ہے، دیکھو یہ قیصر ہے، دغابازوں نے اس کے کیسے تکے بوٹی کئے ہیں۔"

قیصر کی لاش دیکھکر شہریوں کا جوش انتہا کو پہنچ گیا، اور وہ بروٹس وغیرہ کو مارنے چلے، انٹونی نے روک کر کہا:-

(۹) "اچھے دوستو، پیارے دوستو، میری غرض یہ تو نہ تھی کہ آپ اتنے بگڑ جائیں، جنھوں نے یہ کام کیا ہے وہ بڑے بڑے لوگ ہیں۔ قیصر نے انھیں کوئی نقصان پہنچایا اور وہ اس لئے دہ اس کی طرف سے بھرے بیٹھے تھے اور اسے قتل کرکے دل کی بھڑاس نکالی، اس کا حال تو مجھے معلوم نہیں وہ عقلمند اور بزرگ ہستیاں ہیں خود ہی اس کا جواب دیں گی۔ دوستو، میں اس لئے نہیں آیا کہ آپ کے دلوں کو بے قابو کردوں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ میں بروٹس کا سا فصیح نہیں، سیدھا سادہ اکھڑ ہوں، اور اپنے دوست پر مٹا ہوا ہوں۔ اس کو وہ سب بھی جانتے ہیں جنھوں نے مجھے تقریر کی اجازت دی ہے۔ چونکہ عقل۔ قوت بیان۔ قابلیت۔ فصاحت۔ قادر کلامی میرے پاس ہو کر نہیں نکلیں کہ میں کسی کو بھڑکا یا اکسا دوں اس لئے جو دل میں ہے صاف صاف کہتا ہوں، میں آپ سے ہی باتیں کہتا ہوں جو آپ بھی جانتے ہیں۔ پیارے قیصر کے زخم جو دہن بے زبان ہیں دکھاتا اور انھیں سے کہتا ہوں کہ میرے عوض بولو۔ لیکن اگر بروٹس انٹونی ہوتا اور انٹونی بروٹس تو آپ کے سینوں میں آتش غضب شعلہ زن نظر آتی۔ قیصر کے ہر زخم میں ایک زبان پیدا ہو جاتی اور سوم

کا پتھر پتھر آمادۂ بغاوت دکھائی دیتا۔"

شہریوں کا جوش سلاسل ضبط توڑ چکا ہے وہ بروٹس کے قتل اور سازش کرنیوالوں کے گھر جلانے کے لئے جانے والے ہیں کہ انٹونی نے اس مئے دو آتشہ کو اور تیز کرنے کی غرض سے پھر روک کر کہا:-

(تمو) "آپ چلے کہاں، آپ کو یہ تو معلوم ہی نہیں کہ آپ کیا کرنے جا رہے ہیں، افسوس آپ کو یہ تو معلوم ہی نہیں کہ قیصر سے آپ کو اتنی محبت کیوں ہونی چاہیئے، سنیے میں بتاتا ہوں آپ وہ وصیت تو بھول ہی گئے جس کا میں نے ذکر کیا تھا۔"

شہری پھر ٹھہر گئے، اور انٹونی نے کہنا شروع کیا:-

"وہ وصیت یہ ہے۔ اس پر قیصر کی مہر لگی ہوئی ہے، اس نے ہر رومی کے لئے ۷۵-۵- درہم تک کے ہیں چھوڑے ہیں، اس کے علاوہ اس نے اپنی سیرگاہیں، اپنے باغ، اپنے باغیچے جو ٹائبر کے اس جانب ہیں، آپ کو اور آپ کی اولاد کو دیئے ہیں۔ آپ لوگوں کو گلگشتیں ملی ہیں تاکہ آپ ان میں سیر و تفریح کریں۔ قیصر سچ مچ قیصر تھا، اس کا سا دنیا میں کب پیدا ہوتا ہے۔"

اس تقریر کے بعد مجمع منتشر ہو گیا اور انٹونی نے اطمینان کا سانس لیکر کہا۔-

شیطنت تو دنیا میں قدم رکھ چکی، جا، اور اپنے کرشمے دکھا۔"

بروٹس اور انٹونی دونوں کی تقریر پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بروٹس نے صرف اس پر زور دیا ہے کہ قتل کا سا خوفناک جرم محض اس واسطے جائز قرار دیا گیا کہ اس سے رومیوں کی آزادی وابستہ تھی۔ اس نے پہلے اپنی حیثیت کا ذکر کر کے لوگوں کو یقین دلانا چاہا کہ جو کچھ وہ کہتا ہے سچ ہے اور پھر اس کو انھیں کی عقل و انصاف پر چھوڑ دیا کہ اس کا اور اس کے رفقا کا فعل کہاں تک مستحسن تھا۔ اس نے اپنے تعلقات کا ذکر کر کے ان کی لوح دل پر مرتسم کرنا چاہا کہ قومی مسائل ذاتی تعلقات و معاملات سے ارفع ہیں۔ اس لئے جو تقریر کی اس سے مترشح ہوتا ہے کہ جس طرح خود اس نے اس قتل کو میزان منطق و فلسفہ میں تول کر فیصلہ کیا کہ آزادیٔ روم کی قربان گاہ پر قیصر کی سی عظیم الشان ہستی بھینٹ چڑھائی جا سکتی تھی اسی طرح وہ بھی اس کا فیصلہ کر لیں گے۔ اس نے قیصر پر ایک الزام لگایا لیکن کوئی بات اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش نہیں کی۔ اس نے کہیں بھی اس کی کوشش نہیں کی کہ معاملہ کو مختلف پہلوؤں سے پیش کر کے خیالات میں اتنا ہیجان پیدا کر دے کہ پھر کسی اور کا جادو نہ چل سکے اس کی تقریر معمولی دماغوں کی سطح سے بلند ہے اور اتنی خشک کہ اثر کا کل دارومدار غور و فکر پر رہ جاتا ہے۔

اس کی حرکات و سکنات اور آواز ہر چیز سے اثر کو سوں دور ہے، اور تو اور وہ ان سے اتنا بھی نہ کہلا سکا کہ قیصر طالبِ رفعت تھا۔

انٹونی ایک تو تصویرِ غم بنکر فورم پر چڑھا دوسرے اچھی طرح جانتا تھا کہ یہاں دلیل و حجت سے کام نہ چلے گا اور جذبہ خوانی میں ان باتوں کو دخل نہیں۔ اگر اسے بروٹس کی علانیہ تردید کرنی ہوتی تو شاید وہ بھی اس کی طرزِ تقریر کی جانب مائل ہو جاتا لیکن یہ طریقہ اختیار کر کے وہ سامعین پر کوئی اثر نہ ڈال سکتا تھا۔ چنانچہ تردید کے لئے جو پیرایہ اختیار کیا وہ شاعروں کی ہجو ملیح سے کم نہ تھا قیصر کی تعریفیں کیں اور حاضرین ہی سے کہلاتا جاتا تھا کہ اس کے قاتل جھوٹے ہیں۔

تقریر کے پہلے حصے (ا) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی احتیاط سے کام لے رہا ہے، اس نے لوگوں کے دلوں میں بروٹس کی صداقت کی نسبت شک پیدا کر دیا اور جب یقین ہو گیا کہ تذبذب پیدا ہو چلا تو اس کا اندازہ لگانے کے لئے کہ کتنا پیدا ہوا ہے یہ کہکر ٹھہر گیا "میرا دل اس جنازہ میں قیصر کے ساتھ ہے، ہائے مجھ سے بولا نہیں جاتا، جب واپس آ جائے گا بولونگا"

یہ دیکھ کر کہ اس کی تقریر نے لوگوں کو کچھ کچھ بھڑکا دیا اس نے ایک اور مؤثر ہتھیار سے کام لیا (ب) سازش کرنے والوں کا صرف یہی دعویٰ تو تھا کہ قیصر بوالہوس و طالبِ رفعت ہے، اس کی تردید کے لئے اس نے ایک وصیت نامہ پیش کر دیا جو قیصر کا محضر ایثار تھا اور ذاتی منفعت کی چاٹ دیگر دلوں کو مسخر کر رہا تھا، لیکن دیکھئے یہ ماہرِ نفسیات وصیت نامے کے مضمون کا ذکر ہی کرتا ہے، اسے پڑھکر نہیں سناتا۔ ابھی تک اس کے نزدیک خیالات میں وہ انقلاب نہیں پیدا ہوا جو وہ پیدا کرنا چاہتا ہے لوگ اصرار کرتے ہیں اور وہ جو جواب دیتا ہے (ج) اس سے ایک طرف تو یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ میں آتشِ بغاوت مشتعل کرنے کا آرزو مند نہیں اور دوسری طرف ان کے جذبۂ انتقام میں شدت پیدا کرنے کو انھیں قیصر کا وارث بتاتا ہے۔

اس قدر کامیابی کے بعد بھی انٹونی کو کامیابی کی امید نہیں۔ وہ انھیں قیصر کے ایثار کا یقین دلا کے اب قیصر کے زخم دکھا رہا ہے (د۔ ہ) تاکہ جذبات انسانیت بیدار ہو کر ایک آتشہ کو دو آتشہ کر دیں۔ اس وقت اس نے جو کچھ کہا ہے وہ سوز و گداز اور رقت کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

جوش جنون کے درجے تک پہنچ گیا۔ لیکن استادِ ساحری فن اب بھی افسوں گری سے باز نہیں آتا (د) چاہتا ہے کہ جب مجمع منتشر ہو تو باغیوں پر یہ سودا سوار ہو کہ قیصر بے گناہ قتل کیا گیا، اور ان کے فعل کی ذمہ داری خود بلوائیوں کے ذاتی محسوسات پر ہے نہ کہ خارجی اسباب یعنی کسی

کی ترغیب پر۔ اس تقریر کے بعد اسے اپنی کامیابی میں شک نہیں رہتا۔ اس لئے وہ وصیت سُناتا ہے (ر) وصیت نہ سُناتا تو شاید کسی کے دل میں اس کی طرف سے شک وشبہ پیدا ہوجاتا لیکن وہ کامل فن کیوں چوکڑی چوکنے لگا تھا۔

دیکھئے ایک ماہر نفسیات نے کس خوبی سے ایک فلسفی کو چاروں خانے چت پچھاڑا۔ اگر فلسفی معقولیت پر بے حد اعتماد نہ کرتا۔ اپنے فعل کے حق بجانب ہونے کے زعم میں اپنے بیان صحیح واقعات سے مستحکم کرنے سے اجتناب نہ کرتا اور ماہر نفسیات کی ساحری کو جلوہ گری کا موقع نہ دیتا تو پانسا یوں نہ اُلٹتا۔

محبت

(مسز سروجنی نائیڈو کی نظم کا ترجمہ)

اے محبت میں نہیں جانتی کہ جب تو خوش ہوتی ہے،
تو میرا دل کیوں اُچھلنے لگتا ہے
اے محبت اس کی کیا وجہ ہے کہ جب تو رنجیدہ ہوتی ہے
تو میرا دل آہ وزاری کرتا ہے

مجھے معلوم نہیں کہ جس وقت تیرا التفات ہوتا ہے
تو میرے دل کو کیوں اطمینان نصیب ہوتا ہے
اے محبت، اگر تیری آنکھیں درد کی وجہ سے بند ہوجائیں
تو میرے دل میں برچھیاں سی لگتی ہیں

چند ساعت میں ان سحر آمیز پھولوں میں دلکش رنگت آجاتی ہے
اے محبت! مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں
جب تک مجھے معلوم نہ ہو
مَیں تجھ سے جدا نہیں۔ اے محبت تو مجھ سے جدا نہیں

(نقش عالمی)

موجبات جنگ

(از مسٹر منوہر لال طالب بی۔اے (آنرز) ایل ایل۔بی۔ وکیل)

زمانہ بابتہ فروری ۱۹۳۱ء میں "سزا" پر بحث کرتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اس کے آغاز کا ذمہ دار وہ ازلی جذبہ انتقام ہے جو قدرت نے انسانی فطرت میں ودیعت کیا ہے۔ آپ اسے انسانی کمزوری کہیں یا کوئی اور نام دیں، اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیا کی بہت سی برائیاں، ناقابل حل مشکلیں اور پیچیدگیاں اور سیاسی گتھیاں جن کو سلجھانے سے دنیا کے بہترین دماغ عاجز ہو گئے ہیں اسی جذبہ کی بدولت وجود پذیر ہوئی ہیں۔

نظریۂ جنگ پر اظہار خیال کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم نہ صرف جنگ کے اولین مدارج سے آگاہ ہوں بلکہ ابتدائے جنگ کی وجوہ اس کے تدریجی تغیر و تبدل اور اس کے اثرات سے کما حقہ واقف ہوں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو "سزا" اور "جنگ" میں بہت کچھ مناسبت ہے۔ زمانۂ قدیم میں اگر کسی فرد واحد کو سزا دینی ہوتی تھی تو اس سے لڑائی کی جاتی تھی۔ اس کے دوست آشنا ہم قوم و مددگار اس کی امداد پر کمربستہ ہو کر اس کی "سزا" کے سد راہ ہوتے تھے اور دوسرا فریق بھی اپنے رفقا کے ساتھ اس کی سرکوبی کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ انسانی تاریخ میں یہی جنگ کی ابتدا ہے۔ "سزا" کی تہ میں جو کام انتقام کا جذبہ کرتا ہے جنگ کی وجوہ میں سزا دینے کی خواہش وہی کام سرانجام دیتی ہے۔ پس جنگ کی تاریخ میں سزا دینے کی خواہش ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اسی پر جنگ کے ایوان عالی شان کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔

یہاں پر یہ ضروری نہیں ہے کہ انفرادی جنگ سے گروہی جنگ اور گروہی جنگ سے ملکی اور بین الاقوامی جنگ کی تدریجی ترقی کی تفصیل و توضیح کی جائے۔ یہ آسان بات ہے، جس طرح فرد واحد کے مددگار اس کے جانبدار ہو کر جنگ میں شریک ہو جاتے ہیں، اسی طرح آہستہ آہستہ جب گروہی احساس یا جذبۂ قومیت کی نشو و نما ہوئی تو جانبین جنگ بھی پہلے سے بڑے بڑے گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور ایک قوم کی دوسری قوم سے جنگ ہونے لگی۔ پھر دوسری قوم بہ حیثیت مجموعی ہمسایہ قوم کے

آڑے وقت میں امداد کرنے پر مستعد ہوگئی، اسی طرح قومیت اور اس کے حصے قائم ہوگئے۔ رفتہ رفتہ پورے پورے ملک ایک فریق کی حیثیت سے جنگ کرنے لگے اور نوبت حالت موجودہ تک پہونچ گئی۔

اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا ابھی تک باہمی جنگ و جدال کے وہی وجوہ قائم ہیں جو پہلے زمانے میں ہوتے تھے یا ان میں کوئی تغیر رونما ہوا ہے۔ ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ جنگ کا آغاز انسان کے فطری جذبۂ انتقام سے ہوا ہے۔ کسی نے کسی کو گالی دی یا کوئی ہتک آمیز کلمہ کہدیا بس وہی بنائے مخاصمت اور موجب فساد بن گیا۔ گالی یا ہتک آمیز کلمہ کیا ہے، اس کا معیار مختلف زمانوں میں مختلف رہا ہے زمانہ کے ساتھ ان کا مفہوم بھی بدلتا رہا۔ مگر ہمیں سردست اس سے واسطہ نہیں کہ گالی کیا ہے اس سے انسان کیوں مشتعل ہوتا ہے، یہ باتیں اگرچہ دلچسپ ہیں لیکن اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔

انسان ایک قدم آگے بڑھا، اس نے ترقی کی تو اس کے دماغ میں سود و زیاں کا واہمہ گھر کرنے لگا، خود غرضی کی بنیاد قائم ہوئی اور انسان اپنے ماحول پر قابو پانے کی فکر میں مشغول ہونے لگا کسی نے کسی کا زخمی ہرن پکڑ لیا یا کوئی پھل توڑ لیا، خود غرضی نے بھڑکایا اور جنگ باہمی (دنگا فساد) کی بنیاد پڑ گئی۔

جیسے ہی انسانی دماغ میں خود غرضی نے جڑ پکڑی آزاد انسان قدرت کی آزادی کا دشمن ہوگیا پہاڑ، جنگل، دریا، جانور، بھیڑ بکری، گھوڑا جس جس نے انسانی اطاعت قبول کی وہ وجہ فساد بن گیا "ہمارا تمہارا" کے لاعلاج مرض کی ابتدا ہوئی، اور اب یہ مرض تمام دنیا میں پھیل گیا ہے، نفع نقصان کے خیال سے بے جان اشیا کی وجہ سے بھی جنگ ہونے لگی۔ اس نے ہمارے جنگل سے کیوں کوئی درخت کاٹا ہمارے چشمہ سے اپنے مویشیوں کو کیوں پانی پلانے گیا۔ ان ذرا ذرا سی باتوں پر لڑائیاں ہونے لگیں۔ ان مثالوں سے بخوبی واضح ہے کہ انسانی تاریخ میں "حقوق" کی بنا تنگدلی اور خود غرضی پر ہے، یہاں پر اس سے زیادہ توضیح کی گنجائش نہیں، مولانا حالی نے اس عہد کی لڑائیوں کا نقشہ خوب کھینچا ہے

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
یونہی روز رہتی تھی تکرار اُن میں
یونہی چلتی رہتی تھی تلوار اُن میں

انسان نے اور ترقی کی اور کئی قدم آگے بڑھا، اُس کی ذہنی ماہیت و قلبی کیفیت میں نمایاں

تبدیلی ہوئی اور اپنے ماحول کے متعلق سوچنے کی عادت نے اُسے مغلوب کر لیا۔ اس دنیا کی پیدائش کیونکر ہوئی ؟ انسان کی موت کس طرح ہوتی ہے ؟ مرنے کے بعد وہ کہاں چلا جاتا ہے ؟ اس طرح کے بیسیوں ناقابل حل سوالات نے اُسے لاجواب کر کے حیرت و استعجاب کے عمیق گڑھے میں ڈال دیا اور مذہب کی ضرورت لاحق ہوئی۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ موجود ہو ہی جاتی ہے، چنانچہ یہ ضرورت بھی پوری ہو گئی۔ مگر مذہب نے انسان کو اس درجہ گرویدہ کر لیا کہ وہ اس کا دیوانہ ہو گیا۔ بہرحال جنون مذہب نے انسان کو وہ ناچ نچائے اور اب تک نچا رہا ہے جس کو دیکھ کر اہل بصیرت کا سر بار ندامت سے جھک جاتا ہے۔ آخر تعصب اور مذہبی اختلافات جنگ کی وجہ بن گئے، اس طرح مذہبی لڑائیوں کا آغاز ہوا، عیسائیوں کی صلیبی لڑائیاں ابتک تاریخ کے صفحات کو خون آلودہ کئے ہوئے ہیں۔ غرض اس طرح مذہب بھی وجوہ جنگ میں شامل ہو گیا۔

حقوق و ذمہ داری کے احساس نے انسانی دماغ کی نشو و نما میں کس قدر حصہ لیا ؟ اس نے اس کی تہذیب و ترقی کی رفتار پر کیا اثر ڈالا، یہ باتیں ہر ایک ذی علم کو معلوم ہونا چاہیئے۔ بہرحال ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ جب حقوق و ذمہ داری کا احساس بہت سے مدارج ارتقا طے کر چکا ہو گا اُس وقت جذبات لطیف بھی پیدا ہونے شروع ہوئے ہونگے۔ انھیں جذبات کی بدولت حسین اور لطیف چیزوں سے انسان کو انس و محبت اور عشق تک پیدا ہوا۔ انسانی دماغ پہلے قدرتی مناظر کے حسن سے متاثر ہوا ہو گا، بعد ازاں نسوانی حسن کا بھی اثر ہونے لگا اور انسان یہ محسوس کرنے لگا کہ عورت فطرت کی حسین ترین و محبوب ترین تخلیق ہے۔ اس کے بعد اس کے ناموس کی حفاظت وہ اپنا فرض مقدس تصور کرنے لگا اور عورت پر فرد واحد کے خاص حقوق تسلیم ہونے لگے۔ پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ عورت رقابت کی آگ بھڑکانے کے ساتھ ساتھ باہمی جنگ و جدل کی وجہ بھی بن گئی۔ کون نہیں جانتا کہ "جنگ ٹرائے" کی وجہ پر کالۂ آتش ہیلن کا حسن جہاں سوز تھا۔ سچ ہے زر، زمین، زن ہی بنیاد فساد ہیں۔

دولت دنیا کی ایک عظیم ترین طاقت ہے۔ اس کی قدر ان اشیا کی وجہ سے ہے جن کو یہ خرید سکتی ہے ہماری مراد اُن تمام لوازمات سے ہے جو دنیا میں زر کے عوض میسر ہو سکتے ہیں۔ حرص زر نے بڑے بڑے لوگوں کو جائز و ناجائز کام کرنے پر مجبور کیا اور تاریخ میں ایسی لڑائیوں کی مثالیں نایاب نہیں جو محض حصول دولت کے لئے لڑی گئیں، اس کی زندہ مثال خود ہندوستان میں محمود غزنوی کے حملے ہیں، اسی طرح جنگ مہابھارت بھی کوروؤں کے بے انتہا حرص و ہوس کا نتیجہ تھی۔

جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا انسان کے خیالات میں تبدیلی ہوتی گئی جنگ کی وجوہ بھی تبدیل ہو گئیں۔

جب لوگ زیادہ مہذب ہوگئے وہ خیال کرنے لگے کہ محض انتقام کے لئے اس قدر کشت وخون اور بندگانِ خدا کا قتل عام نامناسب بلکہ فضول ہے۔ مذہب کا جنون بھی حکمراں قوموں کے دماغ سے نکل گیا۔ وہ سوچنے لگیں کہ مذہبی عقائد کے متعلق بھی ہر ایک انسان کو اس وقت تک اپنے خیالات مبارک ہیں جب تک وہ ہمارے لئے باعثِ تکلیف نہ ہوں۔ پھر محض اختلافِ مذہب کی وجہ سے کسی ملک پر کیوں چڑھائی کی جائے۔ اس سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے کہ لوگ بزورِ شمشیر مذہب میں شامل کئے جائیں یہ حماقت بھی موجودہ دورِ تہذیب میں ناممکن ہے کہ کسی حسین عورت کے لئے جنگ و جدل کا بازار گرم کیا جائے۔ محض ملک فتح کرنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ اگر وہاں کی زمین بنجر ہے، معدنیات کا نشان نہیں، آب و ہوا اس قابل نہیں کہ فاتح قوم کی نوآبادیاں قائم ہوسکیں، وسعت اقلیم کا چسکا بھی اگر وہ اقتصادی مفاد سے معرا ہے اب کسی کو نہیں ہوسکتا ہے، کوئی شخص ریگ ساحل میں اناج بونا نہیں چاہتا۔ بہر حال زمانہ حال میں جنگ کی وجہ اقتصادی اور صرف اقتصادی ہوتی ہے، کہیں مٹی کا تیل آگ لگا دیتا ہے، کہیں روئی، سن اور معدنیات کے ذخائر اور منفعت بخش تجارت کے مواقع آتشِ جنگ مشتعل کر دیتے ہیں ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کی جنگ عظیم یورپ کی اصلی وجہ بھی اقتصادی رقابت تھی۔ کمزور قوموں کی امداد کا دعویٰ محض ایک بہانہ تھا آج جنگ کی وجہ اقتصادی مفاد ہے، کل خدا جانے کیا ہوگا۔ مگر دورِ حاضرہ کے مختلف نظریے اور مختلف خیالات کی نشو و نما سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مستقبل میں اقتصادی وجوہ کے علاوہ جنگ کی کوئی اور وجہ ہوا کریگی۔ یہ اور بات ہے کہ ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کے اصول خلاف توقع مقبول عام ہوجائیں اور لوگوں کے خیالات یک قلم تبدیل ہوجائیں۔ اس وقت جنگ ہونا مشکل ہوجائیگا۔

آئینہ (پیشاور) ایک علمی وادبی رسالہ ہے جو حال میں صوبۂ سرحد میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت کی غرض سے جاری ہوا ہے۔ اس وقت اس کا پہلا نمبر ہمارے سامنے ہے، جس میں نظم و نثر کے تیس ۳۰ مضامین ہیں۔ مضامین نگاروں میں اکثر حضرات صوبہ سرحد کے باشندے ہیں باقی پنجاب، صوبہ متحدہ اور دکن وغیرہ کے ہیں۔ مضامین عموماً دلچسپ ہیں۔ بہر حال ہم اپنے جدید معاصر کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس کی کامیابی کے لئے دست بدعا ہیں، ہم کو امید ہے کہ مدیر صاحب آئینہ آئندہ نمبروں میں زبان کی خامیوں اور کتابت کی غلطیوں کی طرف زیادہ توجہ فرمائیں گے، لکھائی چھپائی میں بھی اصلاح کی گنجائش ہے۔ ہم کو امید ہے کہ صوبہ سرحد کے شائقینِ ادب اس رسالہ کی قدر دانی فرمائیں گے۔ اس کا سالانہ چندہ صرف ہے ہے جو کسی طرح گراں نہیں کہا جا سکتا۔

رحیم کے دوہے

(از منشی ہری کشن صاحب بی۔اے بی ٹی)

عبدالرحیم خانخاناں المتخلص بہ رحیم دربار اکبری کے نورتنوں میں سے ہیں۔ آپ بیرم خاں کے فرزند دلبند ہیں۔ بیرم خاں اکبر کے حقیقی پھوپھا اور ہمایوں کے مشہور سپہ سالار اور جاں نثار تھے۔ ہمایوں کی وفات کے بعد جب اکبر تخت نشین ہوا اس کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی، چنانچہ اس کی نابالغی کے زمانہ میں بیرم خاں ہی سلطنت کا کام انجام دیتے تھے۔ عبدالرحیم سنہ ۱۵۵۶ء میں بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ ابھی پانچ سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اکبر نے آپ کی پرورش کا انتظام اپنے ذمہ لیا اور فرطِ محبت سے آپ کو مرزا خاں کے نام سے مخاطب کیا۔ رحیم نے تیرہ سال کی عمر تک فارسی ترکی اور عربی میں کمال حاصل کر لیا۔ سنسکرت میں بھی کافی قابلیت پیدا کی اور فنِ جنگ میں مہارت تامہ حاصل کی۔ اسی سال انھیں منعم خاں کا خطاب ملا اور شہنشاہ اکبر کی خدمت میں حاضر رہکر وہ درباداری کے نازک فرائض انجام دینے لگے۔

سنہ ۱۵۸۴ء میں گجرات کی مہم پر عبدالرحیم مامور کئے گئے، جس کو انھوں نے اس خوبی سے انجام دیا کہ بڑے بڑے پرانے سردار دنگ رہ گئے اور اکبر کے دل پر بھی ان کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔ تمام علاقۂ گجرات ممالک محروسہ میں شامل کر لیا گیا۔ اس زبردست فتح کی خوشی میں عبدالرحیم نے نہ صرف مالِ غنیمت ہی بلکہ اپنا ذاتی سامان نقد و جنس خیمہ و خرگاہ سب اہلِ لشکر کو بانٹ دیا۔ کہتے ہیں کہ ایک سپاہی ایسے وقت آیا کہ ان کے پاس ایک قیمتی قلمدان کے سوائے جس سے سرکاری کاغذات پر دستخط کر رہے تھے اور کوئی چیز باقی نہ بچی تھی چنانچہ آپ نے اس کو بھی اس سپاہی کو یہ کہہ کر دیدیا کہ لے بھائی تیری قسمت کا یہ بچا ہوا قلمدان موجود ہے۔ اس فتح کی خوشی میں اکبر نے مرزا خاں کو خانخاناں کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر نے مغلیہ تخت کو زینت دی۔ خانخاناں بھی اپنے علاقۂ برہان پور سے روانہ ہوئے اور متعدد گراں بہا تحائف کے علاوہ موتیوں کی دو تسبیحیں اور چند قطعات لعل و زمرد

کے (جن کی قیمت کا اندازہ تین لاکھ کیا جاتا ہے) جہانگیر کو نذر کئے۔ جہانگیر نے ان کو وزیر الملک کا خطاب عطا کیا۔ عہد جہانگیری میں دیگر فتوحات کے علاوہ دکن کی فتح کا سہرا بھی آپ ہی کے سر بندھا اس جنگ زندگی میں جو شاہجہاں کی بغاوت کے نام سے مشہور ہے خانخاناں کو بھی سخت نقصان اُٹھانا پڑا۔ جہانگیر بلکہ یوں کہیئے کہ نورجہاں کی ناراضگی کی وجہ سے آپ کی جاگیر ضبط ہوگئی اور وہ زمانہ آپ کا سخت مصیبت سے بسر ہوا۔ آپ نے اپنے مشہور مندرجہ ذیل دوہے میں اسی واقعہ کی نسبت اشارہ کیا ہے

ये रहीम दर दर फिरें, माँगि मधुकरी खाहिं
यारो यारी छोरि दो, वे रहीम अब नाहिं ॥

باپ بیٹوں میں صفائی ہو جانے پر ۱۶۲۶ء میں بہ پھر دربار میں طلب کئے گئے۔ مہابت خاں کی بغاوت کے موقعہ پر خانخانی کا خطاب جو اُن سے لیکر مہابت خاں کو دیدیا گیا تھا پھر اُن کو عطا کیا گیا اور اُن کو مہابت خاں کے استیصال کے لئے روانہ کیا گیا۔ اس وقت آپ کی عمر بہتر سال کی تھی اور زندگی سے دل سیر ہو چکا تھا۔ جسمانی طاقت نے بھی جواب دیدیا تھا چنانچہ لاہور ہی میں بیمار پڑ گئے اور دہلی میں پہونچتے پہونچتے ضعف غالب ہوگیا اور ۱۶۲۷ء میں اس دارناپائدار سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

جس طرح آپ ایک زبردست صاحب شمشیر تھے اُسی طرح مشہور اہل قلم بھی تھے۔ فارسی زبان کے مشہور شاعر عرفی نے آپ ہی کے دامن تربیت میں پرورش پائی تھی۔ فن تنقید میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ چنانچہ آپ کے معصر شعرا آپ کی معقول گرفتوں سے فیضیاب ہوکر فن شعر میں کمال حاصل کرتے تھے۔ آپ کو فارسی ہندی دونوں زبان کی شاعری میں کمال حاصل تھا۔

ہندی میں آپ کا کلام "رحیم کے دوہے" کے نام سے مشہور ہے جو نہایت قدر و منزلت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے اور آج تک اہل فہم سے خراج تحسین وصول کرتا ہے۔ اس خیال سے کہ ہندی سے ناواقف اُردو داں شائقین ادب آپ کے کلام سے مستفید ہوں آپ کے دوہوں کا منظوم اُردو ترجمہ ذیل میں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ جو بابو گھمبیر پرشاد صاحب المتخلص بہ قدر ساکن بلند شہر کی طبع رسا کا نتیجہ ہے بابو صاحب کو تحریک نان کوآپریشن کے زمانہ میں سرکاری مہمان ہونے کا موقعہ مل چکا ہے اور ایک دفعہ نہیں بلکہ چار دفعہ آپ قید فرنگ کا لطف اُٹھا چکے ہیں۔ یہ ترجمہ آپ کی چوتھی مرتبہ کی قید فرنگ کا ثمرہ ہے۔ ترجمہ کے ساتھ ساتھ اصل دوہے بھی ہندی میں درج کئے جاتے ہیں:-

دوہا
जो रहीम उत्तम प्रकृति, का करि सकत कुसंग ।
चन्दन बिष व्यापत नहीं, लिपटे रहत भुजंग ॥

ترجمہ۔ نیک خو کو صحبتِ بد کا اثر ہوتا نہیں   زہر کا کالوں کے صندل پر اثر ہوتا نہیں

دوہا: रहिमन धागा प्रेम को, मत तोरौ चटकाये ।
टूटे स पुनि ना मिलै. मिले गांठि पठ़ जाय ॥

ترجمہ رشتۂ الفت نہ توڑے یہ گرہ لو اپنی باندھ   ٹوٹا جڑتا نہیں جڑنے سے پڑجاتی ہے گانٹھ

دوہا رहिमन बात अगम्य की ; कहन सुनन की नाहिं ।
जो जानत सो कहत नहिं ; कहत सा जानत नाहिं ॥

ترجمہ۔ از حق وہ راز ہے جو کہنے سننے کا نہیں   کہنے والا بے خبر ہے، با خبر کہتا نہیں

دوہا यह रहीम दर दर फिरें ; मांग मधुकरी ग्वाहिं ।
यारो यारी छोड़ दो, वे रहीम अब नाहिं ॥

ترجمہ: در بدر پھرتے ہیں خود کھاتے ہیں روٹی مانگ کر   چھوڑ دو یاری نہیں ہم اب رحیم پیشتر

دوہا रहिमन चुप हैं बैठिये, देखि दिनन को फेर ।
जब नीके दिन आइहैं, बनत न लगिहैं बेर ॥

ترجمہ: کھائیے خاموش بیٹھے غم دنوں کے پھیر کا   جب بھلے دن آئیں گے بنتے لگے گی دیر کیا

دوہا रहिमन प्रीति न कीजिये, जस खीरा ने कीन ।
ऊपर से तो दिल मिला ; भीतर फाँकें तीन ॥

ترجمہ: جس طرح کھیرے نے کی ایسی نہ ہم الفت کریں   بظاہر دل ملا اندر سے قاشیں تین ہیں

دوہا रहिमन इस तन सूप ते ; लीजे जगत पछोर ।
हलकन को उड़जानि दे ; गरूये राखि बटोर ॥

ترجمہ غلہ افشاں خرد سے خرمنِ دنیا پر کھ   اہل کو اپنا بنا نا اہل سے مطلب نہ رکھ

دوہا रहिमन अँसुवा नैन ढरि, जिय दुख प्रकट करेय ।
जाहि निकालो गेह ते, कस न भेद कहि देय ॥

ترجمہ: دردِ دل اشکوں نے بہکر آنکھ سے افشا کیا   گھر سے بھیدی کیوں نکالا بھید گھر کا کہدیا

دوہا रहिमन मनहिं लगाय के, देखि लेहु किन कोय ।
नर को बस करिबो कहा, नारायण बस होय ॥

ترجمہ: عشق کہتا ہے کہ انسان کیا خدا قابو میں ہو   جذبِ کامل جس میں ہو لیکن وہ دل پہلو میں ہو

दोहा सम्पती भरम गँवाइ कै, हाय रहत कुछ नाहिं।
ज्यों रहीम सीस रहत है, दिवस अकास हिं माहिं॥

ترجمہ کھوکے دولت کا بھرم وہ بات رہتی ہے کہاں ایک ٹکڑا سا ہے دن کے وقت ماہِ آسماں

दोहा रहिमन अति मुसकिल भयो गाढ़े दोऊ काम।
साँच कहें तो जग नहीं, झूठे मिलें न राम॥

ترجمہ کیا کروں وہ کام ہیں اور ایک بھی سیدھا نہیں سچ کہوں دنیا نہیں جھوٹے کو حق ملتا نہیں

दोहा यों रहीम रहा होत है, उपकारी के संग।
बाँटनवारे को लगे, ज्यों मिंहदी के रंग॥

ترجمہ اس سے وابستہ ہو شہرت کیسے سب کا بھلا بانٹنے والے کے لگ جاتا ہے خود رنگ حنا

दोहा रहिमन असमय के परे, हित अनहित है जाय।
बधिक बधे मृग बान सों, रुधिरै देत बताय॥

ترجمہ دوست ہو جاتے ہے دشمن ساعت نامسعود میں خونِ آہو بن گیا ہے مخبرِ رہِ صیاد میں

दोहा यों रहीम सुख होत है, बढ़त देख निज गोत।
ज्यों बड़री अँखियाँ निरखि, आँखन को सुख होत॥

ترجمہ ہوتے ہیں سب خوش وفا خاندانی دیکھ کر آنکھ سے سرورِ چشم ارغوانی دیکھ کر

दोहा रहिमन रहिला की भली, जो परसे चित लाय।
परसत मन मैला करे, सो मैदा जर जाय॥

ترجمہ خوب ہے جو کی اگر از راہِ الفت پیش ہو نان گندم کیا بھلا گر جو کوئی دل ریش ہو

दोहा बिरह रूप घन तम भयो, अवधि आस उद्योत।
ज्यों रहीम भादों निसा, चमकि जात खद्योत॥

ترجمہ ہے امید وصل کی شعلہ ہجر کی ظلمات میں جیسے جگنو کی چمک بھادوں کی کالی رات میں

दोहा जो रहीम मन हाथ है, मनसा कहुँ किन जाहिं।
जल में ज्यों छाया परे, काया भीजत नाहिं॥

ترجمہ خواہشوں سے کیا جو دل قابو سے انسانی میں ہے جسم تر ہوتا نہیں سایہ اگر پانی میں ہے

سرکار آصفیہ کا جدید نستعلیق ٹائپ

اعلیٰ حضرت نظام حیدر آباد دکن کی معارف پروری اظہر من الشمس ہے۔ یوں تو ہر قسم کے علوم و فنون کی سرپرستی اور اہل علم و فن کی قدر کی جاتی ہے اور ہندوستان کے مختلف ادارے اس سرچشمۂ فیض سے بہرہ ور ہو رہے ہیں مگر اُردو زبان تو خصوصیت سے سرکار دکن کی زیر بار احسان ہے "کلیہ عثمانیہ" اور دار الترجمہ کے قیام سے اُردو ادب کو عظیم فائدہ پہونچ رہا ہے اور ان کی بدولت ہر قسم کے علم و فن کے متعلق کارآمد لٹریچر مہیا ہو رہا ہے۔ اُردو کی توسیع و ترقی میں جو رکاوٹیں ہیں اُن کی طرف بھی خسرو دکن اور اُن کے مشیران خاص کی توجہ ہے۔ چنانچہ عرصہ سے سرکار نظام کی سرپرستی میں اردو ٹائپ بنانے اور اُس کو رواج دینے کی کوشش پیہم ہو رہی ہے۔

دنیا کی ہر زندہ اور ترقی یافتہ زبان میں ٹائپ کا رواج ہو چکا ہے مگر اُردو ابھی تک اس سے محروم ہے۔ اُردو میں جو ٹائپ عام طور پر استعمال ہوتا ہے وہ نسخ ہے اور یہ واقعہ ہے کہ ابتک ہندوستان میں یہ خط مقبول عام نہیں ہوا چنانچہ باوجود اس کے کہ اکثر سرکاری مطبوعات اس ٹائپ میں چھاپی گئیں اور مرحوم سر سید احمد خاں صاحب نے بھی اپنے وقت میں اس ٹائپ کو رواج دینے کی انتہائی کوشش کی بلکہ علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ وغیرہ کو ٹائپ ہی میں شائع کیا پھر بھی یہ رسم الخط ہر دلعزیز نہیں ہوا ہم لوگوں کی آنکھیں نستعلیق تحریر کی کچھ اس قدر عادی ہو گئی ہیں کہ ہزارہا ناظرین کو ٹائپ کی چھپی ہوئی کتابیں پڑھنے میں خاص تکلیف ہوتی ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی صوبۂ متحدہ نے بھی اپنی اُردو مطبوعات کو ٹائپ ہی میں شائع کرنیکا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن یہ تجویز خود اکیڈمی کے حلقۂ اثر میں ہر دلعزیزی حاصل نہیں کر سکی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جبتک اُردو میں ٹائپ کا رواج عام نہ ہوگا اس وقت تک اس زبان کو وہ ترقی نصیب نہیں ہو سکتی ہے جس کے بغیر آج کوئی زبان با وقعت نہیں سمجھی جا سکتی ہے۔ اُردو کا نستعلیق ٹائپ بنانا سخت دشوار ہے کیونکہ اس میں حروف کی نشست اور کرسی وغیرہ کے کچھ اس قسم کے مرحلے ہیں جن سے ٹائپ بنانے والے کو غیر معمولی مشکلات سے سامنا ہوتا ہے اور اس کی تیاری اور چھپائی کا صرفہ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ عام لوگوں کو ادھر رجوع ہونے کی ہمت ہی نہیں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

ابتک اُردو کا کوئی عمدہ ٹائپ تیار نہیں ہوسکا حالانکہ اس کی کوشش سوا سو برس سے زیادہ سے ہو رہی ہے۔ مگر اب اعلیحضرت نظام دکن کی فیاضی و اولوالعزمی سے اُردو کی یہ اہم کمی بھی جلد ہی پوری ہونیوالی ہے اس کے متعلق ابتک بہت سے تجربے بھی ہوچکے ہیں جو آئندہ کے لئے بہت کچھ امید افزا ہیں

درحقیقت اُردو کے نستعلیق ٹائپ بنانے کا خیال سب سے پہلے کمپنی بہادر یوں کو وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل آف انڈیا کے زمانہ میں ہوا تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۰۱ء میں سرکاری گزٹ کے کئی نمبر اُردو ٹائپ میں فورٹ ولیم پریس کلکتہ سے شائع ہوئے تھے بسنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۸۶۰ء تک بنگالہ میں اردو و فارسی کی مطبوعات بھی ٹائپ ہی میں چھپتی رہیں مگر عوام میں یہ رائج و مقبول نہ ہوسکا اور انیسویں صدی کے آخر تک اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔

گذشتہ صدی میں انگلستان میں بھی اُردو کا نستعلیق ٹائپ بنانے کی بہت کوشش کی گئی مگر وہاں بھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ مصر میں بھی نستعلیق ٹائپ بنایا گیا ہے مگر وہ بھی کچھ زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہوا ہندوستان میں صرف دو جگہ ایسی ہیں جہاں اس وقت معمولی نستعلیق ٹائپ مل سکتا ہے، یعنی بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ اور گجراتی ٹائپ فاونڈری بمبئی۔ لیکن ملک میں ہنوز اس کا رواج عام نہیں ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ ممالک غیر میں بھی جو ٹائپ تیار کیا گیا ہے وہ بھی مقبول عام نہیں ہوا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ نستعلیق ٹائپ کے واسطے کثیر التعداد ٹکڑوں کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کو ملانا بھی دشوار ہوتا ہے دیگر ممالک میں تو نسخ ٹائپ رائج ہوگیا ہے لیکن جیسا ہم اوپر لکھ چکے ہیں یہ ابھی تک مقبول عام نہیں ہوسکا۔ لیتھو کی چھپائی میں جہاں اور بہت سے نقص ہیں وہاں اس میں چند خوبیاں بھی ہیں یعنی اس میں حسن ظاہری بھی ہے اور لاگت بھی کم آتی ہے۔ اُردو میں درسی کتابوں کے علاوہ اور مطبوعات تعداد میں کم ہی شائع ہوتی ہیں انہیں وجوہ سے متعدد بار باقاعدہ کوشش ہونے کے باوجود اُردو ٹائپ عام طور پر مروج نہیں ہوا۔ ملک کے بعض اولوالعزم مطابع نے بھی اس مد میں پیشقدمی کی کوشش کی۔ چنانچہ مطبع منشی نولکشور لکھنؤ نے اس کے متعلق ایک اسکیم تیار کی تھی مگر اس کے مالک منشی پراگ نراین صاحب بھارگو کی قبل از وقت وفات سے اس کام کے شروع کرنے کی بھی نوبت نہیں آئی۔ انڈین پریس الہ آباد نے بھی معمولی نستعلیق ٹائپ بہم پہونچا کر چند درسی کتابیں چھاپی تھیں مگر وہ بھی اس کوشش میں زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔ البتہ سنہ ۱۹۲۳ء سے سرکار نظام کی سرپرستی میں نستعلیق ٹائپ بنانے کی باقاعدہ کوشش اور تجربات ہو رہے ہیں اور اعلیحضرت کی گورنمنٹ اس تجربہ پر چھیاسی ہزار روپیہ سے زیادہ صرف بھی کرچکی ہے۔ بہرحال چار سال کی کوشش اور تجربہ کے بعد گورنمنٹ سنٹرل پریس حیدرآباد کے قابل سپرنٹنڈنٹ مسٹر آر۔ وی۔ پلّے نے سید عبدالکریم صاحب کی امداد

سے جو عرصہ تک سروس میں رہکر اس خدمت کے متعلق خاص تعلیم و تجربہ حاصل کرچکے ہیں سات سو چالیس مفرد حروف اور چار سو اکتالیس ٹکڑوں کا نستعلیق ٹائپ مرتب کیا ہے۔ جس سازو سامان اور مشینوں سے یہ ٹائپ تیار ہوا تھا ان پر سرکار دکن کا ساڑھے تریپن ہزار روپیہ کے قریب صرف ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں گورنمنٹ نظام دکن کی مدد سے دہلی میں مسٹر رفیق بیگ دہلوی نے اپنی مخترع وضع کا ٹائپ بنانے کی کوشش کی، چنانچہ انھوں نے چودہ ہزار روپیہ کی لاگت سے دو سو تریپن حروف میں اس کو مکمل کیا۔ ان دونوں نو ایجاد ٹائپ کا امتحان و تجربہ کیا گیا اور دونوں فریق کی کوشش اور ان کی قدردانی کے ساتھ ساتھ مزید اصلاح کی ضرورت محسوس کی گئی۔ بہرحال ۱۹۲۸ء میں نستعلیق کمیٹی کی رپورٹ پر نظام گورنمنٹ نے حروف کے جوڑوں کی تعداد گھٹانے کے واسطے ایکبار پھر کوشش کی اور مسٹر رفیق بیگ دہلوی اور گورنمنٹ کے سنٹرل پریس کی متفقہ سعی سے تقریباً چودہ ماہ کی مدت میں پہلے سے بہتر ٹائپ تیار ہوا جسکا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

عہد ہمایون عثمانی کے بے شمار و لاتحصیٰ برکات میں سے ایک
یہ بھی ہے جو پبلک کے سامنے نستعلیق ٹائپ کے ان مطبوعہ
اوراق کی صورت میں جلوہ گر نظر آرہی ہے یہ محض احکام قضا شیم
خداوندی کی قوت ارادی کے اثرات تھے جنھوں نے کارپردازان
دارالطبع سرکار عالی کے مساعی کو خلعت مشکوری سے مخلع فرمایا
اور آج کے دن ہم اس اہم مشکل کو تقریباً حل کر چکے ہیں جو
سو برس کی کوششوں کے بعد بھی حل نہ ہوئی تھی

اس نئے ٹائپ میں حروف کی تعداد مع اوقاف و ہندسہ وغیرہ چھ سو ہے اور اس کے بنانے میں چھبیس ہزار روپیہ کے قریب خرچ ہو چکے ہیں۔ مگر ہنوز اس کی اصلاح کی کوشش جاری ہے جس سے پوری امید ہے کہ تھوڑے عرصہ میں موجودہ سے کہیں بہتر ٹائپ تیار ہو جائیگا۔ اس وقت نظام گورنمنٹ کا سرکاری گزٹ اس ٹائپ میں شائع ہونے لگا ہے۔ اور کئی سرکاری رپورٹیں اس میں طبع ہوئی ہیں، رفتہ رفتہ درسی کتابیں بھی چھپنے لگیں گی اور اس کے رواج کو ترقی ہوتی جائیگی۔ نظام گورنمنٹ اس کام کو ادھورا چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتی ہے۔ چنانچہ عالیجناب صدر اعظم بہادر ریاست کے حکم سے اس مسئلہ کے مناسب حل میں اہل مطبع و اہل قلم دونوں سے مشورہ کی غرض سے ۲۲ و ۲۳-۲۴ اپریل ۱۹۳۰ء کو ایک نستعلیق کانفرنس بھی طلب فرمائی جس میں ریاست دکن کے اہل الرائے حضرات کے علاوہ ہندوستان کے ہر صوبہ سے بھی خاص خاص معززین

مدعو کئے گئے تاکہ اس جدید ٹائپ اور اس کے ہر پہلو کو بہ نظر غائر ملاحظہ کرکے اس کے متعلق اپنی رائے اور خیالات کا اظہار کریں۔ جس کے جواب میں لکھنؤ سے سید جالب صاحب مرحوم ایڈیٹر ہمت، دہلی سے ڈاکٹر عابد حسین صاحب، انڈین پریس الہ آباد سے مولانا اصغر گونڈوی، کانپور سے منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر زمانہ، کلکتہ سے پروفیسر محفوظ الحق صاحب، مدراس سے پروفیسر عبدالحق صاحب، بمبئی سے حضرت ناظم لکھنوی وغیرہ وغیرہ بہت سے معززین اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کی صدارت خود مہاراجہ سر کشن پرشاد صاحب بہادر بالقابہ کرنے والے تھے مگر ایک خانگی سانحہ کی وجہ سے وہ تشریف نہیں لا سکے اور نواب ولی الدولہ بہادر نائب صدر اکزیکیٹو کونسل ریاست حیدرآباد کی صدارت میں اجلاس ہوا۔ تمام ارکان سلطنت دکن و دیگر معززین بھی موجود تھے جن میں نواب حیدر نواز جنگ۔ سر رچرڈ ٹرنچ۔ سر امین جنگ۔ نواب لطف الدولہ بہادر، نواب مہدی یار جنگ بہادر، مسٹر آرم اسٹرانگ، مسٹر فضل محمد خاں صاحب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم، مسٹر یزدانی صاحب، ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب پرنسپل عثمانیہ یونیورسٹی۔ پروفیسر عبدالحق سکرٹری انجمن ترقی اردو، مولوی خورشید علی صاحب، مولوی اکبر علی صاحب ایڈیٹر صحیفہ، و ایڈیٹر صاحب نظام گزٹ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کانفرنس کے دو اجلاس ہوئے اور تمام حضرات نے گورنمنٹ پریس جا کر تیار شدہ ٹائپ کو ملاحظہ فرما کر تمام پہلوؤں پر عملی حیثیت سے بھی غور کیا۔

اس کانفرنس میں اس نو ایجاد ٹائپ کی تکمیل پر اعلیحضرت خسرو دکن کی گورنمنٹ کو مبارکباد دی گئی اور نستعلیق ٹائپ میں مزید اصلاحات کی ضرورت پر عملی تجاویز سوچنے کے لئے نواب لطف الدولہ بہادر کی صدارت میں گیارہ اصحاب کی ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کے سکرٹری مولوی عبدالحق صاحب منتخب ہوئے۔ اور حیدرآباد کے معززین کے علاوہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی، جناب ناظم لکھنوی، پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی، منشی دیا نرائن نگم، مولانا اصغر گونڈوی وغیرہ اس کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے ہیں۔

اس کانفرنس میں دو اہم تجویزیں بھی پاس ہوئیں، اول یہ کہ عثمانیہ یونیورسٹی اور دارالترجمہ کی آئندہ مطبوعات کے ٹائپ میں چھپنے کی سفارش کی گئی، دوسرے یہ بھی طے ہوا کہ ملک کے مشہور مطابع کو بھی اس نو ایجاد ٹائپ کی کافی مقدار امتحان و تجربہ کی غرض سے ہدیۃً دی جائے تاکہ وہ عملی پہلو سے اس کے حسن و قبح پر رائے دے سکیں۔

دوران مباحثہ اردو رسم الخط کا مسئلہ بھی کانفرنس میں پیش ہو گیا۔ بعض ارکین کی یہ رائے تھی کہ زمانہ حال کی ضروریات کے خیال اور ٹائپ کی ترقی و تکمیل کے لحاظ سے اردو کے موجودہ رسم الخط میں بھی بعض

ترمیمات منظور کرنا چاہیئے۔ مگر اس کے متعلق بعض اکابرین کو شدید اختلاف بھی تھا اور وہ موجودہ طرز تحریر میں ایک نقطہ کی بھی کمی بیشی پسند نہیں کرتے تھے۔ بہرحال اس مسئلہ پر بھی منتخب شدہ سب کمیٹی حسب ضرورت اپنی رائے دے گی۔

اس سب کمیٹی کا ایک جلسہ ستمبر ۱۹۳۲ء میں منعقد ہو چکا ہے۔ اس اثنا میں سنٹرل پریس نے ٹائپ کی کافی مقدار بھی تیار کر لی ہے اور اس میں مزید ترقیاں بھی کر لی ہیں جن کی وجہ سے اس کی خوبصورتی میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ کمیٹی نے ایک دفعہ پھر گورنمنٹ پریس جا کر ان کل امور کو بغور دیکھا اور چند دیگر تجویزوں پر بھی غور کیا جن کی مزید تفصیلات پر غور کرنے کے لئے اکتوبر ۱۹۳۲ء میں پھر اس سب کمیٹی کا اجلاس ہونے والا ہے۔

بہرکیف سرکار آصفیہ کی توجہ و فیاضی سے امید واثق ہے کہ اردو کا نستعلیق ٹائپ جلد ہی مکمل ہو کر رائج ہو جائے گا۔ ہم کو پورا بھروسہ ہے کہ ترقی یافتہ ہندوستان کی تاریخ میں یہ نو ایجاد ٹائپ ہز اکزالٹیڈ ہائینس میر عثمان علی خاں صاحب خسرو دکن کی علم دوستی و معارف پروری کا ایک روشن کارنامہ سمجھا جائیگا

ابتدائی کوششوں کے نمونے

ذیل میں بعض دوسرے ٹائپوں کے عکس ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ ان کے مقابلہ سے حیدرآبادی ٹائپ کی خوبی ظاہر ہو سکے

گورنر جنرل وارن ہیسٹنگس کے زمانہ میں جو ٹائپ گورنمنٹ پریس نے ۱۸۰۱ء میں بنایا تھا اور جس میں کچھ عرصہ تک فورٹ ولیم کا سرکاری گزٹ چھپتا رہا بنگال میں اس ٹائپ میں ۱۸۲۰ء سے ۱۸۴۰ء تک عموماً اردو فارسی کتابیں چھپتی رہیں۔

کے بیتے بہ سبب اور دوسرے حی القائم بیتوں کے محجوب ہوتے ہین

۱۱۸ ۲ اصول میت　دوسری قسم شتمل اصول میت یعنے آباد اجداد پدری شخص متوفی کو شامل ہی' اس ترتیب پر کہ اول پدر میت پھر جد پدری پھر جد اعلا سے پدری اور علی ہذا القیاس - ابد بہ سبب اقرب کے محجوب ہوتا ہی'

لندن کے ٹائپ کا نمونہ

گذشتہ صدی کے آخری بیس سال کے اثنا میں انگلستان کی بعض مشہور ٹائپ فاونڈریوں نے بھی نستعلیق

ٹائپ ڈھالنے کی بڑی کوشش کی اور حروف کے جوڑوں کے لحاظ سے ان کو خاصی کامیابی بھی حاصل ہوئی لیکن خط نستعلیق میں حروف کے اُتار چڑھاؤ کے جو اصول ہیں اُنکا کچھ لحاظ نہ رکھا جاسکا، لندن کے مسرز V. J. Figgins. کے کارخانہ نے جو ٹائپ بنایا اُسکا نمونہ درج ذیل ہے

ایک کایتھ اور اوسکا غلام دونون ایک گھر مین سوتی تھی لالانے کہا رامچیرا دیکھ تو پانی برستا ھے یا کہل گیا اوسنے کہا برستا ھے پوچھا تو کسطرح جانتا ھے نہین تو پڑا سوتا ھے کہا بلی آئی تھی اُسکو مین نے تٹولا تہا بہیگی تھی کہا چراغ بجھا دی کہا منہ ڈھانپ لے

ہندوستان میں ابتک صرف دو ہی کارخانوں نے نستعلیق ٹائپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ کلکتہ کے بپٹسٹ مشن پریس (Baptist Mission Press.) اور گجرات ٹائپ فاونڈری بمبئی۔

بپٹسٹ مشن پریس نے جو ٹائپ بنایا ہے اُسکا نمونہ یہ ہے:-

هرچه هست از قامت ناساز بے اندام ماست
ورنه تشریف تو بر بالای کس کوتاه نیست
هرچه خواهد گو بیاید هرچه خواهد گو برو
پاسبان و حاجب و دربان درین درگاه نیست

اور گجرات ٹائپ فاونڈری کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

گجراتی ٹائپ فاونڈری بمبئی نے ابتک جو کچھ کہ مختلف زبانون کے حرفون یعنی ٹایپو نکے بنانے مین سعی بیات کی ہین اسمین ۲۲ پائنٹ کائی قسم کا بلاک نستعلیق ٹائپ اپنے قدردانون کی خدمت مین پیش کیاجاتا ہے کی

مصر کی مشہور و معروف بیروت فاونڈری نے بھی بارہا نستعلیق ٹائپ ڈھالنے کی کوشش کی۔ حروف کے دائرہ وغیرہ میں اصول فن کا بہت لحاظ بھی رکھا لیکن نظر سے

دیکھنے سے اس ٹائپ میں خط نستعلیق کو نسخ کے اصول پر ڈھالنے کی کوشش نمایاں ہے
بہرحال نمونہ یہ ہے:۔

الحروف الفارسي المشكل من حروف المطبعة
الادبية في بيروت التي تقدم جميع ما يطلب منها من
الحروف وتطبع كتبا متمايزة بحسن الطبع ولطافته ذلك

(نوٹ) مصری ٹائپ میں اعراب بھی ہیں جن کی وجہ سے یہ ٹائپ بہت خوبصورت معلوم ہوتا ہے مگر عکس میں اعراب صاف طور پر نہیں آسکتے تھے اس وجہ سے ان کو چھوڑ دیا گیا ہے

بہترین زندگی

پروفیسر البرٹ اینسٹین نے جنکا شمار دنیا کی اعلیٰ ترین شخصیتوں میں ہے حال ہی میں اپنے اصول کی تشریح میں حسب ذیل خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔

دنیا میں انسانوں کا وجود دیگر انسانوں کے لئے کارآمد ہونیکے واسطے ہوا ہے، خصوصاً اُن لوگوں کی جنکی مسرت اور خوشحالی پر خود ہماری خوشی کا انحصار ہے اور ساتھ ہی ان بیشمار نامعلوم لوگوں کے لئے بھی جنکی قسمتوں کے ساتھ ہمارا ہمدردانہ تعلق ہے۔ خدمت ہمارا فرض مقدم ہے

ہر روز میں کتنے ہی بار محسوس کرتا ہوں کہ میری ظاہری اور باطنی زندگی کی تعمیر کس حد تک میرے زندہ اور مردہ ہمجنسوں کی محنت کی بدولت ہوئی ہے اسلئے یہ کوشش کرنا میرا فرض ہے کہ میں آئندہ نسلوں کو فائدہ پہونچا کر اس زبردست اخلاقی قرض کے بار گراں سے سبکدوش ہوں۔ اس خیال سے میں اکثر متفکر ہو جاتا ہوں کہ میں اپنے ہمجنسوں کی مسلسل کوششوں کا کس قدر رہین منت ہوں۔

جو اصول میرے سامنے روز روشن کی طرح عیاں اور میری زندگی کو خوش گزران بنانیمیں ممد رہے ہیں وہ نیکی، خوبصورتی اور راستی ہیں عیش کوشی و آرام پسندی کو اپنی زندگی کا معیار قرار دینا مجھے کبھی مرغوب نہیں ہوا انکی بنا پر بنے ہوئے اصول مویشیوں کیلئے موزوں ہوں لیکن آدمیوں کیلئے مناسب نہیں ہیں قبضہ داری، ظاہر کامیابی، شہرت، شوق پرستی یہ سب قابل تحقیر چیزیں ہیں میرا عقیدہ ہے کہ جسمانی و دماغی دونوں نقطہ خیال سے

پریم لتا[۱]

(از مسٹر گنگا پرشاد ورما بی اے، بنارس اسٹیٹ)

رات کے تین بج چکے ہیں۔ گرمی کا موسم ہے مطلع صاف و شفاف ہے، چاندنی رات میں ستاروں کی روشنی ماند ہورہی ہے۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔ درخت، دیوار، ٹیلے بلکہ کھیت، میدان وغیرہ عجب خوفناک صورت بنائے ہوئے بےحس و حرکت کھڑے ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آرہے ہیں، مگر درخت ہلتے معلوم نہیں ہوتے اور نہ ان درختوں کے پتوں کی سنسناہٹ ہوا کے جھونکوں کے آنے کی خبر دیتی ہے۔ ہر طرف ہو کا عالم ہے اور ہر شے مصروف خواب معلوم ہوتی ہے

پنڈت آتما رام کے دو منزلہ مکان کی بالائی کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ تمام مکان میں سناٹا چھایا ہوا ہے۔ ایک چھوٹا سا چراغ اس تنگ کمرے کو روشن کر رہا ہے۔ کھڑکی کے سامنے پریم لتا اپنا خوبصورت چہرہ دونوں ہاتھوں پر رکھے کسی خاص غور و خوض میں مبتلا ہے۔ وہ ایسی بےحس و حرکت معلوم ہوتی ہے جیسے کسی نے درد اور غم کی خوبصورت مورت کو کھڑکی کے سہارے کھڑا کر دیا ہے۔ اسکی مخمور آنکھیں اور پژمردہ چہرہ سے صاف ظاہر ہے کہ ساری رات اس نے شب بیداری میں گذار دی ہے۔ درد انگیز خیالات نے اُسے گھنٹہ بھر بھی آرام کی فرصت نہیں دی۔

خدا معلوم کونسا خیال اس کے دماغ کو پراگندہ کر رہا ہے۔ کونسی تشویش اس کے دل کو ستا رہی ہے۔ آخر وہ کونسی بات ہے جس کا خیال آتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ ان کے بشرے سے بیحد درد و مصیبت عیاں ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں اور بھولی بھالی صورت سے ایسی سنجیدگی ظاہر ہورہی ہے جو عموماً اس عمر میں نصیب نہیں ہوتی۔

پریم لتا تنہا کسی خیال میں مستغرق اپنے کمرے میں کھڑی ہے۔ ایک گوشہ میں چراغ رکھا ہے جس سے دھندلی سی روشنی ہورہی ہے کہ یکایک چراغ کے پاس میز سے ایک کتاب زمین پر گر پڑی۔ اس معمولی آواز سے پریم لتا چونک پڑی، اس کا جسم تھرتھرا اٹھا اور وہ خوف زدہ ہوکر زینہ

---

[۱] گجراتی زبان کے ایک افسانہ کا ترجمہ ہے۔

کے دروازہ کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا، وہی چراغ اب بھی ٹمٹما رہا تھا اور اُس کی دھندلی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھکر پریم لتا پھر فکر میں غوطہ زن ہوگئی۔ آخرکار اس کی مہر سکوت ٹوٹی اور دھیمی دھیمی آواز سنائی دینے لگی۔ آئیے دبے پاؤں چلے آئیے، کہیں نزدیک چھپ کر اس کی آواز سنیں۔

" انسان کی بھی کیا عجیب حالت ہے جس دل پر موت کا خیال غالب نہ آسکا جس دل پر موت کے اس قدر قریب ہونے پر بھی ڈر کا شائبہ بھی پیدا نہ ہوا، آج وہی دل ایک کتاب گرنے کی آواز سے اس قدر دھڑکنے لگا۔ ارے نادان! تو نے سمجھا کہ شاید والدہ آگئیں ان کے آنے کے خیال نے تجھکو اتنا ڈرا دیا، لیکن تیرا خوف کچھ بیجا بھی نہیں کیونکہ اگر وہ آجاتیں تو بیشک ساری مصیبتیں تیرے ہی سر جاتیں، تو ہی اس کا ذمہ دار ہوتا۔ لیکن اب تو وہ نہیں آرہی ہیں پھر تو کیوں اتنا دھڑک رہا ہے۔ اس وقت ساری دنیا خواب راحت میں مصروف ہے۔ اور صبح سے پہلے ہی تیرے اور تمام دنیا کے درمیان ایک ایسی دشوار گذار وادی حائل ہو جائیگی جس کا عبور کرنا انسانی طاقت کے باہر ہے۔

" افسوس دنیا میں دم بھر بھی آرام نہ ملا، کوئی گھڑی چین نصیب نہ ہوئی۔ ہمیشہ دوسروں کی خاطر کے لئے تکلیف ہی اُٹھانا پڑی، مگر یہ عالم فانی عیش وعشرت کی جگہ نہیں۔ پھر مجھے کیسے آرام نصیب ہوتا۔ مگر اب تو گھڑی دو گھڑی کا معاملہ رہ گیا ہے۔ اب میرا اور میرے دل کا ساتھ چند گھنٹوں کا رہ گیا ہے۔ پھر کہاں میری روح اور کہاں یہ جسم۔ یا تو دونوں ہمیشہ کے لئے باد فنا کے تیز جھونکوں میں نیست و نابود ہو جائیں گے۔ یا جسم یہیں جل بھنکر خاک ہو جائیگا اور روح عالم بالا میں ہوگی۔"

" تین راتیں متواتر اسی اضطراب و بیقراری میں گذر چکی ہیں۔ آہ یہ راتیں بھی کیسی خوفناک راتیں تھیں۔ خیالات کے کیسے کیسے ڈراؤنے طوفان دل میں اُٹھے اور کس بیدردی سے میرے نخل تمنا کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ اب کوئی آرزو باقی نہیں رہی جس کے مٹنے کا ڈر ہو۔ اب اس جھگڑے سے اس دام فریب سے رہائی حاصل ہوگئی۔ مرنا جینا۔ ماں باپ، شادی بیاہ وغیرہ وغیرہ سب خیالات اُسی اندرونی طوفان کے جھونکے تھے جس کی وجہ سے امید کی ٹوٹی ہوئی کشتی ڈانواڈول ہو رہی تھی۔ مگر اب وہ طوفان بھی تھم چکا ہے۔ اب پریم لتا اس جہان فانی کو الوداع کہنے کو تیار ہوگئی ہے۔ صبح کو آفتاب عالم تاب کی سنہری کرنیں مجھے

ملنے آئیں گی لیکن میں موت کی آغوش میں سکھ کی نیند سو رہی ہونگی۔ آج میری بہنیں میری ہی تلاش میں یہاں آئیں گی۔ لیکن میرے دیدار سے مایوس اور ہمیشہ کے لئے مایوس ہوکر واپس ہونگی۔ طلوعِ آفتاب سے پہلے ہی اسی رات کے سیاہ پردہ میں چھپکر پریم لتا بیرحم ونامنصف دنیا کی آنکھ بچاکر راہی ملکِ بقا ہو جائیگی.......

"میری شادی ہی میری بربادی کا باعث ہوئی۔ یہ مسئلہ درپیش نہ ہوتا تو شاید دنیا کی حقیقت سے میں بےخبر ہی رہتی۔ یوں تو دنیا کی سبھی چیزیں حیرت انگیز ہیں لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز خود انسان ہے۔ اس کی بہادری پر غور کیجئے تو دنیا میں ہر چیز پر اس کا غلبہ ہے۔ کبھی تو آسمان سے تارے توڑ لاتا ہے کبھی سمندر سے موتی نکال لاتا ہے۔ پہاڑ، بجلی، بادل، ہوا سبھی کو اس نے اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ سبھی اس کی ماتحتی کا دم بھر رہے ہیں۔ دوسری طرف اس کی بدعقلی اور ناعاقبت اندیشی دیکھئے تو معمولی باتوں کی بھی اُسے خبر نہیں ہے۔ اُس کی کمزوری کی یہ حالت ہے کہ معمولی برائیوں سے واقف ہونے پر بھی وہ انھیں دُور نہیں کر سکتا ہے۔ اس کی بزدلی بھی انتہا کی ہے روزانہ لوگوں کو بربادی کے غار میں گرتا ہوا دیکھتا ہے لیکن اپنے جان و مال کے خوف سے یا چند روزہ مصیبتوں کے ڈر سے اُن سے رہائی کی کوئی فکر نہیں کرتا ہے۔ چند روزہ زندگی کی ہوس میں یہ سبھی قسم کی ذلتیں بخوشی برداشت کر لیتا ہے۔ ان باتوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان ابھی تک وحشیانہ خصائل سے پاک وصاف نہیں ہوا ہے۔ انسان اور حیوان میں صرف یہی فرق ہے کہ حیوان کسی کو غلامی کی زنجیر میں نہیں جکڑ سکتا، حیوان صرف جسمانی ایذا پہونچا سکتا ہے لیکن کسی چیز کی صورت ہی بگاڑ دینا اس کی طاقت سے باہر ہے، یہ طاقت صرف انسان ہی کو حاصل ہے، وہ نہ صرف حیوان بلکہ اپنے ہم جنس کو بھی اپنے مطلب کے لئے ہمیشہ سے مٹاتا رہا ہے، یہ عمل اب بھی جاری ہے، ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ زمانہ قدیم میں وہ اپنے قوت بازو سے کام لیتا تھا اور اب اُس نے اپنے ظلم و تشدد پر رسم و رواج کا پردہ ڈال رکھا ہے۔"

"رواج، قانون اور قوت بازو ان سبھوں نے متفقہ طور پر کسی کو اتنا نہیں دبایا جتنا ہم مظلوم مستورات کو۔ مذہب نے بھی ہم لوگوں کی کچھ دادرسی نہیں کی، ہاں ہماری غلامی کی زنجیروں کو وفاداری کے خوش آیند نام سے پکار کر ایک سنہرا ملمع چڑھا دیا جس سے

رہائی کی کوئی صورت باقی نہیں رہی کیونکہ مذہب نے ہمارے لوحِ دل پر یہ بات نقش کردی ہے کہ عورت دنیا میں غلامی ہی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور اس کا فرض یہی ہے کہ مرد کی غلامی میں اپنی تمام زندگی بسر کرے۔ مذہب نے جو کسر رکھ چھوڑی تھی اُسے قانون نے پوری کردی اور رسم و رواج نے اُس کو ایسا مستحکم کر دیا ہے کہ اب تمام کوشش اور گریہ وزاری فضول ہے۔۔۔۔۔

"اور لطف یہ کہ ہمارے دل و دماغ پر ایسا طلسمی پردہ ڈال دیا گیا ہے کہ جو چیزیں ہماری بربادی کا باعث ہیں انھیں ہم اپنی دنیوی اور روحانی نجات کا باعث سمجھ رہی ہیں۔"

"ہم کو علم سے بے بہرہ اور تمام دنیوی معلومات سے محروم رکھا جاتا ہے اور الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ ہم کو خود بخود آزادی کا خیال نہیں ہوتا۔ ہمارے خدا مجازی آقا سمجھتے ہیں کہ ہم پر صدیوں سے جو قیدیں عائد ہیں وہ ہمارے ہی فائدے کے لئے ہیں، اگر ہم کو ان سے آزاد کیا گیا تو اس میں ہمارا ہی نقصان ہوگا۔ غرض عورت گویا ایک کھلونا ہے جس کو مرد جب چاہے اس کو کھلائے جس طرح چاہے رکھے لیکن وہ وقت دور نہیں ہے وہ زمانہ قریب ہے جب ان بے انتہا مظالم کے نتائج دیکھنے میں آئینگے"

پریم لتا اپنی ڈائری کو نہایت جوش و سرگرمی سے لکھ رہی تھی، وہ ایک عالم خود فراموشی میں تھی مگر اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے نیچے کے ہونٹ کو چبانے لگی، اس کی سانس تیز ہوگئی، اس کا خوبصورت اور نازک چہرہ اس وقت نہایت خوفناک اور وحشت انگیز ہوگیا، اس وقت اس کی بعینہٖ یہی حالت ہوگئی تھی جو بارش سے پہلے سیاہ گھنگھور گھٹا کی ہوتی ہے، وہ دیر تک اسی حسرت و یاس کے عالم میں کھڑی رہی، آخر کار اس نے اپنی طبیعت کو سنبھال کر دو تین مرتبہ اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور چہرے کو ہاتھوں پر رکھکر بیٹھ رہی۔ فکر میں غرق ہوگئی۔

باب دوم

نسیم کے جھونکے متواتر آ رہے ہیں، چراغ بہزار وقت ٹمٹما رہا ہے اور کوئی دم کا مہمان ہے اور قریب ہے کہ گُل ہو جائے۔ میز سے کاغذ کے چند ٹکڑے اڑ اڑ کر زمین پر گر رہے ہیں۔ ایک پرچہ گرا کہ ایک چوہا اسے گھسیٹ لے گیا، یہ پرچہ اس خط کا ایک ٹکڑا ہے جو پریم لتا نے اپنے والد کے نام لکھ رکھا ہے۔ لیکن پریم لتا کو اس وقت دنیا اور مافیہا کی خبر نہیں ہے، وہ بے حس و حرکت پتلی کی طرح کھڑی ہے، اُسے معلوم ہی نہیں کہ ہوا کے جھونکے کمرے میں کیا غضب ڈھا رہے ہیں، اُس کے خیالات کا سلسلہ ہے کہ ٹوٹتا ہی نہیں، اُس کے دل میں درد اور مصیبت کا غبار جم کر بیٹھ گیا ہے چند ہی دنوں میں اس کے دل میں ایسے ناسور پڑ گئے ہیں کہ اس کا خونِ جگر بہائے بغیر اب وہ دم نہ لیں گے۔"

ہوا کا ایک تُند جھونکا آیا، چراغ گل ہوتے ہوتے بچ گیا، زینہ کے قریب والے دروازہ سے ایک دھماکے کی آواز ہوئی اور وہ بند ہوکر پھر کُھل گیا۔

ایک دوسرا جھونکا آیا، جو پہلے سے زیادہ زبردست تھا۔ اُس نے چراغ کا خاتمہ ہی کر دیا، دروازہ بھی ایسی زور سے ٹکرایا کہ سارا مکان گونج اُٹھا۔ پریم لتا کی والدہ بھی خواب غفلت سے چونک کر بولی کون ہے؟ پنڈت آتمارام نے اطمینان و بُردباری سے کہا "کوئی نہیں"۔

پریم لتا نے فوراً دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ ناظرین خود ہی غور فرمالیں کہ اس کا باعث درد تھا یا اُسے یہ محسوس ہوا کہ اب وہ چکّر کھا کر گرنے والی ہے۔ میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ شاید ماں کی آواز سُنکر پریم لتا کا دل قابو سے باہر ہوگیا۔ خیر، جو کچھ بھی ہو، وہ یکایک گھبرا اُٹھی، اور اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ جسم کی سنسناہٹ ذرا کم ہوئی تو اُسے کچھ ہوش سا آیا، اپنے گرد و پیش کی چیزوں کو محسوس کرنے لگی، چراغ کے پاس آکر اور اُسے گل دیکھکر سوچنے لگی کہ اسے پھر روشن کرے یا یوں ہی رہنے دے۔

بڑے پس و پیش کے بعد آخر چراغ روشن ہوا، گرے ہوئے کاغذات میز پر رکھے گئے، کمرے کے دروازہ کی زنجیر لگادی گئی، اس کے بعد پریم لتا پھر اُسی کھڑکی کے سہارے آکر کھڑی ہوگئی، اس کے چہرے کی عجب حالت تھی، غصہ کا نام و نشان بھی باقی نہ تھا البتہ آنکھوں کی سرخی بڑھ گئی تھی، ہاں غم کا بادل سارے چہرے پر چھایا ہوا تھا، اُس نے بڑی کوشش سے اپنی طبیعت کو روکا مگر خیالات کا کچھ ایسا تلاطم برپا ہوگیا کہ کسی طرح روکے نہ رُکا۔ دل ہی دل میں کہنے لگی:۔

"آخر والدہ صاحبہ کو کیا سوجھا کہ اس وقت بول اُٹھیں، اُن کی آواز مجھے اس عالم میں کھینچکر لیجانا چاہتی ہے جس میں اب مجھے دم بھر جینا بھی گوارا نہیں۔ جہاں گھڑی بھر بھی آرام و آسایش کی اُمید نہیں جسمانی تکلیف و دنیوی مصائب بخوشی برداشت کی جاسکتی تھیں مگر روحانی کوفت اٹھانا میرے قابو سے باہر ہے۔ ۔ ۔ ۔"

"آخر انسانی زندگی کا مدعا ہی کیا ہے۔ خود اُبھرنا اور غیروں کو اُبھارنا یا عیش و عشرت کے ساتھ زندگی بسر کرنا، اس وقت مجھے ان میں کوئی بات نصیب نہیں ہوسکتی"

"خود اُبھرنا تو خیر میرے لئے ناممکن ہے کیونکہ میری قسمت کا فیصلہ ہی دوسروں کے ہاتھ میں ہے، ایسی صورت میں دوسروں کے اُبھارنے کا سوال ہی کیسے پیدا ہوسکتا ہے، اب باقی رہی دنیوی خوشی وہ والدہ کی شفقت اور اُن کی فرمانبرداری پر منحصر تھی لیکن اُنھوں نے اب مجھے علٰحدہ کرنے کا ارادہ کرلیا ہے، ایسی حالت میں دنیا میں رہکر کیا کروں گی؟ اس ذلت اور غلامی

میں رہ کر گھٹ گھٹ کر جان دینے سے تو فوراً لقمۂ اجل ہو جانا ہی بہتر ہے۔ ظلم کو خاموشی سے برداشت کر لینے سے اپنی بربادی کے سوا ظلم کرنے والے کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی ہے .... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت میرے بیاہ کا سوال اُٹھانے کی ضرورت ہی کیا تھی، کم از کم والدہ تو سینکڑوں لڑکیوں کی بربادی دیکھ چکی ہیں لیکن افسوس ابھی تک اُن کی آنکھ کا پردہ نہیں اُٹھا۔ اور ایک دفعہ بھی انھوں نے اپنی پریم لتا سے اس کے دل کی خواہش دریافت نہ کی، مجھے بھی جرأت نہ ہوئی کہ خود ہی کچھ عرض کرتی، وہ پوچھتیں تو کہہ گزرتی، گو یہ ان کے شانِ بزرگانہ سے بعید تھا اور میں خود کچھ کہتی تو میری بے حیائی سمجھی جاتی۔ مگر خیر آج خود ہی ان بیہودہ رسم رواج کا تماشہ دیکھنے میں آئیگا۔ آج پریم لتا وہ آگ روشن کرے گی جس کے بھڑکتے ہوئے شعلے رسم و رواج کو خاک سیاہ کر دیں گے.........

"غلاموں کی فروخت سے ان کے مالک مالی حیثیت سے نفع میں رہتے تھے، لیکن والدہ کی ناز و نعم سے پرورش پائی ہوئی پریم لتا ان غلاموں سے بھی بدتر تھی؟ میرے برابر کوئی غلام بھی اس طرح صدقِ دل سے والدہ کی خدمت نہیں کر سکتا۔ پھر نہیں معلوم انھیں کیا ہو گیا اور انھوں نے مجھے دوسروں کے حوالے کرنے کا کیسے ارادہ کر لیا۔ کیا اس قدر تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد بھی میں اسی قابل ہوئی کہ والدہ کو میرے خریدار کو الٹے کچھ قیمت دینا پڑے۔ اس وقت والدہ کے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہے اور میرے جہیز کے لئے سکونتی مکان فروخت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ غرض میری وجہ سے والدہ کو بیٹھنے کا سہارا بھی نہ رہیگا اور اس طرح میں راحتِ جان ہونے کے بجائے وبالِ جان ثابت ہونگی، اس سے یہی بہتر ہے کہ اپنی جان دیکر والدہ کو اس مصیبت سے بچایا جائے۔

"ماں کا خیال ہے کہ میری شادی میرے لئے خوشی کا باعث ہوگی۔ لیکن اُنھوں نے یہ نہ سوچا کہ جو شخص مجھے اپنے حلقۂ غلامی میں داخل کرنے کے لئے بھی رشوت کا طلبگار ہے وہ میری کیا عزت کرے گا۔ اور خود میری نگاہ میں اس شخص کی کیا عزت ہو سکتی ہے اور مجھے اس کی غلامی میں کیا آرام نصیب ہو گا۔ میں اپنا گھر اپنا خاندان برباد کر کے کیسے زندہ رہ سکتی ہوں۔ میں اپنے کو مٹا دوں گی اور دنیا پر ظاہر کر دوں گی کہ عورت بھی خدا کی مخلوق ہے وہ بھی انسانی شرافت سے محروم نہیں ہے۔ اُسے بھی اپنی عزت کا احساس ہے اور وہ بھی رنج و راحت کے خیال سے متاثر ہوتی ہے......"

"اب میرا زندہ رہنا بالکل فضول ہے، آئندہ زندگی میں مجھے بڑی بڑی تکالیف کا سامنا کرنا پڑیگا۔ زندگی کا اصلی مدعا ترقی کرنا ہے، صرف کھانے پینے اور دنیوی عیش و عشرت میں محو رہکر انسان اپنی زندگی کو پرلطف نہیں بنا سکتا اور نہ ایسی زندگی زندگی کہے جانے کی مستحق ہے۔"

"جب انسان عزت و دولت سے بے بہرہ ہو، طاقت و آزادی سے محروم ہو تو زندہ در گور، مگر عاقبت کے دن گننے سے فائدہ ہی کیا ہے۔ اے دنیاوی چیزوں پر غرور کرنے والو، اے چند روزہ خوشی پر اترانے والے لوگو تم اپنی خودغرضی کی خاطر دنیا میں ظلم کے بیج بو رہے ہو اب خبردار ہو جاؤ آج پریم لتا آگ میں جلکر تم کو دکھا دے گی کہ تمہارے قانون اور تمہارے رسم و رواج سب نکمے اور ناقابل عمل ہیں۔ تمہارے ظلم و زیادتی کا پیالہ لبریز ہو چکا ہے، پریم لتا تم کو یاد دلائے گی کہ عورتیں بھی جن کی تمہاری آنکھوں میں کوئی حقیقت نہیں ہے اشرف المخلوقات ہیں۔ اس وقت دنیا کی آنکھ پر جہالت کا جو پردہ پڑا ہوا ہے شاید میرے جسم سے اٹھتے ہوئے شعلے اسے جلا کر خاک کر دیں۔ ممکن ہے کہ میری موت میری پیاری بہنوں کی ترقی کی باعث ہو۔ اے دل خبردار اب تو جلد ہی اس عالم فانی سے رخصت ہونے والا ہے، دنیا تیری زندگی کی روادار نہ تھی اسلئے تو بھی اس سے منہ موڑ لے۔"

پریم لتا کے لب یکایک بند ہو گئے، وہ خاموش ہو گئی، چہرہ پر مردنی چھا گئی، ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے، سارا جسم کانپنے لگا، دل زور زور سے دھڑکنے لگا، وہ چکر کھا کر زمین پر گرنے ہی والی تھی کہ اس نے اپنے تئیں سنبھالا اور دھیرے دھیرے اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے پاس گئی اور اسے اٹھا کر ہوا سے بچاتی ہوئی سامنے والی چھت پر نکل آئی۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نہایت آہستگی سے چل رہی تھی، مشرق کی طرف آسمان میں جا بجا سنہرے بادل بکھرے ہوئے تھے، مرغ سحری بھی کبھی کبھی آواز سنائی دیتی تھی۔ پریم لتا بائیں ہاتھ میں چراغ لئے ہوئے اس کو مخاطب کرنے لگی:

"میں نے ساری رات تجھے اپنا شریک غم بنا کر ایک منٹ بھی آرام کرنے نہیں دیا میں نے تمام عمر تجھے جلایا ہے آج تو جی کھول کر مجھ سے اپنا بدلہ لے لے۔ شاید تیری روشنی کی ہوئی آگ صرف مجھی کو جلا کر خاموش نہ ہو جائے۔ بلکہ اس جہالت اور خود غرضی کو جلا کر خاک کر دے

جو حضرت انسان کے ایک خاص جز کی بربادی کا باعث ہے۔"

دنیا والو، آنکھیں کھول کر دیکھو، پریم لتا اس ننھے سے چراغ سے تمہارے بیہودہ رسم و رواج کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اب یہ آگ آسانی سے نہ بجھ سکے گی۔ یہ وہ آگ ہے جو اپنی مراد حاصل کئے بغیر ہرگز خاموش ہونے والی نہیں۔"

اتنا کہکر پریم لتا نے چراغ کو اپنے بالکل قریب کر لیا پھر کیا تھا شعلے اس کے آنچل سے لپٹ گئے۔ دھیرے دھیرے سارے جسم پر قبضہ کر لیا۔ ادھر نقیب سحر نے مشرق سے نیر اعظم کے آمد کی خبر دی ادھر حسن کی دیوی پریم لتا آگ کے شعلوں میں چھپ گئی، تھوڑی ہی دیر میں اس کا حسین و نازک جسم ایک تودۂ خاک ہو کر رہ گیا۔

دردِ دل

میرے چراغِ زندگی! تیرے شعلۂ پر سکون کو "موت" کے منحوس لبوں نے بجھا دیا! اور آہ اب وہ واپس نہیں آسکتا۔ میرے محبوب جب تو دنیا میں نہیں ہے تو کیا تیری حیات میں میں زندہ رہ سکتی ہوں۔

میرے شجرِ حیات! تیری جڑ پر موت کی سخت کلہاڑی نے کاری ضرب ماری ہے۔ آہ اب تیری تازگی واپس نہیں آسکتی۔ کیونکہ جب درخت پژمردہ ہو جائے تو شگوفے کیونکر زندہ رہ سکتے ہیں۔

اے میری روح زندگی! خون آشام "موت" کی تلوار نے ہمارے رشتے اس طرح توڑ دیے جیسے شکستہ الفاظ آہ اس نے ہمیں دو ٹکڑوں میں منقسم کر دیا حالانکہ ہم ایک تھے اور افسوس جب روح ہی تن سے جدا ہو جائے تو گوشت کیونکر زندہ رہ سکتا ہے۔

(ماخوذ) اسے وجنتی نائیڈو

تنقید کتب

روح ظرافت

مصنفہ مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔اے۔ ایل ایل بی وکیل جودھ پور
کراؤن سائز قیمت عہ

یہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے آٹھ دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے ان میں ایک قصہ کے علاوہ اور سب مزاحیہ افسانے ہیں۔ میرا اتفاق اس طرف اُردو کے اکثر مزاحیہ مضمون نگاروں کی تصانیف دیکھنے کا ہوا ہے میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے بعد اور کسی اردو مصنف میں ظرافت کی اس قدر پاکیزہ چاشنی نہیں پائی جاتی۔ مرزا عظیم بیگ کی زبان بھی صاف ستھری و سادہ ہے۔ وہ الفاظ کے گورکھ دھندے میں اُلجھ کر مہمل بننے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ اپنے ناظرین کو خواہ مخواہ ہنسانے کی کوشش میں کسی عامیانہ مذاق کی آڑ ڈھونڈتے ہیں۔ مزاحیہ مضمون نگار کو مسخرہ بننے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اس کا یہ کام ہے کہ وہ مضحکہ انگیز حرکات و سکنات یا لہو و لعب سے اپنے ناظرین کو خوش کرے۔ شستہ ظرافت کا معیار یہ ہونا چاہیئے کہ پڑھنے والے کو یہ محسوس نہ ہونے پائے کہ اُسے خواہ مخواہ ہنسانے کی کوشش کی گئی ہے باتوں باتوں میں نادانستہ اور بلا تکلف ہنسنے ہنسانے کا پہلو نکل آئے۔ یہی عمدہ مذاق اور شستہ ظرافت کا بہترین وصف ہے۔ چغتائی صاحب کے افسانے اس معیار میں بالکل پورے اترتے ہیں اور ہم ان کو اس کامیابی پر دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ آپ نے ہر تی کے مضامین سے بھی پرہیز کیا ہے۔ ۔۔۔کے مضمون میں البتہ ایک ہی طرح کے کئی واقعات اکٹھے ہوگئے ہیں جن سے مضمون کا آخری حصہ ذرا پھیکا ہوگیا ہے ہماری رائے میں اگر کیہ کا بھید آخر تک سلامت رہ سکتا تو مضمون زیادہ پرلطف ہوجاتا۔ وکالت کی داستان بھی خوب ہے مگر شاید آپ بیتی ہو کیونکہ اس میں واقعیت کی جھلک بدرجہ اتم موجود ہے۔ مگر اس بات کا دعویٰ چغتائی صاحب نے اپنے سب مضمونوں کے بارہ میں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جملہ افسانے واقعات پر مبنی ہیں، شاید ہوں، لیکن جب تک ہم اس کی تصدیق نہ کرلیں اور بقول مرزا فرحت اللہ بیگ کول تار والے مضمون کے افراد کی شکل نہ دیکھ لیں اس وقت تک ہم اس کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کرسکتے۔

شیون و جواب شیون

از حکیم آشفتہ و جناب سراج لکھنوی۔ کراؤن سائز ۴۴ صفحات قیمت ۸ مطبوعہ یونائیٹڈ انڈیا پریس۔ لکھنؤ

یہ حکیم آشفتہ لکھنوی ایڈیٹر رسالہ مبصر و جناب سراج لکھنوی جوائنٹ ایڈیٹر مبصر کی دو نظموں کا ایک مختصر مجموعہ ہے۔ دونوں نظمیں ڈاکٹر اقبال کی مشہور و مقبول نظم "شکوہ و جواب شکوہ" کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔ قریب قریب وہی طرز شیون میں ہے جو شکوہ میں اختیار کیا گیا ہے اور وہی انداز جواب شیون میں ہے جو جواب شکوہ میں موجود ہے۔ اور اس کی نسبت پیرزادہ سید فدا حسین بی۔ اے (علیگ) نے اپنے مختصر مقدمہ میں باین الفاظ اشارہ کیا ہے:۔

"ممکن ہے کہنے والے کہیں یہ ایجاد نہیں تقلید ہے۔ شکوہ اور جواب شکوہ پہلے سے موجود ہیں۔ اس کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ ضرورت بھی تقلید ہی کی ہے اس لئے کہ جو آواز اقبال نے بلند کی ہے وہ صدائے صحرا ثابت ہو رہی ہے ... اب دیکھنا یہ ہے کہ آشفتہ یا سراج نے آیا محض اقبال ہی کے نقش قدم پر قدم اٹھائے ہیں یا تقلید کے اندر ایجاد کا حق ادا کیا ہے اور اپنی طبیعت کے زور اور خیالات کی ندرت سے کام لیکر ایک نیا اسلوب بیان نکالا ہے۔ انصاف تو یہ کہتا ہے کہ جن پاکیزہ خیالات اور ولولہ انگیز جذبات کا اظہار شیون میں کیا گیا ہے وہ اپنے مقام پر بالکل اچھوتے اور تقلید کی آلائش سے پاک و صاف ہیں۔"

بہرحال یہ دونوں نظمیں اقبال کی نظموں کے اتباع میں کہی گئی ہیں مگر ان میں وہ بلندی خیال کمال جو اقبال کی نظموں کا طرۂ امتیاز ہے۔ تاہم اپنی جگہ اچھی اور لائق مطالعہ ہیں۔ قیمت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

آفتاب وطن

مصنفہ لالہ انوپ چند آفتاب پانی پتی۔ رائل سائز ۱۱۲ صفحات۔ قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ: جسونت سنگھ ولد لالہ جگوار سنگھ جین پانی پت

یہ جناب آفتاب کی قومی۔ ملکی۔ تاریخی۔ مذہبی وغیرہ ستر نظموں کا مجموعہ ہے۔ شروع میں مصنف کے مختصر حالات اور تصویر ہے۔

آفتاب صاحب مولانا سلیم پانی پتی مرحوم کے شاگرد رشید ہیں۔ کلام کے متعلق ہم کوئی رائے پیش کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ چند نظموں سے کچھ اشعار بطور نمونہ نقل کئے دیتے ہیں تاکہ ناظرین ان کے مطالعہ سے خود ہی اندازہ کرلیں کہ آفتاب صاحب کے کلام میں کیا کیا خصوصیات ہیں۔

دُکھیا کی فریاد

بھارت میں ہاہا کار مچا ہے چور منوہر شام ہری ۔ ۔ ۔ ۔ یا کا پربت ٹوٹ پڑا ہے چور منوہر شام ہری
رو نے میں جیون بیت گیا ہے چور منوہر شام ہری ۔ ۔ ۔ ۔ پل بھی چین سے نہ گزرا آنکھوں سے ہر دم خون بہا

ہندوستان

پھر بھی ہے کل جہاں میں پلّا گراں ہمارا ۔ ۔ ۔ ۔ خاک ہو چکا ہے ہندوستاں ہمارا
ہے نام کشوروں میں وردِ زباں ہمارا ۔ ۔ ۔ ۔ رنگ ۔ یا ہے اب تک سارا جہاں ہمارا

زرخیز ہے سراسر یہ گلستاں ہمارا
ہے طائرِ طلائی ہندوستاں ہمارا

نغمۂ وطن

چلے ہیں مرنے کو غربت میں بیقرارِ وطن ۔ ۔ ۔ ۔ ن کو چھوڑ کے جاتے ہیں جاں نثارِ وطن
تمام عمر سہیں رنج دل فگارِ وطن ۔ ۔ ۔ ۔ ہے صانعِ قدرت نے لوحِ قسمت پر
عزیز اس سے ہیں آنکھوں کو میری خارِ وطن ۔ ۔ ۔ ۔ ارم بھی اگر ہوں تو کیا کروں صیّاد
پڑے ہیں گوشۂ زنداں میں یادگارِ وطن ۔ ۔ ۔ ۔ ب حالِ وطن کا نہ ہو کہیں یارب

نالۂ رنج

لقعۂ نور سراپا ہوا تن من میرا ۔ ۔ ۔ ۔ جلوۂ حق سے بنا قلب جو روشن میرا
عمر بھر ایک رہا ظاہر و باطن میرا ۔ ۔ ۔ ۔ شیشۂ دل پہ کبھی گرد کدورت نہ جمی
زندہ در گور نظر آتا ہے دشمن میرا ۔ ۔ ۔ ۔ موت کے خوف سے دل کانپتا ہو قاتل کا
نالۂ رنج پہنچ جائے گا لندن میرا ۔ ۔ ۔ ۔ آتشِ عشقِ وطن دل میں بھڑکنے دو ذرا

نخلِ وصال جناب ریاض خیرآبادی نے مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں مرحوم والی ریاست محمود آباد نتقال پر ایک قطعہ نظم کیا ہے جس میں اکیسو ایک اشعار ہیں۔ اس میں مہاراجہ مرحوم کے ذاتی ت بیان کر کے انکے انتقال پر اظہار غم کیا ہے۔ اور اُن کے جانشین راجہ محمد امیر احمد خاں صاحب ع بوجہ احسن بیان کی ہے۔ آخر میں تاریخ وفات ہے جو دلچسپ و برجستہ ہے ؎

سر تربت بہ صنعتِ منقوط ۔ ۔ ۔ ۔ بنے یہ شعر شمع نور فشاں
دھوم ہے دھوم خلد میں آئے ۔ ۔ ۔ ۔ سر محمد علی محمد خاں (۱۳۵۰ھ)

"جین مترمنڈل دہلی" کے اُردو ٹریکٹ

تقریباً پندرہ سولہ سال سے دہلی میں "جین مترمنڈل" قائم ہے جس کا مقصد جین مذہب کی اشاعت و تبلیغ ہے۔ اس اہم مقصد کی تکمیل کے لئے جین مذہب کے متعلق مفید و مختصر مضامین چھوٹے چھوٹے ٹریکٹوں کی صورت میں شائع کرکے بلا قیمت یا برائے نام قیمت پر ملک میں پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ ٹریکٹس ہندی، اُردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں شائع ہوتے ہیں تاکہ جین مذہب کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے خواہشمند اصحاب اپنے اپنے مذاق کے مطابق ان کا مطالعہ کر سکیں۔ چنانچہ اس سلسلہ کے اُردو زبان کے چند ٹریکٹس ہمیں بغرض اظہار رائے وصول ہوئے ہیں جن پر ذیل میں ایک سرسری نظر ڈالی جاتی ہے:-

۱۔ خیالات لطیف۔ یہ سری امت گت اچاریہ کے سامایک پاٹھ (سنسکرت) اور اس کے انگریزی ترجمہ سیور تھالٹس (پاکیزہ خیالات) کا اُردو منظوم ترجمہ ہے جس کو لالہ جولاناتھ صاحب جینی درخشاں نے نظم کیا ہے۔ اس میں صرف بتیس قطعات ہیں۔ خیالات پاکیزہ اور ترجمہ صاف و رواں ہے۔ قیمت ۱ر

۲۔ آرزوئے خیرباد۔ پنڈت جگل کشور صاحب کی تصنیف "میری بھاونا" کا منظوم ترجمہ ہے جو صرف گیارہ بندوں پر مشتمل ہے اور ہر بند میں تین اشعار ہیں جن میں اپنے خیالات و افعال کی پاکیزگی کے لئے دُعا کی گئی ہے۔ مترجمہ درخشاں صاحب۔ قیمت صرف ۱ر

۳۔ حقیقت دنیا۔ اس میں درخشاں صاحب نے دنیا کے متعلق مختلف العقائد لوگوں کے خیالات بطرز مسدس نظم کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حقیقت میں دنیا ہمیشہ سے ایسی ہی ہے اور ایسی ہی رہیگی اور خدا کو اس کے نظم و نسق سے کوئی تعلق نہیں ہے، یعنی مادیئین کے اعتقاد کو (جو جین مذہب کا عقیدہ ہے) بیان کیا گیا ہے۔ قیمت ۱ر

۴۔ گلزار تخئیل۔ یہ بھی جناب درخشاں کی طبع سخن سنج کا نتیجہ ہے۔ شریمان تنگ آچاریہ کی کتاب "بھکتامراستوتر" کو موصوف نے رباعیوں کی صورت میں منظوم کیا ہے۔ اس میں صرف اڑتالیس رباعیاں ہیں جو حمد کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ زبان صاف اور انداز بیان دلکش ہے۔ قیمت صرف ۔

۵۔ جین دھرم کی عظمت مصنفہ بابو رکھب داس جی بی۔ اے۔ اس میں جین مذہب کی عظمت و قدامت نیز عقائد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ خدا کی ہستی کے متعلق جین مذہب کا عقیدہ بالکل مادیئین سے ملتا جلتا ہے، چنانچہ اس مختصر رسالہ میں بھی اس کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ جینی کسی ایسی ہستی کے قائل نہیں جس کے صرف ایک اشارہ پر دنیا پردۂ عدم سے منصۂ شہود پر آگئی ہے یا جب وہ چاہے اسکو مٹا سکتا ہے





بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ پرماتما کو کرتا دھرتا مان کر اسکی پرستش کرنے سے انسان جھگڑوں میں پھنس جاتا ہے اور اپنی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن اس بنا پر جینیوں کو جو ناستک (ملحد) کہا جاتا ہے وہ غلط ہے۔ جینی اگرچہ بلاواسطہ خدا کی پرستش نہیں کرتے اور اس کو دنیا کا پیدا یا فنا کرنے والا نہیں مانتے لیکن وہ اس جیتین آتما کو پوجتے ہیں جو "علم کل" "نظر کل" اور "طاقت کل" کے روپ میں نظر آتا ہے۔ غرض اس میں جین دھرم کے عقائد کے متعلق ضروری معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ قیمت ۱ر

۶۔ **جین کرم فلاسفی**۔ یہ بھی بابو رکھب داس جینی بی۔ اے کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اس میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے جین دھرم کے نقطۂ نظر سے انسان کے کرموں کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت ۱ر

۷۔ **صبح صادق** (دس لکشن دھرم) از بابو پرکاش چند جین مائل دہلوی۔ اس میں جین مذہب کے مطابق روح کی دس ذاتی و حقیقی صفات یعنی عفو، انکسار، بے ریائی، صفا، صدق، زہد، ریاضت، ترک لذات، بے لوثی و استغنا اور پارسائی سے بحث کی گئی ہے۔ اور روح کو ان صفات سے متصف کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ قیمت ۱ر

۸۔ **نایاب گوہر**۔ یعنی جین دھرم کے متعلق مہرشی شیوبرت لال ورمن صاحب کے خیالات جو سری مہاویر جینتی کی مقدس تقریب پر ضبط تحریر میں لائے گئے اور جو مندرجہ ذیل پانچ اصولوں کی تشریح و توضیح پر حاوی ہیں۔ (۱) تصوف کا باطنی راز (۲) انسان کی حقیقی معراج (۳) حقیقی خدا اور خدا پرستی کا اصول (۴) بے تعصبی اور (۵) اہنسا۔ قیمت ۰ر

۹۔ **بھگوان مہاویر**۔ مصنفہ لالہ رشب لال جین۔ اس میں جین مذہب کے مہرشی بھگوان مہاویر سوامی کے حالات و آپ کی تعلیمات کا ذکر ہے، اور روح و مادہ کے تعلقات، اثرات، اور روح کی صفائی سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۱ر

۱۰۔ **سپت ویسن**، از بابو سمیر چند اگروال جین۔ یعنی ان سات بری عادتوں کا بیان جو جین دھرم کے مطابق ایک آدمی میں نہ ہونا چاہیئے۔ یعنی جوا کھیلنا، گوشت کھانا، شراب پینا، عیاشی کرنا، شکار کھیلنا، چوری کرنا اور غیر کی عورت کو نظر بد سے دیکھنا۔ یہ ساتوں عادتیں ایسی ہیں جو نہ صرف جین دھرم بلکہ اکثر مذاہب میں مذموم قرار دی گئی ہیں۔ مصنف نے ان بد عادتوں سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اُن پر تبصرہ کیا ہے۔ قیمت ۰

۱۱۔ **گیان سورج ادے**۔ (حصہ دوم) مصنفہ بابو سورج بھان جین وکیل۔ یہ چند ابواب پر مشتمل ہے

جن میں کرم اور اس کا پھل نیز تدبیر و تقدیر کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۸ر

ہندو اور عیسائیوں کیلئے ایک کتاب

مرتبہ مولوی ابو محمد مصلح، کراؤن سائز ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ۸ر
ملنے کا پتہ:- دفتر قرآنی تحریک، حیدر آباد دکن

موجودہ زمانہ کی ضروریات کو مد نظر رکھکر مولوی ابو محمد مصلح نے قرآنی تعلیم کو خاص و عام تک پہنچانے کے لئے جدید اصول کے مطابق تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا ہے یہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے اور ہر ماہ اسی قسم کی ایک کتاب شائع کی جائیگی۔

اس کتاب میں اول مذہب کی حقیقت و ضرورت سے بحث کی گئی ہے، بعد ازاں ہندو اخلاقیات کے ذیل میں وید، اپنشد، منوجی کے اصول، مہا بھارت، چانکیا، بودھ، بھگوت گیتا وغیرہ سے کارآمد اقوال پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد عیسائی اخلاقیات میں عہد نامۂ جدید سے مفید باتیں اخذ کی گئی ہیں پھر قرآنی اخلاقیات ہیں۔ اس آخری باب میں عربی اور اسکا ترجمہ مع ضروری تشریح ساتھ ساتھ ہے مسلمانوں کو خصوصیت سے اور دوسرے مذاہب کے پیرووں کو عمومیت سے اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے، اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ سب مذاہب میں اصول اخلاق کتنے مشابہ ہیں اور در اصل دنیا کے کسی مذہب میں بھی برائی کی تعلیم نہیں، اصل ایک ہے البتہ فروعات میں اختلاف ہے۔

جو حضرات اس سلسلہ کی تمام کتابوں کو خریدنا چاہیں اُن سے سالانہ قیمت دس روپیہ لی جائیگی اور ہر ماہ کی کتاب کی قیمت ایک روپیہ ہوگی۔

قرآن اور نئی روشنی

مترجمہ سید حبیب احمد آفتی کاظمی امروہوی۔ ڈمائی سائز ۱۴۰ صفحات قیمت عہ
ملنے کا پتہ:- ترقی بک ڈپو، جھونا مارکیٹ کراچی۔

یہ علامہ طنطاوی جوہری مصری کی ایک جدید تصنیف "القرآن والعلوم العصریہ" کا اُردو ترجمہ ہے۔ موضوع کتاب یہ ہے کہ مسلمانوں کو علوم جدیدہ حاصل کرنے کی ضرورت سے آگاہ کیا جائے اور اس بارہ میں قرآن شریف کے جو احکام ہیں یا جو احادیث ان کے حصول کی تعلیم دیتی ہیں ان کو پیش کردیا جائے تاکہ مسلمان اپنی مذہبی تعلیم سے واقف ہوکر ہر قسم کے علوم و فنون، تجارت، صنعت و حرفت وغیرہ میں حصہ لینے کی کوشش کریں اور دنیا میں کامیاب و بامراد زندگی بسر کرسکیں۔ ترجمہ سلیس و رواں ہے۔

یادِ رفتگاں

مسٹر کے۔ سی۔ رائے مرحوم

ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کے بانی مسٹر کیشب چندر رائے ہندوستان کے اُن چند نامورں میں سے تھے جنھوں نے ابتدائی مشکلات کے باوجود محض خداداد قابلیت اور مسلسل محنت سے ملک میں عزت و شہرت حاصل کی۔ آپ کا وطن فرید پور اور سال پیدائش ۱۸۶۸ء ہے۔ آپ ایک غریب گھر کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والدین کی مالی حالت اس قابل نہ تھی کہ آپ کے لئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا بندوبست ہو سکتا مگر شفیق والدین نے جس طرح بھی ہو سکا آپ کو انٹرینس تک تعلیم دلائی۔ آپ بچپن ہی سے نہایت ذہین و ہوشیار تھے اس لئے آپ کے استاد بھی آپ پر بہت مہربان تھے۔ انٹرینس پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں آپ کلکتہ گئے مگر مالی دقتیں سدِ راہ ہوئیں جس کی وجہ سے آپ کو مجبوراً کلکتہ پریسیڈنسی کالج کے ایک ہوسٹل کی اسسٹنٹ منیجری قبول کرنی پڑی۔ معاش کی سبیل نکلتے ہی آپ نے نجی درس و تدریس کا سلسلہ جاری کر دیا اور مطالعہ کتب کے ذریعہ اپنے علم کو ترقی دینے میں مصروف ہو گئے۔ انگریزی زبان میں آپ کو پہلے ہی سے اچھی مہارت تھی۔ اس نے تھوڑی ہی مدت میں آپ ... انگریزی اخباروں میں مضمون نگاری کے قابل ہو گئے۔ چنانچہ آپ مقامی پرچوں میں مضامین لکھنے لگے اور رفتہ رفتہ آپ کے مضامین کو قبول عام حاصل ہو گیا۔ ترقی کی خواہش آپ کے دل میں موجود تھی۔ ایڈیٹران اخبارات کی حوصلہ افزائی سے آپ ہوسٹل منیجری سے استعفے دیکر باقاعدہ مضمون نگار کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ "انڈین ڈیلی نیوز" کلکتہ کے نیوز ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے محض اپنے خدمات منصبی ادا کرنے پر اکتفا نہ کی بلکہ سیاسی معاملات پر بھی مختصر مضامین لکھتے رہے۔ اس سلسلے سے آپ کو اکثر موقعوں پر گورنمنٹ ہند کے دفاتر کے ساتھ شملہ بھی جانا پڑا اور شدہ شدہ آپ گرمیوں میں شملہ اور جاڑے میں کلکتہ رہنے لگے۔ اسی اثناء میں بعض دوسرے اخبارات کے ساتھ بھی آپ کے تعلقات قائم ہو گئے جس کی بدولت .... امرت بازار پتر کا۔ ایڈوکیٹ آف انڈیا، انڈین ڈیلی ٹیلیگراف، اسٹیٹسمین

وغیرہ جیسے مقتدر ملکی اخبارات میں آپ کے مضامین شائع ہونے لگے۔

اُس وقت تک ہندوستان میں کوئی "نیوز ایجنسی" نہ تھی، اس لئے بڑے بڑے اخبار اپنے خاص نامہ نگار کلکتہ اور شملہ بھیجا کرتے تھے جو اپنے اپنے اخباروں کو تمام ضروری خبریں بھیجا کرتے تھے آپ نے خبر رسانی کے متعلق اپنے فرائض اس خوبی سے انجام دیے کہ معاصرین میں آپ ایک خاص وقعت کے ساتھ دیکھے جانے لگے۔ سر ایڈورڈ بک کی وساطت سے آپ کا تعلق الہ آباد کے مقتدر انگریزی روزنامہ "پائنیر" سے قائم ہوگیا، اور بعد چندے آپ شملہ میں پائنیر بلیٹن کے منیجر مقرر ہوگئے۔

۱۹۰۰ء میں مسٹر رائے نے ایک "نیوز ایجنسی" قائم کرنے کا ارادہ کیا، اور سر ایڈورڈ بک اور بعض دیگر حضرات نے آپ کی حوصلہ افزائی کی۔ آخر آپ کی کوشش بارآور ہوئی اور "ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا" کے نام سے ہندوستان کی سب سے پہلی نیوز ایجنسی قائم ہوگئی۔ اس سلسلے میں آپ نے بڑا کام یہ کیا کہ اخباروں کو بیرنگ تار بھجوانے کے احکام حاصل کئے۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کی بنیاد کے بعد مسٹر کوٹس نے "انڈین نیوز ایجنسی" کے نام سے ایک اور ایجنسی قائم کی۔ مگر کچھ دنوں کے بعد یہ نہ چل سکی اور اسکو ایسوسی ایٹڈ پریس ہی میں شامل ہونا پڑا۔ ۱۹۰۰ء سے تا دمِ مرگ بجز چند ماہ کے آپ ایسوسی ایٹڈ پریس کے صدر ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

مسٹر رائے اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی کی بدولت سرکاری دفتروں کے انتظامات قواعد و ضوابط آئین و اصول سبھی سے بخوبی واقف ہوگئے تھے جس کی وجہ سے اکثر سربرآوردہ حضرات سیاسی معاملات میں آپ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ اسی سلسلہ سے آپ کو ملک کی قانونی مجالس میں بھی شرکت کرنے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ پہلے آپ گورنمنٹ کی طرف سے کونسل آف اسٹیٹ کے ممبر نامزد کئے گئے، پھر ۱۹۲۴ء میں لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن مقرر ہوئے اور آخر تک اس مرکزی قانونی مجلس کے ممبر رہے چنانچہ اپنے انتقال کے دن اسمبلی کے اجلاس ہی میں آپ پر فالج کا دورہ ہوا اور آپ اپنی جگہ بیہوش ہوکر گر پڑے، ممبران..... آپ کو اٹھا کر برآمدہ میں لے آئے اور طبی امداد بہم پہونچائی گئی اور آپکو رپن اسپتال بھیجا گیا مگر وقت پورا ہوچکا تھا کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور ۶ ستمبر کی شام تک آپ اس دارِ فانی سے رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے۔

مسٹر رائے بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ آپ ہندوستانی اخبار نویسی کو ترقی کے انتہائی منزل پر پہونچانا چاہتے تھے، اپنے معاصرین کو مفید مشورے دیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں آپ کو ملک کی فلاح و بہبود کا بھی ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ غیر ممالک میں جو ہندوستانی آباد ہیں اُن کے ساتھ بھی گہری ہمدردی تھی۔

چنانچہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی مشکلات دُور کرنے کے سلسلہ میں جو "کینیا کمیٹی" لندن گئی تھی آپ اس کے رکن تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں "لندن امپائر پریس کانفرنس" میں مرحوم نے ہندوستان کی طرف سے نمایندگی کی تھی اور ہندوستانی اخبارات کی مشکلات پر پُر زور تقریر فرمائی تھی۔ آپ "اِپرانڈیا جرنلسٹ ایسوسی ایشن" کے صدر اور "آل انڈیا جرنلسٹ ایسوسی ایشن" کے نائب صدر بھی تھے۔

ہندوستانی اخبارات کی رہنمائی کے علاوہ مسٹر رائے کو اقتصادی معاملات سے بھی خاص دلچسپی تھی آپ "پنجاب چیمبر آف کامرس" کے ممبر اور دہلی یونیورسٹی کے خزانچی بھی تھے۔ اسی طرح مختلف قسم کے تجارتی و اقتصادی معاملات میں آپ ہمیشہ حصہ لیتے رہتے تھے۔ اب آخری وقت میں آپ اس کمیٹی کے ایک رکن تھے جو تخفیف اخراجات کے سلسلہ میں منجانب گورنمنٹ ہند قائم ہوئی ہے اور مرنے سے ایک روز قبل اس کمیٹی کے جلسہ میں شرکت کر چکے تھے،

بہر حال مسٹر رائے کی وفات سے ہندوستانی صحافت کا ایک نامور رکن اور ایک بہترین خیر خواہ کم ہو گیا جس کی تلافی کی امید مشکل ہے۔

پنڈت وشنو ڈگامبر مرحوم

پنڈت وشنو ڈگامبر قدیم علم موسیقی کے مشہور ماہر تھے، اور اس فنِ لطیف کے کاملوں کی صفِ اول میں شمار ہوتے تھے۔ وہ قدیم علم موسیقی کی اصلاح و اشاعت کی تحریک کے بانی تھے اور اپنی تمام عمر اسی علم کی توسیع و ترقی میں بسر کر دی۔

موسیقی کا شمار فنون لطیفہ میں ہے اور وہ انسانی جذبات کو برانگیختہ کرنے میں بہت موثر ہوتی ہے۔ انسان کیا حیوان اور نباتات بھی موسیقی سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس کے اثر کے نتائج ہر شخص پر اس کی دلی کیفیات کے مطابق ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک دنیادار اس سے صرف وقتی طور پر متاثر ہوتا ہے اور اہل دل حضرات اس سے روحانی سکون و قلبی اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں اس فن کے ماہرین کی بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی مگر زمانہ کی رفتار کے ساتھ یہ فن لطیف بھی تغیر و تنزل پذیر ہو گیا اور صرف پیشہ ور گانے والوں تک محدود ہو جانے کی وجہ سے شرفا و مہذب لوگ اس فن کے حاصل کرنے سے گریز کرنے لگے اور اب بھی گانے والے عموماً عزت کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے۔

پنڈت وشنو ڈگامبر مرحوم نے جب قدیم علم موسیقی کی اصلاح و ترویج کی طرف توجہ کی تو ان کو حصول مقصد میں بہت مشکلیں پیش آئیں، ایک طرف تو مہذب لوگ اس فن کو حاصل کرنا اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے دوسری طرف یہ فن بھی پیشہ ور گانے والوں کے ہاتھوں اپنا قدیم وقار کھو بیٹھا تھا۔ اعلیٰ درجہ کے گانے جن

جن میں کرم اور اس کا پھل نیز تناسخ و تقدیر کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ١ر

ہندو اور عیسائیوں کیلئے ایک کتاب

مرتبہ مولوی ابو محمد مصلح، کراؤن سائز، ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ١٢ر
ملنے کا پتہ:۔ دفتر قرآنی تحریک۔ حیدرآباد دکن

موجودہ زمانہ کی ضروریات کو مدنظر رکھکر مولوی ابو محمد مصلح نے قرآنی تعلیم کو خاص و عام تک پہنچانے کے لئے جدید اصول کے مطابق تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ وہ ہر ماہ اسی قسم کی ایک کتاب شائع کیا کرینگے۔

اس کتاب میں اول مذہب کی حقیقت و ضرورت سے بحث کی گئی ہے۔ بعد ازاں ہندو اخلاقیات کے ذیل میں۔ وید، اپنشد، منوجی کے اصول، مہابھارت، چانکیا، بودھ، بھگوت گیتا وغیرہ سے کارآمد اقوال پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد عیسائی اخلاقیات میں عہدنامہ جدید سے مفید باتیں اخذ کی گئی ہیں پھر قرآنی اخلاقیات ہیں۔ اس آخری باب میں عربی اور اسکا ترجمہ مع ضروری تشریح ساتھ ساتھ ہے۔ مسلمانوں کو خصوصیت سے اور دوسرے مذاہب کے پیرووں کو عمومیت سے اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ہر سہ مذاہب میں اصول اخلاق کتنے متشابہ ہیں اور دراصل دنیا کے کسی مذہب میں بھی برائی کی تعلیم نہیں، اصل ایک ہے البتہ فروعات میں اختلاف ہے۔

جو حضرات اس سلسلہ کی تمام کتابوں کو خرید کرنا چاہیں اُن سے سالانہ قیمت دس روپیہ لی جائیگی اور ہر ماہ کی کتاب کی قیمت ایک روپیہ ہوگی۔

قرآن اور نئی روشنی

مترجمہ سید حبیب احمد آفاق کاظمی امروہوی۔ ڈمائی سائز، ۲۱۰ صفحات قیمت ۲ر
ملنے کا پتہ:۔ ترقی بک ڈپو، جونامارکیٹ کراچی۔

یہ علامہ طنطاوی جوہری مصری کی ایک جدید تصنیف "القرآن والعلوم العصریہ" کا اُردو ترجمہ ہے۔ موضوع کتاب یہ ہے کہ مسلمانوں کو علوم جدیدہ حاصل کرنے کی ضرورت سے آگاہ کیا جائے اور اس بارہ میں قرآن شریف کے جو احکام ہیں یا جو احادیث ان کے حصول کی تعلیم دیتی ہیں ان کو پیش کردیا جائے تاکہ مسلمان اپنی مذہبی تعلیم سے واقف ہوکر ہر قسم کے علوم و فنون، تجارت، صنعت و حرفت وغیرہ میں حصہ لینے کی کوشش کریں اور دنیا میں کامیاب و بامراد زندگی بسر کرسکیں۔ ترجمہ سلیس و رواں ہے۔

یادِ رفتگاں

مسٹر کے۔ سی۔ رائے مرحوم

ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کے بانی مسٹر کیشب چندر رائے ہندوستان کے اُن چند ناموروں میں سے تھے جنھوں نے ابتدائی مشکلات کے باوجود محض خداداد قابلیت اور مسلسل محنت سے ملک میں عزت و شہرت حاصل کی۔ آپ کا وطن فریدپور اور سال پیدائش سنہ۱۸۸۱ء ہے آپ ایک غریب گھر کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والدین کی مالی حالت اس قابل نہ تھی کہ آپ کے لئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا بندوبست ہو سکتا مگر شفیق والدین نے جس طرح بھی ہو سکا آپ کو انٹرنس تک تعلیم دلائی۔ آپ بچپن ہی سے نہایت ذہین و ہوشیار تھے اس لئے آپ کے استاد بھی آپ پر بہت مہربان تھے۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں آپ کلکتہ گئے مگر مالی دقتیں سدِّراہ ہوئیں جس کی وجہ سے آپ کو مجبوراً کلکتہ پریسیڈنسی کالج کے ایک ہوسٹل کی اسسٹنٹ منیجری قبول کرنی پڑی۔ معاش کی سبیل نکلتے ہی آپ نے نجی درس و تدریس کا سلسلہ جاری کر دیا اور مطالعۂ کتب کے ذریعہ اپنے علم کو ترقی دینے میں مصروف ہو گئے۔ انگریزی زبان میں آپ کو پہلے ہی سے اچھی مہارت تھی، اس لئے تھوڑی ہی مدت میں آپ... انگریزی اخباروں میں مضمون نگاری کے قابل ہو گئے۔ چنانچہ آپ مقامی پرچوں میں مضامین لکھنے لگے اور رفتہ رفتہ آپ کے مضامین کو قبول عام حاصل ہو گیا۔ ترقی کی خواہش آپ کے دل میں موجود تھی، ایڈیٹران اخبارات کی حوصلہ افزائی سے آپ ہوسٹل منیجری سے استعفےٰ دیکر باقاعدہ مضمون نگار کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ "انڈین ڈیلی نیوز" کلکتہ کے نیوز ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے محض اپنے خدمات منصبی ادا کرنے پر اکتفا نہ کی بلکہ سیاسی معاملات پر بھی مختصر مضامین لکھتے رہے، اس سلسلے سے آپ کو اکثر موقعوں پر گورنمنٹ ہند کے دفاتر کے ساتھ شملہ بھی جانا پڑا اور شدہ شدہ آپ گرمیوں میں شملہ اور جاڑے میں کلکتہ رہنے لگے۔ اسی اثنا میں بعض دوسرے اخبارات کے ساتھ بھی آپ کے تعلقات قائم ہو گئے جس کی بدولت.... امرت بازار پترکا۔ ایڈوکیٹ آف انڈیا، انڈین ڈیلی ٹیلیگراف، اسٹیٹسمین

وغیرہ جیسے مقتدر ملکی اخبارات میں آپ کے مضامین شائع ہونے لگے۔

اُس وقت تک ہندوستان میں کوئی "نیوز ایجنسی" نہ تھی، اس لئے بڑے بڑے اخبار اپنے خاص نامہ نگار، کلکتہ اور شملہ بھیجا کرتے تھے جو اپنے اپنے اخباروں کو تمام ضروری خبریں بھیجا کرتے تھے آپ نے خبر رسانی کے متعلق اپنے فرائض اس خوبی سے انجام دیے کہ معاصرین میں آپ ایک خاص وقعت کے ساتھ دیکھے جانے لگے۔ سر ایڈورڈ بک کی وساطت سے آپ کا تعلق الہ آباد کے مقتدر انگریزی روزنامہ "پانیر" سے قائم ہو گیا، اور بعد چندے آپ شملہ میں پانیر بلیٹن کے منیجر مقرر ہو گئے۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں مسٹر رائے نے ایک "نیوز ایجنسی" قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ اور سر ایڈورڈ بک اور بعض دیگر حضرات نے آپ کی حوصلہ افزائی کی۔ آخر آپ کی کوشش بار آور ہوئی اور "ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا" کے نام سے ہندوستان کی سب سے پہلی نیوز ایجنسی قائم ہو گئی۔ اس سلسلے میں آپ نے بڑا کام یہ کیا کہ اخباروں کو پریس تار بھجوانے کے احکام حاصل کئے۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کی بنیاد کے بعد مسٹر کوٹس نے "انڈین نیوز ایجنسی" کے نام سے ایک اور ایجنسی قائم کی، مگر کچھ دنوں کے بعد یہ نہ چل سکی اور اسکو ایسوسی ایٹڈ پریس ہی میں شامل ہونا پڑا۔ سنہ ۱۹۱۰ء سے تا دمِ مرگ بجز چند ماہ کے آپ ایسوسی ایٹڈ پریس کے صدر ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

مسٹر رائے اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی کی بدولت سرکاری دفتروں کے انتظامات قواعد و ضوابط آئین و اصول سبھی سے بخوبی واقف ہو گئے تھے جس کی وجہ سے اکثر سر بر آوردہ حضرات سیاسی معاملات میں آپ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ اسی سلسلے سے آپ کو ملک کی قانونی مجالس میں بھی شرکت کرنے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ پہلے آپ گورنمنٹ کی طرف سے کونسل آف اسٹیٹ کے ممبر نامزد کئے گئے، پھر سنہ ۱۹۲۴ء میں لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن مقرر ہوئے اور آخر تک اس مرکزی قانونی مجلس کے ممبر رہے چنانچہ اپنے انتقال کے دن اسمبلی کے اجلاس ہی میں آپ پر فالج کا دورہ ہوا اور آپ اپنی جگہ بیہوش ہو کر گر پڑے، ممبران.... آپ کو اُٹھا کر برآمدہ میں لے آئے اور طبی امداد بہم پہونچائی گئی اور آپکو رپن اسپتال بھیجا گیا مگر وقت پورا ہو چکا تھا کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور ۷ ستمبر کی شام تک آپ اس دارِ فانی سے رہگرائے عالمِ جاودانی ہو گئے۔

مسٹر رائے بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ آپ ہندوستانی اخبار نویسی کو ترقی کے انتہائی منزل پر پہونچانا چاہتے تھے، اپنے معاصرین کو مفید مشورے دیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں آپ کو ملک کی فلاح و بہبود کا بھی ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ غیر ممالک میں جو ہندوستانی آباد ہیں اُن کے ساتھ بھی گہری ہمدردی تھی۔

چنانچہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی مشکلات دُور کرنے کے سلسلہ میں جو کینیا کمیٹی" لندن گئی تھی آپ اس کے رکن تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں "لندن امپائر پریس کانفرنس" میں مرحوم نے ہندوستان کی طرف سے نمایندگی کی تھی اور ہندوستانی اخبارات کی مشکلات پر پُر زور تقریر فرمائی تھی۔ آپ "پرانڈیا جرنلسٹ ایسوسی ایشن" کے صدر اور "آل انڈیا جرنلسٹ ایسوسی ایشن" کے نائب صدر بھی تھے۔

ہندوستانی اخبارات کی رہنمائی کے علاوہ مسٹر رائے کو اقتصادی معاملات سے بھی خاص دلچسپی تھی آپ پنجاب چیمبر آف کامرس کے ممبر اور دہلی یونیورسٹی کے خزانچی بھی تھے۔ اسی طرح مختلف قسم کے تجارتی و اقتصادی معاملات میں آپ ہمیشہ حصہ لیتے رہتے تھے۔ اب آخری وقت میں آپ اس کمیٹی کے ایک رکن تھے جو تخفیف اخراجات کے سلسلہ میں منجانب گورنمنٹ ہند قائم ہوئی ہے۔ مرنے سے ایک روز قبل اس کمیٹی کے جلسہ میں شرکت کر چکے تھے۔

بہر حال مسٹر رائے کی وفات سے ہندوستانی صحافت کا ایک نادر رکن اور ایک بہترین خیر خواہ کم ہو گیا جس کی تلافی کی امید مشکل ہے۔

پنڈت وشنو ڈگامبر مرحوم

پنڈت وشنو ڈگامبر قدیم علم موسیقی کے مشہور ماہر تھے، اور اس فنِ لطیف کے کاملوں کی صفِ اول میں شمار ہوتے تھے۔ وہ قدیم علم موسیقی کی اصلاح و اشاعت کی تحریک کے بانی تھے اور اپنی تمام عمر اسی علم کی توسیع و ترقی میں بسر کر دی۔

موسیقی کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہے اور وہ انسانی جذبات کو برانگیختہ کرنے میں بہت موثر ہوتی ہے۔ انسان کیا حیوان اور نباتات بھی موسیقی سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس کے اثر کے نتائج ہر شخص پر اس کی دلی کیفیات کے مطابق ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک دنیا دار اس سے صرف وقتی طور پر متاثر ہوتا ہے اور اہل دل حضرات اس سے روحانی سکون و قلبی اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں اس فن کے ماہرین کی بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی مگر زمانہ کی رفتار کے ساتھ یہ فنِ لطیف بھی تغیر و تنزل پذیر ہو گیا اور صرف پیشہ ور گانے والوں تک محدود ہو جانے کی وجہ سے شرفاء و مہذب لوگ اس فن کے حاصل کرنے سے گریز کرنے لگے اور اب بھی گانے والے عموماً عزت کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے۔

پنڈت وشنو ڈگامبر مرحوم نے جب قدیم علم موسیقی کی اصلاح و ترویج کی طرف توجہ کی تو ان کو حصول مقصد میں بہت مشکلیں پیش آئیں، ایک طرف تو مہذب لوگ اس فن کو حاصل کرنا اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے دوسری طرف یہ فن بھی پیشہ ور گانے والوں کے ہاتھوں اپنا قدیم وقار کھو بیٹھا تھا۔ اعلیٰ درجہ کے گانے جن

سے روح و قلب کو تسکین ہوتی ہے ناپید تھے۔ عام پیشہ ور معمولی گانے گاتے تھے۔ بہرحال پنڈت جی مرحوم اپنے مقصد کی اشاعت اعلیٰ خاندانوں اور مہذب جماعتوں میں آسانی سے نہ کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے ہمت نہ ہاری۔ برابر سرگرمِ کوشش رہے اور آخرکار کامیاب ہوئے۔

پنڈت جی کو اپنے مقصد کی اشاعت میں ایک اور دقت بھی پیش آئی، یعنی فنِ موسیقی کے متعلق عمدہ و مفید کتابیں نایاب تھیں۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لئے انھوں نے "گندھرب مہا ودیالیہ" قائم کیا اور فنِ موسیقی کی بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ اسی کے ساتھ عمدہ گانوں کے کئی مجموعے بھی مرتب کرکے شائع کئے جن میں سورداس، تلسی داس اور میراں بائی کے بھجن، دوہے وغیرہ حسنِ ترتیب سے جمع کئے ہیں۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ پنڈت جی کی کتابیں کم از کم چالیس ہزار اشخاص کی نظروں سے گزر چکی ہیں۔ "گندھرب مہا ودیالیہ" سے اب تک دو سو اشخاص فنِ موسیقی کی تکمیل کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ آجکل یہ سب کے سب اصحاب ودیالیہ کے اغراض و مقاصد کی اشاعت میں مصروف ہیں۔ ان حضرات نے صرف اپنی قابلیت ہی سے شہرت حاصل نہیں کی بلکہ اپنی سرگرمی و جانفشانی نیز کیریکٹر کی پختگی سے اس تحریک کے اعلیٰ مقاصد کو بدرجۂ اتم پورا کیا ہے۔ اکثر بڑے بڑے شہروں میں ان کی بہت قدر و منزلت ہے۔ کالیتھ پاٹھ شالا الہ آباد اور بعض دوسرے تعلیمی ادارے، پریاگ سنگیت سماج، اکیڈمی آف میوزک، میوزک ایسوسی ایشن آف الہ آباد یونیورسٹی وغیرہ انھیں ماہرینِ فن کی توجہ و کوشش کا نتیجہ ہیں۔

پنڈت وشنو ڈگامبر مرحوم کی زندگی کے آخری ایام رام نام کی تبلیغ میں بسر ہوئے، اور مرحوم کے اس طرزِ عمل نے یہ ثابت کر دیا کہ فنِ موسیقی سے اگر احتیاط کے ساتھ فائدہ اُٹھایا جائے تو سکونِ قلب و روح میسر آ سکتا ہے۔ افسوس حال ہی میں اس ماہرِ فن نے بعارضۂ فالج اُنسٹھ سال کی عمر میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ امید ہے کہ مرحوم کے شاگرد اپنے دائرۂ عمل کو برابر وسعت دیتے رہیں گے اور یہ فنِ شریف و لطیف جلد مقبولِ عام و خاص ہو جائے گا۔



گول میز کانفرنس لندن میں
شرکت کے لئے

مہاتما گاندھی کی روانگی

(از چودھری جگت موہن لال رواںؔ، ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)

ہزار شکر، امیدِ عوام بر آئی — شعاعِ نور شبِ تار میں نظر آئی
غریب ہند کی تقدیر راہ پر آئی — قضیئے ختم ہوئے نوبتِ سفر آئی
نمازِ قوم کو فخرِ انام جاتے ہیں
تمام مقتدیوں کے امام جاتے ہیں

وہ گاندھی کہ سرِ خلق جس کے آگے خم — وہ گاندھی کہ خجل جس سے تاج قیصر و جم
وہ گاندھی جسے کہیئے مسیح یا گوتم — وہ گاندھی کہ ہیں افلاک جسکے زیر قدم
دیارِ ہند کا اعزاز و افتخار ہیں یہ
ہریشچندر و بھیشم کی یادگار ہیں یہ

وہ جس کو دوست میں دشمن میں امتیاز نہیں — وہ قلب صاف جو شرمندۂ گداز نہیں
وہ بے نیاز جسے حاجتِ نیاز نہیں — وہ رازدارِ حقیقت کہ جس سے راز نہیں
رکھا ہے جس نے یہ معیار زندگی کے لئے
حیات شمع ہے محفل کی روشنی کے لئے

وہ اک مثال ترقیِ روحِ انسانی — تمام قوم کا خاکہ ہے جس کی عریانی
وہ ایک ذرہ فدا جس پہ مہرِ نورانی — وہ ایک قطرہ سمندر کی جس میں طغیانی
فرشتہ کہیئے اُسے نائبِ خدا کہیئے
جس آدمی کا یہ رتبہ ہو اُس کو کیا کہیئے

زمین بدلے، اگر آسماں بدل جائے — ہمالیہ اگر اپنی جگہ سے ٹل جائے
چھری بھی ظلم کی قلب و جگر پہ چل جائے — ضعیف جسم سے جانِ حزیں نکل جائے
مہاتما کی طبیعت بدل نہیں سکتی

جو بات منہ سے نکلجائے ٹل نہیں سکتی

خود اپنے دوش پہ لیکر تمام قوم کا بار چلا ہے پیش رو ملک جانب اغیار
نہ ایسا زور قلم اور نہ طاقت گفتار بس ایک صدق و محبت پہ سارا دار و مدار
یہ کیفیت بھی رواں کتنی پُر اثر ہو گی
اُدھر جلال اُدھر دکھ بھری نظر ہو گی

نوید صلح ہے مغرب کے اہل دل کیلئے پیام امن ہے دنیائے مشتعل کے لئے
ہمارا وفد ہے اک نظم مستقل کیلئے یہی بہت ہے اب اس قوم مضمحل کے لئے
ستم ہے گر دل سایل میں انفعال آیا
غضب ہوا اگر اس آئینے میں بال آیا

خدائے پاک گر انصاف و حق نواز بھی ہے کمال دولت و طاقت سے بے نیاز بھی ہے
اگر حقیقت و باطل میں امتیاز بھی ہے اور اسکی نظروں میں کچھ قدر سوز و ساز بھی ہے
بجائے جنگ سے سارے جہاں کی بربادی
پلٹ کے لائیں گے گاندھی پیام آزادی

رباعیات محمود

(از مولوی محمود اسرائیلی)

کب فصل چمن کیف سے خالی آئی شب لطف میں دن سے بھی نرالی آئی
جلوے سے ہیں جگنوؤں کے گلشن پرنور معلوم یہ ہوتا ہے دیوالی آئی

ولہ

کیا کرمک شبتاب نے دکھلائی بہار جلوے سے کیا اپنے ہرا خاں گلزار
یہ چرخ سے ٹوٹے ہیں ستارے محمود یا رات کو چھٹ رہے ہیں گلشن میں انار

لطفِ سخن

انتخاب مشاعرۂ غازی آباد

(منشی گوبرسرن لال ادیب لکھنوی بی۔اے۔)

یارب وہ گل کھلیں چمنِ روزگار میں
جن سے خزاں نہ آئے وطن کی بہار میں

بیکس ہوں بے نوا ہوں غریب الدیار ہوں
اے موت بھی رہا ہوں ترے انتظار میں

ہم اپنے ہاتھ پاؤں ہلاتے نہیں، مگر
ہیں انتظارِ رحمتِ پروردگار میں

(منشی گوپی ناتھ امن لکھنوی)

جلوے تڑپتے ہیں جو مرے قلبِ زار میں
کیفیتیں کہاں ہیں وہ برق و شرار میں

کچھ حسرتوں کی راتیں ہیں کچھ دن امید کے
بس اور کیا ہے عالمِ ناپائیدار میں

صورت کے اعتبار سے سب اختلاف ہے
جلوہ ہے ورنہ ایک ہی برق و شرار میں

(جناب انور علی قریشی انور)

آتی ہے یاد تیرے تبسم کی جب ہمیں
بجلی سی کوندتی ہے دلِ بیقرار میں

(جناب خورشید علی خورشید)

ساقی پلا وہ بادۂ گلگوں بہار میں
دنیا کو بھول جاؤں میں جس کے خمار میں

سب ایک سے بنائے مگر سب الگ الگ
تھوڑا سا فرق کر دیا نقش و نگار میں

(جناب رضا حسین رضا اٹاوی)

ہونے لگا سکون دلِ بیقرار میں
دنیا بدل نہ جائے کہیں انتظار میں

دور از خیال نور سحر خندہ زن نہیں
امید کی جھلک ہے شبِ انتظار میں

(جناب حکیم رضوان احمد رضوان)

اے ناوکِ نگاہ ترے انتظار میں
ہے آرزوِ خلش کی دلِ بے قرار میں

(جناب مولوی زکریا خاں سراج)

دعوت جو دی مجھے خلشِ نوکِ خار نے
رہنے دیا نہ ایک دم اپنے دیار میں

پائی اماں نہ جورِ فلک سے کسی طرح یہ فتنہ ساز ساتھ رہا ہر دیار میں

(جناب ہرسرن داس کمبوہ شہید)

ان کی نگاہِ لطف کا الٹا ہوا اثر اک درد اٹھ رہا ہے دل بے قرار میں

واعظ وہ باوفا نہ سہی بے وفا سہی میں کیا کروں کہ دل ہی نہیں اختیار میں

(جناب حافظ فخرالدین فخری پانی پتی)

اک اک کلی ہے خار مجھے ہجر یار میں کیسے کروں بسر چمن روزگار میں

سینے پہ ہاتھ در پہ لگی ہے نگاہِ شوق تصویر بن گیا ہوں ترے انتظار میں

(جناب کمال)

اک میں اسیرِ الفت صیاد رہ گیا سب ہم صفیر قید سے چھوٹے بہار میں

(جناب حکیم عبدالغنی مسیح)

وہ بے رخی سے آپ کی برباد ہو گئی دنیا بسی تھی جو دلِ امیدوار میں

میرے چھپائے چھپ نہیں سکتا ہے رازِ عشق میں کیا کروں کہ دل ہی نہیں اختیار میں

(جناب مظاہر حسین مظاہر)

گل میں کشش رہی نہ خلش نوکِ خار میں اب فرق کیا رہا ہے خزان و بہار میں

(لالہ منوہر لال ایڈوکیٹ)

کلیاں جو کھلنے والی ہیں کھلکر رہیں گی وہ دامانِ گلستاں میں ہوں یا کوہسار میں

دنیا کی کشمکش نے دیا مجھ کو یہ سبق دل تو لگا عبادتِ پروردگار میں

(مرسلہ جناب آدیب لکھنوی)

میں!

رکتا نہیں جو کبھی وہ دریا ہوں میں،

جس کی نہیں انتہا وہ صحرا ہوں میں،

ہر شے پہ ہوں چھایا ہوا قدرت کی طرح،

لیکن مجھے معلوم نہیں کیا ہوں میں،

(سید احمد اللہ قادری)

علمی خبریں اور نوٹ

عمر خیام کی عالمگیر شہرت...... کی صدائے بازگشت ہندوستان کے مختلف زبانوں میں بھی سنائی دیتی ہے، چنانچہ بنگلہ و گجراتی وغیرہ زبانوں میں، رباعیات خیام کے مختلف باتصویر ایڈیشن شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں بنگال کے مشہور و معروف مصور ابنیدرناتھ ٹیگور نے اپنے موقلم سے خیام کے شاعرانہ تخیل کی ترجمانی بھی کی ہے، اور رباعیات خیام کے متعلق ٹیگور کی تصویریں انگریزی کے بعض مشہور رسالوں میں شائع ہو کر قدردانان فن سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ ایک اور نامور بنگالی آرٹسٹ نے بھی خیام کی شاعری کا پردۂ تصویر میں عکس اتارا ہے اور رسالہ بھارت ورشا کلکتہ کے پبلشرس نے انکا ایک خوبصورت مجموعہ شائع بھی کر دیا ہے جو بنگالی زبان میں بہت ہر دلعزیز ہوا ہے۔ اب ہندی کے نامور شاعر ہمارے مکرم میتھلی شرن صاحب گپتا نے شہید قوم محب وطن گنیش شنکر ودیارتھی بانی و ایڈیٹر اخبار پرتاپ کانپور کی یادگار میں رباعیات کا ایک نہایت خوشنما اور پسندیدہ ہندی ایڈیشن شائع کیا ہے جس میں ایک چابکدست مصور سے خاص طور پر...... بارہ سہ رنگی و پنج رنگی تصویریں بنوا کر ہدیۂ ناظرین کی گئی ہیں۔ درحقیقت ہندی زبان میں رباعیات کا ترجمہ انگریزی سے بدرجہا زیادہ مشکل ہے۔ زمانۂ قدیم سے شیشہ و ساغر کی جو پرستش فارسی شعرا کا جزو ایمان رہی ہے اس کا شائبہ بھی ہندی ادب میں کبھی موجود نہیں رہا مگر گپت جی کوئی معمولی شاعر نہیں ہیں چنانچہ آپ نے اپنے زور طبع کی بدولت اس پرانی شراب کو ہندی کی بوتلوں میں اس طرح محفوظ کیا ہے کہ اس بادۂ کہن سال کی لطافت و خوش رنگی میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔ کتاب کی خوبصورت چھپائی، تصویروں کی نفاست، جلد کی خوشنمائی غرض سبھی چیزیں اپنی اپنی جگہ پر قابل داد ہیں۔ پرکاش پستکالیہ کانپور اپنی چند سالہ زندگی میں ہندی ادب کی قابل قدر خدمت انجام دے رہا ہے لیکن رباعیات خیام کا یہ جدید ایڈیشن اس نامور دار الاشاعت کیلئے بھی باعث فخر ہے۔ رباعیات کے ترجمے کے علاوہ اس میں عمر خیام کی شاعری پر ایک پر از معلومات تمہیدی مضمون بھی ہے، بنارس کے مشہور نقاد فن رائے کرشن جی نے کتاب کی تمام تصاویر کا ایک مختصر مگر قابل دید تبصرہ لکھا ہے۔ محاسن ظاہری میں سب سے زیادہ قابل ذکر سرورق کی خوبصورت تصویر ہے جس میں خیام کے متمہد زندگی اور اسکے

شاعرانہ تخیل کا دلربا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچکر رکھدیا گیا ہے ٹائیٹل پیج و دیگر صفحات کی جدولوں میں بوڑھے خیام کی ساغر بکف تصویر سے بھی عجب آرزو سے سرمستی ترشح ہورہی ہے، کاغذ بھی نہایت موزوں استعمال ہوا ہے اور چھپائی بھی بہت ہی خوبصورت ہے۔ غرض پوری کتاب حُسن طبع اور لطافت فن کا ایک دلپذیر نمونہ ہے، جس پر ہم اس کے نامور مترجم سر بجت تیھلی سرن جی گپت اور اس کے اُولوالعزم پبلشر پنڈت شیو نراین صاحب مصر کو تہِ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ قیمت ؎ ہے شایقین پرکاش پستکالیہ کانپور سے طلب فرمائیں۔

رباعیات خیام کا ایک اور ہندی ایڈیشن جلد ہی انڈین پریس الہ آباد سے بھی شائع ہونیوالا ہے جس میں سولہ رنگین تصاویر دینے کا انتظام ہو رہا ہے۔ رباعیات کا ترجمہ ہمارے دوست سحرؔ ہنگامی صاحب نے کیا ہے۔ ہم اس کارنامے پر اپنے دوست کو مبارکباد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

سال رواں کی دوسری سہ ماہی مختتمہ جون ۱۹۳۱ء میں صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ میں اُردو زبان میں نثر کی صرف ستائیس کتابیں شائع ہوئیں جن کی تفصیل بلحاظ موضوع حسب ذیل ہے۔

آرٹ	۱	سفرنامہ	۱
سائینس	۱	قانون	۱
زبان	۲	طب	۳
ناول	۴	سیاسی	۲
درسی	۷	مذہبی	۵
متفرق	۵		

ان کے علاوہ نظم کی پچیس کتابیں اور شائع ہوئی ہیں مگر ان میں زیادہ تر معمولی ہیں، خاص طور پر قابل ذکر دیوان داغ، کلیات اکبر حصہ دوم اور زہر عشق کے جدید ایڈیشن، دیوان یقین نیرنگ نصرت و جواہرات مونس ہیں۔

مسٹر محمد شبیر احمد علوی صاحب بی۔ اے اُردو زبان میں شعر کہنے والی عورتوں کا ایک تذکرہ مرتب کر رہے ہیں چنانچہ ابتدائی زمانہ سے گذشتہ صدی کے آخر تک کی شاعرات کا تذکرہ تو مکمل ہو چکا ہے لیکن ۱۹ سنہ

کے بعد کی شعر گو خواتین کے حالات اور نمونہ کلام کی جستجو میں ہیں، چنانچہ اس بارے میں وہ اہل ذوق و علم دوست معززین سے طالب امداد ہیں، مجلہ خط و کتابت صاحب موصوف کے نام پتہ ذیل پر ہونا چاہیے

اورنٹیل پبلشنگ ہاؤس ۳۲ امین آباد پارک لکھنؤ۔

ہندوستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ نے یونیورسٹی طلبا کو اردو ہندی زبانوں میں تصنیف و تالیف کا شوق دلانے کی غرض سے تلو سو روپیے کے چند انعامات مقرر کئے ہیں چنانچہ اس سال اس قسم کے پانچ انعامات مندرجہ ذیل اصحاب کو دئے گئے ہیں:-

ہندی زبان میں فن تنقید پر بہترین مضمون لکھنے کے صلہ میں مسٹر ماتا پرشاد گپت (ہوسٹل الہ آباد) کو انعام ملا، نیز پنڈت تلسی رام شرما (ہوسٹل الہ آباد) کا لکھا ہوا افسانہ اور مسٹر آما پرشاد باجپئی (طالب علم لکھنؤ یونیورسٹی) کی نظم بھی مستحق انعام قرار پائی۔

اردو میں مسٹر محمد مقبول (مسلم ہوسٹل الہ آباد) کا مختصر ڈراما اور مسٹر محمد عظیم الحق جنیدی (طالب علم کرائسٹ چرچ کالج کانپور) کا تنقیدی مضمون (اقبال کا فلسفۂ موت) بھی قابل انعام قرار دیا گیا۔ ہماری رائے میں اکیڈیمی کو امسال کے مقابلۂ مضامین کا جلد سے جلد اعلان کر دینا چاہیے۔

حسب معمول امسال بھی ہندوستانی اکیڈیمی اردو ہندی کے بہترین مصنفوں کو پانچ پانچ سو کے انعامات دیگی۔ یہ انعامات جنوری ۱۹۲۸ء کے بعد کی چھپی ہوئی کتابوں پر دیئے جائیں گے۔ جن کا موضوع یا تو علمی سائینس کا کوئی شعبہ مثلاً طب، انجینیرنگ، زراعت، فن باغبانی وغیرہ ہوگا یا اردو ہندی کا بہترین ناول یا مختصر افسانوں کا مجموعہ ہو۔ اس مقابلے میں شریک ہونے کے لئے اردو ہندی مصنفین کو اپنی اپنی تصانیف کی سات سات جلدیں ۳۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء سے قبل سکریٹری صاحب ہندوستانی اکیڈیمی کے پاس بھیج دینا چاہیئے

صدیق بک ڈپو لکھنؤ کے اہتمام میں دیوان غالب کا ایک بہتم بالشان ایڈیشن زیر طبع ہے جس میں مروجہ دیوان کے علاوہ مرزا صاحب کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام بھی شامل کیا گیا ہے اور مرزا صاحب کی نوجوانی کی تصویر ہدیۂ ناظرین کی گئی ہے۔

اس بک ڈپو نے حضرت شوق لکھنوی کی مشہور مثنوی عالم خیال کا ایک باتصویر ایڈیشن بھی شائع کرنے کا بندوبست کیا ہے۔

جولائی سنہ حال سے لکھنؤ کے مشہور محب وطن مولانا ظفر الملک صاحب علوی نے اپنے قابل قدر رسالہ الناظر کی اشاعت بند کر دی ہے۔ جس ناخوشی، خلوص اور بے لوثی سے اس رسالہ نے اکیس سال تک ملک کی ادبی خدمت انجام دی ہے اس کے خیال سے ہم اس واقعہ کو اردو کے لئے ایک سانحہ عظیم سے کم نہیں سمجھتے ہیں۔ ہمارے دوست ظفر الملک صاحب اُن سچے عاشقانِ وطن میں ہیں جو حب الوطنی کی راہ میں ہر دقت مرمٹنے کے لئے مستعد رہتے ہیں۔ انھوں نے ملک و قوم کی خاطر تکلیفیں اُٹھائی ہیں۔ اذیتیں سہی ہیں اور بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں۔ مگر جس طرح ہم ان کے تمام کارناموں میں الناظر کی اشاعت اُن کی سب سے بڑی ملکی خدمت سمجھتے ہیں اسی طرح آج اس کا بند کرنا بھی ہم اُن کی سب سے بڑی قربانی جانتے ہیں۔ ظفر الملک صاحب کا شمار گنتی کے اُن چند لوگوں میں ہے جن کے دماغ میں انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کے دلوں میں ادب اردو کا ذوق پیدا کرنے اور اُردو کو جدید علوم و فنون کا سرمایہ دار بنانے کا سودا سمایا ہوا ہے۔ مولوی صاحب کا یہ دعویٰ کہ "الناظر کی اکیس سالہ زندگی میں یہ مرکزی نقطۂ خیال کبھی ایک لمحہ کے لئے نظر انداز نہیں ہونے پایا" حرف بحرف صحیح ہے۔ ابتدائے اشاعت سے ہم الناظر کو غور سے دیکھتے رہے ہیں اور گو اکثر موقعوں پر ہم کو اُسکی رایوں سے اختلاف ہوا ہوگا لیکن جو اعلیٰ اصول اس نے آغاز اشاعت سے آخر تک اپنے پیش نظر رکھے جس خلوص اور آزاد خیالی، بے نفسی اور اولوالعزمی، دیانت و متانت کو الناظر نے اپنا معیار ذہنی بنا لیا تھا اسپر وہ اپنے با اصول اور بے لوث ایڈیٹر کی بدولت آخر تک ہمت و استقلال کیساتھ قائم رہا۔ محاسن ظاہری اور حجم کے اعتبار سے اُردو کے بہت سے رسالے الناظر سے بدرجہا آگے بڑھے ہوئے ہیں مگر اصولی حیثیت سے اُس کی جگہ ہمیشہ اُردو اخبارات و رسائل کے صفِ اول میں رہی یہی وجہ ہے کہ کثیر الاشاعت پرچوں کے مقابلہ میں بھی دنیائے ادب پر اسکا اخلاقی اثر ہمیشہ زیادہ رہا۔ اس دشوار گزار منزل میں ہم ایک ادبی رفیق سفر ہونے کی حیثیت سے اپنے عزیز ہمدم و ہمعصر کا ساتھ چھوٹنے پر دلی رنج و افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ لکھنؤ کی سرزمین خالص ادبی خدمت کے لئے کچھ بہت موزوں ثابت نہیں ہوئی ہے لیکن کارکنان الناظر نے جس استقلال و وضعداری سے اکیس سال۔۔۔ نباہ دیئے اس پر وہ قدر شناسان ادب سے دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مالی حیثیت سے ظفر الملک صاحب کے اہم خدمات کی کافی قدر نہیں ہوئی لیکن ایک با اصول اور بے لوث کارکن کو اپنا حق ادا کرنے کے بعد جو دلی اطمینان نصیب ہوتا ہے وہ ایڈیٹر صاحب الناظر کو بھی حاصل رہے گا۔ اور ہم اس سکون خاطر اور اطمینان قلب کو تمام دنیوی جاہ و حشمت پر قربان کرنے کو تیار ہیں۔

تصحیح زمانہ بابتہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں یاد رفتگاں کے ذیل میں جو مضمون مسٹر ایس خدا بخش مرحوم کے متعلق شائع ہوا ہے اسمیں پٹنہ لائبریری کا قیام مسٹر ایس۔ خدا بخش کے نام سے منسوب ہو گیا ہے مگر یہ لائبریری ان کے والد خدا بخش مرحوم نے قائم کی تھی۔ مسٹر ایس خدا بخش کا پورا نام صلاح الدین خدا بخش ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔

زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم بی اے

جلد ۵۷	نومبر ۱۹۳۱ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

قیمت سالانہ ہے

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت فی پرچہ ۱۲

قیمت ممالک غیر سے سالانہ ششماہی ہندوستان کے لئے ششماہی ہے،

خاص رعایت

صرف

رسالہ زمانہ کے ۵۰۰ خریداروں کے لئے

حسن کی چنگاری (مولفہ ٹھاکر کشن بہادر) انڈین شیکسپیر آغا حشر کاشمیری۔ افتخار الشعرا برق دہلوی بی۔ اے، رسا رامپوری اور بیتاب بریلوی بی اے کے افکار عالیہ کا چھٹکا ہوا نایاب مجموعہ۔ سرورق پر ایک حسین تصویر لکھائی چھپائی دیدہ زیب کاغذ نہایت نفیس قیمت صرف ۲ ر اتنی سستی و قیمتی کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔

بندے ماترم (مؤلفہ بابو راجیشور ناتھ ورما ایڈیٹر رسالہ ستارہ) ہندوستان کے چوٹی کے ادیبوں اور قوم پرستوں کی حب وطن سے لبریز نغموں اور ترانوں کا اچھوتا مجموعہ جو اردو۔ ہندی، انگریزی اور بنگالی زبان میں ایک ساتھ نہایت خوبصورتی کے ساتھ چھاپا گیا ہے۔ سروجنی۔ ٹیگور۔ بنکم بابو، آروند و گھوش اور للتا کپتا وغیرہ وغیرہ کے پرزور قلم کے نوادر کا ایسا بیش بہا مجموعہ آج تک شائع نہیں ہوا۔ قیمت صرف دو آنہ ۲ ر

(نوٹ) اپنے نمبر خریداری کا حوالہ دیکر ۳ ر کے ٹکٹوں پر دونوں کتابیں حاصل کیجئے

فوراً طلب فرمائیے بہت تھوڑی جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

بجلی ڈاکٹر شفاع جناب بیتاب بریلوی بی۔ اے۔ نے بنگلہ زبان کے معرکۃ الآرا ناول تسوفی سے ترجمہ کیا ہے مترجم موصوف نے اپنا سارا زور قلم صرف کر دیا ہے۔ ایسا غضب کا ناول ہے کہ ایک بار شروع کر کے ختم کئے بغیر نیند نہیں آتی۔ حجم دو سو صفحات چھپائی وغیرہ نہایت عمدہ

قیمت زمانہ کے صرف پہلے ۱۰۰ خریداروں سے ۲ ر علاوہ محصول۔

ستلڑی مسٹر بیتاب بریلوی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کے بہار آفریں قلم سے نکلے ہوئے سات افسانوں کا قابل قدر مجموعہ ہے۔ جس کا ہر افسانہ اعلیٰ پایہ کے ادبی رسائل میں شائع ہو کر مصنف کے لئے خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔ بید نفیس کاغذ پر اس خوبی سے چھپائی ہوئی ہے کہ پھر ہی دیکھا کیجئے۔ اس قدر نفاست و ضخامت کے باوجود بھی قیمت صرف عہ ایک روپیہ مگر زمانہ کے صرف پہلے ۱۰۰ خریداروں سے آٹھ آنہ علاوہ محصول۔

رسالہ ستارہ یہ وہ مصور مجلہ ہے جس کا ثانی ہندوستان کی کسی بھی دوسری زبان میں ملنا مشکل ہے! جو فتح ایشیا سوراجیہ اور تیج وغیرہ اخبارات کے سابق ایڈیٹر اور شہرہ آفاق مصنف بابو راجیشور ناتھ ورما زیبا کی زیر ادارت انگریزی فن صحیفہ نگاری کی پابندیوں کے ساتھ ہر ماہ شائع ہوتا ہے۔ ستارہ اپنے رنگ کا واحد رسالہ ہے جس میں متعدد تصویریں اور دنیا کے ہر موضوع پر پُر مغز مضامین کا التزام رہتا ہے حجم ۲۰×۳۰ کے ۹۰ صفحات۔ دس بارہ تصویریں کاغذ نہایت عمدہ طباعت لاثانی سرورق بعید لیل ان سب ستارہ خوبیوں کے باوجود بھی چندہ سالانہ ۲ ر دو روپیہ معہ محصول۔ ایک آنہ کا ٹکٹ بھیجکر نمونہ مفت منگائیے۔

مہتمم آکاش بانی آفس، بریلی

زمانہ

جلد ۵۷ — نومبر سنہ ۱۹۳۱ء — نمبر ۵

حکیم محمد قاسم فرشتہ

از سید احمد اللہ قادری، نائب ایڈیٹر "تاریخ" حیدرآباد

حکیم محمد قاسم فرشتہ مازندران کا رہنے والا تھا۔ اس کی ولادت سنہ ۹۶۰ھ کے قریب استرآباد میں ہوئی تھی۔ فرشتہ کے والد غلام علی ہندوشاہ بڑے عالم و فاضل آدمی تھے، اُن کے علم و فضل کا حال خود فرشتہ نے اپنی تاریخ میں بھی لکھا ہے۔

غلام علی ہندوشاہ مغل بادشاہوں کی داد و دہش اور علمی فیاضیوں کا حال سنکر شہنشاہ اکبر (سنہ ۱۵۵۵ء سنہ ۱۶۰۵ء) کے عہد میں آگرہ آئے، اور کچھ عرصہ یہاں قیام کیا۔ اس دوران میں ملّا احمد تتوی سے ان کی ملاقات ہوگئی جو دربار اکبری کے معروف مورخ تھے اور جنھوں نے تاریخ الفی کے چند حصے تالیف کئے تھے۔ فرشتہ نے ملا صاحب کی ملاقات کو غنیمت سمجھا اور اُن سے استفادہ شروع کردیا اور قلیل مدت میں مختلف علوم و فنون خاص کر علم طب کی تعلیم ان سے حاصل کرلی۔ چنانچہ تاریخ فرشتہ میں سلطان محمود خلجی کے بیان میں اس کا سرسری طور پر تذکرہ کیا ہے۔

"پوشیدہ مباد کہ در کتب تاریخ ہند خصوصاً در تاریخ الفی مرقوم قلم زریں رقم استاذی ملا احمد تتوی گردیدہ کہ چوں اولاد غوریہ مستاصل گشتند" تاریخ فرشتہ جلد دوم مقالہ پنجم صفحہ ۲۴۲

آگرہ میں ہندوشاہ کی کوئی قدر نہیں ہوئی تو وہ تلاش معاش میں احمد نگر چلے آئے، اس وقت احمد نگر میں مرتضیٰ نظام شاہ (سنہ ۹۷۲ھ سنہ ۹۹۶ھ) حکمران تھا۔ اس نے ان کی بڑی عزت کی، اور انھیں

اپنے ولی عہد میران حسین نظام شاہ (۹۹۶ھ - ۹۹۷ھ) کا اتالیق مقرر کردیا۔ اس اعزاز کے بعد ہندو شاہ نے بتدریج اعلیٰ مناصب حاصل کر لئے۔

ہندو شاہ جب شہزادے کو درس دیا کرتے تو اس میں فرشتہ کو بھی شریک کر لیا کرتے تھے، اس طرح سے شہزادہ اور فرشتہ میں دوستی پیدا ہوگئی۔ ۹۸۹ھ کے اوائل میں بادشاہ نے فرشتہ کو ملازمان شاہی میں منسلک کردیا۔ اور اس نے بالکل تھوڑی مدت میں بادشاہ کے مزاج میں بہت رسوخ پیدا کر لیا اور ۹۹۰ھ میں اس کا شمار بادشاہ کے ندیموں میں ہونے لگا۔ اسی زمانہ میں فرشتہ نے بادشاہ کے حکم سے رموز مملکت میں حصہ لینا شروع کیا، اور سیاسی امور کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دینے لگا جس کے باعث اعیانِ احمد نگر میں بھی اسکی خاص وقعت ہوگئی۔

اسی ضمن میں فرشتہ کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے کہ مرزا خاں وکیل سلطنت (احمد نگر) نے بادشاہ کو تخت سے معزول کرکے اس کے بیٹے میران حسین نظام شاہ کو جانشین بنانے کی سعی کی۔ میران حسین نظام شاہ چونکہ ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ - ۱۰۳۷ھ) کا بہنوئی تھا، اس لئے اس کو بہت زور ہوگیا۔ بادشاہ ان کارروائیوں سے بالکل ناآشنا تھا۔ فرشتہ کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے یہ تمام واقعات بادشاہ کے گوش گزار کئے، اور وقتاً فوقتاً اس نے انتشار کے فرو کرنے کی تدابیر اختیار کیں۔ اس پر بادشاہ نے فرشتہ کو جاسوس مقرر کرکے مرزا خاں کی فوج میں بھیجا، اور اس نے وہاں کے اندرونی حالات معلوم کیے۔ مرزا خاں کو جب فرشتہ کے آنے کا علم ہوا تو اس کے گرفتار کرنے کا حکم دیا، اور تعاقب میں بہت دور تک آدمی بھیجے۔ لیکن یہ بادشاہ تک صحیح وسلامت پہونچ گیا۔ اس کے بیان پر بادشاہ نے اپنی حفاظت کے ذرائع اختیار کئے مگر آخر بغاوت کا سیلاب کسی طرح نہ رک سکا۔ اور بادشاہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر مرزا خاں شہر پر قابض ہوگیا۔ اور شہزادہ تھوڑی سی فوج لیکر قلعہ میں داخل ہوا۔ اس وقت بادشاہ کے ہمراہ کوئی امیر و سپاہی نہ تھے۔ یہ تمام شہزادے سے مل گئے، مگر فرشتہ اس حالت میں بھی بادشاہ کا رفیق تھا۔

شہزادہ نے قلعہ میں آکر قتل عام کا حکم دیا، چنانچہ جو شخص ملتا فوراً قتل کردیا جاتا تھا۔ اس وقت فرشتہ کو بھی شہزادہ کے آدمیوں نے گرفتار کر لیا۔ اتفاق سے شہزادہ ادھر آگیا۔ فرشتہ سے وہ پہلے ہی سے واقف تھا اس لئے اس کو رہا کرادیا۔

ان واقعات کو فرشتہ نے اپنی تاریخ میں تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ ذیل میں اس کی اصل عبارت پیش کی جاتی ہے:-

"سلطان حسین سبزواری را کہ زائیدہ احمد نگر بود، بمنصب وکالت نواختہ بخطاب مرزا خاں و منصب

بپیشوائی مخصوص گردانید و او چون ارادهٔ نظام شاه میدانست فتحی شاه خویشان و قرابتیان او را به بذل نقود فراوان از خود راضی ساخت و پنهانی نزد دلاورخان به بیجاپور کس فرستاده پیغام کرد که این پادشاه دیوانهٔ مطلق شده میخواهد که پسر خود را بکشد اگر شما امداد نموده خود فرض گردانیده متوجه سرحد گردید می توانم که پدر را گرفتار کرده پسر را بر تخت متمکن سازیم دلاورخان قبول این معنی کرده با عادل شاه متوجه سرحد گردید میرزا خان بوساطت فتحی شاه بعرض نظام شاه رسانید که عادل شاه با سپاه فراوان به قصد تسخیر ولایت احمدنگر رایت عزیمت افراخته بتعجیل می آید درین باب حکم چیست نظام شاه چون از مقدمه خبر نداشت علاج آن امر بمیرزا خان رجوع فرمود. میرزا خان امرائے کلان را بدان بهانه که لشکرکشی عادل شاه به تحریک ایشانست مقید گردانید، قرابتان و آشنایان خود را بجائے ایشان نصب کرد و با جمعیت بسیار از احمدنگر بر آمده در ظاهر قصبه والوره فرود آمد نظام شاه از مقام کردن مرزا خان متوهم گشته مسودهٔ این اوراق محمد قاسم فرشته را جهت تحقیق معامله نزد امرا مرسول داشت چون مرزا خان اخلاص مرا نسبت بان شهریار لاجبی میدانست یقین کرد که حقیقت حال بخاطر آورده آنچه هست بے ملاحظه بعرض پادشاه خواهد رسانید ازین سبب از رفتن به لشکرگاه در اضطراب و تلواسه افتاد بفتحی شاه گفت اگر حکم حاصل کنی که من به لشکر رفته امرا را بجنگ خصم ترغیب و تحریص نمایم عجب مرحمتی و شفقتی خواهد بود و بشکرانهٔ آن دوازده هزار هون نقد جهت مجلس بزم شما داده روانه خواهم شد فتحی شاه که نام دوازده هزار هون شنیده در ساعت نظام شاه عرض کرده حکمی بخط وی حاصل کرد که مرزا خان خود به لشکر رفته بمدافعهٔ دشمن قیام نماید وی بدین امر مبتهج و مسرور گشته بے توقف دوازده هزار هون بفتحی شاه تسلیم نمود هنوز این نوبت در لشکر بود که مرزا خان با یلغار بآنجا آمد و چون او را طشت از بام افتاده بود و خاص و عام به ارادهٔ اش مطلع بودند عازم آن شد که مؤلف را محبوس و مقید گرداند تا اخبار آن دو بعرض پادشاه نرسد درین اثنا یکے از دوستان مرا برین آگاهی بخشیده بیاری هونان از گرفتار او دور قریب به شام بدبخت مرزا خان واقف گشته جمعے کثیر دنبال من نامزد کرد چون مشعل و دیوتی خاموش گردانیده بودم و ایشان بعکس آن افروخته بودند ازین جهت بر تعاقب آنها اثری مترتب نشد فقیر قریب صبح بود که بملازمت نظام شاه رسیده از عقب سراپرده قصد و اندیشهٔ مرزا خان را بتفصیل معروض داشتم فتحی شاه معارض من شده و گفت آنچه میگوئی خلاف واقعست هرگز حرامخوری از میرزا خان صدور نخواهد یافت گفتم مرا با میرزا خان عداوتے نیست که در حق وے تهمت نمایم آنچه شنیده ام لغرض صاحب خود رسانیده ام امیدوارم که عنقریب صدق و کذب من بر یکسان ظاهر شود درین حرف و حکایت بودم

که مقارن آن حال جاسوسان از گرد راه رسیده خبر آوردند که میرزا خان با جمیع امرا به دولت آباد رفت
که میران حسین را از قلعه بیرون آورده به پادشاهی برداشته متوجه احمدنگر شود. نظام شاه در دریای حیرت
افتاده و از بنده طریق علاج استفسار نمی معروض داشتم که بدو نهج علاج این متصور است یکی آنکه پادشاه
با خواص پیاده همراه و سوار شوند با این دو سه هزار سلحدار و خاصه خیل که در رکاب همایون اند بجانب پیتن
توجه فرموده راه بر میرزا خان بگیرند که بمجرد شنیدن این خبر جمیع امرا و سپاه ترک رفاقت میرزا خان
کرده در ظل رایت عرش آیت مجتمع خواهند شد نظام شاه گفت پیش ازین به یک دو فلان خواجه سرای علیحده
برای من آورده بمجرد خوردن درد شکم و بهم زدگی طبیعت رسیده منجر با سهال دموی شد اکنون احشائی
من مجروح است و قدرت بر سواری ندارم گمان آن است که میرزا خان با خواجه سرا ساخته آن
مطبوخ را مسموم گردانیده بود گفتم علاج دیگر آن است که فرمان استخلاص صلابت خان بقلعه دهارا بیجور
فرستاده به تعجیل او را و دیگر مردم را که در قلعه محبوس اند طلبیده و خود نیز بدولت و سعادت در پالکی نشسته
بهانهٔ شکار بجانب باره جیر که سر راه صلابت خان است تشریف برند که بمجرد رسیدن صلابت خان
بپابوس عالم پناه تمامی خیل و حشم از شهزاده و میرزا خان جدا شده و بملازمت خدایگان اعلیٰ خواهند پیوست
نظام شاه در ساعت فرمان طلب صلابت خان و قاسم بیگ و میرزا محمد تقی و حکیم محمد مهدی نوشته بصحوب
قاصدان جلد روانه نمود و خود نیز ساعت خوش کرده می خواست که سوار شود ناگاه فتحی شاه نمک حرام سر
در پای او نهاده بهای های گریستن شروع نمود و گفت بمجرد رفتن از قلعه احمدنگر این مردم خاصه
خیل که حاضر اند برای مجرای خدمت خود ترا گرفته پیش شهزاده خواهند برد نظام شاه باور کرده فسخ
عزیمت نمود و مردم چوت را که بمحافظت دریا به اشتغال داشت آن روز بحضور اقدس طلبیده میکالمه
تشریف سرافراز ساخت و او پادشاهی بود قوی هیکل گندم گون فراخ چشم و بلند اندام و شوکت و
صلابت با هم جمع داشت و فارسی را بغایت نیک می گفت نقل گفت فتحی شاه چنین و چنان میگوید
بهتر آن است که درین قلعه بوده انتظار صلابت خان بکشیم چون فقیر چاره نداشت موافق مزاج آن حضرت
حرف گفته رضا بقضا داد اما چون حکایت فاش شد جمیع مردم از سوار و پیاده که نزد او مانده بود تبدیل
و مایوس شده فوج فوج بجانب دولت آباد رفتند و میرزا خان از بیم وصول صلابت خان دو منزل
را یکی کرده به تعجیل هر چه تمامتر شهزاده را باحمدنگر آورده و دعوی ارادهٔ نمود که دروازهٔ قلعه بسته تا رسیدن
صلابت خان محافظت نماید اما چون صغیر و کبیر خود را بر سر یار انداخته لشکر ملحق شدند و خارج فتحی شاه و کنیز
او سبزه نام و سه چهار پرده دار کس در قلعه نماید مسودهٔ این اوراق دست از مدافعه باز داشته سکوت

اختیار کرد، در آں اثنا شاہزادہ و مرزا خاں با سی چہل کس از مردم اجلاف و اوباش بہ قلعہ درآمدہ با شمشیرہائے برہنہ بہ عمارت بغداد کہ مسکن نظام شاہ بود درآمدہ ہر او دیدند گشتند بندہ را شناختہ و نسبت ہم مکتبی منظور داشتہ مانع کشتن شدہ و مرا ہمراہ خود بالائے عمارت بغداد بردہ فوراً خفا ہر چہ او امر در عالم منظور است نسبت پدر بجائے آورد نظام شاہ سکوت اختیار کردہ از روئے حیرت بجانب دے می نگریست۔"

(تاریخ فرشتہ جلد دوم مقالہ سوم صفحہ ۱۴۰ – ۱۴۱)

اس کے بعد شہزادہ محل میں آیا اور اپنے باپ مرتضیٰ نظام شاہ کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔ اور تیسرے روز اسے ایک گرم حمام میں بند کیا جس کے صدمے سے اس نے ۱۴ رجب ۹۹۶ھ کو وفات پائی۔

میران حسین کے تخت نشین ہونے کے بعد فرشتہ کی وہ پہلی سی قدر و منزلت نہ رہی کیونکہ شہزادہ اسے اپنے والد کا خیر خواہ تصور کرتا تھا۔ مرتضیٰ نظام شاہ کی وفات کے بعد یہ دو سال تک احمد نگر میں رہا۔ اس کے بعد ۱۹ صفر ۹۹۸ھ کو ابراہیم عادل شاہ ثانی بیجاپور چلا آیا۔

بیجاپور میں فرشتہ دلاور خاں نائب سلطنت کی سرکار میں باریاب ہوا۔ یہ شخص خود بھی عالم تھا اور اہل کمال کی قدر کیا کرتا تھا۔ اس کے دربار میں بڑے بڑے علماء و فضلا جمع رہتے تھے۔ ملک قمی، و ملا ظہوری کو اسی نے طلب کیا تھا اور انھیں بادشاہ سے وظیفے مقرر کرا دیئے تھے۔ فرشتہ کی بھی اس نے اچھی قدر کی اور کچھ دن کے بعد اسے بھی بادشاہ کی خدمت میں لیجا کر نوکر رکھا دیا۔

راقم حروف نیز در نوزدہم صفر سنہ ثمان و تسعین و تسعمایۃ از احمد نگر بہ بیجاپور آمدہ بوساطت دلاور خان بشرف آستان بوسی شاہ عدالت گستر مشرف گردیدہ در سلک نوکران و ملازمان او انتظام یافتہ تا یوم التحریر از خاکروبان آں عتبۂ عالیہ است۔

(تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۱۵۰)

فرشتہ نے بیجاپور میں بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کا مختصر تذکرہ تاریخ فرشتہ میں بھی موجود ہے۔ برہان نظام شاہ ثانی (۹۹۹ھ – ۱۰۰۳ھ) والی احمد نگر سے فرشتہ کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اس سے اس زمانہ کی ملاقات تھی جبکہ وہ احمد نگر میں قید تھا۔ اس کا بیٹا اسمٰعیل نظام شاہ (۹۹۷ھ – ۹۹۹ھ) جب تخت نشین ہوا تو فرشتہ نے برہان نظام شاہ کی بادشاہی کے لئے بڑی کوشش کی۔[۵]

۵؎ مرتضیٰ نظام شاہ کے بعد میران حسین نظام شاہ تخت پر بیٹھا۔ اس کے قتل ہونے کے بعد برہان نظام شاہ ثانی کا فرزند اسمٰعیل نظام شاہ بر سر حکومت ہوا۔ چونکہ برہان نظام شاہ بقید حیات موجود تھا۔ اس لئے اسمٰعیل نظام شاہ سلطنت کا حقیقی وارث نہیں ہو سکتا تھا اور اسمٰعیل کی گدی نشینی کے وقت برہان نظام شاہ ثانی اکبر کے امراء میں شامل تھا۔ اس کو جب اپنے فرزند کے بادشاہ ہونے کی اطلاع ملی تو اکبر سے دکن جانے کی اجازت چاہی۔ اکبر نے اسے بعد فتح احمد نگر برار کا علاقہ نذرانے میں پیش کرنے کے وعدے پر اجازت دی اور اس کی خاطر اپنے چار ایلچی برہانپور، احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈے میں بھیجے

سنہ ۹۹۶ھ میں دلاور خاں اکبر کے ایما سے برہان نظام شاہ کی اعانت کے لئے گیا تو اس لڑائی میں فرشتہ خود بھی شریک تھا۔ اور دلاور خاں سے اسمٰعیل نظام شاہ کے وزیر جمال خاں سے بمقام دارا سنگ مقابلہ ہوا جس میں امراء کی سرکشی کے باعث بیجاپور کی فوج کو شکست ہوئی اور اس کو فرار ہونا پڑا۔ ایسے نازک اور بُرے وقت میں دلاور خاں کے ساتھ صرف بارہ آدمی تھے جن میں فرشتہ بھی تھا۔ فرشتہ کو اس معرکہ میں کئی زخم آئے جس کی وجہ سے یہ بے حد نڈھال ہو گیا اور جمال خاں نے تعاقب کرکے اسے گرفتار کر لیا لیکن بعد میں اُسے ملّا خیال کرکے چھوڑ دیا گیا

اس جنگ کے بعد دلاور خاں کے بہت سے امیر دشمن ہو گئے۔ مگر اس پر بھی اس کا رعب و دبدبہ اسی قدر تھا اور بادشاہ خود بھی اس سے خائف رہتا تھا اور یہ بادشاہ کو اپنے پورے اثر و اقتدار میں رکھتا تھا۔ مگر بادشاہ کو ہمیشہ اس بات کی فکر دامنگیر رہتی تھی کہ کسی طرح اس کی حراست سے نجات پائے۔ ایک دن موقعہ پاکر بادشاہ شب میں عین الملک کے محل میں پناہ کی خاطر چلا گیا۔ اس نے بادشاہ کے گرفتار کرانے کی ہر چند کوشش کی لیکن عین الملک اور آتش خاں کی اندرونی طرفداری سے کچھ نہ کر سکا۔ جب یہ خبر شہر میں عام طور پر مشہور ہوگئی تو فوج اور امیر جوق در جوق بادشاہ کے سلام کے لئے عین الملک کے محل پر حاضر ہوئے۔ فرشتہ کو جب اس کی اطلاع ملی تو یہ بھی پیادہ پا لشکر کے ہمراہ سلام کے لئے گیا۔ بادشاہ اس کو دیکھ کر بہت مسرور ہوا یہ واقعہ ۱۴ رجب سنہ ۹۹۹ھ کا ہے۔

دلاور خاں کے معزول کئے جانے کے بعد شاہنواز خاں وزیر مقرر کیا گیا۔ اس نے بہت جلد اچھی اچھی خدمات حاصل کر لیں۔ فرشتہ سے اس سے مخلصانہ تعلقات تھے۔ ابتدا میں یہ بھی دلاور خاں کا متوسل تھا اور اسی کی سفارش پر بادشاہی ملازم ہوا تھا۔ اس کو بھی اس علم سے خاص دلچسپی تھی اور یہ ان کی قدر کیا کرتا تھا۔ فرشتہ کی تاریخ نگاری میں اس نے بڑی مدد دی ہے۔ تاریخ فرشتہ میں اس کا تذکرہ سنہ ۱۰۱۰ھ تک باقاعدہ ملتا ہے۔

سنہ ۱۰۱۳ھ میں ابراہیم عادل شاہ نے اپنی دختر شہزادہ دانیال کو بیاہ دی، دلہن جب نوشہ کے پاس برہانپور بھیجی گئی تو بادشاہ نے فرشتہ کو شہزادی کے ہمراہ برات کے ساتھ روانہ کیا، جس کے باعث اس کا برہانپور میں کچھ مدت تک قیام ہو گیا۔ وہاں اس نے تاریخ کے لئے کچھ معلومات مہیا کئے اور شاہی کتب خانہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۱) ان میں ایک مشہور شاعر فیضی تھا۔ جو بمقام برہان پور راجہ علی خاں (سنہ ۹۹ھ سنہ ۱۰۰۵ھ) کے دربار میں آیا۔ خواجہ امین الدین احمد نگری احمد نگر میں، میر محمد شہدی بیجاپور میں، مرزا مسعود گولکنڈے میں وارد ہوئے۔ ان سبھوں نے برہان نظام شاہ کو شاہ احمد نگر تسلیم کرانے کی کوشش کی۔ (سوانح چاند بی بی صفحہ ۲۰)

بھی دیکھا شہزادہ دانیال کے دیوان خواجہ حسن تربتی کے ساتھ جاکر قلعہ کی سیر کی۔ تاریخ فرشتہ میں اس واقعہ کا مجمل طور پر تذکرہ ہے:۔

مؤلف این کتاب در سنہ ثمان عشرین والف ہمراہ خواجہ حسن تربتی کہ دیوان شاہزادہ دانیال بود بالائے قلعہ رفتہ تفرج نمودم۔ (تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۲۹۰)

یہ شہنشاہ جہانگیر (سنہ ۱۰۱۴ھ تا ۱۰۳۶ھ / ۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء) کے اوائل عہد میں ابراہیم عادل شاہ کی جانب سے تحفہ وہ اپنا لیکر لاہور گیا تھا۔ چنانچہ تاریخ فرشتہ میں اس واقعہ کو سلطان غیاث الدین تغلق (سنہ ۷۲۰ھ تا ۷۲۵ھ) کے حالات میں اس طرح بیان کیا ہے۔

مورخین ہندوستان از متقدمین و متاخرین غافل گشتہ ہیچ یک از اصل و نسب تغلق شاہیہ برقوم قلم تحقیق نگزاشتہ و ہنگامیکہ راقم اوراق محمد قاسم فرشتہ بود در اوائل عہد نور الدین جہانگیر بادشاہ از جانب سلطان حضرت ابراہیم عادل شاہ بہ بلدہ لاہور رسید از بعض مردم آنجا کہ ایشان در غایتی خواندہ تواریخ بادشاہان ہندوستان بود و از احوال سلاطین ہند مطلع بودند (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۳۰)

فرشتہ نے بہت طویل عمر پائی تھی سنہ ۱۰۳۳ھ کے بعد تک بھی بقید حیات موجود تھا۔ چنانچہ اس کی تصدیق خود اس کی تاریخ سے ہوتی ہے:۔

بہادر خاں را اکبر بادشاہ بدار السلطنۃ لاہور بردہ دیگر روئے سلطنت ندید، اما و فرزندان او از سرکار بادشاہی ملوفہ می رسید تا آن کہ بعد فرخندہ حضرت نور الدین جہانگیر بادشاہ ولد اکبر بادشاہ در سنہ ثلث و ثلثین والف ۱۰۳۳ در دار الخلافہ آگرہ باجل موعود درگذشت (تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۲۹۱)

فرشتہ کا سب سے مشہور کارنامہ اس کی تاریخ ہے جس کے باعث اس نے دنیائے تاریخ میں غیر فانی شہرت حاصل کی ہے۔

تاریخ فرشتہ ہندوستان کی عام تاریخ ہے۔ جس میں قدیم زمانہ سے سنہ ۱۰۱۵ھ تک مسلسل واقعات ہیں ضمناً سنہ ۱۰۱۶ھ سنہ ۱۰۲۳ھ اور سنہ ۱۰۳۳ھ کے بعض اذکار کا کہیں کہیں تذکرہ ہے۔[۲]

---

[۱] تاریخ فرشتہ کے مطبوعہ نسخے (طبع نولکشور لکھنؤ سنہ ... جلد دوم صفحہ ۲۹۰) میں فرشتہ کے قیام برہانپور کا سنہ ثلث عشرین والف (یعنی سنہ ۱۰۲۳ھ) ہے۔ لیکن حقیقت میں اسے سنہ ۱۰۱۲ھ ثلث عشر والف ہونا چاہیے تھا۔ شہزادہ دانیال نے کثرت شراب خواری کے باعث یکم ذی الحجہ سنہ ۱۰۱۳ھ مطابق سنہ ۱۶۰۵ء کو بعمر (۳۳) سال برہانپور میں انتقال کیا۔ (سوانح چاند بی بی صفحہ ۶۰)

[۲] اخیر کے حالات کے اختصار کی وجہ یہ ہے کہ اکبر کے ایام سے دکن پر مغلیہ فوج ہو گئے تھے اور سنہ ۱۰۰۹ھ میں احمد نگر و برہانپور فتح ہو چکا تھا۔ مزید براں بیجاپور اور گولکنڈے کو بھی تسخیر کرنے کی کوشش جاری تھی یہی اسباب تھے جس نے

مثال کے طور پر دو مقامات پیش کئے جاتے ہیں:-

"و زمان تحریر این حکایت کہ سنہ ثلاث و عشرین والف باشد ہنوز آں عمارت و مسجد و چار طاق بازار بزرگ باقیست (یہ بیان مدرسہ محمودیہ بیدر کے متعلق ہے۔ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۰)

"بہادر خان ...... (والی برہانپور) بعہد فرخندہ حضرت نور الدین جہانگیر پادشاہ ولد اکبر بادشاہ در سنہ ست و ثلثین والف در دار الخلافہ آگرہ باجل موعود درگذشت۔ (تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۲۹۱)

تاریخ فرشتہ ہندوستان کی تاریخوں میں خاص اہمیت رکھتی ہے، اور موضوع و نوعیت کے اعتبار سے اپنے طرز کی واحد تصنیف ہے۔ اس کی تالیف کے بعد جس قدر کتابیں ہندوستان پر لکھی گئی ہیں بالعموم ان تمام کا یہی ماخذ ہے۔ یہ سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی کے ایما سے لکھی گئی ہے۔ اسکی تصنیف کی ابتدا ۱۰۰۰ھ سے شروع ہوتی ہے اور تاریخ اختتام ۱۰۱۵ھ ہے۔ فرشتہ کو اس کی تالیف کا شوق اس طرح پیدا ہوا کہ ایک دن بادشاہ نے فرشتہ سے تاریخ روضۃ الصفا کی بڑی تعریف کی۔ اور فرمایا کہ اس انداز میں ہندوستان کی ایک مستند اور جامع تاریخ لکھی جانی چاہیئے جس میں سلاطین ہند کے حالات ہوں۔ فرشتہ کو ایسی باتوں سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کو جب بادشاہ کے ذوق علم کا پتہ چلا تو اس کام کے انجام دینے کے لئے ہمہ تن تیار ہوگیا، اور عشرہ کے اندر سلطان کے حالات لکھکر گذرانے۔ بادشاہ نے اس کو بیحد پسند کیا اور اپنی سرپرستی میں تصنیف کرنے کی اجازت عطا کی۔ فرشتہ نے جب تاریخ مکمل کرلی تو اس کا نام ابراہیم عادل شاہ کے نام پر گلشن ابراہیمی، رکھا لیکن یہ نام عام طور پر مقبول عام نہیں ہوا اور یہ کتاب تاریخ فرشتہ ہی کے نام سے مشہور ہوگئی۔

فرشتہ نے اس کی ترتیب میں تاریخ کی ۳۲ مستند کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ جن میں بعض اس وقت تک نایاب ہیں۔ عام واقفیت کے لئے ذیل میں اس کے ماخذات کی فہرست درج کی جاتی ہے:

۱۔ تاریخ یمینی عتبی	۲۔ زین الاخبار
۳۔ تاج المآثر حسن نظامی	۴۔ طبقات ناصری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۳) دکن کو بہت کم چین نصیب ہوا، اور مغلوں کے غیر معمولی اقتدار سے دکن کی بادشاہیاں ان سے بدظن تھیں۔ جب یہ مغلوں کی مدافعت کے لئے منعطف ہوئے تو ان کی تمام علمی دلچسپیاں سلب ہوگئیں، اور غالباً انہی مشکلات کو پیش نظر رکھکر فرشتہ نے بھی سلسلۂ تصنیف کو ترک کردیا کیونکہ اسکی تاریخ نویسی کا سب سے بڑا سبب سلاطین کا علمی ذوق تھا۔ البتہ بعض باتیں جو ضروری تھیں وہ وقوع کے لحاظ سے بعد میں وقتاً فوقتاً اضافہ کردی ...

۵۔ ملحقات شیخ عین الدین بیجاپوری
۶۔ تاریخ فیروز شاہی
۷۔ فتوحات فیروز شاہی
۸۔ واقعات بابری
۹۔ واقعات ہمایونی
۱۰۔ تاریخ بناکتی
۱۱۔ مبارک شاہی
۱۲۔ بہمن نامہ شیخ آذری منظوم
۱۳۔ سراج التواریخ بہمنی ملا محمد لاری
۱۴۔ تحفۃ السلاطین ملا داؤد بیدری
۱۵۔ تاریخ الفی ملا احمد تتوی
۱۶۔ روضۃ الصفا میر خوند محمد خاوند شاہ
۱۷۔ حبیب السیر غیاث الدین خوندمیر
۱۸۔ تاریخ حاجی محمد قندھاری
۱۹۔ طبقات محمود شاہی گجراتی
۲۰۔ کتاب المآثر محمود شاہی گجراتی
۲۱۔ تاریخ بہادر شاہی گجرات
۲۲۔ تاریخ مظفر شاہی گجرات
۲۳۔ تاریخ محمود شاہی بزرگ مندوی
۲۴۔ تاریخ محمود شاہی خورد مندوی
۲۵۔ طبقات اکبری نظام الدین احمد
۲۶۔ تاریخ بنگالہ
۲۷۔ تاریخ سندھ میر محمد معصوم بھکری نامی
۲۸۔ تاریخ کشمیر
۲۹۔ فوائد الفواد
۳۰۔ خیر المجالس
۳۱۔ خیر العارفین
۳۲۔ قطبی

اس کے ابواب اور مضامین کی فہرست حسب ذیل ہے۔

کتاب میں ایک مقدمہ بارہ مقالے اور ایک خاتمہ ہے۔

مقدمہ۔ ذکر راجگان ہنود و کیفیت ظہور اسلام در ہندوستان۔

مقالہ اول۔ ذکر سلاطین لاہور

مقالہ دوم۔ ذکر سلاطین دہلی (شہاب الدین غوری سے شہنشاہ اکبر کی وفات تک)

مقالہ سوم۔ ذکر شاہان دکن۔

روضہ اول۔ ذکر سلاطین بہمنیہ

روضہ دوم۔ ذکر سلاطین بیجاپور ملقب بہ عادل شاہ

روضہ سوم۔ ذکر سلاطین احمد نگر ملقب بہ نظام شاہ

روضہ چہارم۔ ذکر سلاطین تلنگانہ ملقب بہ قطب شاہ

روضہ پنجم۔ ذکر سلاطین برار ملقب بہ عماد شاہ۔

روضہ ششم - ذکر شاہان بیدر ملقب بہ بریدشاہ

مقالۂ چہارم - ذکر شاہان گجرات

مقالۂ پنجم - ذکر شاہان مالوہ

مقالۂ ششم - ذکر سلاطین خاندیس

مقالۂ ہفتم (۱) ذکر سلاطین بنگالہ

(۲) ذکر سلاطین جونپور

مقالۂ ہشتم - ذکر سلاطین ملتان

مقالۂ نہم - ذکر سلاطین سندھ

مقالۂ دہم - ذکر سلاطین کشمیر

مقالۂ یازدہم ذکر حکام ملیبار و کیفیت پرتگیزان ہندوستان

مقالۂ دوازدہم - ذکر مشائخین ہندوستان

خاتمہ - کیفیت ہندوستان۔

تاریخ فرشتہ متعدد دفعہ چھپ چکی ہے اور اس کے ترجمے کئی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے بمبئی کے گورنر اور تاریخ ہند کے مشہور عالم لارڈ الفنسٹن نے اسے بڑے اہتمام کے ساتھ ۱۸۳۲ء میں بمقام بمبئی دو جلدوں میں چھپوایا۔ اس کے بعد لکھنؤ کے معروف مطبع "نولکشور" نے اس کے تین ایڈیشن شائع کئے جو ۱۸۶۴ء، ۱۸۶۵ء و ۱۸۸۴ء میں چھپے ہیں۔

اس کے انگریزی میں بھی متعدد ترجمے ہوئے، اسکندر ڈو نے مقالہ اول کا ترجمہ کیا جس میں دہلی اور لاہور کا تذکرہ ہے۔ یہ حصہ تاریخ ہندوستان کے نام سے ۱۸۶۸ء میں بمقام لندن دو جلدوں میں چھپا ہے۔ میجر اسکاٹ نے بھی اس کے مقالۂ سوم کا ترجمہ کیا جو دکن سے متعلق ہے۔ یہ دو حصوں میں تاریخ دکن کے نام سے ۱۸۰۶ء میں شائع ہوا ہے۔

مقالہ یازدہم (متعلق حکامان ملیبار) کا انڈرسن نے ترجمہ کیا اور اسے کلکتہ کے رسالہ ایشیاٹک مسیلنی میں (۱۷۹۹ء میں) اکاؤنٹ آف ملیبار کے نام سے شائع کرایا۔

جیمس برگس نے کامل تاریخ کا ترجمہ کیا جو چار جلدوں میں بمقام لندن ۱۸۲۹ء میں چھپا ہے اور یہی دوبارہ ۱۹۱۰ء میں کلکتہ میں چھاپا گیا ہے۔

اردو زبان میں بھی اس کے کئی ترجمے ہوئے۔ منشی نولکشور نے ۱۳۰۹ھ میں کامل کتاب کا ترجمہ

دو جلدوں میں شائع کیا۔ اس کے بعد مولوی محمد علی بجنوری کا ترجمہ عام طور پر مشہور رہتے ہیں جو پنجاب کے سررشتۂ تعلیم کی فرمائش سے ۱۰ ہزار کے تین مقالوں کا کیا گیا تھا۔ یہ دو جلدوں میں طبع ہوا ہے۔ اس کی پہلی جلد جو سلاطین لاہور و دہلی سے متعلق ہے تحفۃ الملوک کے نام سے معروف ہے۔ دوسری جلد جو سلاطین ہندیہ کے حالات میں ہے وہ سلطان التواریخ کہلاتی ہے۔ یہ دونوں جلدیں بجنور میں طبع ہوئی ہیں۔

ان کے علاوہ حال میں جامعہ عثمانیہ کی جانب سے ایک مستند ترجمہ ہو رہا ہے، جو ابھی تک ختم نہیں ہوا مگر اب تک اس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں جو اکبر کی وفات تک ہیں۔ اس کے مترجم فدا علی صاحب ہیں۔ فرشتہ نے تاریخ کے علاوہ علم طب میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام دستور الاطبا ہے، اس میں ہندوؤں کے طریق علاج اور ہندی ادویہ کے افعال و خواص بیان کئے ہیں۔ یہ ۱۹۱۱ء میں امرتسر میں چھپی ہے۔

مغربی مورخین نے فرشتہ کی نسبت بڑی بڑی قدر دانیاں کی ہیں۔ پروفیسر لیتھبرج نے تاریخ ہندوستان میں اس کو احمد نگر کا باشندہ بتلایا ہے اور تاریخ فرشتہ کے متعلق سنین بھی غلط درج کر دیئے ہیں[۵]۔

تاریخ فرشتہ میں اکثر جگہ اعلام و سنین کی خامیاں رہ گئی ہیں جن میں بعض اس موقعہ پر صحت کی خاطر پیش کی جاتی ہیں:-

۱۔ سنہ ۳۵۲ھ میں جب الپتگین نے انتقال کیا تو اس کا بیٹا ابو اسحاق سبکتگین کے ساتھ بخارا گیا۔ لیکن امیر منصور نے ظاہر الطور پر غزنی کی حکومت ابو اسحاق کو دی مگر ملک کا سارا انتظام سبکتگین کے تفویض کیا اس کی تھوڑی ہی مدت بعد اسحاق نے انتقال کیا اور امرا نے سبکتگین کو اس کی جگہ بادشاہ بنا دیا۔ یہ ۳۶۷ھ میں غزنین کا مستقل فرمانروا ہو گیا۔ اور الپتگین کی دختر بھی اس سے منسوب کر دی گئی۔ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۰۔

یہ واقعات تاریخی اعتبار سے غلط ہیں۔ الپتگین کی رحلت کے بعد اس کا بیٹا ابو اسحاق (نا درست ہے) اسحاق تخت نشین ہوا، اس نے تقریباً چار سال حکومت کی اور ۳۵۵ھ میں انتقال کیا اس کی جگہ امیر بلکاتگین بادشاہ ہوا۔ ۳۶۲ھ میں جب یہ مر گیا تو غزنین کا تخت امیر پیری کے سپرد کیا گیا۔ یہ بہت غدار اور ظالم سلطان تھا، اس کو ترک امیروں نے سلطنت سے (بعض روایات کے اعتبار سے ۳۶۶ھ یا ۳۶۷ھ میں) علیحدہ کر دیا اور سبکتگین اس کا جانشین بنایا گیا۔ منہاج السراج نے سبکتگین کی تخت نشینی کی تاریخ ۲۷ شعبان ۳۶۷ھ بتائی ہے لیکن عام متداول تاریخوں میں ۳۶۶ھ تحریر ہے۔ طبقات ناصری ریورٹی صفحہ ۷۲، ۷۳۔ طبقات ناصری

---

[۵] تاریخ ہندوستان از لیتھبرج اردو ترجمہ صفحہ ۲۵۱

مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ صفحہ ۔۔

۲۔ یہ بات تاریخی حیثیت سے صحیح ہے کہ محمود نے انتقال سے دو دن قبل اپنا تمام مال و اسباب اور زر و جواہر جو اس کی زندگی کا سرمایہ تھا خزانہ سے منگوا کر محل میں جمع کیا جس سے اس کا محل گلزار ارم بنا ہوا تھا۔ محمود اس کو دیکھ کر زار و قطار روتا تھا۔ اس کے بعد جواہرات کو اس نے خزانہ میں واپس کر دیا۔ اس میں سے کسی کو ایک حبہ نہیں دیا۔ اس پر لوگ اسے بخیل کہتے ہیں۔ اس کے دوسرے دن پالکی میں بیٹھ کر ایک میدان میں گیا جہاں اس نے اونٹ گھوڑے اور ہاتھیوں کا معائنہ کیا کچھ دیر تک حسرت سے ان کو دیکھتا رہا اس کے بعد چلا چلا کر رونے لگا۔۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔

طبقات ناصری کے مصنف نے لکھا ہے کہ یہ علما و محدثین کی مجلس میں بیٹھ کر بیحد مسرور ہوتا تھا اور قیامت کے متعلق بھی اس کو کچھ شکوک تھے۔ اس کے علاوہ اپنے نسب میں بھی کچھ شبہ کرتا تھا۔ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۶

محمود کا یہ واقعہ ایک فسانہ کی حیثیت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہے اس کو محمود کے کسی ہمعصر مورخ نے بھی نہیں لکھا ہے۔ اور فرشتہ نے بھی اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ خواجہ نظام الدین احمد نے طبقات اکبری (صفحہ   ) میں اس کا سرسری طریقے پر ذکر کیا ہے اسی کی بنیاد پر فرشتہ نے یہ حاشیہ آرائی کی ہے۔

طبقات ناصری کے حوالے سے محمود کے نسب کے متعلق جو بیان لکھا گیا ہے وہ طبقات ناصری میں کسی جگہ نہیں ہے۔ اس کے ماسوا سلطان کی ہمعصر اور مابعد کی تاریخیں بھی اس سے ساکت ہیں۔

۳۔ عبدالمجید احمد بن عبدالصمد وزیر (ابراہیم بن سلطان مسعود غزنوی) کی مدح میں ابو الفرج کا قصیدہ مشہور ہے جس کا مطلع ہے:۔

ترتیب فضل و قاعدۂ جود و رسم   داد   عبدالمجید احمد عبدالصمد نہاد

ابوالفرج سلطان کا ہمعصر تھا۔ اس کو بعض مورخین سیستانی اور بعض غزنوی خیال کرتے ہیں۔ مشہور شاعر عنصری کا استاد تھا۔ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۴۰

ابوالفرج کو عنصری سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کا وطن لاہور تھا، اوحدالدین انوری اسی کا متبع تھا۔

۴۔ جس دن شہاب الدین نے برہیک میں قیام کیا۔ اس کے دوسرے روز بیس گکھڑ جو اپنے عزیزوں کے قتل اور اُن کی خانہ بدوشی کے باعث اس سے بدظن ہوگئے تھے بادشاہ کے قتل کے لئے تیار ہوگئے

اور کسی طریقہ سے شاہی خیمہ تک پہونچ گئے۔ اس وقت فراش بادشاہی سراپردہ اتار رہا تھا، اُس کو شاہی آدمی جانکر زخمی کردیا۔ یہ واقعہ شعبان کی تیسری شب کا ہے۔ اس کے بعد محل میں داخل ہوئے۔ بادشاہ سونے کے لیے تیار ہو رہا تھا اُس کو چھُروں سے جسم پر بائیس کہرے زخم پہنچے جن کے صدمہ سے اُس کا انتقال ہوگیا۔ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۶۰

شہاب الدین غوری کو گکھڑوں نے شہید نہیں کیا بلکہ فرقۂ باطنی یا قرامطہ کے کسی فدائی نے قتل کردیا۔ اس بیان کی توثیق حسن نظامی کی کتاب "تاج المآثر" اور طبقات ناصری کے تحریرات سے ہوتی ہے۔ فرشتہ نے یہ واقعہ تاریخ الفی مرتبہ ملا احمد تتوی سے نقل کیا ہے۔ لیکن تاج المآثر اور طبقات ناصری کے سامنے یہ بیان کوئی خاص وقعت نہیں رکھتا ہے۔

۵- چاندی کے سکہ کو تنگہ نقری کہتے تھے۔ ایک تنگہ نقرہ کی قیمت پچاس جیتل یا اس کے مساوی تھی۔ جیتل کا وزن صحیح طور پر معلوم نہیں، بعض اس کو ایک تولہ کے برابر کہتے ہیں جس کا بیان ہے کہ موجودہ پیسہ کی طرح جیتل کا وزن پونے دو تولہ تھا تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۱۲۔

ایک تنگہ نقری کے چالیس جیتل ہوا کرتے تھے۔

۶- آخر علاؤالدین سنہ ۶۹۶ھ میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا اور تخت پر جلوس کیا تاریخ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۱۰۱

علاؤالدین سنہ ۶۹۵ھ میں دہلی میں داخل ہوا اور ۲۲۔ ذالحجہ کو تخت پر بیٹھا۔

۷- انہیں واقعات کے دوران میں قلعہ چتوڑ کے حاکم راجہ رتن سین نے جو ایک زمانہ سے قید تھا غیر معمولی طریقے سے نجات حاصل کی۔ اس راجہ کے آزاد ہونے کی داستان یہ ہے کہ راجہ کے قید ہونے کے ایک مدت بعد بادشاہ نے سنا کہ راجہ کی رانیوں میں ایک عورت ہے جو حسن و صورت قد و قامت غرض ہر اعتبار سے مرغوب اور تمام صفات محبوبی سے متصف ہے۔ بادشاہ نے رتن سین کو یہ پیام دیا کہ اگر تو رہائی چاہتا ہے تو پدمنی کو میرے حضور میں پیش کر۔ راجہ نے بادشاہ کی یہ شرط قبول کی اور چند آدمیوں کو اہل و عیال کے لانے کے لئے روانہ کیا۔ راجہ کے اعزا و اقربا یہ بات سنکر بہت ہی رنجیدہ ہوئے۔ اس لڑکی نے جب راجہ کا ارادہ اور اپنے عزیزوں کا خیال معلوم کیا تو اپنے لوگوں کو ایک ایسی تدبیر بتائی جس سے اس کی عصمت اور راجہ کی عزت بچ سکتی تھی۔ وہ یہ کہ راجپوت سورماؤں کی ایک کثیر جماعت پالکیوں میں مسلح بیٹھکر سوار اور پیادوں کے ہمراہ دہلی روانہ ہو۔ ایک پہر رات گذرنے پر یہ جماعت شہر میں داخل ہو اور یہ بات مشہور کی جائے کہ پدمنی بادشاہ کے حکم سے مع متعلقہ

کے آئی ہے۔ پالکیاں قید خانے کے قریب پہنچیں اور سرکش دربانوں کو قتل کر کے راجہ کو چھڑا لیں اور اُنہیں برق رفتار گھوڑے پر سوار کر کے بھیج دیں۔ غرض کہ اسی طرح کیا گیا لیکن راستہ میں بادشاہ کے آدمیوں سے لڑائیاں ہوئیں مگر راجہ اس کی حسن تدبیر سے علائی پنجہ سے نکل گیا۔

تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۱۵

فرشتہ کا یہ بیان سہو پر مبنی ہے اور تاریخی حیثیت سے اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اس فسانہ کا کسی معاصر مورخ نے بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ فرشتہ نے اس کو کس تاریخ سے اخذ کیا اس کا حوالہ بھی نہیں ہے۔

۱۰ ہندوستان کے تمام مورخین نے خاندان تغلق کے نسب کی نسبت التفات نہیں کیا ہے۔ جس کے باعث ان کے حالات ورطۂ گمنامی میں رہ گئے ہیں۔ ان اوراق کا مؤلف محمد قاسم فرشتہ جب سلطان عصر ابراہیم عادل شاہ کی جانب سے شہنشاہ جہانگیر کے اوائل عہد میں لاہور گیا تو وہاں بعض بزرگوں سے ملاقات ہوئی جنھیں تاریخ ہند سے دلچسپی تھی میں نے ان سے خاندان تغلق کے نسب کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کتب تواریخ میں اس کا ذکر نہ ہونے کا افسوس کیا۔ یہاں اس کے متعلق جو روایت مشہور ہے وہ یہ کہ شاہ غیاث الدین کا باپ ملک تغلق سلطان غیاث الدین بلبن کا ترکی غلام تھا۔ ملک تغلق نے اہل جٹ کے ساتھ رشتہ بندی قائم کی اور اس خاندان کی ایک لڑکی سے بیاہ کیا۔ اس سے سلطان غیاث الدین تغلق پیدا ہوا۔ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۳۰۔

فرشتہ کا بیان غلط ہے۔ ملک تغلق سلطان علاء الدین کے عہد میں بخارا سے ہندوستان آیا اور اس کے بھائی الغ خاں کی فوج میں ملازم ہوا۔ اور ادنیٰ خدمت سے ترقی پا کر بادشاہ بن گیا ضیاء الدین برنی نے اس کے حسب و نسب کے متعلق سکوت اختیار کیا ہے۔ غالباً اسکی وجہ یہ ہے کہ غیاث الدین تغلق ایک معمولی درجہ سے اتنے بڑے رتبہ تک پہنچا تھا۔ اسی کا فرزند محمد تغلق تھا۔ ملک تغلق کے دو بھائی ابوبکر اور رجب تھے جو اس کے ساتھ آئے تھے۔ رجب کی شادی رانا مل کی دختر سے ہوئی اور اُسی کے بطن سے فیروز شاہ تغلق پیدا ہوا۔ منشی سوجان رائے بٹالوی نے خلاصۃ التواریخ میں فرشتہ کا اتباع کیا ہے۔ انگریز مورخ اسمتھ اور الفنسٹن بھی یہی لکھتے آئے ہیں۔ منہاج السراج نے طبقات ناصری میں اس کی تصریح کر دی ہے کہ رجب کی شادی رانا مل بھٹی کی بیٹی سے ہوئی تھی تفصیل کے لیے سر جان ایلیٹ کی انڈین ہسٹری دیکھئے۔ سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم صفحہ ۸۵

تاریخ فیروز شاہی سراج عفیف صفحہ ۴۳۔ تاریخ فیروز شاہی ضیا برنی صفحہ ۵۲۱۔ طبقات اکبری صفحہ ۲۱۱۔ خلاصۃ التواریخ صفحہ ۳۳۶۔ تاریخ ہند ذکاء اللہ جلد دوم صفحہ ۱۶۱۔ الیٹ جلد سوم صفحہ ۴۰۶

۹۔ سترہویں ربیع الاول ۹۷۷ھ کو بیہارشنبہ کے دن صبح کو جب کہ آفتاب برج میزان کے درجہ میں تھا۔ شہزادہ سلیم حضرت شیخ کے مکان قصبہ سیکری میں پیدا ہوا۔ خاقان اکبر نے اس عطیہ الٰہی کے شکرانہ میں تمام ممالک محروسہ کے قیدیوں کو آزاد کیا۔ خواجہ حسن ثنائی نے تہنیت میں ایک قصیدہ نظم کیا جس کے اشعار کے پہلے مصرعہ سے جلوس اکبری اور دوسرے مصرعوں سے شاہزادہ سلیم کا سن ولادت برآمد ہوتا تھا۔ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۵۸۔

اس قصیدے کا مصنف خواجہ حسین مروی تھا۔ ثنائی لکھنا صریحاً غلطی ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے قصیدے کے اکتیس شعر نقل کئے ہیں۔ معتمد خاں نے اقبالنامہ جہانگیری میں بھی اسکا ذکر کیا ہے۔ اکبر نے اس کے صلہ میں خواجہ کو دو لاکھ تنگہ عطا فرمائے تھے۔ منتخب التواریخ صفحہ ۱۰۲۔ اقبال نامۂ جہانگیری صفحہ ۲۴۷۔ دیباچہ تزک جہانگیری صفحہ ۴۔

۱۰۔ سلطان قلی ترکان بہارلو سے تھا جو میر علی شکر کی قوم سے تھے، بعض اس کے نسب کو دودمان سے ملاتے ہیں اور سلطان قلی کو جہان شاہ مقتول کے نواسوں سے خیال کرتے ہیں لیکن پہلی روایت صحیح اور قرین صحت معلوم ہوتی ہے۔ تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۱۶۷۔

سلطان قلی کا تعلق قراقوینلو خاندان سے تھا، جن کے اجداد تیمور کے خروج سے مدت پہلے آرمینیہ میں حکومت کرتے تھے۔ ترکی زبان میں "قرا" سیاہ کو کہتے ہیں اور "قوینلو" مینڈھے کے واسطے استعمال ہوتا ہے۔ ان کے پرچموں پر سیاہ مینڈھے کے نشانات ہوتے تھے۔ اس لئے یہ "قراقوینلو" کے نام سے مشہور ہوئے۔ سلطان قلی کا جدامجد امیر قرا یوسف تھا جس نے ۸۲۳ھ میں انتقال کیا۔ اس کا بیٹا میرزا اسکندر تھا اس نے کم و بیش اٹھارہ سال حکومت کی جس کے بعد اس کا بھائی جہان شاہ، شاہ رخ بن تیمور کی مدد سے تخت نشین ہوا۔

سلطان محمد قطب شاہ نے کنز اللغات کے ایک مخطوطہ پر اپنے دست خاص سے سلاطین قطب شاہیہ کا نسب نامہ اس طرح تحریر کیا ہے۔ "سلطان قلی قطب الملک بن اویس قلی بن پیر قلی بن الوند بیگ بن مرزا اسکندر بن قرا محمد ترکمان" ان کے تفصیلی حالات کے لئے رسالہ "تاریخ" حیدرآباد۔ جلد ۲ نمبر ۲ دیکھئے۔

۱۱۔ سلطنت بہمنیہ جب حد سے زیادہ کمزور ہوئی اور سلطان محمود شاہ بہمنی کا اقتدار گھٹ گیا، تو

سلطان قلی نے سنہ ۹۱۸ھ میں خود مختاری اختیار کی اور قطب شاہ نام رکھا۔ تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۱۶۸

سلطان قلی سنہ ۹۲۴ھ تک خود مختار نہیں ہوا تھا، اور شاہ کا لقب بھی اختیار نہیں کیا تھا۔ سنہ ۹۲۴ھ میں جب سلطان محمود شاہ بہمنی نے انتقال کیا تو اس وقت آزادی حاصل کی۔ دیکھو ہمارا مضمون سلطان قلی مطبوعہ رسالہ عالمگیر سنہ ۱۹۲۹ء۔

۱۲۔ بعہد سلطان محمد شاہ خواجہ جہان گاوان کی سفارش پر اسے عماد الملک کا خطاب ملا اور برار کا سپہ سالار بنایا گیا۔ سنہ ۸۹۰ھ میں خود مختار ہو کر خطبہ و سکہ اپنے نام کا جاری کیا۔ تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۳۴۰۔

یہ واقعہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ محمود گاوان سنہ ۸۸۶ھ میں قتل کیا گیا تھا، اس وقت کسی حاکم یا سپہ سالار نے خود سری اختیار نہیں کی تھی۔ یہ سنہ ۸۹۱ھ میں خود مختار ہوا مگر اس وقت بھی یہ بادشاہ کے زیر اثر تھا۔

۱۳۔ راجہ علیخاں فاروقی جب تخت نشین ہوا تو اس وقت اکبر بنگالہ، سندھ، مالوہ، گجرات پر متصرف ہو چکا تھا۔ اس کی وجہ سے راجہ علیخاں نے اپنے نام کے ساتھ لفظ شاہی کبھی استعمال نہیں کیا۔
تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۲۸۸

فرشتہ کو اس بارے میں سہو ہو گیا ہے۔ راجہ علیخاں اپنے کو ہمیشہ شاہ لکھا کرتا تھا۔ چنانچہ جامع مسجد پر جو کتبہ کندہ ہے اس میں "شاہ" صاف طور پر کندہ ہے۔ تاریخ برہانپور صفحہ

۱۴۔ الغرض یہ مستحکم قلعہ بڑی آسانی کے ساتھ شہنشاہ اکبر کے قبضہ میں آگیا گویا سنہ ۱۰۰۸ھ میں سلطنت فاروقیہ یہاں سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی، اور اکبر نے بہادر شاہ فاروقی کو قید کر کے لاہور بھیجدیا۔ تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۲۹۱۔

برہانپور اکبر نے ۵۔ رمضان سنہ ۱۰۰۹ھ کو فتح کیا ہے۔ اس واقعہ کے متعلق میر محمد معصوم نامی کا ایک کتبہ یہاں کی جامع مسجد پر کندہ ہے، جس سے اس بیان کی توثیق ہوتی ہے۔ میر محمد معصوم عہد اکبری کا مشہور مورخ اور کتبہ نویس گذرا ہے۔ اس کے لئے دیکھو مولوی حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری کا مضمون سید معصوم بھکری مطبوعہ رسالہ تاریخ جلد ۱ نمبر ۱۔

---

۱۵ تاریخ فرشتہ جلد دوم کے اغلاط کی ہم نے جو تصحیح کی ہے، وہ صرف قطب شاہی، عماد شاہی اور شاہان برار پر مشتمل ہے۔ انشاء اللہ کسی اور اشاعت میں سلاطین بہمنیہ، شاہان احمد نگر، بیجاپور، گجرات، مالوہ، بنگالہ، جونپور، ملتان، سندھ، کشمیر، ملیبار وغیرہ سے بحث کی جائے گی۔ یہ نوٹ محض ایک سرسری مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

تعلیقات

غلام علی ہندوشاہ فرشتہ کے والد غلام علی ہندوشاہ شاعر بھی تھے فرشتہ نے ان کے چند شعر اپنی تاریخ میں نقل کئے ہیں۔ سنہ ۹۶۱ھ میں ہندوستان کے تین اولوالعزم سلاطین محمود شاہ گجراتی، برہان نظام شاہ بحری، سلیم شاہ سوری نے ایک سال میں انتقال کیا تو غلام علی نے ان کی تاریخ وفات "زوال خسرواں" سے نکالی اور حسب ذیل شعر تصنیف کئے۔

سہ خسرو را زوال آمد بیک بار   کہ ہند از عدل شاں دار الاماں بود
یکے محمود شاہنشاہ گجرات   کہ ہم چوں دولت خود نوجواں بود
دوم اسلیم شاہ سلطان دہلی   کہ در ہندوستاں صاحبقراں بود
سوم آں نظام آں شاہ بحری   کہ در ملک دکن خسرو نشاں بود
زمن تاریخ فوت ایں ہر سہ خسرو   چو مے پرسی زوال خسرواں بود

لیکن ان میں کے دو شعر نعمت اللہ رشوتی کے کہے ہوئے ہیں "زوال خسرواں" مادۂ تاریخ بھی اسی کی تصنیف ہے۔ فرشتہ کے والد کو اس میں توارد ہوگیا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی رشوتی کے ان اشعار کو منتخب التواریخ میں نقل کیا ہے۔ منتخب التواریخ صفحہ ۴۳۱ جلد اول۔

سہ خسرو را زوال آمد بیک بار   کہ ہند از عدل شاں دار الاماں بود

ملا احمد تتوی عہد اکبری کے مشہور مورخ ہیں۔ انھوں نے بادشاہ کے حکم سے "تاریخ الفی" کی دو جلدیں لکھی ہیں۔ یہ کتاب حضور اکرم کی رحلت کے چھتیسویں سال شروع ہوئی اور چنگیز خاں کے عہد تک ہے۔ منتخب التواریخ میں ان کے تعصب اور شعیت کے اکثر حالات ملتے ہیں۔ خاصکر عبدالقادر بدایونی نے ان کے اخلاق اور مذہب پر اس قدر اعتراض کئے ہیں کہ اس سے زیادہ لکھنے کی قلم میں طاقت نہ تھی۔

مرزا فولاد کو ان سے سخت دشمنی تھی۔ ایک روز شب میں یہ ملا صاحب کے مکان پر گیا اور بادشاہ کی جانب سے انھیں بلایا۔ ملا صاحب خالی الذہن تھے یہ اس کے ساتھ ہوگئے۔ لاہور کی کسی گلی میں ان کا خنجر سے کام تمام کردیا۔ سنہ ۹۹۶ھ ان کی تاریخ انتقال ہے۔ منتخب التواریخ صفحہ ۲۴۴-۳۳۰۔ مآثر الامرا جلد سوم صفحہ ۳۶۰۔

دلاور خاں بیجاپور کا مشہور وزیر اعظم گزرا ہے، اس نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ دکن کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ تدبر اور علمی حیثیت سے دکن کا "نظام الملک طوسی" ہے سنہ ۹۹۱ھ میں جب یہ عہدہ

سے معزول کر دیا گیا تو یہاں سے احمد نگر جا کر برہان نظام شاہ ثانی کا متوسل ہو گیا۔ برہان نے اس کی بڑی عزت کی اور اسے اپنے امرا میں داخل کر لیا۔ دلاور خان کے احمد نگر آنے کے بعد برہان کو بڑی بڑی فتوحات حاصل ہوئیں اور اس کی سعی کے باعث بیجاپور کی سلطنت کو بہت نقصان پہونچا۔ اس وقت دلاور خان نے ابراہیم عادل شاہ سے پھر بیجاپور آنے کی خواہش کی، ابراہیم کو چونکہ اس کی وجہ سے شکستیں ہوئی تھیں اس نے اسے بخوشی آنے کا حکم دیا۔ دلاور خاں بادشاہ کے فرمان پر بیجاپور آ گیا۔ ابراہیم نے اسے گرفتار کر کے اندھا کر دیا اور قلعہ ستارہ میں بھیج دیا جہاں اس نے بحالت قید سنہ ۱۰۱۲ھ میں وفات پائی۔

یہ بہت ذی علم آدمی تھا، صواعق محرقہ کا اس نے فارسی زبان میں ترجمہ کرایا تھا، غرض کہ اس سے بیجاپور اہل کمال کا مرکز و مرجع بنا ہوا تھا۔ تاریخ دکن حصہ دوم صفحہ ۲۰۲۔

شاہنواز خاں ابراہیم عادل شاہ کا وزیر تھا اس کا نام خواجہ ... الدین تھا۔ شاہ ... کو جب سلطان علی عادل شاہ نے شیراز سے طلب کیا وہ بھی اس کے ساتھ آیا۔ اس کے بعد اپنے وطن کو واپس چلا گیا اور بعد میں فرائض حج کربلائے معلیٰ و نجف ... سعادت حاصل کی۔ سنہ ۹۹۶ھ میں ملا شکیبی شاعر اور خواجہ عنایت اللہ شیرازی ... سے سوار ہو کر بندر چیول پر اترا اور سنہ ۹۹۰ھ میں دلاور خاں کی سرکار میں باریاب ہو ... سے بادشاہ تک پہونچایا۔ بادشاہ نے عنایت خاں اور سعید خاں کا خطاب دیا ... میں برہان نظام شاہ کے پاس تصفیہ کے لئے گیا اور جب سنہ ۱۰۰۲ھ میں اسمٰعیل ... بغاوت کا ... آیا تو محمد قلی قطب شاہ کے پاس بادشاہ کی جانب سے اس غرض سے گیا کہ ... بیجاپور کو مدد دیں۔

سنہ ۱۰۱۱ھ میں اس کے یہاں لڑکا پیدا ہوا جس کی تہنیت میں ... اس میں بادشاہ خود بھی آیا۔ اس نے دروازے سے بادشاہ کی ویوڑھی تک ... تھا جو زر بفت و اطلس مصری وغیرہ سے پٹا ہوا تھا اور بازار میں ... کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ یہ فرشتہ کا بہت بڑا مربی و سرپرست تھا ... لکھتے ہیں۔ تاریخ فرشتہ جلد دوم تاریخ دکن صفحہ ...

ابراہیم عادل شاہ ثانی بیجاپور کا چھٹا فرمانروا تھا یہ اپنے چچا سلطان ... سنہ ۹۸۶ھ میں تخت نشین ہوا، یہ ایک بیدار مغز سلطان ... عالم و فاضل بادشاہ تھا۔ علما، شعرا، مصنفین کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اس کے دربار میں بڑے ...

جمع تھے جن میں ملا نورالدین ظہوری، ملا ملک قمی، حکیم محمد قاسم فرشتہ، عبدالرشید بالبستگی، رفیع الدین [illegible] شیخ علم اللہ محدث خاص طور پر مشہور ہیں۔ ظہوری اسی کے خانوادے کا ایک ایسا طرز نویس تھا جس کی نثر ساری دنیا میں مشہور ہے۔

[illegible] شاہ کو تصنیف و تالیف کا غیر معمولی ذوق تھا [illegible] جگت گرو کہا کرتے تھے۔ اس نے علم موسیقی میں ایک کتاب بھی لکھی [illegible] نام نورس نامہ ہے [illegible] سہ نثر ظہوری کہلاتا ہے۔ اس نے ۱۰۳۵ھ میں انتقال کیا۔ اردو کے قدیم [illegible]

فرشتہ کے حالات کتب ذیل سے اخذ کئے گئے ہیں :-

۱ تاریخ فرشتہ	حکیم محمد قاسم فرشتہ	طبع لکھنؤ ۱۹۰۵ء
۲ [illegible]	محمد [illegible]	[illegible] ۱۳۰۹ھ
۳ سلسلہ آصفیہ	مدرسہ ترقی علوم فنون [illegible]	[illegible] ۱۸۹۷ء
۴ گلدستہ بیجاپور اردو [illegible]	میر احمد علی [illegible]	[illegible] صفحہ
۵ مورخین ہند	مولوی [illegible] اللہ [illegible]	[illegible] ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۹
۶ قاموس المشاہیر	نظامی بدایونی [illegible] دوم	[illegible] ۱۹۲۴ء صفحہ ۱۲۳
۷ تاریخ برہانپور	خلیل الرحمن	طبع دہلی ۱۹۱۴ء صفحہ ۲۰
۸ بیاگرفیکل ڈکشنری	بیل	طبع لندن ۱۸۹۴ء لفظ فرشتہ
۹ فہرست مخطوطات فارسی [illegible] میوزیم مرتبہ چارلس ریو		طبع لندن ۱۸۷۹ء تا ۱۸۸۳ء صفحہ ۲۲۵
۱۰ ایلیٹ کی تاریخ ہندوستان جلد ششم		طبع لندن صفحہ ۲۰۷ تا ۲۳۶
۱۱ ایلیٹ کا انڈکس صفحہ ۳۱۰		
تاریخ ہندوستان [illegible] الفنسٹن اردو ترجمہ		طبع لاہور [illegible]
تاریخ [illegible]	ذکاء اللہ [illegible] جلد اول	[illegible]
[illegible] مخطوطات فارسی کتب خانہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی مرتبہ ڈاکٹر [illegible]		
فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس مرتبہ ہرمن ایتھے جلد اول		

[illegible] مقامات سے حالات اخذ کئے گئے ہیں، زیادہ تفصیل کے لئے ان کتابوں میں ابراہیم عادل شاہ [illegible] حال دیکھا جائے۔

سارناتھ

از رائے بہادر پنڈت شیو نرائن شمیم، ایڈوکیٹ (لاہور)

کاشی جی کا نام کس نے نہیں سنا۔ بنارس کا پرانا نام کاشی ہے۔ دو ندیاں ایک ورنا دوسری آسی بنارس کے قریب گنگا جی میں گرتی ہیں۔ ان کے درمیان ایک رقبہ ہے جسے "ورنا آسی" کہا جاتا تھا جس سے لفظ وارنسی یا بنارس بنا تھا۔ تلفظ میں "و" و "ب" کا بدل ہوتا رہتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق قدیم کاشی یہ نہ تھی جہاں اب گھاٹ اور راستے عظیم الشان مندر لب دریائے گنگ موجود ہیں بلکہ کاشی قدیم ورنا اور آسی ندیوں کے درمیان واقع تھی۔ یہ کاشی ایک ریاست کا صدر مقام تھا (البیرونی جلد ۱ صفحہ ۲۹۹۔ الہند قدیم مقامات از بارنٹ صفحہ ۱۳۱) ایک قوم جس کا نام کاشی تھا یہاں آباد تھی اور اس رقبہ کا نام اس قوم کے نام پر پڑ گیا تھا۔ اسی رقبہ میں ایک رقبہ رشی پتانا کہلاتا تھا، جو پالی زبان میں بعدہٗ اسی پتانا کہلانے لگا۔ یہ ایک بستی تھی جہاں سنسکرت کے عالم درس دیتے تھے اور جہاں زاہد اور تارک الدنیا لوگ یعنی یوگی، رشی، منی بود و باش رکھتے تھے۔ اس کے قریب ہرنوں کی رمنا تھی یعنی ایک دشت غزالاں تھا جسے سنسکرت میں مرگ داوا اور زبان پالی میں مگ دا بولتے تھے۔

شہزادہ سدھارتھ گوتم کا اپنا گھر چھوڑنا اور حقیقت کی تلاش میں جا بجا گھومنا، برہمنوں کی صحبتوں میں بیٹھنا۔ نجات کے طریقوں کی جستجو کرنا اور بالآخر بدھ گیا جانا اور پیپل کے درخت کے نیچے سمادھی لگانا یہ سب باتیں عام کتابوں میں مندرج ہیں۔ یہ بھی تواریخوں میں درج ہے کہ جب یوگ کے مسلسل مشق سے وہ اتنے دبلے ہو گئے کہ پسلیاں نظر آتی تھیں تو ایک روز ضعف کے مارے بیہوش ہو کر گر پڑے۔ ایک گوالے نے انھیں دودھ پیش کیا۔ جب انھوں نے خود تعزیری ریاضت کو بے سود تصور کر کے ترک کر دیا تو ان کے پانچ ہمجولی یوگی جو انھیں اپنا ہادی و رہنما سمجھتے تھے اُن سے کنارہ کش ہو گئے۔

جب سدھارتھ کو نور باطن حاصل ہو گیا تو بدھ کہلانے لگے۔ اپنے تئیں وہ تتھاگت کہتے تھے جس کے معنی ہیں روندگان سابق یعنی گذشتہ بدھوں کے مانند۔ شروع میں بدھ بھگوان کو اپنے مسلک کی تلقین میں تامل تھا مگر جب اس کا ارادہ مصمم ہو گیا کہ پرچار شروع کیا جائے تو اُن کے

دل میں اُن پانچ شاگردوں کو تلاش کرنے کا خیال پیدا ہوا جو اُن سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔ چنانچہ اُن کی تلاش میں وہ اس مقام پر پہونچے جسے اب سارناتھ کا رقبہ کہا جاتا ہے۔ یہاں اُنھیں وہ پانچوں شاگرد مل گئے جو پہلے تو بے اعتنائی سے پیش آئے مگر جب اُنھوں نے اصول مسلک خود بدھ بھگوان کی زبان مبارک سے سُنے تو قائل ہوکر دوبارہ شاگرد ہوگئے۔ بدھ مت کے پھیلانے میں اُنکا بہت حصہ ہے۔

جس مقام پر بُدھ بھگوان نے پہلا دیا کھیان دیا تھا وہاں مہاراجہ اشوک نے ایک یادگاری استھم بنوا دیا ہے۔ اب یہ ستون مسمار ہوگیا ہے۔ روایت ہے کہ اسی مسمار شدہ اسٹوپا میں ہمایوں نے اپنا تخت بچھایا جسے اب چوکھنڈی بھی کہتے ہیں۔ نہ معلوم وہ یہاں کیوں آیا اور آکر کیا کیا۔ مگر اکبر نے اپنے باپ کے اس جگہ آنے کی یادگار میں اسی اسٹوپا پر ایک برج اور ایک گنبد بنوا دیا۔ اور ایک لوح سنگی پر کندہ کرکے دروازہ کے محراب پر نصب کردیا اس میں جو سال تعمیر درج ہے اُس کے مطابق یہ واقعہ ۱۵۸۸ء کا ہے۔ اس گنبد میں شش زاویہ عمارت کو چوکھنڈی کہتے ہیں جو اس وقت بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ اس سے تھوڑی دور متصل عجائب خانہ کی سڑک کے ایک قبر ہے۔ یہ تحقیق نہیں ہوا کہ کس مسلمان بزرگ کی یہ قبر ہے اور کس زمانے میں یہ بنی تھی۔ ہم لعمرانی کے تاریخی حالات بعد میں بیان کرینگے اس سے پہلے یہ ذکر کردینا مناسب ہے کہ اس رقبہ میں جین مت کے لوگوں نے ۱۸۲۴ء میں ایک مندر اور ایک دھرم سالا بنائی ہے کیونکہ اُن کے گیارھویں تھنکر کو ایک گاؤں میں کشف حاصل ہوا تھا جو یہاں سے صرف تین میل پر واقع ہے۔ اسی مندر کے قریب کھنڈرات ہیں اور سڑک کے دوسری طرف ایک عجائب خانہ ہے جس میں جو جو اشیا کھدائی سے نکلی ہیں محفوظ رکھ لی گئی ہیں۔ یہ عجائب خانہ ۱۹۱۰ء میں بنا تھا اس سے تھوڑی دور پر جزیرہ لنکا کے بدھوں نے ایک اسکول تعمیر کیا ہے جہاں آس پاس کے مواضعات کے لڑکوں کو مفت تعلیم دیجاتی ہے۔ آگے چلکر پھر ایک عالی شان بودھ مندر چار سال کے عرصہ میں تعمیر ہوا ہے جس کی افتتاحی رسم نومبر ۱۹۳۱ء میں ادا ہوگی۔ اس کے ایک طرف ایک مہادیوجی کا مندر ہے جسے اس رقبہ کی مناسبت سے سارناتھ کہتے ہیں۔ یہ مندر قدیم نہیں ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی کوئی بودھ عمارت تھی جس کے آثار اب تک نظر آتے ہیں۔ بنارس چھاؤنی کے ریلوے اسٹیشن سے سات میل پر یہ رقبہ جسے سارناتھ کہا جاتا ہے واقع ہے۔ چھوٹی لائن نے اب اس نام کا ایک اسٹیشن بنا دیا ہے۔ یہ چھوٹی لائن الہ آباد تک جاتی ہے۔ ریلوے اسٹیشن عجائب خانہ مذکورہ بالا سے ڈیڑھ میل پر واقع ہے۔ لوگ یا تو اس ریل سے سارناتھ آتے ہیں یا چھاؤنی بنارس سے لاری، موٹر کار یا گاڑی پر آتے ہیں۔ ہر روز ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔ یورپ سے بہت سیاح آتے ہیں بودھ ممالک سے بھی بکثرت زائرین آتے ہیں۔ ہندوستان سے بھی بہت

سیاح آتے ہیں۔ بودھ لوگ تو پوجا کرتے ہیں مگر اور لوگ محض سیر و سیاحت کے لئے آتے ہیں۔ فری اسکول مذکورہ بالا میں ایک چھوٹا سا مندر ہے جس میں بودھ بھگوان کی دو مورتیاں ہیں وہاں ہر شام کو بہت سے بھکشو ایک ساتھ ملکر بودھ بھگوان کی مدح میں گیت گاتے ہیں جس میں پینتالیس منٹ کے قریب لگتے ہیں۔ پچھلے سال جنوری میں راقم الحروف اسی اسکول کے قریب پونے دو مہینے خیموں میں رہا۔ کچھ وقت نوجوان بھکشو طالب العلموں کو انگریزی پڑھاتا اس کے بعد تاریخی کتبوں کی تحقیقات کرتا اور شام کو پوجا میں شامل ہوتا تھا مگر پالی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے اُستتی (مدح) کے گانے میں شامل نہیں ہوسکتا تھا۔ امید کی جاتی ہے کہ سارناتھ کسی دن بین الاقوامی زبانوں کی تعلیم کا مرکز بن جائے گا۔ کیونکہ یہاں ایک عالی شان کالج بنانے کی تجویز ہے جہاں ایشیا اور یورپ کی زبانیں سکھائی جائیں گی۔

اوپر بیان ہوچکا ہے کہ کاشی کہاں تھی اور اس وقت سارناتھ میں کیا کیا ہے۔ اب یہ بتلانا ضروری ہے کہ سارناتھ مخفف ہے لفظ سارنگ ناتھ کا۔ جس کے معنی ہے مولائے غزالاں۔ جاتک کہانیوں میں مذکور ہے کہ بودھ بھگوان کسی سابقہ جنم میں سارنگ (ہرن) کے ناتھ (مولا) تھے اس لئے انھیں لوگ سارنگ ناتھ کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس رقبہ کا نام بھی سارناتھ ہوگیا۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ چونکہ اس جنگل میں ہرن چرا کرتے تھے اور بودھ بھگوان کے زمانہ میں اُن کا شکار کرنا بند ہوگیا تھا اور وہ بودھ بھگوان سے مانوس ہوگئے تھے اس لئے اس جنگل کو سارنگ ناتھ کا مخفف سارناتھ کہنے لگے حتیٰ کہ بہت بدھی نشانوں۔ مہروں۔ علموں اور کئی چیزوں پر ہرن کی شکل دکھلائی گئی ہے۔ نالندا یونیورسٹی کے نشان پر بھی ایک دائرہ بنایا گیا ہے جس میں دو ہرن آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بنائے گئے ہیں۔

رائے بہادر دیا رام ساہنی نے ایک گائڈ لکھی تھی جو بڑی مکمل تحقیقات کے بعد تاریخی واقعات لکھے ہیں اس مضمون میں اس گائڈ سے مدد لی گئی ہے گو اس وقت یہ گائڈ عموماً دستیاب نہیں ہوتی ہے مگر اس کا نیا ایڈیشن عنقریب شائع ہونیوالا ہے۔ مہاراجہ اشوک نے بدھ دھرم اختیار کرکے بدھ بھگوان کی سوانح عمری کے متعلق بہت سے اسٹوپا اور درگاہیں بنوائی تھیں۔ چنانچہ ہوتے ایک اسٹوپا سارناتھ میں بھی بنوایا تھا اور غالباً ایک اور بھی اسٹوپا خاص اس مقام پر بنوایا تھا جہاں اب چوکھنڈی ہے۔ جو کھنڈی والا اسٹوپا تو نہ معلوم کیونکر برباد ہوگیا۔ ایک لاٹ بھی بنوائی تھی جس کے اوپر شیروں کے سنگین مجسمے رکھوائے تھے اور اُن کے اوپر ایک پہیہ بنوایا تھا۔ غارت گروں نے ان سب کو توڑ ڈالا اور شیروں والا کیپی ٹل (Capital) لاٹ پر سے گرا دیا۔ پہیئے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے برآمد ہوئے ہیں ٹوٹی ہوئی لاٹ بھی ملی ہے جو اب ایک احاطہ کے اندر محفوظ کرکے رکھدی گئی ہے

کیپٹل عجائب خانہ میں رکھ دیا گیا ہے ان پر آئینہ کے مانند پالش ہے جس کی نظیر دنیا میں کسی دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آتی ہے۔ رائے بہادر ساہنی صاحب لکھتے ہیں کہ غارتگروں کا پہلا حملہ چھٹی صدی میں ہوا تھا اور یہ بدھ قوم سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے یہاں فاہیان چینی جاتری نے چوتھی صدی میں دو درگاہیں یعنی بھکشوؤں کے رہائشی مکانات اور چار اسٹوپے دیکھے تھے اس کے بعد بت قوم نے کیا کیا برباد کیا یہ پورے طور پر تحقیق نہیں ہو سکا مگر اتنا معلوم ہے کہ اس وقت تک کوئی ہندو مندر نہ تھا ہن کے حملے کے بعد کچھ نہ کچھ مرمت ہوئی اور ہندوؤں کا دخل بھی ہونے لگا چنانچہ ان کے مندر بن گئے۔ بہرحال جب ہیون تسنگ دوسرا چینی جاتری یہاں آیا تو اس کو تیس مانسٹریاں یعنی گویا ان بودھ کے معتقدوں کے رہائشی مکانات ملیں جس میں پندرہ سو بھکشو جنوبی بودھ مت کے پیرو رہتے تھے ایک اسٹوپا پر ایک سونے کا آم تھا مگر وہ لوٹ سے کیسے بچ سکتا تھا۔ ان مکانات اور اسٹوپوں کے علاوہ اس سیاح نے یہاں ہندو دیوی دیوتاؤں کے تقریباً سو مندر بھی دیکھے۔ اس کے بعد محمود غزنوی کا اس مقام پر حملہ ہوا جس سے معلوم نہیں کیا کیا نقصان پہنچے۔ سنہ ۱۰۲۶ء سے سنہ ۱۱۵۶ء کے درمیان قنوج کی ایک رانی نے یہاں نئی مندر بنوائے کئی ایک کی بنیادیں اور ایک تحت زمین باہر جانے کا راستہ بھی برآمد ہوا ہے۔ اخیر تباہی سنہ ۱۱۹۴ء میں محمد غوری کے جنرل قطب الدین سے ہوئی۔ بعض مکانات پر تو ایسی تباہی آئی کہ بھکشو کھانا کھا رہے تھے کہ کھانا بھی چھوڑ کر بھاگ گئے آتشزدگی کے آثار بھی پائے جاتے ہیں یہ حالت بیچ کی اس والی مانسٹری میں ہوئی تھی جو اس نے سنہ ۱۸۵۱ء میں کھود کر نکالی تھی۔ اس آخری تباہی کے بعد سارناتھ بالکل ویران لق و دق میدان ہو گیا۔ ایک اسٹوپا تو جو کھنڈی کے نیچے آ گیا تھا در سٹوپے باقی رہ گئے تھے، اتفاق ایسا ہوا کہ ایک شخص جگت سنگھ نامی جو مہاراجہ بنارس کا ملازم تھا اشوک والے اسٹوپا کو جس کا نام کتابوں میں دہرم راج کا اسٹوپا آیا ہے بنیاد سے اکھاڑ کر سب اینٹیں لے گیا اور جگت گنج بنایا جو اس وقت تک موجود ہے۔ کھدائی کے دوران میں اس اسٹوپا میں سے اندر ایک پتھر کا ایک بکس نکلا جو پتھر کے ایک بڑے بکس میں تھا، اس کے اندر کے بکس میں انسانی ہڈیاں، موتی، سونے کے ورق وغیرہ برآمد ہوئے یہ ہڈیاں غالباً گوتم بودھ کی تھیں جو گنگا جی میں ڈال دی گئیں۔ بکسوں کا پتہ نہیں کہاں غائب ہو گئے۔ افسران سرکاری کو اس برآمدگی کی اطلاع پہونچی تو انھوں نے توجہ کی، ورنہ اگر یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا تو اس وقت سارناتھ کے نام و نشان سے بھی کوئی واقف نہ ہوتا اور دنیا کو کچھ بھی معلوم نہ ہوتا کہ یہاں کیا تھا اور کیا ہوا۔ غرض اس کے بعد کھدائی کا دور شروع ہوا۔

سنہ ۱۸۱۵ء سے کئی انگریزوں نے مختلف اوقات میں کھدائی شروع کی درمیان میں بہت سے نقشے

بھی ہوئے۔ جرنیل کننگھم نے وسیع پیمانہ پر کھدائی کا حکم دیا چنانچہ ایک سال سے زیادہ کھدائی ہوئی یعنی ۱۸۳۴ء سے ۱۸۳۵ء تک اس عرصہ میں جو جو ضروری انکشافات ہوئے وہ سب کلکتہ میوزیم میں جو ہیں جو غیر ضروری سمجھے گئے وہ وارنا کے پل کی کوٹھیوں میں ڈال دیئے گئے، کیا معلوم ان ٹکڑوں سے کیا کیا تاریخی معلومات مل سکتے تھے۔ کچھ برآمد شدہ اشیا کوئن کالج بنارس میں بھیجدی گئیں مگر عجائب خانہ قائم ہونے پر واپس منگوالی گئی ہیں۔ جرنیل موصوف مبارکباد کے مستحق ہیں کہ سارا خرچ کھدائی کا انھوں نے اپنی گرہ سے ادا کیا۔ ۱۸۵۱ء میں میجر کٹلو نے ایک وسیع درگاہ کی بنیادیں دریافت کیں جس میں سے پکے ہوئے چاول موجود پائے یہ جین مندر کے عقب میں دریافت ہوئی۔ القصہ جب گورنمنٹ کو اس مقام کی تاریخی اہمیت ذہن نشین ہوگئی تو ۱۸۵۶ء میں سارا رقبہ ایک انگریز مسٹر فرگوسن نیل کے سوداگر سے خرید لیا گیا۔ اس کے بعد ایک عرصہ دراز تک تو کچھ نہیں ہوا لیکن ۱۹۰۴ء میں محکمہ آثار قدیمہ نے باضابطہ چارج لے لیا اور باقاعدہ مختلف کھدائی شروع کر دی جن کے متعلق رپورٹیں بھی لکھی گئی ہیں ۱۹۱۰ء میں ایک عجائب خانہ بھی کثیر لاگت سے قائم کیا گیا جو دیکھنے کے لائق ہے۔ ۱۹۲۲ء میں کھدائی بند کر دی گئی حالانکہ ابھی بہت سا رقبہ باقی ہے۔ ۱۹۰۴ء سے پہلے ایک اور اتفاق ہوا تھا کہ ۱۹۰۴ء کی باضابطہ کھدائی کے چند سال پیشتر بودھ مت کا ایک سرگرم سنگالی اپدیشک جو کرنیل اسکاٹ کا شاگرد تھا یہاں آیا جب اس نے دیکھا کہ یہاں سور پالنے والے لوگ رہتے ہیں اور جابجا سور پھرتے ہیں تو اُسے خیال آیا کہ کچھ زمین خریدے چنانچہ اُس نے اپنی والدہ کے نام پر ایک ٹکڑہ زمین کا خرید کیا اور یہاں سے ۱۸۹۳ء میں امریکہ چکاگو ریلجس کانگریس میں بدھ مت کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوا جہاں اس کو ایک امریکن خاتون مسز فاسٹر ملیں اور بودھ دھرم کی تعلیم کی کشش سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ انھوں نے مختلف اوقات میں لاکھوں روپیہ اس مت کے پرچار کے لئے دیا جس سے کلکتہ کا وہار بنا جس کا نام جگت سنگھ والے مسمار شدہ اسٹوپا کے نام پر دھرم راجکا رکھا گیا اور کئی اور تعمیراتی کام بھی اس روپیہ سے ہوئے جن کی تفصیل یہاں بنظر اختصار نظر انداز کی جاتی ہے۔ اس خاتون نے سارناتھ کے جدید مندر کے لئے بھی ایک کثیر رقم دی تھی۔ گورنمنٹ نے ابھی کھدائی کے لئے جو رقبہ محفوظ تھا خاتون موصوف نے اس کا کچھ حصہ سنگالی اپدیشک سے جس کا نام انگریکا دھرم پال تھا لے لیا اور عوض میں ایک بیش بہا آم کا باغ عطا فرمایا۔ باقی ماندہ رقبہ میں دھرم پال جی نے فری اسکول بنا دیا ہے۔ حال ہی میں اس کے قریب ایک عالی شان بودھ مندر تیار ہوگیا ہے جس کا نام مولگندھ کٹی رکھا گیا ہے۔ نام ایک پتھر کی سل پر اُس مکان کا کندہ نکلا جو بدھ بھگوان کی رہائش کے لئے کسی پیرو نے شروع

بنایا تھا۔ ایسے اور بھی مکان اُن کے لئے بنائے گئے تھے اور غالباً اُن سب کے نام تھے۔ لیکن ایک ان میں مول یعنی سب سے بڑا کہلاتا تھا گندھ کٹی کے معنی "حجرۂ معطر" ہے لیکن یہ سمجھ میں دو نکلی نہیں آتے۔ گردون گرداں کی گردش جاری ہے۔ سارناتھ کا نام و نشان بھی مٹ گیا تھا مگر اب اس کا پھر نصیبا جاگا ہے اور بودھ زمانہ کی عظمت کے آثار پھر نمودار ہو گئے ہیں۔

یہاں کا عجائب خانہ خاص طور پر دیکھنے کے لائق ہے۔ اس کی تمام چیزیں نہایت قدیم ہیں۔ اگرچہ ان کے مفصل بیان کی تو اس مضمون میں گنجایش نہیں ہے لیکن تین چیزیں خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔

اوّل لائن کیپیٹل (Lion Capital) جو دنیا کے عجائبات میں سے سمجھا جاتا ہے۔ جس پر زمانہ اور قدرت صدمہ پہونچنے کے باوجود بھی ابھی تک یہ خاصی اچھی حالت میں ہے۔ ہندوستان کی بودھ کی صنعت سنگتراشی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کے اوپر کا پہیہ ریزہ ریزہ ہو گیا ہے۔ اس کے نیچے کی لاٹ بھی شکستہ ہو گئی ہے مگر جتنی باقی رہی وہ محفوظ رکھی گئی ہے۔

دوم۔ کرشن جی کی ایک قدآدم سے اونچی مورتی یہاں ملی تھی جو ایک گاؤں سے برآمد ہوئی تھی جو بنارس سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ کرشن جی کے بازو اور ایک حصہ جسم کا ٹوٹا ہوا ہے۔ مورتی میں کرشن جی کو گوردھن پہاڑ اُٹھائے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

سوم۔ شیوجی یعنی مہادیوجی کی بہت بڑی مورتی جو نامکمل ہے سارناتھ کے قریب سے برآمد ہوئی تھی ایک راکشس کو مارنے کو مہادیو تیر استعمال کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔

ان کے علاوہ چینیوں کی سنگی مورتیاں جو نکلی تھیں ان میں سے اکثر عجائب خانہ کے باہر اور جین مندر کے عقب میں رکھ دی گئی ہیں۔ بعض چینی اور ہندو مورتیاں بھی عجائب خانہ میں موجود ہیں۔

بہرحال یہ وہ سرزمین ہے جہاں پہلا وعظ بودھ بھگوان نے دیا تھا۔ بودھ زمانہ میں یہاں اشوک اور دیگر پیروان بودھ مذہب نے بہت سی عمارتیں بنائیں جو حملوں کی نشانہ ہدف ہوتی رہیں اور ان کی مرمتیں بھی ہوئیں۔ جب بودھ مت کو زوال آیا، سلطنت مٹ گئی ختم ہو گئی تو ہندوؤں اور چینیوں نے اسی مقام پر اپنے مندر بنائے۔ پہلو بہ پہلو تینوں دھرموں کے لوگ یہاں پوجا کرتے تھے۔ اخیر غارت گری سے ایسی غضب کی آفت آئی کہ یہ رقبہ ویران ہو گیا۔ سب شکستہ چیزیں زیر زمین ہو گئیں سوائے ایک عالی شان اسٹوپا کے جو دھمیک کہلاتا ہے اور جس کے پتھر لوہے کی سلاخوں سے ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ جگت سنگھ اس کو اکھاڑ نہ سکا۔ چند پتھر تو اس نے نکالے مگر اسٹوپا کے منہدم کرنے میں وہ کامیاب نہ ہوا۔ یہاں سے پتھر اُس نے نکالے وہاں گڑھے رہ گئے تھے جو محکمۂ آثار قدیمہ نے پُر کر دیئے۔ بودھی

لوگ اس اسٹوپا کی پرکما (طواف) کرتے ہیں اور چراغ جلا کر پوجا کرتے ہیں یہ تحقیق نہیں ہوا کہ یہ اسٹوپا کس نے بنایا اور کس مقصد سے بنایا تھا

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا راقم الحروف سارناتھ میں خیموں میں پونے دو مہینے موسم سرما میں رہا یہاں آنے سے پہلے اُس نے اپنا کتب خانہ یہاں روانہ کر دیا تھا جو اب مہابدھی سوسائٹی کو نذر کر دیا گیا ہے اور نئے بدھ سکول کی الماریوں میں رکھ دیا گیا ہے۔ جس خوشی سے یہاں وقت کٹا تمام عمر ایسی مسرت قلبی کبھی حاصل نہ ہوئی۔ چونکہ یہاں میری کتب تاریخ موجود تھیں، ساہنی صاحب کی گائیڈ بھی میرے پاس تھی۔ محکمہ آثار قدیمہ کی رپورٹیں عجائب خانہ کے دفتر سے مل گئیں مجھے خیال آیا کہ چونکہ ساہنی صاحب کی گائیڈ اب دستیاب نہیں ہوتی اور نہ جانے طبع ثانی کب شائع ہو۔ لہذا یہاں کے قیام کے دوران میں میں نے سارناتھ کے حالات اور تاریخی واقعات انگریزی میں سپرد قلم کئے جو اب ایک رسالہ کی صورت میں شائع ہو گئے ہیں اور راقم الحروف سے یہ رسالہ مفت مل سکتا ہے۔

گیانی

۱۔ سمندر برسات سے بھرتا ہے۔ قحط میں خشک ہوتا ہے، اسی طرح گیانی اپنی عادات و حرکات میں ثابت قدم رہتے ہیں اور دنیا کی کامیابی یا ناکامی انھیں رنج یا خوشی نہیں دیتی۔

۲۔ پروانہ چراغ کی روشنی کو دیکھ کر مرجاتا ہے اسی طرح نادان لوگ مایا کا موہنی روپ دیکھ کر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں مایا کی موہنی صورت میں زہر چھپا ہے۔

۳۔ بھونرا پھول کی پنکھڑیوں سے رس لیکر ان کے حسن کو تباہ نہیں کرتا نہ کسی ایک پھول سے تعلق رکھتا ہے گیانی بھی اپنی زندگی بھونرے کی مانند بسر کرتے ہیں اور دنیا کو کسی قسم کا صدمہ نہیں پہنچاتے نہ کسی چیز سے تعلق رکھتے ہیں۔

۴۔ شہد کی مکھی محنت کر کے خزانہ جمع کرتی ہے مگر لوگ چھین کر لیجاتے ہیں اسیطرح کنجوس کی دولت پرائے ہاتھ جاتی ہے اور اس کو کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔

۵۔ ایک پرندہ پنجہ میں گوشت کا ٹکڑا دبائے لئے جاتا تھا باز اور چیل نے دیکھ لیا، اور وہ دونوں اس پر جھپٹے۔ پرندہ جب تک گوشت کے ٹکڑے کو بچاتا رہا پریشان رہا آخر جب اس نے اسے پھینک دیا تو باز اور چیل آپس میں لڑنے لگے، پرندہ سکھی ہو گیا۔ اسی طرح عارف دنیا کی پیاری چیزیں اوروں کے لئے چھوڑ کر خود سکھی ہونا پسند کریگا۔

(ماخوذ)

سید اظہر حیدر مہار پوری

دیوان جہان

از مسٹر محمد حفیظ سید، ایم۔اے۔ ایل۔ٹی (مقیم لندن)

منشی بینی نرائن جہان کے "تذکرہ شعرائے اردو" کا ذکر اکثر کتابوں میں ملتا ہے مگر اس کے نسخے نایاب ہیں۔ اس تذکرہ کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ جہاں اس پر ایڈ ۲۴۰۴۲ کا نمبر پڑا ہوا ہے۔ اس کا دوسرا نسخہ میری نظر سے کسی اور کتب خانہ میں نہیں گزرا، اس لئے اس کے مختصر حالات ناظرین زمانہ کی دلچسپی اور اطلاع کے لئے قلمبند کئے جاتے ہیں۔

اس کے شروع میں منشی بینی نرائن لکھتے ہیں کہ وہ اصل میں لاہور کے باشندے ہیں مگر مفلوک الحال ہونے کی وجہ سے اپنے وطن مالوف کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوئے اور تلاش روزگار میں سرگردان و پریشان کلکتہ پہنچے۔ وہاں بارہ برس تک سخت تنگدستی اور افلاس کی حالت میں زندگی بسر کی۔ بالآخر اتفاقاً ایک روز منشی حیدر بخش حیدری سے ملاقات ہوئی جو اس زمانہ میں فورٹ ولیم کالج میں منشی گری کے عہدہ پر مامور تھے۔ موصوف ان کے حال زار سے بہت متاثر ہوئے اور کپتان ٹامس روبک معتمد فورٹ ولیم کالج سے ان کا تعارف کرادیا۔ صاحب موصوف نے ان کی کافی قدردانی کی۔ پہلے چہار گلزار کا اردو میں ترجمہ کرایا بعدہٗ اردو شعرا کا ایک تذکرہ تیار کرنے کی فرمائش کی۔

یہ ایک سو پچیس ۱۲۵ اردو شعرا کے کلام کا بہت مختصر تذکرہ ہے۔ اس کی ترتیب بحساب حروف تہجی ہے۔ اختصار کی یہ کیفیت ہے کہ شعراء کے اسمائے گرامی، تخلص، ولدیت، سکونت اور ان کے استادوں کے نام کے علاوہ اس میں اور کچھ نہیں۔ کسی ایک شاعر کی ولادت اور وفات کی تاریخ بھی اس میں درج نہیں ہے۔ اس لئے اس کو شعرا کے کلام کا انتخاب کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

غالباً سنہ ۱۸۱۰ء میں یہ تذکرہ ترتیب دیا گیا۔ روبک صاحب نے فورٹ ولیم کالج کے کارنامہ دنیا میں اس کا ضمناً ذکر کیا ہے۔ اسپرنگر صاحب اس کے تحریر کی تاریخ سنہ ۱۸۱۲ء لکھتے ہیں، شاید اسی سال مؤلف نے اس کو ترتیب دینا شروع کیا ہو۔ اس تذکرہ کے آخری حصہ میں متعدد رباعیاں اور قطعے درج ہیں اور

یہ خود مرتب صاحب کے جودت طبع کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔

گارسن دی تاسی کا خیال ہے کہ منشی بینی نراین نے تنبیہ الغافلین کا ترجمہ فارسی سے اُردو میں کیا تھا۔ اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ آخر عمر میں جہان صاحب مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے اور مشہور و معروف مصلح سید احمد (جو ۱۸۳۱ء میں قتل کیے گئے تھے) کے مرید تھے۔

اس تذکرہ کے سب سے آخری حصہ میں اُن آٹھ شاعروں کی غزلیں بھی درج ہیں جو ۲۵- جولائی کے مشاعرہ میں کلکتہ میں سنائی گئی تھیں۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس سال کی جولائی میں یہ مشاعرہ منعقد ہوا تھا جن شعراء نے اپنا کلام اس مشاعرہ میں پڑھکر سنایا تھا اُن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:-

۱۔ جوان مرزا کاظم علی متوطن دہلی

۲۔ میر حیدر بخش حیدری دہلوی

۳۔ سید جعفر علی جوان لکھنوی

۴۔ افتخار الدین علی خاں

۵۔ مرزا ہاشم علی عیان ولد کاظم علی جوان

۶۔ ابوالقاسم خاں قاسم دہلوی

۷۔ مرزا قاسم علی ممتاز

۸۔ مظہر علی خاں ولا دہلوی

اس تذکرہ کے ابتدائی اشعار یہ ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کروں آغاز سخن حمد خدا سے ۔۔۔ پھر اس کے بعد نعت مصطفیٰ سے

خدا خالق ہے ہم ہیں آفریدہ ۔۔۔ نبی جتنے ہیں سب ہیں برگزیدہ

محمد پر ہوئی ختم رسالت ۔۔۔ علی ہے مالک ملک ولایت

ہمیشہ یاد خاص اُن کی کیا کر ۔۔۔ انھیں کا ساغر الفت پیا کر

الٰہی تیرے بندے جتنے ہیں خاص ۔۔۔ جناب حق میں کتنا ہوں میں اخلاص

مجھے تو اس وسیلے سے شب و روز ۔۔۔ نموں پر رکھنہ ظفر او نصیب روز

فلک پر چمکے یوں میرا ستارا ۔۔۔ کریں بخ والم جس سے کنارا

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صحیح الاعتقاد شیعہ مسلمانوں کے فکر کا نتیجہ ہیں۔ اگر منشی بینی نراین

جہاں صاحب نے یہ تذکرہ مسلمان ہونے کے بعد مرتب کیا ہوتا پھر اس میں کوئی تعجب کا موقع نہیں کیونکہ خوش اعتقاد مسلم ہمیشہ حمد و نعت کے بعد اپنا کلام شروع کرتا ہے لیکن راقم الحروف کا خیال ہے کہ اگر منشی صاحب مشرف با اسلام ہو چکے ہوتے تو ہندی مسلمانوں کے قدیم اور جدید رویہ کے مطابق اُن کا نام ضرور تبدیل کر دیا جاتا اور وہ خود یوں سخن سرا نہ ہوتے

دعا بر ختم کر بینی نرائن — کہ مستحسن سخن گوید بہ ہر فن

ممکن ہے کہ اس تذکرہ کی ترتیب اور تکمیل کے زمانہ تک وہ باقاعدہ اسلام کی جماعت میں نہ شامل ہوئے ہوں، بعد کو گارسن دی تاسی کے خیال کے مطابق اپنے آبائی مذہب کو ترک کر دیا ہو۔

اس تذکرہ کی چند اور خصوصیات یہ ہیں:۔

"مہر سپہر جہانبانی شاہ عالم بادشاہ بنت آرام گاہ ابن عالمگیر ثانی متخلص بہ آفتاب کا کلام اور تذکروں میں جو میری نظر سے گذرا ہے بجز چند اشعار زیادہ درج نہیں، برخلاف اس کے جہان نے پوری چھ غزلیں لکھی ہیں جن کا مطلع اور مقطع یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

کہو بلبل سے لے جاوے چمن سے آشیاں اپنا — پڑے گر سد ہزار افسوں نہ ہوگا باغباں اپنا

مگر دل سے بنا رکھتا علی گوہر سے پیارے کو — وہ حکم شاہی رکھتا تھا ولے تھا مہرباں اپنا

دوسری غزل کا مطلع اور مقطع یہ ہے:۔

میں کیا کہوں کہ شاد مرا دل ہے اس قدر — آنے کی یار کے مجھے قاصد نے دی خبر

وہ ماہ رو جو آویگا مجھ پاس آفتاب — مقدم سے اُسکے ہوئیگا یہ نور بار گھر

تیسری غزل کا مطلع ؎

مت پوچھ اپنے ہجر میں اے دلربا مرے — رویا ہوں یاں تلک کہ ہیں آنکھیں ہنوز نم

مقطع۔ اے آفتاب مجھکو تو ہاتف نے دی ندا — تیرے ہی بخت میں ہوں عرب اور یہ عجم

چوتھی غزل کا مطلع ؎

عاجز ہوں تیرے ہاتھ سے کیا کام کروں میں — کر چاک گریباں تجھے بدنام کروں میں

مقطع مجھ کو شہ عالم کیا اس رب نے تو کیونکر — اللہ کا شکرانہ اکرام کروں میں

پانچویں غزل کا مطلع یہ ہے ؎

آنکھوں میں ہے تصور صورت کا دلربا کی — دل میں اور نقشہ ہے اس نازنیں لقا کی

مقطع یہ ہے:۔

روشن جہان نثارہ اے آفتاب عالم عالم کی جان تیں نے تجکو ہی دعا کی

چھٹی غزل کا مطلع یہ ہے ؎

کیونکر نہ کٹے زندگی ہو بن دیکھے اس صنم کے دل رات بے کلی ہے دوری سے اس قدم کے

ہوں آفتاب عالم مجھ پر ہے فضل یزداں دیں گے خراج مجھ کو شاہاں عرب عجم کے

شاہ عالم نے پہلی غزل میں اپنا تخلص علی گوہر، تیسری میں شہ عالم لکھا ہے۔

اسی طرح نواب آصف الدولہ تخلص بہ آصف کی پانچ غزلیں درج ہیں۔ ان کی پہلی غزل کا مطلع

یہ ہے ؎

تری تیغ جب ہم علم دیکھتے ہیں

وہیں سر کو اپنے قلم دیکھتے ہیں

اور مقطع ۔

بتوں کی گلی میں شب و روز آصف

تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

حضرت آصف کی یہ غزل بہت مشہور ہے۔

معروف شعرا میں شیر علی افسوس۔ انشا۔ میر تقی میر۔ قلندر بخش جرأت۔ قائم اور سودا کی چند غزلیں درج ہیں۔ ان کے علاوہ ایک غیر معروف شاعر طالب بیگ ولد نیاز بیگ خاں دہلوی تخلص بہ غالب کی بھی تین غزلیں درج ہیں۔ ان میں سے پہلی غزل کا مطلع یہ ہے ؎

کب رہا ہے اب ہمیں حور و بشر کا امتیاز

دیکھ کر جاتا رہا تجکو نظر کا امتیاز

دور حیات

از جناب بسمل الہ آبادی

قدرت کا یہ دستور سمجھتا ہوں میں مختار نہ مجبور سمجھتا ہوں میں

بسمل مری نظروں میں ہے وہ جلوہ حسن ہر ذرے کو اک طور سمجھتا ہوں میں

نزدیک سے کب دور سمجھتا ہوں میں یہ شیوہ و دستور سمجھتا ہوں میں

ہر سانس انا الحق نہ کہے کیوں بسمل اپنے کو جو منصور سمجھتا ہوں میں

منشی درگا پرشاد بیکنٹھ باشی

(از خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی)

چالیس برس اُدھر کے ہندو مسلمانوں کی سوانح عمریاں جب کبھی پڑھی جاتی ہیں تو بلا مبالغہ یہ ماننا پڑے گا کہ آج کل کے مغرب زدہ حضرات سے ان کا وقار بہت زیادہ تھا۔ [illegible] نفس پاک تھے جو کچھ ان کے دل میں ہوتا تھا وہی زبان سے کہتے تھے۔ آنکھوں دیکھی بات ہے کہ لکھنؤ محلہ فوارہ گنج میں [illegible] کے اور کائستھوں کی کافی بستی تھی، ہر وقت چہل پہل رہتی تھی۔ محلہ کے ہندو مسلمان سب ایک دل و ایک زبان تھے۔

اسی محلہ کے [illegible] منشی درگا پرشاد [illegible] بھی رہتے تھے۔ وہ کچھ زیادہ دولتمند تو نہ تھے مگر ان کی [illegible] دولتمندوں کا وقار بخشتا تھا۔ [illegible] قوم کے کائستھ سکسینہ تھے اور مذہب کے سخت پابند۔ جاڑا ہو یا گرمی یا برسات، کیسی ہی شدت کی سردی پڑتی ہو، کیسا ہی زور کا پانی برستا ہو، ان کو منہ اندھیرے بستر سے اٹھنا، گومتی سے پانی بھر کر اشنان کرنا، اور [illegible] کی جگت پر [illegible] پوجا کا سامان رکھنا اور مالا ہاتھ میں لے کر جپنا، [illegible] آٹھ بجے تک اسی شغل میں [illegible] رہتا تھا۔ ظاہر میں جو شخص ان کو دیکھتا وہ کاہے کو سمجھتا ہوگا کہ ان کو مسلمانوں سے نفرت ہوگی، مگر ان سے [illegible] کیجئے تو شک ہوتا تھا کہ یہ دل سے مسلمان ہی ہیں۔

ان کے [illegible] پیچھے کی طرف بہت بلندی پر ایک کمرہ بنا ہوا تھا جس کا زینہ [illegible] تین پتھر رکھے ہوئے تھے ان پر سے دو پر [illegible] لکھا ست نرائن سوچ، پوران، رامائن [illegible] کا پتھر چھپا کرتا تھا۔ لکھائی چھپائی اس قدر سستی تھی [illegible] کاغذ [illegible] اور چھپائی [illegible] آدمی [illegible] پانچ کش [illegible] بیلن دینے والا [illegible] تو آخر [illegible]

اگر دن بھر میں دو ہزار کاغذ چھاپ لیتے تو ایک روپیہ دو آنہ ملتے جس کو وہ چاروں آدمی آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ مصلح سنگ کی اجرت فی پتھر [illegible] آنہ تھی، دن بھر میں چار پتھر بنانے پر

مصلح سنگ کو چھ آنے ملتے تھے۔ دفتری آٹھ روپیہ ماہوار پر خوشی خوشی کام کرتا تھا اور یہ سب کا رِیگر مسلمان تھے۔ البتہ مصلح سنگ ہندو تھے اور اُن کا نام چندن لال تھا۔ وہ پتھر بھی عمدہ بناتے تھے اور مصوری میں بھی کمال رکھتے تھے۔ کتاب کی لوحیں بناتے اور جدول کشی کرتے۔ غرض مجموعی طور پر بیس روپیہ ماہوار پیدا کر لیتے تھے۔

منشی چندن لال منشی درگا پرشاد کے عزیز قریب تھے اور فن مصوری میں ان کے بہت سے شاگرد تھے چنانچہ کانپور کے مشہور مطبع نامی پریس کے نامور مالک منشی رحمت اللہ رعد منشی چندن لال جی کے شاگرد رشید تھے۔ انھوں نے لکھنؤ آکر اس فن کو منشی صاحب سے سیکھا تھا۔

اس زمانہ میں پریس کا متفرق خرچ ہی کیا ہوتا تھا۔ تین آنے کی سیاہی فی ڈبہ، ایک پیسہ کی گوند کشائی، دو پیسے کے کوئلے پتھر گرم کرنے کے لئے

منشی درگا پرشاد اتنے بھولے تھے کہ پریسمین ہمیشہ اپنی مصیبت کی ایک داستان بنا کر ان کو سناتے تھے اور کچھ رقم بطور قرض لے جاتے تھے جو کبھی ادا نہ ہوتی تھی۔ ان کا تجارتی طریقہ یہ تھا کہ کچھ لوگ تو ایسے تھے جو دو چند کاغذ دیکر نصف کتابیں لے لیتے تھے اور کچھ ایسے تھے جو ان سے کتابیں نقد دام پر خرید لیتے تھے اس طرح کہ تمام مطبوعات میں نصف جلدیں فوراً فروخت ہوجاتی تھیں باقی کتابوں کے بکنے کی صورت یہ تھی کہ نتھو نامی ایک جلد ولی تھا جو ایک حرف نہیں پڑھا تھا مگر کتابیں لیکر ہر ایک میلے میں جاتا تھا اور دو چار پنڈت اور ایک آدھ مسلمان اس کے ساتھ جاتے تھے وہ لوگ نتھو سے کتابیں لیکر میلے میں دوکان لگاتے تھے جس قدر کتابیں بک جاتی تھیں ان کی اصل قیمت ناتھو کو دیدیتے تھے اور نفع خود رکھ لیتے تھے۔ اس صورت میں اکثر نقصان بھی ہوجاتا تھا مثلاً ناتھو کی جہالت سے کسی نے حساب میں غبن کر دیا یا کسی میلے میں خرچ بہت ہوگیا اور بکری کم ہوئی تو وہ اصل میں سے بھی کھو بیٹھتا تھا مگر جب کوئی ایسی صورت پیش آتی تو یہ روپیہ کسی دوسرے میلہ میں وضع ہوجاتا تھا۔

لوگوں کو تعجب تھا کہ نتھو ایک حرف نہیں جانتا مگر جو کتاب خریدار مانگتا ہے وہی نکال کر دیدیتا ہے اور دم بھر میں ہزاروں کا حساب لگا لیتا ہے۔ نیز ہر کتاب کے جزو اس کو زبانی یاد تھے اسی وجہ سے ناتھو منشی درگا پرشاد کے کارخانہ کا معتمد علیہ ہوگیا تھا۔ وہ اتنا نیک تھا کہ اگر کوئی مسلمان کتاب فروش کسی میلے میں آتا اور کھانا پکانا نہ جانتا تو ناتھو اس کے کھانے کا انتظام اپنے ذمہ لے لیتا تھا اور جو چیز اپنے لئے پکاتا اس کا حصہ پہلے اس مسلمان کو دیدیتا۔ اس کے بعد خود کھاتا اور لطف یہ کہ اس کھانے کی کوئی قیمت نہیں لیتا تھا ان باتوں سے ناتھو ایسا ہر دلعزیز ہوگیا تھا کہ تمام میلے کے لوگ جو کتاب کی تجارت کرتے تھے لالہ ناتھو سے ضرور

تعلق رکھتے تھے، ان کا طریقہ یہ تھا کہ جو لوگ ان کی کتابیں میلے میں بیچتے ان سے وہ جو کتابیں بچ رہتیں واپس لے لیتا تھا اور اگر کچھ روپیہ باقی رہ جاتا تو دوسرے میلے میں ادا کرنے کے وعدہ پر چھوڑ دیتا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے معاملہ داروں کو حسب ضرورت ویسے بھی قرض دیدیتا تھا۔ دعیدو برہمن اس کے ساتھ ضرور جاتے تھے اور پھیری پھر کے کتابیں بیچتے تھے اور شام کو لالہ ان کے یہاں روٹی بناتے تھے اور انھیں کی دوکان میں سوتے تھے۔ آخر زمانے میں اس سے ایک غلطی ہوگئی کہ لالہ ننکو مل ایجنٹ مطبع نولکشور نے دیکھا کہ ناتھو باوجود کم مال کے زیادہ بکری کر لیتا ہے۔ تو انھوں نے اس کو لالچ دلایا کہ تم مطبع نولکشور کا ہی مال ہم سے لیکر بیچا کرو اس سے تم کو زیادہ نفع ہوگا کیونکہ یہاں ہر قسم کی کتابیں موجود ہیں اور بڑی بڑی کتابیں بھی مل سکتی ہیں جو مطبع نولکشور کے علاوہ اور کہیں دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں۔ جیسے مہابھارت۔ بھاگوت رامائن۔ حالانکہ یہ کتابیں بھی منشی درگا پرشاد خرید کر کے ناتھو کو دیدیتے تھے لیکن اس میں وہ دو آنہ روپیہ منافع کا خود بھی لے لیتے تھے۔ جب ناتھو نے دیکھا کہ لالہ ننکو مل سے مطبع کشوری کا مال بھی کفایت کے ساتھ اور واپسی کے وعدے پر مل سکتا ہے تو لالچ میں آکر مطبع نولکشور سے براہ راست معاملہ کر لیا۔ گو اس کے ساتھ اس نے یہ وعدہ بھی کر لیا کہ میں منشی درگا پرشاد کی بھی کتابیں بیچا کرونگا۔ چند روز تک اسی طرح سلسلہ چلتا رہا لیکن اس کے بعد لالہ ننکو مل نے ناتھو کو اپنے یہاں نوکر رکھ لیا۔ اس وقت اس نے لالہ درگا پرشاد کا حساب کر کے ان کا کل مال واپس کر دیا جائے، پانچسو روپیہ اس کے ذمہ نکلا جس کی ادائیگی کے لئے قسط بندی ہوگئی۔ اس حساب میں وہ روپیہ بھی شامل تھا جو ناتھو نے کسی تقریب کے موقع پر منشی درگا پرشاد سے قرض لیا تھا

منشی درگا پرشاد کے پوتوں کی تعلیم کے لئے ایک مسلمان معلم نوکر تھے۔ علی انور ان کا نام تھا کسی گاؤں کے رہنے والے تھے اس لئے دن رات منشی صاحب کے مکان پر رہتے تھے۔ کوٹھے کے کمرے کے دو درجے تھے، دوسرے درجہ میں دو کوٹھریاں تھیں جن میں سے ایک کوٹھری مولوی صاحب کے اسباب رکھنے کو دیدی گئی تھی اور کمرے میں نماز پڑھنے کو ایک چوکی بچھادی گئی تھی۔ اسی پر وہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے۔ دونوں وقت پکا پکایا کھانا منشی درگا پرشاد کے گھر سے آتا تھا اور یہ عجیب بات تھی کہ مولوی صاحب کے واسطے سب سے پہلے کھانا آتا تھا یعنی ابھی گھر کے لوگ کھانا نہیں کھاتے تھے کہ مہری ان کے واسطے کھانا لیکر آجاتی اور ان کے برتنوں میں رکھکر چلی جاتی۔ کھانے میں عموماً دھوئی ماش کی دال اور موسمی ترکاری، کچھ چٹنی، رائتہ اور روٹیاں ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی منشی درگا پرشاد خود بھی کھانا لیکر آتے تھے۔ مولوی صاحب کی تنخواہ تو قلیل تھی یعنی پانچ [illegible] روپیہ ماہوار لیکن

مدارات بہت ہوتی تھی اور ضرورت کے وقت وہ قرض بھی لے لیا کرتے تھے۔ ایک کمرے میں مولوی صاحب پڑھاتے تھے اور دوسرے میں منشی جی کا دفتر تھا۔ دفتر کا کام منشی جی کے اکلوتے فرزند منشی رام لال کیا کرتے تھے جو بہت نیک اور منکسر مزاج تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ مولوی صاحب نے کسی شرارت یا سبق یاد نہ کرنے پر لڑکے کو مارا اور وہ زور سے چیخ کر رونے لگا لیکن منشی صاحب نے کبھی ان کی طرف منہ پھیر کر نہیں دیکھا اور نہ مولوی صاحب سے شکایت کی۔

جب لالہ جی نوالگ ہو گئے تو منشی درگا پرشاد خود میلوں میں مال لیکر جانے لگے۔ مال کی روانگی میلہ میں دکان کا لگانا اور واپسی سب ضامن علی خاں مالک مطبع فیض رساں کے ذمہ تھی۔ وہ بھی ہندی کی کتابیں چھاپتے تھے اور اس زبان سے واقف تھے۔ اکثر منشی درگا پرشاد خاں صاحب کے یہاں بھی اپنا مال چھپوا لیا کرتے تھے اور ان کے ساتھ رعایت بھی ملحوظ رکھتے تھے۔ خانصاحب بھی وضع کے پابند تھے اور منشی صاحب کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ منشی صاحب کا قرضہ بھی کتب فروشوں سے یہی وصول کیا کرتے تھے کیونکہ منشی صاحب سخت گیری کے عادی نہ تھے اور خانصاحب ہر طرح سے روپیہ وصول کرنے کے خوگر تھے۔

جب منشی درگا پرشاد جو دھیا یا پریاگ کے میلے میں جانے لگے تو انھوں کی طرح ان کے ساتھ بھی کئی برہمن جاتے تھے جو ان سے کتابیں لیکر میلے میں بیچتے تھے اور اچھا نفع اٹھاتے تھے۔ میلا ختم ہونے کے بعد جو برہمن یہ کہتے تھے کہ ہمارے پاس خرچ نہیں رہا تو منشی جی ان کو دو چار روپیہ نقد دیدیا کرتے تھے جس کو وہ کبھی دوسرے میلے میں وصول کر لیتے تھے اور کبھی چھوڑ بھی دیتے تھے۔ لالہ کاشی چرن کاپی نویس بھی منشی صاحب سے مال لیکر ادھر ادھر فروخت کرتے تھے۔ غرض اسی طرح کئی ہندو اور کئی مسلمان منشی درگا پرشاد سے مال لیکر باہر جاتے تھے اور واپسی پر جو مال بکتا تھا اس کا روپیہ ادا کرکے باقی مال واپس کر دیتے تھے۔ اس طرح منشی صاحب کو گھر بیٹھے اچھی آمدنی تھی۔ شیخ عبدالعزیز مالک مطبع عزیزی بھی اکثر کانپور سے آکر منشی درگا پرشاد سے مال خریدتے تھے اور وہ ان کے ساتھ خاص رعایت کیا کرتے تھے۔ منشی صاحب کا یہ حال تھا کہ جس شخص نے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ان سے مال مانگا انھوں نے بغیر دریافت مال دیدیا اب چاہے وہ روپیہ دے یا نہ دے۔ دیگا تو لے لیں گے نہ دیگا تو نالش نہیں کرینگے۔ چھیاسی ستاسی برس کی عمر ہوئی مگر انھوں نے کبھی کچہری کی صورت نہیں دیکھی نہ کسی نے ان پر نالش کی نہ انھوں نے کسی پر نالش کی تقاضے سے روپیہ مل گیا تو لے لیا ورنہ تقاضہ برقرار رہا۔

منشی صاحب کے پوتوں کی شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی اس شادی میں ان کی برادری سے زیادہ مسلمان تاجران کتب مدعو تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بھائی میری برادری میں یہی مسلمان تاجران کتب ہیں

جنھوں نے میری رفاقت میں عمر بسر کی ہے البتہ شادی میں نیوتہ کا روپیہ انھوں نے کسی مسلمان سے نہیں لیا اور عذر کیا کہ میرے یہاں غریب امیر سبھی مہمان ہیں آپ سے لوں اور کسی کو دینے کی مقدرت نہ ہو تو اس کو شرمندگی ہوگی جس کو میرا دل قبول نہیں کرتا ہے۔ مہمانوں کی خاطر منشی صاحب نے اس قدر ملحوظ رکھی کہ سب مسلمان مہمانوں کو ہندوؤں سے پہلے کھانا کھلایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر رقص و سرود کی محفل بھی منعقد ہوئی اور شراب کا بھی دور چلا۔

مولوی مراد اللہ ایک شریف نمازی پرہیزگار شخص تھے۔ وہ چوک میں قلمی اور قدیم چھاپہ کی کتابوں کی تجارت کرتے تھے۔ ان سے اور منشی جی سے کوئی تجارتی معاملہ تو نہ تھا اس لئے کہ وہ انگریزی کی کتابیں بیچتے تھے لیکن یاد اللہ بہت تھی۔ جب چوک میں آتے تھے تو گھنٹہ دو گھنٹے ان کی دکان پر ضرور بیٹھتے تھے۔ لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ ان میں دوستانہ مراسم کیونکر قائم ہو گئے کیونکہ ایک تو تلک دھاری تھا دوسرا لمبی داڑھی والا مولوی۔ ان دونوں کا یکجا ہونا چہ معنی دارد۔ مگر کچھ ایسی دوستی تھی کہ کچھ میں نہ آتا تھا۔ مولوی صاحب ہفتہ میں ایک مرتبہ خود منشی صاحب کے مکان پر ملاقات کو جاتے تھے اور منشی صاحب ہمیشہ دوسرے تیسرے ان کی دوکان پر آکر بیٹھتے تھے اور کچھ ایسی باتیں ہوا کرتی تھیں جن میں دونوں کو دلچسپی تھی۔

مولوی صاحب نواب گنج بارہ بنکی کے رہنے والے تھے اور شاید اپنے گھر سے خفا ہو کر آئے تھے کہ کبھی گھر کا رخ نہیں کیا۔ ڈاک کے پل کے پاس ایک مسجد تھی جس کے حجرے میں ان کی چارپائی اور اسباب رکھا تھا۔ نماز بھی یہی پڑھاتے تھے اور کھانا بازار سے منگا کر کھاتے تھے یا خود پکا لیتے تھے۔ ضعیف بہت تھے کچھ زمانے کے بعد وہ سخت بیمار ہو گئے تو منشی صاحب کا یہ معمول تھا کہ روزانہ خیریت پوچھنے جاتے تھے۔ وہ دوا وغیرہ جس چیز کی ضرورت ہوتی لا دیتے تھے۔ منشی صاحب کو روزانہ مسجد میں آتے جاتے دیکھ کر ناواقف لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ شاید منشی صاحب مسلمان ہو گئے ہیں۔ بالآخر مولوی مراد اللہ کا اسی بیماری میں انتقال ہو گیا لیکن منشی صاحب مرتے دم تک ان کے شریک حال رہے۔

منشی صاحب نے اپنے پوتوں پوتیوں کی شادی اپنی حیات ہی میں کر دی تھی وہ سب الگ الگ رہنے لگے تھے۔ قریب ساٹھ برس کے سن میں منشی رام لال بیمار ہوئے۔ بہت کچھ علاج ہوا مگر قضا سے تو کسی کا بس نہیں چلتا آخر ان کا انتقال ہو گیا۔ باپ کے سامنے بیٹے کا مر جانا ایسا سانحہ ہے جو کلیجے سے جدا نہیں ہوتا چنانچہ اس واقعہ کے بعد منشی صاحب کی زندگی میں تغیر عظیم پیدا ہو گیا اور وہ تارک دنیا ہو گئے، ہر وقت مالا جپا کرتے تھے اور اگر کوئی شخص اپنے دکھ درد کی بات کرتا تھا تو ان کی آنکھ سے آنسو نکل آتے تھے۔ صرف اجودھیا اور پراگ جی جب اشنان کی غرض سے جاتے تھے تو کچھ مال بھی اپنے ساتھ رکھ لیتے تھے اور اسی پر بسر اوقات تھی۔ بیوی

پیچھے رہ گئی تھی۔ لڑکی بھی جوانی ہی میں مر گئی تھی۔ صرف ایک بہو باقی رہ گئی تھی جو ان کا کھانا بنا دیتی تھی۔ آخر عمر میں ان کی غذا بھی کم ہو گئی تھی۔ دن رات میں صرف ایک دفعہ کچھ کھا لیتے تھے۔ آخر اسی حالت میں تخمیناً نوے برس کے سن میں انھوں نے انتقال فرمایا۔

مرتے دم تک اُن کی بصارت و سماعت میں فرق نہ آیا تھا۔ محلے کے بہت سے مسلمان جو منشی صاحب کو دیکھ چکے ہیں اُن کا ذکر کر کے اب تک روتے ہیں اور کہتے ہیں وہ ایک صوفی صافی درویش تھے۔ ان کو ہندو سے غرض تھی نہ مسلمان سے بلکہ وہ ہمیشہ یہی چاہتے تھے کہ اُن کی ذات سے کسی فرد بشر کو فائدہ پہنچ جائے

چند پند

(۱) بہترین دوست وہ ہے جس کی دوستی رسمی نہ ہو۔

(۲) بادشاہ کا رعایا کے باب میں سستی کرنا اُس کے ظلم سے بڑھکر ہے۔

(۳) ہر شخص کو اس طرح نصیحت کرو کہ وہ تمہاری بات مان لے نہ کہ تمہارا دشمن ہو جائے۔

(۴) اپنے سے کم درجہ شخص پر مہربانی کرنا اُسے اپنا غلام بنا لینا ہے۔

(۵) ضروریات کو بڑھانے سے تکلیف اور گھٹانے سے آرام ملتا ہے۔

(۶) کسی آدمی کو تنہائی میں اُس کی بُرائیوں سے آگاہ کرنا اور اُسے سمجھانا نصیحت کہلاتی ہے لیکن چند آدمیوں کے سامنے کسی کے عیوب ظاہر کرنا بُرائی میں شامل ہے۔

(۷) اپنے ماتحت ملازم، اعزا اور دیگر اشخاص سے اسی قدر کام لو کہ وہ خوشی کے ساتھ انجام دے سکیں اور اس طرح گفتگو کرو کہ تمہارے مداح رہیں۔

(۸) ہر روز کو عمر کا آخری دن تصور کرو، کیونکہ زندگی کا اعتبار نہیں۔

(۹) نیک کام کرنے میں دیر نہ کرو۔

(۱۰) محنت سے پیدا کی ہوئی جَو کی خشک روٹی بے ایمانی، دھوکے اور ظلم کے پلاؤ سے بہتر ہے۔

(ماخوذ)　　(سید اظہر حسین سہارنپوری)

شعرا اور موت

(از جناب محمد عبدالوہاب متسلم)

قاعدہ ہے کہ سخت بیماری کی حالت میں ایسے خیالات پیدا ہوتے ہیں جن میں بیمار اپنی گذشتہ زندگی پر نہایت گہری اور ناقدانہ نظر ڈالتا ہے۔ موت کا بھیانک نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اسے یقین ہونے لگتا ہے کہ اب اس کی زندگی دشوار ہے۔ وہ اپنے اعزا و اقربا، یار و احباب یہاں تک کہ دشمنوں سے بھی عفو اور درگذر کا طالب اور امیدوار ہوتا ہے تاکہ زندگی کے بار سے سبکدوش ہو کر آرام و اطمینان کے ساتھ منزل مقصود کو روانہ ہو۔ یہ حالت انسان کے لئے بے حد خطرناک ہوتی ہے۔ قلب یونہی بیماری کی وجہ سے کمزور اور مضمحل ہوتا ہے ایسے خیالات برداشت نہیں کر سکتا اور اکثر حالتوں میں حرکت قلب بند ہونے سے موت ظہور پذیر ہوتی ہے۔

شعرا جو بہت زیادہ ذکی الحس ہوتے ہیں اس حالت سے خاص طور پر متاثر ہوتے ہیں اور اکثر اوقات بیماری میں ان کی زبان پر ایسے اشعار جاری ہو جاتے ہیں جو دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کا مرقع آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتے ہیں اور جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر اپنے مرنے کی اطلاع دے رہا ہے یا اس کے متعلق پیشین گوئی کر رہا ہے۔ ایسے اشعار لکھکر اگر کوئی شخص مر جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص کو پہلے ہی سے موت کی اطلاع مل گئی تھی اور اس نے اشعار کے ذریعہ مرنے کی پیشین گوئی کر دی تھی۔

کسی شاعر کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہر سال اپنے انتقال کی تاریخ لکھکر رکھ لیا کرتے تھے لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ جس سال ان کا انتقال ہوا اسی سال انھوں نے تاریخ نہ کہی تھی۔ غالب کے متعلق مشہور ہے کہ انھوں نے مرنے سے بیس سال قبل سنہ ۱۲۷۷ھ میں اپنے مرنے کی تاریخ اس طرح نظم کی تھی:-

منکہ باشم کہ جاوداں باشم چوں نظیری نماند و طالب مُرد
وز بپرسند در کدامیں سال مُرد غالب بگو کہ غالب مُرد

اس حساب سے انھیں سنہ ۱۲۷۷ھ میں مر جانا چاہیئے تھا مگر ایسا نہ ہوا چنانچہ میر مہدی مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"یہاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی بعد رفع فساد ہوا سمجھ لیا جائیگا"

۱۹۰۵ء میں ان کا انتقال ہوا چنانچہ مرتے وقت یہ شعر زبان پر جاری تھا:

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

اگر غالب کا انتقال ۱۲۷۷ھ میں ہوتا تو لوگ کہتے کہ دیکھو غالب کو پہلے ہی سے معلوم ہوگیا تھا اور انھوں نے صحیح پیشین گوئی کی تھی۔ ایسے واقعات ہمارے سامنے بہت کم آتے ہیں ورنہ دنیا ایسے لوگوں سے خالی نہیں جو مرتے وقت نمود و نمائش و تصنع سے نہیں چوکتے۔

صاحبِ تذکرہ آبحیات شیخ ابراہیم ذوق کے متعلق لکھتے ہیں کہ انھوں نے مرنے سے تین گھنٹے قبل یہ شعر کہا تھا

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

انیس و دبیر میں اکثر معاصرانہ چشمک رہتی تھی بیفکرے ایک کو دوسرے سے لڑانے کی فکر میں رہتے تھے چنانچہ اسی بنا پر انیسی اور دبیری پارٹیاں بھی قائم ہوگئی تھیں۔ انیس بیمار پڑے، دبیر کے ایک شاگرد نے اپنے استاد کو اطلاع دی کہ انیس عالمِ نزع میں ہیں وہ فوراً عیادت کو پہنچے اور حال دریافت کیا انھوں نے ٹھنڈی سانس لیکر فرمایا:۔

آخر ہے عمرِ زیست سے دل اپنا سیر ہے
پیمانہ بھر چکا ہے چھلکنے کی دیر ہے

انشاء اور ناسخ میں بھی اکثر معاصرانہ نوک جھونک ہوتی رہتی تھی لیکن وہ زمانہ کس قدر پر لطف تھا اور وہ لوگ کیسے نیکدل اور صاف باطن تھے کہ ایک دوسرے کے خلاف کینہ اور بغض و عداوت کو دل میں جگہ نہ دیتے تھے اور ایک دوسرے کی تکلیف و پریشانی نہ دیکھ سکتے تھے۔ چنانچہ انشاء کی بیماری کا حال سنکر مصحفی مرحوم عیادت کے لئے گئے۔ انشاء کا دماغ خراب ہوچکا تھا اور بیماری اس قدر غالب آچکی تھی کہ آنکھ بند کئے ہوئے تھے مصحفی نے نبض پر ہاتھ رکھا تو حال غیر پایا۔ بیساختہ یہ مصرع زبان سے نکل گیا۔

تیرے بیمار کو ہے عزمِ سفر آج کی رات

انشاء نے یہ سنتے ہی آنکھیں کھول دیں اور فوراً یہ مصرع پڑھا:۔ نبض چل بسنے کی دیتی ہے خبر آج کی رات۔ یہ کہا اور ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔

خواجہ آتش کے لائق شاگرد خواجہ وزیر جنھوں نے آخر عمر میں شیخ امام بخش ناسخ سے تلمذ حاصل کرلیا تھا

بستر مرگ پر لیٹے تھے یار و احباب چاروں طرف جمع تھے یکایک دنیا سے جانے والے نے حالت بیہوشی سے کچھ ہوشیار ہو کر یہ شعر پڑھا اور ہمیشہ کے لئے بیہوش ہو گیا۔

بیمارِ محبت نے ابھی یاد کیا تھا
خوب آ گئی اے موت تری عمر بڑی ہے

خواجہ آتش کے شاگرد عزیز اور فخر لکھنؤ پنڈت دیا شنکر نسیم نہایت خوش گو شاعر تھے۔ ذہن بھی سیماب پا پایا تھا کہ ایک مرتبہ خواجہ آتش نے جتنی دیر میں اپنی ایک نو تصنیف غزل لکھوائی انھوں نے اس پر جھٹ سے گا کر مخمس بنا دیا۔ عالم نزع میں یہ شعر آپ کی زبان پر جاری تھا:-

پہنچی راحت نہ ہم سے کسی کو بلکہ اذیت کوش ہوئے
جان پڑی تب بارِ شکم تھے مر کے وبالِ دوش ہوئے

سلطان واجد علی شاہ اختر شاہ اودھ کو زمانہ [illegible] کیوں نہ کہے؟ ان کا دل وطن اور وطن والوں کی محبت سے معمور تھا چنانچہ جس وقت لکھنؤ سے مٹیا برج (کلکتہ) روانہ کئے گئے یہ حسرت ناک شعر ورد زبان تھا:-

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اس کس قدر حسرت آمیز شعر ہے سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ مٹیا برج کے زمانہ قیام اور وہاں کی تکالیف پر ایک مثنوی لکھی تھی جس کا نام حزن اختر ہے۔ مرحوم کو اگر وہاں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو تو اس سے بڑھ کر اور کیا تکلیف ہو سکتی ہے کہ سلطنت چھن گئی آزادی سے محروم اور وطن و اہل وطن سے دور ہو گئے تھے اس غریب الوطنی کی حالت میں بیمار پڑے نزع کی حالت میں شدت کرب سے کراہتے دیکھ کر جاں نثاروں نے عرض کیا کہ "حضور کراہیں نہیں اس سے بدشگونی ہوتی ہے" اس وقت بھی اپنی خلقی شگفتہ مزاجی سے مسکرا کر کہنے لگے:-

آہ کرتے ہیں تو سب لوگ خفا ہوتے ہیں
اے نسیم سحری! ہم تو ہوا ہوتے ہیں

یہ کہا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر کے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گئی۔

عرفی شیرازی اپنی بلند پروازی اور نازک خیالی کے لئے [illegible] ۹۹۹ھ میں [illegible] بوقت رحلت یہ رباعی کہی جو یادگار رہے گی:-

باقی دمِ نزع است ہماں ہستی تو آیا بچہ امید بار بستی تو
مرد است کے دولتِ کونین بکف جویائے متاع است تہی دستی تو

اسی طرح ملا فیضی کے متعلق مشہور ہے کہ ۱۰۰۳ھ میں سخت بیمار ہوئے شہنشاہ اکبر کو دونوں بھائی بیحد عزیز تھے، چنانچہ عیادت کے لئے تشریف لے گئے، حالت غیر تھی شہنشاہ کو دیکھکر یہ رباعی عرض کی۔

دیدی کہ فلک بمن چہ نیرنگی کرد مرغ دلم از قفس بر آہنگی کرد
آں سینہ کہ عالمے درد مے گنجید تا نیم نفس بر آورم تنگی کرد

سرمد شہید کے متعلق مشہور ہے کہ عالموں کے فتوے کے بموجب قتل کئے گئے تو یہ شعر ان کی زبان پر جاری تھا:

سرجدا کرد از تنم شوخے کہ با ما یار بود
قصہ کوتہ کرد ورنہ دردِ سر بسیار بود

مولوی محی الدین خاں ذوق کاکوروی اردو و فارسی کے ماہر اور بلند پایہ شاعر خصوصاً تاریخ گوئی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ اُن کی بہت سی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف موجود ہیں۔ فارسی میں ان کے استاد منشی محمد مہدی جلال آبادی اور اردو میں نواب مرزا خاں شوق لکھنوی تھے۔ مرحوم کو تاریخگوئی میں اس قدر ملکہ تھا کہ دعویٰ کرتے تھے کہ "میں مسلسل چھ گھنٹہ تک تاریخ میں گفتگو کر سکتا ہوں یعنی جو لفظ یا فقرہ زبان سے نکلے اس میں تاریخ ہو" انھوں نے متعدد بے مثل تاریخیں کہی ہیں۔ ۱۳۰۲ھ میں بیمار ہوئے۔ عالمِ نزع میں فرمایا:۔

دریں سال ہجری یقیں داشتم کہ گریم نصیب است پنداشتم
زہاتف سنِ فوت خود خواستم بگفتا بگو ذوق برخاستم

مولوی نادر علی خاں صاحب نادر کاکوروی ان اہلِ کمال افراد سے تھے جن کی آغوشِ شفقت میں جدید شاعری نے پرورش پائی۔ ۱۹۱۲ء میں انتقال ہوا۔ ہنگام نزع میں یار و احباب اعزا و اقربا کا مجمع تھا، مرحوم آنکھیں بند کئے لیٹے تھے۔ اس وقت ان کے چھوٹے بھائی نے ایک صاحب سے کہا کہ میں نے رات کو خواب میں ایک غزل کہی تھی جو اب بالکل فراموش ہو گئی ہے۔ فقط ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ مرنے والے نے آنکھیں کھول لیں اور سنانے کی فرمایش کی۔ انھوں نے کہا

قفس میں مرغِ بسمل کے تڑپنے میں مزا کیا ہے

مرحوم نے بے ساختہ یہ مصرع لگا کر مطلع بنا دیا:۔

نکل جانِ حزیں اِس جسمِ خاکی میں دھرا کیا ہے

شاید اس مصرع ہی کے لئے جان اٹکی رہ گئی تھی مصرع کہتے ہی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور یہ مطلع یادگار رہ گیا:

نکل جانِ حزیں اس جسمِ خاکی میں دھرا کیا ہے
قفس میں مرغِ بسمل کے تڑپنے میں مزا کیا ہے

حضرت فاخر الہ آبادی کے ایک خالہ زاد بھائی تھے محمد اسمٰعیل نام ذبیح تخلص الہ آباد میں طاعون زوروں پر تھا انھوں نے یہ مطلع کہا

وائے محرومی کہ عاشق مر گیا دیدار سے
مثلِ سبزہ بے پھلے پھولے گیا گلزار سے

پھر اسی کاغذ کی پشت پر ایک غزل لکھی، اُسی روز بخار آیا اور غفلت طاری ہو گئی جس وقت حضرت فاخر باہر سے تشریف لائے اور اُن کی حالت خراب دیکھی ماں نے کہا "اچھے میاں (ذبیح کا عرف تھا) آنکھیں کھولو" مرحوم نے آنکھ کھولی اور جیب سے نکال کر وہ کاغذ دیا جس پر انھوں نے اپنی موت کا واقعہ نظم کیا تھا یعنی مذکورہ بالا مطلع اور غزل مرحوم دو روز بیمار رہکر اعلیٰ علیین کو سدھار گئے۔

جونپور میں ایک صاحب غبار تخلص رہتے تھے کلام سیدھا سادہ اور صاف ہوتا تھا اور عمر کے آدمی تھے، ایک دن بیمار ہوئے علالت معمولی تھی نہیں معلوم اس حال میں دل پر کیا گذری مقطع میں تاریخِ وفات نظم کر گئے دو ہی دن میں رہگرائے عالمِ باقی ہوئے۔

ایک مصرع میں کہہ کے وہ تاریخ
غش ہوئے اے غبار کیا کہنا
۱۲۸۱

مالک الدولہ صولت لکھنؤ کے خاص نوابوں سے تھے انھیں تاریخ گوئی میں خاص ملکہ تھا اولاد کوئی نہ تھی اس لئے اکثر افسردہ رہتے تھے چنانچہ مرتے وقت انھوں نے یہ قطعہ نظم کیا جس میں خاتمۃ النسل پر افسوس کیا ہے

بعد ہمارے نہیں باقی نشاں ۔۔۔ نام ہوا جد و پدر کا تباہ
مرض الموت میں صولت لکھئے ۔۔۔ خاتمۂ نسل ہوا حیف آہ

انھوں نے اسی حالت میں مندرجہ ذیل رباعی بھی بادشاہ کی خدمت میں بھیجی تھی:۔

یارب یہ ہو بادشاہ کشور کا ۔۔۔ اقبال ہو دارا کا حشم قیصر کا
تا قائم دہر رہے اس کا دور ۔۔۔ یوں اوج گزیں ستارہ ہو اختر کا

ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیچیدہ مسائل

(از اخبار نویس)

ملک ہند کی تازہ مردم شماری

ہر ایک مہذب حکومت ہر دس سال کے بعد مردم شماری کرتی ہے جس سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اس کی آبادی بڑھ یا گھٹ رہی ہے۔ اس کے ساتھ کئی اور باتیں بھی دریافت ہو جاتی ہیں، مثلاً خانہ شماری یعنی ملک کے اندر کتنے مکانات آباد اور کتنے غیر آباد ہیں، ہر ایک آباد گھر کے اندر کتنے آدمی بستے ہیں، مرد و عورت، لڑکے لڑکیاں، ہر ایک کی عمر بھی قلمبند ہوتی ہے۔ مذہب، پیشہ، تعلیمی حالت کا حال معلوم ہو جاتا ہے، پڑھے لکھے لوگوں میں کتنے آدمی مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانوں میں خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ حکومت انگلشیہ ۱۸۷۲ء سے ہندوستان کی مردم شماری کرتی چلی آتی ہے۔ اس سے پہلے سارے ملک ہند کی باضابطہ مردم شماری کبھی نہیں ہوئی تھی۔ البتہ ۱۸۵۵ء میں صوبہ پنجاب کی مردم شماری کی گئی تھی اور اس کے بعد دیگر کئی صوبوں کی مردم شماری بھی ہوئی تھی۔

لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ مردم شماری کا دستور انگریزوں کی جدت ہے مگر یہ خیال غلط ہے۔ پرانے زمانے میں بھی مردم شماری ہوا کرتی تھی۔ چندر گپت اعظم موریہ کے عہد میں مردم شماری، خانہ شماری اور خسرہ گرداوری کا دستور تھا۔ مرد و عورت، لڑکے لڑکیوں کے نام درج رجسٹر ہوتے تھے۔ پیدائش و اموات کے رجسٹر ہر قصبہ اور شہر میں رکھے جاتے تھے۔ دیہات میں کھیتوں کے نمبر اور ملکیت کا باقاعدہ اندراج ہوتا تھا۔ اسی طرح شہروں میں مکانوں کا اندراج رجسٹروں میں کیا جاتا تھا۔ مالکان مکانات کے نام خانہ ملکیت میں درج کئے جاتے تھے۔ سڑکوں پر میلوں کے نشانات نصب کئے جاتے تھے۔ چوراستوں پر مختلف شہروں اور مقاموں کے نام اور فاصلے درج کئے جاتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ دفتر شاہی حکومت چندر گپت اعظم کے نظام حکومت کی ہو بہو نقل ہے۔ انجیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس وقت عیسائی مذہب کے بانی یسوع مسیح کا اس دنیا میں ظہور ہو رہا تھا تو قیصر روما گسٹس کے حکم سے فلسطین کی مردم شماری ہوئی تھی۔ یوسف بڑھئی اور حضرت مریم نام درج کرانے کو بیت اللحم آئی تھیں اور اسی دوران میں مسیح کی ولادت واقع ہوئی تھی۔ مگر عرصہ معینہ کے بعد باقاعدہ مردم شماری زمانہ حال کی قابل قدر اختراع ہے۔

۱۹۳۱ء کی مردم شماری

۲۶۔ فروری ۱۹۳۱ء کو تمام ملک ہند اور ریاستوں کے لوگوں کا چھٹی بار جائزہ لیا گیا
قسم کے اعداد مہیا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس بارے مختلف گروہوں نے خصوصیت سے حکام کو مختلف قسم
کے مشورے دیئے۔ ایک فرقہ نے بار بار درخواست کی کہ ہندوؤں کی ذات پات کا امتیاز اڑا دیا جائے۔ د
قوں نے اور ہی قسم کے مطالبات کئے۔ خیر، مردم شماری کی کارروائی تکمیل کو پہونچی۔ کاغذات میں غلطیوں سے بچنے
راج ہوتا رہا جس کی تصدیق ۲۶۔ فروری کی رات کو ہوئی۔ محکمہ مردم شماری کی طرف سے تمام صوبوں کے اعداد
م کرکے اجمالی کیفیت گورنمنٹ ہند میں پیش ہوئی جس کا اعلان ۱۹ ستمبر کو شملہ سے کیا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے
مام ملک ہند کی کل آبادی ۳۵ کروڑ ۲۹ لاکھ ۸۶ ہزار ۸۷۶ نفوس ہے۔ ان میں ۱۸ کروڑ ۱۹ لاکھ ۱۲ ہزار مرد
ر ۱۷ کروڑ ۱۰ لاکھ ۷۴ ہزار عورتیں ہیں۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مقابلہ میں اب کے ۱۰.۶ فیصدی بیشی
ئی ہے۔ انگریزی صوبجات اور علاقے کی مجموعی مردم شماری ۲۷ کروڑ ۱۰ لاکھ ۳۰ ہزار ہے۔ اور باقی سات کروڑ
لاکھ تیرہ ہزار ۶۹۱ ریاستوں کی آبادی ہے۔ رقبہ اٹھارہ لاکھ مربع میل ہے جس میں سے تہائی ریاستوں کے
ر اہتمام ہے۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیان ملک ہند کی آبادی میں تین کروڑ ۴۰ لاکھ ۴۴ ہزار اضافہ
ا ہے۔ کیونکہ دس برس پیشتر کی مردم شماری کی رو سے سلطنت ہند کی مجموعی آبادی ۳۱ کروڑ ۸۹ لاکھ ۴۲ ہزار
دس تھی۔ یہ بیشی جو گذشتہ دس سال کے دوران میں ہوئی ہے قابل قدر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ استادان
رب کے خیال کی رو سے ملک ہند کی اقبال مندی اور شوکت اس کی بڑھتی ہوئی آبادی سے عیاں ہے

بلحاظ مذاہب آبادی کئی گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ہندو ۲۳ کروڑ ۸۲ لاکھ ۳۰ ہزار۔ مسلمان ۷ کروڑ
لاکھ ۳۴ ہزار۔ عیسائی ۵۹ لاکھ ۶۱ ہزار ۷۹۴ اور سکھ ۴۳ لاکھ ۶ ہزار ۴۴۲ نفوس ہیں۔ سکھوں نے ۳۳
صدی۔ عیسائیوں نے ۲۵ فیصدی، مسلمانوں نے ۱۱ اور ہندوؤں نے ۸ فیصدی کے قریب ترقی کی
ے۔ اس بات کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ ہر سال ہزارہا آدمی ہندوؤں میں سے نکل نکل کر سکھ، مسلمان
عیسائی ہوتے جاتے ہیں، اگر یہ قباحت نہ ہو تو ہندو آبادی کا اوسط اتنا ہلکا نہ ہو جتنا کہ دکھائی دیتا ہے
ب سے آباد صوبہ بنگال ہے جس کی آبادی ۵ کروڑ ہے۔ مسلمان پونے تین کروڑ، ہندو دو کروڑ ۱۵ لاکھ ۴۷
ر۔ دوسرے درجہ پر یو۔ پی ہے جس کی کل آبادی چار کروڑ اسی لاکھ ہے۔ اس میں ہندو چار کروڑ اور مسلمان
لاکھ ۱۰ ہزار ہیں۔ تیسرے درجہ پر مدراس ہے جس کی ساری آبادی چار کروڑ ۶۵ لاکھ ہے مسلمانوں کا
قلیل یعنی ۳۲ لاکھ سولہ ہزار ہے۔ پھر بہار و اڑیسہ کا نمبر ہے۔ پنجاب کا درجہ بلحاظ آبادی پانچواں ہے
آبادی دو کروڑ ۳۵ لاکھ اسی ہزار ہے۔ مسلمان ایک کروڑ ۳۳ لاکھ ۳۲ ہزار، ہندو ۶۲ لاکھ ساڑھے ۲۰
ر اور سکھ ۳۰ لاکھ ۶۴ ہزار ہیں۔ برطانوی صوبجات کے کل ۲۶۷ اضلاع ہیں جن کا رقبہ بالاوسط چار ہزار

مربع میل سے زیادہ ہے۔ وزیگاپٹم (مدراس) سب سے بڑا ضلع ہے جس کا رقبہ ۱۹۲۱ء میں سترہ ہزار ۲۲۳ میل اور آبادی تیس لاکھ تھی اور سب سے گنجان آباد ضلع میمن سنگھ (بنگال) ہے، جس کی مردم شماری سے دس سال پہلے ۴۵ لاکھ نفوس تھی۔ جو یورپ کی کئی خود اختیار حکومتوں سے زیادہ ہے مثلاً ایرلینڈ، سوئٹزرلینڈ، یونان، بلگیریا، ہالینڈ، ڈنمارک و بلجیم۔

ساٹھ سالہ ترقی
انیسویں کی تین گنتیوں کے اعداد

سب سے پہلی مردم شماری ملک ہند کی ۱۸۷۱ء میں ہوئی تھی، غالباً یہ امتیاز صوبہ پنجاب ہی کو حاصل ہے کہ اول مرتبہ ۱۸۵۵ء میں اس کے باشندوں کی صحیح اور باقاعدہ گنتی ہوئی تھی اور صوبوں کی بعد میں مردم شماری ہوئی۔ ۱۸۷۲ء میں سارے ملک میں بیس کروڑ ۶۲ لاکھ ۹۹ ہزار ۶۱۱ آدمی تھے، یہ رقبہ جس کے باشندوں کا صحیح تخمینہ لگایا گیا تھا دس لاکھ مربع میل سے اوپر تھا۔ مرد دس کروڑ باسٹھ لاکھ ۲۳ ہزار اور عورتیں دس کروڑ دو لاکھ ۷۶ ہزار تھیں۔ دوسری مردم شماری ۱۸۸۱ء میں ہوئی، ملک کا رقبہ تیرہ لاکھ ۸۲ ہزار مربع میل تھا۔ کل آبادی ۲۵ کروڑ ۳۸ لاکھ ۹۱ ہزار نفوس تھی۔ قصبات و دیہات سات لاکھ پونے پندرہ ہزار، آباد مکانات چار کروڑ ۳۵ لاکھ ۲۴ ہزار اور ساڑھے چھیالیس لاکھ سے کم خالی تھے۔ مرد بارہ کروڑ ۹۹ لاکھ ۴۲ ہزار، عورتیں بارہ کروڑ ۳۹ لاکھ ۵۰ ہزار تھیں۔ اوسط آبادی فی مربع میل ۱۸۴ نفوس تھی۔ بلحاظ مذہب ہندو ۱۸ کروڑ ۷۹ لاکھ ساڑھے ۳۷ ہزار، مسلمان ۵ کروڑ، اصل باشندے سوا چونسٹھ لاکھ، بودھ سوا چونتیس لاکھ، عیسائی ۱۸ لاکھ ۶۲ ہزار، سکھ ۱۸ لاکھ ۵۳ ہزار، جین مت والے بارہ لاکھ ۲۱ ہزار، پارسی ۸۵ ہزار ۳۹۷، یہودی اٹھارہ ہزار سات سو، برہم سماج والے ۱۱۴۷ تھے۔ سارے ملک کی بیوہ عورتوں کا شمار دو کروڑ تھا جس میں مسلمان ۴۰ لاکھ تھیں اور ہندو ایک کروڑ ۶۱ لاکھ۔ آخر الذکر کا شمار سب سے زیادہ اس وجہ سے تھا، کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں میں بیوہ عورتوں کی دوسری شادی نہیں ہوتی۔ گو حال میں روشن خیال لوگوں نے پرانے دستور کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہندوستانی بولنے والے سوا آٹھ کروڑ اور بنگالی بولنے والے چار کروڑ سے کچھ کم تھے۔ کل ملک میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ۹۷ لاکھ کے قریب تھی جس میں پونے تین لاکھ عورتیں تھیں۔ طلبا پونے انتیس لاکھ تھے۔ ۱۸۷۲ء اور ۱۸۸۱ء کے درمیانی دس سالوں میں چار کروڑ ۴۷ لاکھ آدمیوں کی بیشی ہوئی۔ اور یہ تمام مردم شماریوں کی دہ سالہ ترقیوں میں بڑھ کر ہے۔

تیسری گنتی ۱۸۹۱ء میں ہوئی، کل رقبہ جس کے باشندوں کی مردم شماری ہوئی، پندرہ لاکھ ساٹھ ہزار مربع میل تھا، کل آبادی ۲۸ کروڑ ۷۲ لاکھ ۲۳ ہزار نکلی۔ اوسط آبادی فی مربع میل ۱۸۴ نفوس تھا انگریزی اضلاع کا مجموعی رقبہ ۹ لاکھ ۶۴ ہزار ۹۹۳ مربع میل تھا، ریاستوں کا پانچ لاکھ ۹۵ ہزار مربع میل تھا

ریاستوں کے زیر حکومت آبادی کا صحیح تخمینہ چھ کروڑ ساڑھے ۶۰ لاکھ پایا گیا۔ تمام ہندوستان کے دیہات و قصبات سات لاکھ سترہ ہزار تھے اور شہر ۲۰۳۵ نکلے۔ مکانات پانچ کروڑ ۲۹ لاکھ پائے گئے۔ شہری آبادی کی تعداد پونے تین کروڑ برآمد ہوئی۔ مردوں کی تعداد چودہ کروڑ ۷۰ لاکھ اور عورتوں کی چودہ کروڑ چار لاکھ تھی۔ سنہ ۱۸۸۱ء اور سنہ ۱۸۹۱ء کے درمیان دو کروڑ ۸۰ لاکھ کی بیشی برآمد ہوئی۔ بلحاظ مذہب ہندو (۲۰۷) کروڑ ۷۷ لاکھ ۳۱ ہزار۔ آریہ ۳۹ ہزار ۹۵۲ اور برہمو سماج والے ۳۰۵۱۔ سکھ ۱۹ لاکھ۔ مسلمان پانچ کروڑ ۷۳ لاکھ اور عیسائی ۲۲ لاکھ ۸۴ ہزار۔ اصل باشندے ۹۲ لاکھ ۸۰ ہزار ۔۔۔ سارے ملک میں بیوہ عورتوں کا شمار سوا دو کروڑ تھا۔ پڑھے لکھوں کی تعداد ایک کروڑ ۲۰ لاکھ تھی جن کا اوسط ۴.۶۱ فیصدی مرتب ہوتا ہے۔ سب سے بڑا شمار ان پڑھوں کا مسلمانوں میں پایا گیا۔ ہزار میں ۹۲۹ سکھوں میں ہزار میں ۹۰۴، ہندوؤں میں ۸۹۵، عیسائیوں میں ۷۶۵ اور پارسیوں میں ۲۲۳ فی ہزار ان پڑھ تھے۔ تمام ملک میں ہندو بیوہ عورتیں ایک کروڑ ۵۴ لاکھ اور مسلمانوں میں ساڑھے ۴۵ لاکھ تھیں بھیک منگوں کے لشکروں کا شمار ۱۴ لاکھ، رنڈیوں کی تعداد ایک لاکھ ۶۷ ہزار، اپاہج (لنگڑے، لولے، اندھے، کوڑھی وغیرہ) چھ لاکھ ۲۹ ہزار تھے۔

<u>بیسویں صدی کی گنتیاں</u> موجودہ صدی کے آغاز کے بعد ہی پہلی مردم شماری مارچ سنہ ۱۹۰۱ء میں ہوئی تھی کل رقبہ ۱۷ لاکھ ساڑھے ۶۶ ہزار مربع میل تھا اور آبادی ۲۹ کروڑ ۴۳ لاکھ ۶۱ ہزار ہوئی۔ ریاستوں کا رقبہ چھ لاکھ اٹھارہ ہزار مربع میل اور آبادی چھ کروڑ باسٹھ لاکھ نفوس تھی۔ شہر ۲۱۴۸ دیہات سات لاکھ ۲۸ ہزار ہوئے۔ ہندو بیس کروڑ ۷۱ لاکھ ۴۷ ہزار، آریہ سماجی ایک لاکھ ساڑھے نوے ہزار اور برہمو سماج ۴۰۵۰ تھے۔ سکھ ۲۱ لاکھ ۹۵ ہزار۔ مسلمان چھ کروڑ ۲۴ لاکھ ۵۸ ہزار۔ عیسائی ۲۹ لاکھ ۲۳ ہزار تھے۔ بیوہ عورتیں دو کروڑ ۵۹ لاکھ جس میں ہندو ایک کروڑ ۹۰ لاکھ اور مسلمان ۵۴ لاکھ ۵۹ ہزار تھیں۔ خواندہ جماعت کا شمار ایک کروڑ ۵۶ لاکھ ۸۶ ہزار تھا جس میں عورتیں فقط نو لاکھ ۹۶ ہزار تھیں۔ انگریزی خوانوں کی تعداد سوا گیارہ لاکھ تھی جس میں ایک لاکھ تین ہزار عورتیں تھیں۔ اپاہج چھ لاکھ ۸۵ ہزار، رنڈیاں پونے دو لاکھ تھیں۔ سنہ ۱۸۹۱ء اور سنہ ۱۹۰۱ء کے درمیانی عرصہ میں ۲۴ لاکھ ۷۰ ہزار بیشی ہوئی جو سنہ ۱۸۸۱ء اور سنہ ۱۸۹۱ء کی مردم شماریوں کے مقابلہ میں بہت تھوڑی ہے۔ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ اس عرصۂ دہ سالہ میں اول مرتبہ طاعون نمودار ہوا اور سنہ ۹۹-۱۹۰۰ء میں زمانۂ حال کا سب سے بڑا قحط نمودار ہوا تھا۔ سنہ ۱۸۸۱ء اور سنہ ۱۹۰۱ء کے درمیان آٹھ کروڑ اکاسی لاکھ اور ۹۸ ہزار آدمیوں کا اضافہ ہوا۔

دوسری مردم شماری سنہ ۱۹۱۱ء میں ہوئی۔ ملک کا رقبہ ۱۸ لاکھ دو ہزار ۶۵۷ مربع میل تھا، ریاستوں کا

رقبہ سات لاکھ نو ہزار ۲۰۰ مربع میل نکلا۔ کل آبادی ۳۱ کروڑ ساڑھے ۱۵ لاکھ نفوس ہوئی۔ مرد سولہ کروڑ تیرہ لاکھ ۳۸ ہزار، عورتیں پندرہ کروڑ ۳۰ لاکھ سترہ ہزار تھیں۔ باعتبار مذہب ہندو ۲۱ کروڑ ۷۵ لاکھ ۰۰ ہزار، آریہ دو لاکھ ۴۳ ہزار، برہم سماج والے (۵۵۰۴) تھے۔ سکھ ۳۰ لاکھ چودہ ہزار، مسلمان چھ کروڑ ۶۰ لاکھ ۴۷ ہزار، اور عیسائی ۳۸ لاکھ ۷۰ ہزار تھے، پارسی ایک لاکھ۔ بیوہ عورتیں دو کروڑ ۶۴ لاکھ ۲۱ ہزار تھیں، جن میں ہندو بدھوائیں ۱۰ کروڑ، اور مسلمان مستورات بیوہ ۴۶ لاکھ ۵۲ ہزار تھیں۔ پڑھے لکھے آدمیوں کا تخمینہ ایک کروڑ ۸۵ لاکھ ۳۹ ہزار تھا، جس میں عورتیں سولہ لاکھ تھیں، انگریزی خوانوں کی تعداد سولہ لاکھ ستر ہزار تھی جس میں ایک لاکھ باون ہزار عورتیں تھیں۔ مسلمان انگریزی خوان ایک لاکھ ۷۹ ہزار مگر عیسائی تین لاکھ ۹۵ ہزار تھے۔ بھکاری، آوارہ گرد اور رنڈیاں وغیرہ پنجاب میں پانچ لاکھ ۸۰ ہزار جس میں مسلمانوں کی تعداد چار لاکھ ۲۲ ہزار، یو۔پی میں چار لاکھ ۹۶ ہزار، بنگال میں چار لاکھ ۳۱ ہزار تھے۔ اس سے ان کی مجموعی تعداد کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۱۱ء کے درمیان دو کروڑ پونے آٹھ لاکھ آدمیوں کی بیشی ہوئی۔ اگر پلیگ اور ۱۹۰۸ء کے وبائی بخار اور دیگر مہلک امراض کا لحاظ کیا جائے تو یہ اضافہ بھی غنیمت ہے۔

تیسری مردم شماری ۱۹۲۱ء کی ہے، رقبہ جس کے باشندوں کا شمار کیا گیا اٹھارہ لاکھ ۵ ہزار ۳۳۲ مربع میل ہے اور کل آبادی ۳۱ کروڑ ۸۹ لاکھ ۴۲ ہزار ہوئی، ریاستوں کا رقبہ سات لاکھ ۱۱ ہزار اور آبادی سات کروڑ ۱۹ لاکھ ۳۹ ہزار تھی۔ سارے ملک میں مرد سولہ کروڑ ۳۹ لاکھ ساڑھے ۹۵ ہزار اور عورتیں ساڑھے پندرہ کروڑ تھیں۔ دس سال میں فقط ۳۸ لاکھ ۶۶ ہزار آدمیوں کی بیشی ہوئی۔ ترقی کا اوسط شرح ۱ء۲ فیصدی برآمد ہوا۔ اصل یہ ہے کہ ۱۹۱۸ء کے وبائی زکام کی نذر آبادی کا ایک بڑا حصہ ہوگیا جس کی تعداد کا اندازہ دشوار ہے، طاعون اور دیگر پرانے امراض بھی شامل تھے۔ ساڑھے چار سال تک جنگ رہی جس میں بہت آدمی مارے گئے۔ مذہب کے اعتبار سے ہندو ۲۱ کروڑ ۶۰ لاکھ ۳۴ ہزار، سکھ ۳۲ لاکھ ۳۹ ہزار، مسلمان چھ کروڑ ۸۰ لاکھ ۳۵ ہزار، عیسائی ۴۷ لاکھ ۵۴ ہزار، پارسی ایک لاکھ، اصل باشندے خرافات پرست دکھائے گئے ہیں جن کا شمار ۹۸ لاکھ تھا۔ آریہ سماج کے ممبر چار لاکھ ساڑھے ۶۷ ہزار اور برہم سماج والے ۶۳۸۸، اور جین مت کے لوگ گیارہ لاکھ ساڑھے ۷۸ ہزار تھے۔ بیوہ عورتوں کا شمار دو کروڑ ۶۸ لاکھ ۳۵ ہزار تھا، جس میں ہندو دو کروڑ پانچ لاکھ اور مسلمان ۴۸ لاکھ ۱۲ ہزار تھیں۔ پڑھے ہوؤں کا شمار دو کروڑ سوا ۲۶ لاکھ تھا، انگریزی دانوں کی تعداد ۲۵ لاکھ سوا ۷۲ ہزار تھی۔ ہندو پندرہ لاکھ ۹۷ ہزار اور مسلمان تین لاکھ اور عیسائی دو لاکھ ۶۰ ہزار انگریزی خواں تھے۔ عورتیں دو لاکھ ۲۰ ہزار انگریزی پڑھی ہوئی تھیں، آوارہ گرد

بھک منگے اور رنڈیاں وغیرہ ۲۲ لاکھ شمار ہوئی تھیں۔ ۷۰ فیصدی آبادی زراعت پر بسر اوقات کرتی ہے۔ اندھے، کوڑھی، لنگڑے لولے وغیرہ پونے، سات لاکھ تھے۔

بیسویں صدی کے دوران میں چار مرتبہ مردم شماری ہوئی۔ ۱۹۰۱ء کی رو سے بیشی ۴۷ لاکھ ۰ ہزار۔ ۱۹۱۱ء کی گنتی کے رو سے دو کروڑ پونے آٹھ لاکھ۔ ۱۹۲۱ء کے اعداد کے مطابق ۲۳ لاکھ ۹۶ ہزار اور ۱۹۳۱ء کی گنتی میں آبادی کی ترقی ۳ کروڑ ۴۰ لاکھ ۴۴ ہزار مرتب ہوئی۔ گویا گذشتہ تیس سال میں چھ کروڑ ۲۲ لاکھ ۲۶ ہزار آدمیوں کا اضافہ ہوا ہے۔ انیسویں صدی کی تین گنتیوں میں (۱۸۷۲ء سے ۱۸۹۱ء) آٹھ کروڑ ساڑھے گیارہ لاکھ کا اضافہ ہوا تھا۔ گویا ۱۸۷۲ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیان تقریباً ساٹھ سال کے عرصہ میں ملک ہند کی آبادی میں چودہ کروڑ ۳۲ لاکھ ۸۶ ہزار آدمیوں کی بیشی ہوئی۔

تعلیمی ترقی کا رجحان

آبادی کی سال بسال بیشی ملک کی اقبالمندی کی دلیل ہے جیسا کہ ماہران اقتصادیات اور سیاست کا خیال ہے۔ مگر تمام ترقیاں آبادی کی تعلیمی ترقیوں سے منسلک ہوتی ہیں۔ اگر پڑھے لکھے آدمیوں کی ترقی سے اندازہ کیا جائے تو بھی ترقی نظر آتی ہے، گو اس کی رفتار ایسی نہیں ہے جس پر اہل وطن اور قوم پرست فخر کر سکیں۔ ۱۸۸۱ء میں طلبا کی تعداد ۲۸ لاکھ ۹۰ ہزار تھی، اور خواندہ مرد و عورت سوا ۹۰ لاکھ تھے۔ ۱۹۲۶-۲۵ء میں انگریزی اضلاع کے ہر قسم کے زیر تعلیم طلبا کا تمام ۹۳ لاکھ لڑکے اور گیارہ لاکھ ستر ہزار لڑکیاں تھیں، میزان کل ایک کروڑ پانچ لاکھ سترہ ہزار ہوتی ہے۔ گویا پینتالیس سال میں ۳½ گنا ترقی ہو گئی۔ ۱۹۲۱ء میں پڑھے ہوئے دو کروڑ سوا ۴۰ لاکھ پائے گئے۔ ۱۹۳۱ء کے تفصیلی اعداد ابھی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے ہیں وس تعداد میں اسی رفتار سے ترقی نہیں ہوئی ہے جیسی طلبا کے شمار میں نظر آتی ہے ایک ۲½ گنا مرتب ہوتی ہے ۱۹۱۱ء کے اعداد مردم شماری کی رو سے پڑھے ہوئے ۸۴ر۵ فیصدی تھے جو ۱۹۲۱ء میں ۹۳ر۱ فیصدی پائے گئے مگر انگریزی اضلاع کا اوسط چودہ فیصدی پایا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں گیارہ فیصدی مرتب ہوا تھا۔ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان اوسط شرح ۱½ گنی بڑھ گئی۔ انگریزی صوبوں میں بنگال سب سے بڑھا ہوا ہے جس کا اوسط ۲۲ر۵ فیصدی ہے اور اس کا درجہ دوسرا ۴ر۲۱ بمبئی کا ۴ر۱۹ فیصدی آسام کا ۱ر۱۵ بہار و اڑیسہ ۷ر۱۲ ممالک متوسط کا ۴ر۱۰ پنجاب کا ۷ر۹ اور یو۔پی کا ۱ر۱۰ فیصدی تھا، مگر برہما سب سے بڑھ گیا۔ اس کا ۶۴ فیصدی اوسط خواندگی تھا۔ ریاستوں میں ٹراونکور ۴۹ فیصدی، کوچین ۷ر۲۱ فیصدی، بڑودہ ۴ر۲۱، میسور ۱۱ فیصدی، راجپوتانہ ۸ر۹، حیدرآباد دکن ۷ر۵ فیصدی اور کشمیر کا ۶ر۴ فیصدی تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ممالک ہند کے مختلف علاقوں کا اوسط مختلف ہے۔ مگر اس امر کو خوب ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ملک میں پانچ کروڑ اچھوت قومیں ہیں۔ اور جو اعداد ابتدائی بالا مندرجہ بیان کئے گئے ہیں جو نوشت و خواند سے نس

ناآشنا ہیں۔ اگر اس سات کروڑ آبادی کو حساب سے خارج رکھا جائے تو اوسط ایک دم ۲۰ فیصدی کے قریب ہو جائے گا۔ اتنی بڑی آبادی کو جلاوطن کرکے روس کے لق ودق میدانوں اور افریقہ کے وسیع علاقوں میں آباد کرنا حالات سے بعید ہے۔ اس وجہ سے وطن پرست گروہوں کا یہ فرض اولیٰ ہے کہ وہ اس پست حال اور ذلیل آبادی کی اخلاقی حالت سدھاریں ورنہ ملک ہمیشہ ان پڑھوں کے شمار کے سبب سے جاہل نظر آئے گا۔ اور ترقی کی رفتار شکستہ رہے گی۔

مردوں اور عورتوں کا تناسب

ملک ہند میں جہاں اور باتیں سب سے نرالی ہیں وہاں ایک بات یہ بھی ہے کہ مردوں کا شمار عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، اور اس میں بتدریج زیادتی ہوتی چلی جاتی ہے۔ ۱۸۷۲ء کی مردم شماری کی رو سے مرد دس کروڑ ۹۱ لاکھ ۳۲ ہزار اور عورتیں دس کروڑ دو لاکھ ۷۰ ہزار تھیں، کمی ساٹھ لاکھ سے کچھ کم تھی۔ ۱۸۸۱ء کی گنتی میں بھی فرق ساٹھ لاکھ کے لگ بھگ تھا۔ ۱۸۹۱ء میں ۶۳ لاکھ کی کوتاہی مرتب ہوئی، ۱۹۰۱ء کی مردم شماری میں مردوں اور عورتوں کی تعداد میں ۵۵ لاکھ کا خسارہ پایا گیا، مردوں کے مقابلہ میں عورتیں کم تھیں۔ ۱۹۱۱ء میں عورتوں کی کمی ۷۰ لاکھ رونما ہوئی جو ۱۹۲۱ء میں نوے لاکھ ۴۹ ہزار ہوگئی، حال کی مردم شماری میں عورتوں کی تعداد میں خسارہ ایک کروڑ ساڑھے آٹھ لاکھ پایا گیا ہے۔ انیسویں صدی کی تینوں مردم شماریوں میں عورتوں اور مردوں کا فرق ساٹھ لاکھ یا ذرا کچھ اوپر رہا۔ مگر موجودہ صدی میں شماری اختلاف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے، عورتوں کا شمار کیوں کم ہو رہا ہے؟ اس کے اسباب پر سرکاری رپورٹ میں ضروری بحث ہوگی جو شاید اگلے سال طبع ہوگی۔ مگر سرکاری اعداد کی رو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لڑکوں کی شرح ولادت لڑکیوں سے فائق ہے۔ اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ پندرہ اور تیس سال کے درمیان عورتوں کی شرح اموات مردوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے عورتوں کی کمی بڑھتی جاتی ہے اور اس کا انسداد ہونا ضروری ہے ورنہ کئی بدترین نتائج مرتب ہوں گے۔ ۱۹۲۱ء میں احاطہ مدراس میں پندرہ اور بیس سال کے مردوں کی شرح اموات ۸ء۵ فی ہزار اور اسی عمر کی عورتوں کی ۱۰ء۶ فی ہزار تھی۔ بیس اور تیس سال کے مردوں کی شرح اموات اس سال ۱۰ء۷ اور عورتوں کی ۱۱ء۶ تھی۔ پنجاب میں ۱۹۲۱ء میں اسی عمر کے مردوں کی شرح اموات ۱۱ء۲۲ اور ۱۳ء۵۰ فی ہزار تھی۔ یہی حال دوسرے صوبوں کا بھی ہے۔ شرح اموات یکساں نہیں ہے۔ بلکہ اس میں کمی بیشی پائی جاتی ہے۔ پولیس کی کارگذاری کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں کے خلاف جرائم ترقی پر ہیں، اور اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلہ میں کم ہے۔ اگر ممالک مغرب کے حالات پر غور کرو تو وہاں پر معاملہ دگرگوں ہے یعنی عورتوں کا شمار مردوں پر غالب ہے، پرتگال میں ۱۰، برطانیہ میں ۹، روس میں ۷، جرمنی میں ۶ فیصدی عورتیں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ یورپ کے باقی ملکوں میں بھی کم وبیش عورتوں کا شمار زیادہ ہے، ہندوستان میں سکھوں میں عورتوں

کی چار فیصدی، عیسائیوں میں چھ فیصدی، ہندوؤں میں پانچ اور مسلمانوں میں ۹ فیصدی خسارہ پایا جاتا ہے۔

بڑھتی ہوئی آبادی کا بارگراں اب اخیر میں اس اہم سوال پر بحث کرنا لازم ہے "ملک ہند بڑھتی ہوئی آبادی کی پرورش کا بارگراں کب تک برداشت کر سکتا ہے"۔

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ساٹھ سال کے عرصہ میں ملک کی آبادی چودہ کروڑ ۴۵ لاکھ بڑھ گئی ہے۔ اگر طاعون وبائی نزلہ اور دیگر مہلک امراض نہ ہوتے تو یہ آبادی ضرور دگنی ہو گئی ہوتی۔ اگر اسی حساب سے ہر دس سال بعد آبادی بڑھتی چلی جائے تو کچھ مدت بعد یہ مسئلہ پیدا ہوگا کہ وافر آبادی کہاں سے روزی حاصل کرے گی۔

انگریزی اضلاع کا غیر آباد رقبہ ۲۶-۱۹۲۵ء کی پیمائش کی رو سے برطانوی اضلاع کا کل رقبہ ۶۶ کروڑ ۷۰ لاکھ ایکڑ ہے جس میں آٹھ کروڑ ۶۹ لاکھ ۴۷ ہزار ایکڑ پر جنگلات کھڑے ہیں۔ پندرہ کروڑ ایکڑ رقبہ ایسا ہے کہ اسے مزروعہ کر کے آباد کرنا محال ہے۔ یہ رقبہ شہروں، قصبوں اور گاؤں کی آبادیوں، دریاؤں، ندی، نالوں، جھیلوں، تالابوں، جوہڑوں، سڑکوں، راستوں، پگڈنڈیوں کے علاوہ بالکل بنجر، ریتیلا اور کلیۃً ناقابل کاشت ہے۔ پندرہ کروڑ پونے ۱۹ لاکھ ایکڑ رقبہ قابل زراعت ہے مگر ابھی تک مزروعہ نہیں ہوا ہے۔ چار کروڑ ۹۲ لاکھ ایکڑ اراضی مزروعہ ہے مگر سال دو سال سے اس میں کوئی فصل نہیں بوئی گئی ہے۔ مزروعہ رقبہ ۲۲ کروڑ ساڑھے ۵۰ لاکھ ایکڑ ہے اور آبپاش رقبہ چار کروڑ پونے ۷۰ لاکھ ایکڑ ہے۔ اگر امساک باراں کی آفت نہ ہو تو کم و بیش ۲۲ کروڑ ایکڑ اراضی سالانہ مزروعہ ہوتی ہے جس سے ۷۲ فیصدی آبادی پرورش پاتی ہے۔ حال کی مردم شماری سے ۲۷ کروڑ پونے تیرہ لاکھ آبادی ہے جو اسی رقبہ سے معاش حاصل کرتی ہے۔ اگر ملک ہند میں وافر رقبہ نہ ہو تو بھی ۲۲ کروڑ ایکڑ اراضی میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ آئندہ ساٹھ سال کے دوران میں بڑھنے والی آبادی کی پرورش کے لئے مکتفی ہو۔

آب پاش رقبہ کی تگنی پیداوار اگر آبپاش رقبہ وضع کر دیا جائے تو پونے اٹھارہ کروڑ ایکڑ رقبہ بارانی رہتا ہے، اس کا انحصار تمامی بارش پر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہروں، کنوؤں اور تالابوں، ندی نالوں سے سیراب ہونے سے کھیتی کی پیداوار امر یقینی ہے۔ مگر بارش سے نہیں۔ اسی وجہ سے گورنمنٹ امساک باراں کے خوفناک انجام یعنی قحط کی روک تھام کے لئے عرصہ سے نہروں اور تالابوں کی فکر میں ہے کیونکہ آبپاشی سے پیداوار تگنی ہوتی ہے۔ اگر آئندہ بیس سال میں سالانہ مزروعہ رقبہ نصف آب پاش ہو جائے تو پیداوار تین گنا ہو جائیگی جس سے روز افزوں آبادی کی پرورش کا خاطر خواہ اہتمام ہو سکے گا۔ اس امر کو خوب ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ صنعت و حرفت کے کارخانوں کا آئندہ بیس سال یعنی ۱۹۵۰ء میں دگنا ہو جانے کی توقع ہے۔ ۲۶-۱۹۲۵ء میں ہر قسم کی کمپنیاں مشترکہ سرمایہ کی ۴۹۲۶ تھیں، جن کے

توسط سے لاکھوں آدمیوں کی روزی بہم پہونچ سکے گی۔ کارخانوں کے اندر کام کرنے والے کاریگروں اور مزدوروں کے علاوہ مستری اور ان کے معاون، منیجر، بابو، کلرک وغیرہ حساب کے واسطے، خام چیزیں خرید کر بہم پہونچانے والا گروہ علیحدہ ہوگا۔ کارخانوں کی تیار کی ہوئی چیزوں کے بیوپاری بھی ہزاروں ہوں گے۔ اس طرح پر صنعت کی توسیع سے لکھو کھا آدمیوں کی معاش کی معقول صورت پیدا ہو جائیگی۔

غیر مزروعہ رقبہ علاوہ ازیں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ انگریزی اضلاع میں بیس کروڑ ایکڑ آراضی غیر آباد پڑی ہے، اگر برہما کا چھ کروڑ ایکڑ قابل زراعت رقبہ وضع کر دیا جائے تو بھی چودہ کروڑ ایکڑ آراضی ایسی ہے کہ جس کو مزروعہ کرنے سے بشرطیکہ اس میں سے تہائی آبپاش ہو جائے تو جتنی آبادی ہے اس سے دگنی پرورش پا سکتی ہے۔ اور اتنی بیشی سوا سو سال میں ہو سکے گی۔ پنجاب کا ڈیڑھ کروڑ، مدراس کا سوا کروڑ، یو۔پی کا ایک کروڑ، ممالک متوسط کا ڈیڑھ کروڑ اور آسام کا ڈیڑھ کروڑ ایکڑ رقبہ بے کار اور اجاڑ پڑا ہے۔ بنگال اور بمبئی میں بھی ہے جو پونے دو کروڑ ایکڑ رقبہ کے قریب ہوگا۔ یہ بات یقینی ہے کہ عوام آبپاشی کے فوائد بخوبی سمجھتے ہیں، ہر سال کنوؤں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور گورنمنٹ نہریں نکالنے کی فکر میں ہے جس سے کروڑوں ایکڑ آراضی سیراب ہونے کی توقع ہے۔

سائنٹفک طریق کاشت قابل زراعت غیر آباد رقبہ سے قطع نظر زراعت کی ترقی سے جس سے بڑھتی ہوئی آبادی کی گزران کی نفع آور صورت مرتب ہوگی شاندار امید وابستہ ہے، جا بجا زراعتی کالج اور تجرباتی فارم قائم کئے گئے ہیں، جہاں برسوں کے تجربات کے بعد عمدہ تخم پیدا کئے گئے ہیں، کسان اور اہل زراعت دن بدن ان سے مستفید ہو رہے ہیں، الو کھے اور مفید آلات کشاورزی قبولیت حاصل کرتے جاتے ہیں جس سے رفتہ رفتہ زرعی پیداوار کی مقدار اور نفع بہت بڑھ جائے گا۔ کمزور زمین سے اچھی طرح پیداوار کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ سائنٹفک طریق کاشت سے اس نازک سوال کا اطمینان بخش جواب بہم پہونچتا ہے۔

اس مختصر بحث کا ماحصل یہ ہے کہ روز افزوں آبادی سے جو خوفناک انجام منسلک ہے وہ آئندہ ڈیڑھ سو برس تک رونما نہ ہوگا، جب ملک مزید بار گراں کا متحمل نہ ہو سکے گا تو اس زمانہ کے لیڈر کوئی صورت تلاش کریں گے۔

تنقید

مسئلۂ ارتقا اور معمۂ عالم

(از ٹھاکر جے۔ آر۔ رلئے صاحب)

مسئلۂ ارتقا کی توضیح و تشریح میں ایک چھوٹی سی کتاب موسومہ "ارتقا" مولفہ جناب اشتیاق احمد وجدی انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام حال ہی میں طبع ہوئی ہے۔ ظاہری محاسن کے لحاظ سے یہ کتاب قابل تعریف ہے مگر نفس مضمون کی صحت اور طریقۂ استدلال و تصریح نظر ثانی کی محتاج ہیں کیونکہ جو معلومات اس میں درج ہیں وہ اب فرسودہ و متروک ہو چکی ہیں۔ چونکہ ان سے اُردو داں جماعت میں اس مسئلے کے متعلق مغالطے میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے لہذا ہم ان امور کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

لفظ ریولیوشن یعنی ارتقا پر بحث کرتے ہوئے۔ اسے ہربرٹ اسپنسر کی جدت سے منسوب کیا گیا ہے مگر برطانیہ کے ممتاز پروفیسر میک برائڈ فیلو رائل سوسائٹی اپنی ایک تازہ ترین تصنیف (ایولیوشن صـ۷۶ مطبوعہ مارچ ۱۹۳۰ء) میں لکھتے ہیں:۔

"اٹھارھویں صدی میں ماہران زوالوجی (حیوانات) کے دو گروہوں میں سخت بحث چھڑ گئی تھی، ایک فرقہ اپنے آپ کو ارتقا پرست (Evolutionist) کہتا تھا جس کا یہ نظریہ تھا کہ حیوانی جسم اسی طرح بڑھتا ہے جس طرح کلی بتدریج بڑھتی کھلتی اور پختگی حاصل کرتی ہے۔ لامارک نے حیوانات کے قد اور صورت کے بتدریج بدلنے کے فطری عمل کو تغیر (Transformism) سے موسوم کیا تھا جو موجودہ زمانہ کے ماہران بیالوجی کی مقبول عام اصطلاح ارتقا کے ہم معنی ہے۔ چارلس لائل بانیٔ ارضیات نے یا تی۔ جاڑے اور مینہ کے اثر سے زمین کے طبعی خط و خال کی تبدیلیوں کا نام ارتقا رکھا تھا۔ بعد ازاں ہربرٹ اسپنسر نے فلسفۂ ترکیبی میں لامارک اور چارلس لائل اور لاپلاس کے نظریات کو ایک جامع تصور کے تابع کر کے ارتقا کے نام سے موسوم کیا۔ بعض لوگوں میں جو یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ ارتقا کی رو سے تمام مظاہر کی توجیہ ہو سکتی ہے یہ ہربرٹ اسپنسر کی بے سر و پا کلیات کی وجہ سے ہے ماہران

فزیالوجی کا ایک فرقہ سو سال سے ہربرٹ اسپنسر کے نظریہ کی تائید و تصدیق میں سرگرداں ہے
مگر وہ ہنوز کامیابی سے اتنا ہی دور ہے جتنا پچاس برس پہلے تھا۔"

پروفیسر سر آرتھر جے۔ ٹامسن رقمطراز ہیں کہ "ارتقا ایک ایسا جامع لفظ ہے جس کی توضیح محال ہے کیونکہ اس سے مراد عمل کون (*Process of Becoming*) ہے۔ اگر اسے ارتقائے موجودات ذی روح کا مترادف قرار دیا جائے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ نباتات اور حیوانات مسلسل طبعی تغیر سے معرض وجود میں آئے ہیں۔ ان کے اجداد ان سے کچھ مختلف اور نسبتاً سادہ قسم کے تھے۔ ارتقا عمل کون ہے جو ایک نوع یا نسل کے جانداروں پر عائد ہوتا ہے۔ جامع نظریۂ ارتقا کا مطلب یہ ہے کہ حال، ماضی کا بچہ اور مستقبل کا باپ ہے۔ تمام نظام موجودات ذی حیات مسلسل تبدلات سے رونما ہوتا ہے۔ اس سلسلۂ تغیر میں بعض جاندار لاکھوں برس تک اس کے عمل سے متاثر نہیں ہوتے، بعض اپنی اصلی ہیئت کھو بیٹھتے ہیں، بعض زوال سے دوچار ہوتے ہیں، بعض دوسروں کی ہستی مٹا کر سرسبز ہوتے ہیں۔ بایں ہمہ مجموعی حیثیت سے انواع میں تبدیلی اور تفاوت پیدا ہوتا رہتا ہے جس سے نئے جاندار معرض وجود میں آتے ہیں ارتقا کی بڑی بڑی تین قسمیں ہیں (۱) ارتقائے جمادات (۲) ارتقائے موجودات ذی روح اور (۳) ارتقائے تمدن۔ تصور ارتقا اب جامع تصور ہے جس کے ذریعے سے بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں اس سے کرۂ ارض کی حقیقت واضح ہوتی ہے، ماضی پر نگاہ ڈالنے سے حال پر روشنی پڑتی ہے۔ ارتقا کی حقیقت ہر قسم کے شکوک سے بیگانہ ہے، مگر اس کے اسباب اور محرکات ہنوز کماحقہ واضح نہیں ہوئے ہیں۔ یہ عقلی ہتھیار ہے جس سے ہم روزمرہ کام لیتے ہیں۔ نظام شمسی کی ابتدا اور کرۂ ارض کی ترکیب کے طریقہ پر سب سے پہلے اس کا اطلاق ہوا تھا۔ لہذا ازاں نباتات اور حیوانات پر عائد ہوا، پھر انسان اس کا محکوم ہوا، رفتہ رفتہ زبان، جمہور کے رسم و رواج اور رسمیات پر بھی چسپاں ہو گیا۔ اب کیمیائی عناصر اور جذبات و خواہشات پر بھی حاوی ہو گیا ہے۔ یہ کون و فساد کے عمل کا مظہر ہے۔"[۵۱]

پروفیسر جولین ہکسلے کا قول ہے کہ "تصور ارتقا کئی شعبہ جات علوم پر حاوی ہو گیا ہے۔ انسانیات، علم الاقوام، تاریخ، مذاہب، تمدن اسی کے حلقۂ اثر میں شامل ہیں، ماہران نفسیات کا یہ دعویٰ ہے کہ اگر ارتقا کو مدار نفسیات نہ تسلیم کیا جائے تو نفسیاتی کوائف کی توجیہ ناممکن ہے۔ اسی کے طفیل سے ہمارا رشتہ حیوانات سے ثابت ہوتا ہے اسی کی بدولت انسان زمانہ آئندہ میں بلند تر مرتبہ پر فائز ہونے کی توقع کر سکتا ہے۔"[۵۲] پروفیسر ای۔ ایس گڈریچ نیلو آف سوسائٹی کہتے ہیں کہ "ارتقا اور اختلاف جو ہمارے اردگرد دیکھنے میں آتا ہے وہ زمانۂ گزشتہ کے اسباب

۵۱؎ "گاسپل آف ایولیوشن" صفحہ ۱۱-۳۲-۳۴-۳۷-۳۰ - مطبوعہ ۱۹۲۹ء

۵۲؎ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۸ صفحہ ۱۶ مطبوعہ ۱۹۲۹ء

طبعی کے عمل کا نتیجہ ہے، اور یہ اب بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ تصور تمام عالم پر حاوی ہے، جاندار اور بیجان دونوں اس کے محکوم ہیں۔ تمام مشہور ماہرانِ بیالوجی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ نابود اور موجود جاندار ان اجداد کی نسل سے ہیں جو نہایت پرانے زمانے میں روئے زمین پر رہتے تھے اور بتدریج تغیر یعنی عمل ارتقا سے وہ اس مرحلہ پر نمودار ہوئے ہیں، اسی عمل سے بیجان مادہ سے ہیولائے ذی حیات[۵۱] ظہور میں آیا تھا۔" ان تصریحات سے ارتقا کا مفہوم واضح ہے اور ان کے مقابلہ میں زبیدی صاحب کی تشریح کافی معلوم نہیں ہوتی

مسئلہ ارتقا کی حقیقت کتاب زیر ریویو میں جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے اس سے ارباب سائنس کے تازہ ترین خیالات اور مسلمات پر کماحقہٗ روشنی نہیں پڑتی۔ سر آرتھر جے ٹامسن کا قول ہے کہ "یہ امر بلا تامل تسلیم کیا جاتا ہے کہ نظریۂ ارتقا کا واسطہ دور افتادہ زمانۂ ماضی کے حالات سے ہے، اور یہ قیاس سحاب سے مشابہت رکھتا ہے، جس کی رو سے آفتاب اور اس کے متعلقات کے ابتدا کی تشریح کی جاتی ہے۔ کروڑوں برس پہلے جو کچھ واقع ہوا تھا اس کا صحیح نقشہ[۵۲] آنکھوں کے سامنے کوئی فرد بشر پیش نہیں کر سکتا۔" گویا مسئلہ ارتقا کو منطقی استدلال سے معقول ثابت کرنا محال ہے، جولین ہکسلے کا قول ہے کہ "ارتقا کے طریق عمل کی نسبت تو ہمارا علم ڈارون اور اس کے معاصرین سے کہیں زیادہ ہے لیکن کئی باتوں کی نسبت بہت سے شکوک پیدا ہو گئے ہیں مگر ارتقا کی حقیقت 　　　 کی نسبت کسی قسم کا شک نہیں ہو سکتا۔ ماہرانِ بیالوجی اور ارضیات اس کی معقولیت کے قائل ہو چکے ہیں"۔ ارتقا کے اثبات کی بابت وہ لکھتا ہے کہ "اس کے حق میں بہت زبردست ثبوت ہیں مثلاً متحجرات۔ حقیقت جنین، جانوروں کی جغرافیائی تقسیم وغیرہ مگر ہنوز مزید مشاہدہ اور تجربہ کی ضرورت ہے۔"

بہرحال ان اقتباسات سے زبیدی صاحب کے دعوے کی تائید نہیں ہوتی، یہ ایک نظریہ ہے اور اس کے متعلق کئی نازک سوالات ہیں۔ مثلاً بیجان مادہ سے عمل ارتقا سے جاندار کس طرح پیدا ہوئے تھے پھر ذی حس جانور اور اخیر میں انسان اپنی روح اور حواس اخلاقی اور مذہبی اور قوائے عقلیہ سمیت کس طرح معرض وجود میں آیا۔ پروفیسر آرتھر جے ٹامسن[۵۳] اور پروفیسر گڈریچ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ سائنس ان سوالات کے جواب دینے سے قاصر ہے۔ رسل والس کا قول ہے کہ حکمت الٰہی سے بیجان مادہ میں جان پڑی اور اسی کی قدرت سے ذی شعور انسان ظہور پذیر ہوا تھا۔ مگر دوسرے ماہروں کو والس کی رائے سے اختلاف ہے۔ برطانیہ کے مشہور فلاسفر پروفیسر اے۔ ای۔ ٹیلر کی رائے ہے کہ ارتقا سے مراد یہ ہے کہ ایک جاندار

---

۵۱ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۸ صفحہ ۹۱۶-۹۱۷ (مطبوعہ ۱۹۲۹ء)

۵۲ گاس پل آف ایولیوشن صفحہ ۴، ۵، ۷۔ ۵۳ گاس پل آف ایولیوشن صفحہ ۲۱۔

کی صورت ظاہری ماحول کے اثر سے بدل جاتی ہے۔ اس وجہ سے عمل ارتقا کے لئے ضروری ہے کہ تغیرات کا سلسلہ مربوط ہو اور ان خارجی اسباب کو بھی واضح کیا جائے جن کے زیر اثر اس کا رخ معین ہوتا ہے۔ ارتقا کے واسطے وجود تغیر پذیر اور ماحول کا ہونا امر لازمی ہے اور ان کے اثر باہمی کو بھی ماننا ضروری ہے۔ نیز یہ بھی ماننا ضروری ہے کہ تغیر قبول کرنے والے وجود سے پہلے ماحول مستقل ہو۔ ارتقا کا مقصود اور مفہوم اسی صورت میں قابل ادراک ہو سکتا ہے۔ کہ وہ اپنی حقیقت سے محدود و مشروط ہو جو استمراری اور تغیر و تبدل کے عمل سے بالا ہو۔ اگر محسوسات کے مجموعہ کو عالم مانا جائے تو عمل ارتقا محال عقلی ٹھہرتا ہے۔ البتہ عالم کے اجزائے ترکیبی کا ارتقا ممکن ہے، وجہ یہ ہے کہ مادیات ارتقا کا اثر و عمل قبول کرنے کے فطری میلان سے آراستہ ہیں۔"

یہاں پر دو نازک سوالات پیدا ہوتے ہیں (۱) کیا ایسا وجود آخری ہے جو تغیرات سے سراسر ناآشنا ہے اور ارتقا کا مبدء و محرک قرار پائے؟ (۲) کیا محسوسات کل کی ہیئت اضافی اختیار کر سکتے ہیں؟ ان سوالات کا جواب شافی سائنس سے نہیں مل سکتا ہے غرض اس مختصر بحث سے واضح ہے کہ ارتقا کو معمۂ عالم کی کلید اعظم تصور کرنا جیسا کہ وجدی صاحب کا گمان غالب ہے دشوار ہے۔ یہ مسئلہ ہنوز ظنیات میں شمار ہونے کے قابل ہے۔

ہند و تصور ارتقا اہل مغرب ارتقا کے تصور کی اختراع حکمائے یونان اور ارتقائے موجودات ذی جان کی بنیاد ڈارون سے منسوب کرتے ہیں، اس لئے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ مسٹر مشتاق احمد نے اپنی کتاب زیر بحث میں اس کی ایجاد ہندو رشی کپل دیو بانی فلسفہ سانکھ سے وابستہ کی ہے۔ گویا فلسفیانہ خیال ارتقا سب سے پہلے ہندو حکما نے وضع کیا تھا۔ پروفیسر سر اے۔ بی۔ کیتھ لکھتے ہیں کہ "پرش اور پرکرتی دو قدیم ہستیاں ہیں۔ اول الذکر غیر متغیر، ذی حس، لطیف و بسیط اور مؤخر الذکر خبیط کل ہے۔ ان دونوں کے ملاپ سے موجودات عالم معرض وجود میں آئے۔ سب سے پہلے بدھی (عقل) ظہور میں آئی پھر آہنکار (انانیت) پھر بدھی اندریان (حواس خمسہ) پھر کرم اندریان (اعضائے فعل) پھر تن ماترہ (پانچ عناصر لطیفہ) اور ان سے مہابھوت (عناصر کثیف) پیدا ہوتے ہیں جن سے موجودات ظہور میں آتی ہیں۔" پرش سمیت پچیس تت ہیں جن کے ہیر پھیر سے کائنات کی جملہ ہستیاں پیدا ہوتی ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ شعور سے معرا پرکرتی (کائنات) سے پرش کی خاطر تمام عالم وجود پذیر ہوتا ہے پرکرتی کا ظہور اس کے جبلی خواص، ستو، رج، تم کے طفیل میں ہوتا ہے۔ کپل رشی یونانی حکیم تالیس سے بہت مدت پہلے گذرا ہے۔ بعض اسے سن عیسوی سے آٹھ سو برس پہلے قرار دیتے ہیں۔

مسیحی خیال آفرینش مصنف "ارتقا" نہ فقط مسائل سائنس ہی سے بے خبر معلوم ہوتے ہیں بلکہ مذاہب کے بھی

لہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۔ صفحہ ۹۴۸۔۹۵۰۔۹۵۱۔ ۲ہ سانکھ سسٹم۔

اپنی عدم واقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں کہ "تورات میں بتایا گیا ہے کہ عالم کی تخلیق میں صرف چھ دن صرف ہوئے۔" (صلہ ۲) اگر کسی مسیحی عالم سے پوچھتے یا کم از کم بائبل کا ابتدائی بیان آفرینش غور سے پڑھتے تو ایسی غلطی نہ ہوتی۔ "چھ دن" سے مراد چھ مختلف قرن ہیں "دن" کا مطلب چوبیس گھنٹہ کا عرصہ نہیں ہے کیونکہ سورج اور چاند چوتھے دن[۱] تک رونما نہ ہوئے تھے۔ عیسائی خیال مصر، بابل یا دیگر قوموں سے مستعار نہیں جیسا کہ وجدی صاحب (صہ) لکھتے ہیں صلا پر آپ عیسائیت کو علوم کا دشمن ٹھہراتے ہیں، یہ سراسر خلاف واقعہ ہے، علوم سائنس کو سب سے زیادہ ترقی مسیحی ملکوں میں حاصل ہوئی اور اس میں دیندار عیسائیوں نے سب سے بڑا حصہ لیا ہے البتہ ہر ملک میں نئے خیال کی مخالفت ہوتی ہے۔ کلیسیا کے بزرگوں نے بھی ابتدائی ارباب تحقیق سے سخت بدسلوکی کی تھی جس کا الزام عیسائیت کو دینا حق و انصاف سے بعید ہے۔

نظام شمسی اور اجرام فلکی کے آغاز کا مسئلہ

"ستارہ مالا" کے تحت میں آپ نے نظام شمسی کا ذکر کرتے ہوئے نظریۂ سحاب سے تفصیلی بحث کی ہے جس کی بنیاد جرمنی کے سب سے بڑے فلاسفر کانٹ اور فرانسیسی ماہر ریاضیات لاپلاس سے منسوب کی ہے۔ اجرام فلکی کا نشوونما کروڑوں برس (صہ[۲]) میں اور "تکوین عالم کا موجودہ نظریہ مسلّمات سائنس کے سراسر متبائن ہے۔ تازہ تحقیقات کی رو سے یہ سراسر ناقابل تسلیم ہے اور اس میں نظام شمسی مع سورج کی ابتدا کا تازہ ترین نظریہ مدّوجزر کہلاتا ہے جس کی اختراع شہرۂ آفاق مہندس سر جے۔ جینز اور پروفیسر جیفریز اور مولٹن کی مسلسل تحقیقات کی مرہون منت ہے، سر آرتھر ٹامسن لکھتے ہیں کہ "ایک بالکل انوکھا مگر دلفریب نظریہ معرض وجود میں آیا ہے جسے نظریۂ مدّوجزر کہتے ہیں۔ سورج اور چاند کی کشش سے سمندروں میں جوار بھاٹے آتے ہیں اس وجہ سے یہ قرین عقل ہے کہ ایک ستارے میں جو کسی درخشاں سحاب کے انقباض سے وجود میں آیا ہو پاس سے گذرنے والے کسی ستارے کی حرکت سے مدوجزر کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ جس سے اثر سے گیس جیسے مادہ کا ایک حصہ کٹ کر دور جا پڑا جس سے سیارگان پیدا ہوئے۔ اگر یہ نظریہ معقول ثابت ہو تو ظاہر ہے کہ اس کے موجدوں نے اس کے تمام پہلوؤں کو خوب سوچ لیا ہوگا۔ گمان کیا جاتا ہے کہ جب نظام شمسی کے ابتدائی مبدء کے قرب سے دوسرا ستارہ گزرا تو اس کے اثر سے اس کا خارجی حلقہ علیحدہ ہوگیا اور وہ سحاب پیچان بن گیا جس کے بازوؤں میں عقدے نمودار ہوئے جو آخر کار سیاروں کے منبع بنے۔" ماہر موصوف کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر ہمارا کرۂ ارض اسی طرح بنا تو اس کا سرچشمہ سحاب درخشاں ہے جس کے اندر کئی عجیب و غریب چیزیں ہوں گی۔ یہ سانحۂ فلکی کب ظہور میں آیا تھا؟ اس کی نسبت سر جے۔ جینز کی تازہ ترین رائے یہ ہے کہ پانچ ارب برس گذرے جب سیارے مع کرۂ ارض اپنے ابتدائی مبدء سے علیحدہ ہوئے تھے۔ اس بنا پر کرۂ ارض کی عمر دو ارب اندازہ کی جاتی ہے۔ ہیولائے ابتدائی سے ساڑھے

---

[۱] بائبل اول فصل آیات ۱۶-۱۷-۱۸-۱۹۔ [۲] گاسپل آف ایولیوشن صہ ۴۴۲-۴۵۰۔ [۳] ملاحظہ ہو اسٹرانومی اینڈ کاسموگنی صہ ۴۱۶ مطبوعہ ۱۹۲۸ء

ارب سالوں میں عمل انقباض سے سحاب درخشاں پیدا ہوتا ہے اور اس سے باقاعدہ گردش کرنے والے سیارے تیرہ کھرب برسوں میں نمودار ہوتے ہیں اور کرۂ ارض کی طرح ٹھوس صورت اختیار کرنے کے لئے بھی اتنا ہی عرصہ لگتا ہے یعنی ابتدائی ہیولا کو عمل انقباض سے ٹھوس شکل میں تبدیل ہونے کے واسطے ۲۶ کھرب ۶۰۱ ارب برس درکار ہوتے ہیں، اس سے عیاں ہے کہ "اجرام فلکی کا نشو و نما کروڑوں برس" میں ہونا ماہران بالا کے خیالات کے موافق ہے یا متضاد۔

ابوالبشر کا معرکہ خیز مسئلہ

یہ مسئلہ ارتقا کا سب سے بڑا متنازعہ فیہ مسئلہ ہے جس کے متعلق وجدی صاحب لکھتے ہیں کہ (۱) عام طور پر ارتقا کے محض یہ معنی سمجھے جاتے ہیں کہ انسان بندروں کی اولاد سے ہے، گو آج تک کسی سائنس داں نے ایسا دعویٰ نہیں کیا۔" صہ (۲) "ارتقا کو نسل انسان کے مسئلہ سے کوئی خصوصیت نہیں" صہ (۳) "نئی شہادتیں اس کثرت سے جمع ہو گئی ہیں کہ اب انسان اور بن مانسوں کی نسل ایک ہونے سے انکار کرنا ناممکن ہے" صہ وجدی صاحب کے بیانات کے متعلق تفصیلی بحث کی ضرورت ہے۔

انسان کی ابتدا کے بارہ میں ابتدائی دور کے ماہروں کے خیالات

(۱) انسان کے مورث اولیٰ کی نسبت ڈارون اور اس کے مقلدوں کا کیا خیال تھا؟ اس کے متعلق ڈاکٹر آر سی مکفی رقمطراز ہیں کہ "ڈارون کا یہ خیال تھا کہ نئی اور پرانی دنیا کے بندروں کا مورث بندر تھا اور انسان گوریلہ اور چمپانزی پرانی دنیا کے بندروں کی نسل سے ہیں، گویا انسان کا جدامجد ایک قسم کا بندر تھا جس کے دم تھی اور وہ درختوں پر بسیرا کرتا تھا۔ ہیگل نے بھی انسان کے اجداد کا کھوج لگاتے لگاتے نئی اور پرانی دنیا کے بندروں تک پہونچا دیا، اور اورنگ اوٹ گبن بندر بلاواسطہ انسان کے مورث اعلیٰ قرار دئیے پس ہیگل کے نظریہ کی رو سے انسان کے ابتدائی اجداد نہ صرف ایک قسم کے بندر تھے بلکہ وہ گبن اور اورنگ جیسے بندروں[1] کے مشابہ تھے: پروفیسر سر ڈبلیو کے۔ گریگری کا قول ہے کہ" انسان کی قرابت چمپانزی اور گوریلہ کی بابت کسی قسم کا شبہ نہیں ہو سکتا"

موجودہ زمانہ کے ماہران سائنس کی اکثریت کا جو نظریہ انسان کے مورث اولیٰ کی بابت ہے وہ بقول سر آرتھر تھامسن یہ ہے کہ" سائنس کے نظریہ کے رو سے انسان اس تنے کی قلم ہے جو اعلیٰ طبقہ کے بن مانس اور انسان کے اجداد کا مورث مشترکہ تھا۔ دس لاکھ برس گذرے جب انسان نما ہستیوں اور بن مانس کے بزرگوں میں مغائرت و مفارقت واقع ہوئی تھی۔ عہد ایوسین کے وسط میں اور غالباً شمالی ہند میں انسان اور بن مانس کے اجداد میں تفرقہ واقع ہوا تھا۔ آخر الذکر سے گوریلہ، اورنگ اوطان اور چمپانزی پیدا ہوئے۔ مگر انسان کو موجودہ مرحلہ تک پہونچنے میں بہت بڑی مسافت طے کرنا پڑتی تھی۔

---

[1] ملاحظہ ہو سائنس اینڈ ایس گورزگاڈ صہ ۲۰۴ - ۲۰۵ مطبوعہ سنہ ۱۹۳۰ء [2] گاسپل آف ایولیوشن صہ ۱۲۶ - ۲۲۰

قدامت انسان انسان کے ارتقا اور قدامت کا اندازہ ان ہڈیوں سے کیا گیا ہے جو دنیا کے مختلف مقامات سے برآمد ہوچکی ہیں۔ ۱۸۹۲ء میں جاوا سے ایک جانور کی ہڈیاں دستیاب ہوئی تھیں جسے وحدی صاحب "سیدھا بن مانس" ۱؎ قرار دیتے ہیں اور اس کی عمر پانچ لاکھ برس بیان کرتے ہیں، حالانکہ ماہروں نے اس کی عمر پانچ لاکھ برس اندازہ کی ہے۔ پروفیسر میک برائڈ کا بیان ہے کہ ماہروں کی زیادہ تعداد جاوائی کھوپڑیوں کو بن مانس کی ہڈیاں قرار دیتی ہے۔ ہیڈل برگ (جرمنی) سے جس انسان نما جاندار کی چند ہڈیاں برآمد ہوئی تھیں اس کی عمر پانچ لاکھ برس اندازہ کی گئی ہے۔ پلٹ ڈاون (برطانیہ) سے جو انسانی ہڈیاں نکلی تھیں ان کی عمر ساٹھ ہزار سے ایک لاکھ برس کے درمیان بیان کی گئی ہے۔ سر آرتھر کیتھ کا بیان ہے کہ زمانۂ حال جیسے مہذب آدمی اب سے پانچ لاکھ برس پہلے یورپ میں رہتے تھے۔ سر آرتھر ٹامسن نے مہذب آدمیوں کا زمانہ دس لاکھ سال تسلیم کیا ہے ۲؎۔ بعض ماہر ابتدائی انسان کی عمر بیس لاکھ سال بیان کرتے ہیں۔ یعنی انسان کی قدامت ۳؎ کی نسبت سر دست تعداد کثیر کو اتفاق کلی نہیں ہے۔

انسان کا مورث کون تھا اس معرکۃ الآرا مسئلہ کی بابت ارباب سائنس میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ پروفیسر ولیسٹن ہیفر (جرمنی) نے ۱۹۲۱ء میں سالسبرگ کی انتھراپالوجیکل کانگریس کے اجلاس میں بڑے وثوق کے ساتھ یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ڈارون کا یہ خیال سراسر غلط ہے کہ ابوالبشر بن مانس جیسا جاندار تھا بلکہ اصل یہ ہے کہ اس کا جد امجد انسان نما جاندار تھا۔ "کلکتہ کے اخبار اسٹیٹسمین میں کسی ماہر (ایم۔ این۔ او) نے ایک سلسلۂ مضامین انسان کی ابتدا پر لکھا تھا۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کی ابتدا جو عرصہ تک گوریلا سے منسوب ہوتی رہی۔ اب ارباب سائینس اس خیال سے دست بردار ہوگئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ زمانۂ ایوسین کے ابتدائی حصہ میں ایک نامعلوم جاندار تھا جو انسان اور بن مانس کا مورث ابتدائی بنا۔ یہ نہ تو انسان تھا اور نہ بن مانس بلکہ دونوں سے مقدم تھا، اگر وہ انسان نہ تھا تو غالباً ایسا جاندار ہوگا جس میں بندر بن مانس اور انسان کے خواص تھے۔ اس نوع کا اب کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ وہ نوع انسان سے تھا اور تمام دودھ دینے والے جانوروں سے تین باتوں میں ممتاز تھا ذہانت، قوت اور ہر قسم کے ماحول میں رہنے کی صلاحیت جبلّی۔ وہ بے مثال وجود تھا جس کی نسل روئے زمین پر آباد دو ارب سے اوپر شمار میں ہے۔ اور کسی جانور کی اولاد بنی آدم کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ روئے زمین پر تین لاکھ ریڑھ دار اور بے ریڑھ کے جانور اور دس لاکھ ننھے ننھے جاندار ہیں۔ پانچ لاکھ قسم کے نباتات ہیں۔ سر آرتھر کیتھ نے "قدامت انسان" کی طبع ثانی (۱۹۲۵ء) میں جو شجرۂ نسب دیا ہے اس سے بھی انسان اور بن مانس کا مورث اولین از قسم بندر نہیں بلکہ انسان ظاہر ہوتا ہے۔ ذیل کے ماہروں کے آرا ٹھنڈے دل سے پڑھنے کے قابل ہیں۔

(۱) پروفیسر ایچ۔ الیف۔ آسبرن رقمطراز ہیں کہ "انسان کے بن مانس سے ابتدا کے نظریہ کو میں کلیۃً غلط اور مغالطہ خیز

۱؎ ایولیوشن ص۷، ۲؎ ملاحظہ ہو "قدامت انسان" مطبوعہ زمانہ فروری ۱۹۲۹ء ۳؎ ملاحظہ ہو زمانہ فروری ۱۹۲۹ء مضمون "قدامت انسان"۔

سمجھتا ہوں۔ اسے سائنسی وجوہات سے اپنے تخیل سے خارج کر دینا چاہیئے۔ پلائیوسین زمانہ کے انسان دماغی اور نفسیاتی خواص میں زمانۂ حال کے آدمیوں سے چنداں مختلف نہ تھے۔ پلائیوسین زمانہ کے آدمی سیدھے چلتے، سادہ زندگی بسر کرتے، بڑے دماغ اور گویائی سے آراستہ، بن مانسوں سے کوئی نسبت نہیں رکھتے تھے۔ انسان کے بن مانس مورث کا خیال محض افسانہ ہے اور ہماری جہالت کا تخیل ہے۔"

(۲) پروفیسر کلاتش کا قول ہے کہ انسان کے دانت اس کی ابتدائی حالت پر دلالت کرتے ہیں جو شیر اور بیل کے دانتوں سے رونما نہیں ہوئے بلکہ اصل یہ ہے کہ شیر اور بیل کے دانت کسی دور افتادہ زمانہ میں موجود الوقت آدمیوں کے مشابہ تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دودھ دینے والے جانوروں کی کسی نوع سے بھی انسان کا ارتقا نہیں ہوا ہے بلکہ شروع ہی میں دیگر دودھ دینے والے جانوروں کی طرح پیدا ہوا تھا۔"

(۳) پروفیسر وڈ جونز پروفیسر کلاتش سے پورا اتفاق رکھتے ہیں کہ بن مانس اور بندر انسان کے مورث اعلیٰ کی نسل سے ہیں اور نیچے اصل رتبہ کو چھوڑ کر حیمیت میں دوبارہ جا پہنچے ہیں۔ آپ کی رائے میں ٹارسیئس جیسے جاندار سے انسان کا استحالہ ہوا تھا۔ آپ کا قول ہے کہ "ڈاروِن کے مقلد بندر اور انسان کے ڈھانچہ سے استدلال کر کے مغالطہ میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ مماثلت تو تھوڑی ہے مگر اختلاف سخت ہے۔ انسان کے جسم میں کئی ایسی چیزیں ہیں جن سے بن مانس کلیتہً محروم ہیں۔ زبان، ناک کی ہڈیاں، گردے وغیرہ اور بعض دیگر خصوصیات قدرت نے ودیعت کر دی ہیں۔ رگوں اور پٹھوں کی ترتیب ایسی ہے جیسی بن مانسوں کے نچلے طبقہ کے دودھ دینے والے جانوروں میں دیکھنے میں آتی ہے۔ انسان کے ڈھانچہ اور جنین کے نمو سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ جہاں تک ہمارے ابتدائی اجداد کا پتہ چلتا ہے وہ دو ٹانگوں کے بل سیدھے چلتے تھے۔"

(۴) پروفیسر آسٹن ایچ۔ کلارک۔ اسمتھ سونین انسٹی ٹیوٹ امریکہ کا بیان[۵۲] ہے کہ "انسان کا بن مانس سے کوئی علاقہ نہیں ہے، وہ اتفاقی سانحہ سے رونما ہوا ہے۔ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ جانوروں کے بڑے بڑے گروہ عمل ارتقا سے ظہور میں آئے تھے۔ انسان زمانہ پلائیوسین سے پیدا ہوا تھا وہ یکایک رونما ہوا اور ابتدا سے ایسا ہی ہے جیسا کہ اب ہے۔ اس سے پیشتر کے زمانوں میں اس کی ہستی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ہمیں سیدھے چلنے اور سوچنے اور اپنی حفاظت کرنے کی اہلیت تھی۔" ڈاکٹر کلارک کا نظریہ ایک حد تک رسل واس کے نظریہ کے مشابہ ہے کہ جانداروں کی ابتدا اور حواس و شعور کا آغاز قدرت ربانی اور حکمت یزدانی سے ہوا تھا۔ جرمنی کے ماہر رڈالف آٹو نے ایک رسالہ میں دسمبر ۱۹۰۲ء سے لیکر فروری ۱۹۰۳ء تک ایک سلسلہ مضامین انسان کی ابتدا کے متعلق شائع کیا تھا جس میں جرمنی

---

[۵۱] ماخوذ از سائنس اینڈ ریس کونزگا صفحہ ۲۰۹ سے ۲۱۲ تک

[۵۲] کلارک کا مضمون بیالوجیکل کوارٹرلی میں طبع ہوا تھا جس سے اسٹیٹسمین نے نقل کیا تھا۔

ہالینڈ، آسٹریا اور یورپ کے ماہروں کی رائیں نقل کرکے یہ ثابت کیا تھا کہ انسان کی ابتدا کا ڈارون کا نظریہ ماہران بیالوجی کے نزدیک قابل تسلیم اور مقبول نہیں ہے۔ پروفیسر موراٹ کی رائے ہے کہ انسان اور بن مانس اور اس سے نچلے درجہ کے جانور ایک سلسلہ میں منسلک اور متماثل نہیں ہو سکتے جس کی انتہا انسان پر ختم ہوتی ہے۔

غرض ابوالبشر کا مسئلہ ہنوز کھٹائی میں پڑا ہوا ہے، ایک فریق ڈارون کے نظریہ کو نا قابل تسلیم ٹھہراتا ہے دوسرا انسان کا مورث اعلیٰ ایسا جانور تصور کرتا ہے جو انسان اور بن مانس کا مشترکہ بزرگ تھا۔ تیسرا گروہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ انسان کا مورث اولین انسان نما جانور تھا جس میں انسان اور بن مانس کے ملے جلے خواص تھے۔ ایسی صورت میں کسی خاص نظریہ کو مسئلہ قرار دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

وحیدی صاحب نے مذہب و اخلاق سے بھی بحث کی ہے۔ افسوس کہ اس وقت بخوف طوالت ہم اسکی تفصیلات میں نہیں جا سکتے ہیں۔ اس مسئلہ کے ساتھ تصور ذات خدا بھی منسلک ہے جو بجائے خود بہت جامع بحث ہے۔ وحیدی صاحب کا خیال ہے کہ سائنس مذہب و اخلاق اور خدا کو نظرانداز کر رہا ہے۔ ہماری رائے میں اس سے مذہب کی ضرورت اور خدا کی ہستی واجب التسلیم ٹھہرتی ہے۔

باغبانی پروجیکٹ

مرتبہ مولوی محمد عبدالغفار مدھولی، کراؤن سائز، ۴۰ صفحات۔ قیمت ۸ ر

ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

باغبانی کے سلسلہ میں طالب علموں نے جو کام کئے ان کا تفصیلی ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ پھول ترکاریاں وغیرہ بونے کا طریقہ، سینچائی، پیداوار کی عمدگی وغیرہ کے متعلق ضروری باتیں درج ہیں۔ اس سلسلہ میں طالب علموں کی چند کہانیاں بھی ہیں۔ بچوں کی تصویریں بھی دی گئی ہیں جن کو کام کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ غرض بچوں کو باغبانی کے متعلق بہت سی مفید باتیں اس سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

ہمکو دلی رنج و افسوس کے ساتھ معلوم ہوا ہے کہ گذشتہ ۲۲۔ اکتوبر کو اردو کے نامور شاعر و نثار مرزا رسوا صاحب لکھنوی رکن دارالترجمہ حیدرآباد دکن کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی تصانیف اردو ادب میں آپکے نام کو ہمیشہ روشن رکھیں گی۔ دارالترجمہ میں آپ بعض دقیق ترین انگریزی کتابوں کے ترجمہ میں مصروف تھے۔ اردو مصنفین کی صف میں جو جگہ آپ کی وفات حسرت آیات سے خالی ہوئی ہے وہ کسی طرح پر نہیں ہو سکتی۔

۱ے زمانہ فروری ۱۹۲۹ء صفحہ ۹۰ ۲ے زمانہ بابتہ نومبر ۱۹۲۰ء مضمون "تمدن کی قدامت اور اس کا ارتقا" ملاحظہ کیجئے۔

پندِ سودمند[1]

(از جناب مولانا سید علی حیدر نظم طباطبائی المخاطب بہ نواب حیدر نواز جنگ بہادر)

خوبیاں انسان کی جتنی ہیں گر پیدا نکر — تو بھی ہے انسان، پھر اِس بات کا دعویٰ نکر
گر کسی کا عیب ہو معلوم، تو اس کو چھپا — گر کسی کا راز ہو معلوم، تو افشا نکر
آتش افروزی کرے کوئی، کسی کا گھر جلے — ہے جو ہمدردی تجھے، تو دُور سے دیکھا نکر
ہے غبارِ فتنہ انگیز اِس جہاں میں افتراق — بھول کر بھی تو کبھی اِس راہ سے گذرا نکر
کر نہ دعوائے قناعت سیر ہو جب تک نہ چشم — دل غنی جب تک نہ ہو، اظہارِ استغنا نکر
آنکھ کو تعلیم دے، پاسِ ادب رکھے نگاہ — دل پہ کر قدغن کہ ہر اک بات پر مچلا نکر
گوہرِ یکدانۂ مطلوب کی گر ہے ہوس — کتنے پانی میں ہے تو اسکا خیال اصلا نکر
کرتا ہے مشکل کو مشکل تر وفورِ اضطراب — مرغِ زیرک ہے تو آکر دام میں پھڑکا نکر
دیکھ لے گرجے برس پڑتا ہے اکثر ابرِ تر — بخل اگر تجھ کو برسنے میں ہے تو گرجا نکر
کہتے ہیں عاقل "ہے از قسمِ جنوں طیش و غضب" — شیر ہے تو، میں نے یہ مانا مگر بپھرا نکر
علم و حکمت چاہیئے اِنسان بننے کے لئے — آرزوئے نعمتِ دنیا و ما فیہا نکر
پر لگا دیتی ہے راہِ شوق میں دل کی اُمنگ — اُڑ کے منزل پر پہنچ تقلیدِ نقشِ پا نکر
جو کمالاتِ بشر ہیں چاہیئے حاصل ہوں سب — ہے دلیلِ نقص ہرگز اِس میں اِستغنا نکر

---

[1] یہ نظم عثمانیہ کالج حیدرآباد کے سالانہ مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی۔

جب حقیقت ہو عیاں اوہام کا دھوکا نکھا — ہو کے غافل صبح صادق کو شبِ یلدا نکر
صاف کر یہ زنگ ہے آئینۂ ادراک کا — "ہم کسی سے کم نہیں" دل میں یہ خیال اصلا نکر
ساتھ والوں سے پہنچ منزل پر اپنی پیشتر — تھک کے پیچھے کوئی رہ جائے تو کچھ پروا نکر
التفات و انقلابِ دہر سب ہیں بے ثبات — یہ ہے چلتی چھاؤں اس کو دیکھ کر دوڑا نکر
ہاتھ کا ہے مَیل مال و زر کہ آیا اور گیا — کر کے ہمت پر بھروسا دل کو تو میلا نکر
عقل کر دیتی ہے زائل نعمتِ دُنیا کبھی — خود سے رو گرداں اگر ہو جائے تو پیچھا نکر
جبکہ ناکامی کا باعث دست و بازو ہوں ترے — ہے قصور اپنا، فلک کا شکوہ بے جا نکر
کل جو کچھ ہونا ہے اُس کے واسطے آمادہ رہ — شادیِ امروز کو محوِ غمِ فردا نکر
تیرے باطن کو ہے توفیقِ الٰہی سے بھی راہ — منع وہ جس بات کو کر دے اُسے حاشا نکر
ہاتھ فوراً روک لے، باز آ، قدم پیچھے ہٹا — جب صدا آتی ہو یہ دل سے کہ دیکھ ایسا نکر
بے تامل اُٹھ جو نصرت کو پکارے تجھ کو قوم — وقت ایسا ہو تو کچھ سوچا نکر سمجھا نکر
لَا یُلَامُ الْمَرْءُ فِیْ حُبِّ الْعَشِیْرَۃ یاد رکھ — پھر ملامت بھی کرے کوئی تو کچھ پروا نکر
تجھ کو حاصل ہو نہ جب تک اوجِ معراجِ کمال — محو دل سے ذکر سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی نکر
لکھ کے کچھ تو ظلِ ممدود اپنے خامہ سے دکھا — آپ کو منت کشِ ظلِ ہما اصلا نکر

نظمؔ یہ باتیں گرہ میں باندھ رکھنے کی ہیں سب
لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کر یا نکر

چودھویں کا چاند

(از جناب محشر لکھنوی)

دل کسی عاشق کا ہے یا چودھویں کا چاند ہے — جس کی ضو سے آئینہ محبوب کا جھلی ماند ہے
جملہ موجودات پر ہے چاندنی چھائی ہوئی — دور عالم میں بہار نور ہے آئی ہوئی
شام ہوتے ہی اُٹھا بستر اندھیری رات کا — درہم و برہم ہوا دفتر اندھیری رات کا
صدقے ہونے کو اُڑا اپنے نشیمن سے چکور — کھل گئی اسرار الفت دیکھنے کو چشم کور
بزم سیار و ثوابت کی منور ہو گئی — وسعت گردوں جواب کوئے دلبر ہو گئی
خشک و تر بستان و صحرا سب منور ہو گئے — جتنے ذرے ہیں جواب انجم و اختر ہو گئے
دل میں دریاؤں کے پیدا جزر و مد کا جوش ہے — قدرت جذب تجلی سے ہویدا جوش ہے
باغ میں ہر اک شجر ہے طور سینا کا جواب — دیدۂ بلبل کو کہیے چشم موسیٰ کا جواب
ہر طرف ہے عالم آرائی فروغ نور کی — بے تکلف دیکھتی ہیں آنکھیں ہر شئے دور کی
معنی افزا اک ورق کہیے کتاب حسن کا — یا کہ آئینہ شعاع آفتاب حسن کا
چاندنی کے پھول کی گلشن میں بر آئی مراد — پرتو مہتاب سے دل ہو رہا ہے شاد شاد
سیر کرنے گھر سے نکلے مہ جبینان جہاں — ہر قدم پر ہو رہی ہیں ناز سے اٹکھیلیاں
چودھویں کا چاند ہے یا روئے جاناں بے نقاب — چل رہا ہے محفل انجم میں یا جام شراب
مبتلائے اختلاج قلب میں حباب آ گئی — روح پرور چاندنی اپنا اثر دکھلا گئی
چودھویں کا چاند ہے یا عابد شب زندہ دار — شام سے تا صبح محو طاعت پروردگار
چاندنی چھٹکی ہوئی یا رات کو نکلی ہے دھوپ — وسعت گیتی کی تاریکی نے بدلا دن کا روپ
دور وسعت میں بسائے پھرتا ہے دنیا نئی — سیر ہے اہل رصد کے واسطے کیا کیا نئی

آئینہ ہے فلسفی کی قوتِ ادراک کا
یا مسلّم کیجئے علمِ ہیئتِ افلاک کا

منزلوں پر منزلیں طے کیں ہوا جب بدر نام
مدتوں دیکھے ہوئے قدرت کا حسنِ انتظام

چاندنی سطحِ زمیں پر خود ہے بالائے فلک
ایک جلوے میں مجازی و حقیقی کی جھلک

چودھویں کا چاند ہے محشر جو زیبِ آسماں
میرے دل میں ہے کسی محبوب کا جلوہ نہاں

صبح دم لکھا ہے اس کی نجمِ قسمت میں زوال
ہر نفس ہے ماہِ کامل کو مرے دونا کمال

دوست کے جلوے سے ہی روشن ہوئے خورشید و ماہ
دیکھ غافل دیدۂ دل سے جو رکھتا ہو نگاہ

دورِ حیات

از جناب بسمل الہ آبادی

الطاف و عنایت کو سمجھتا ہوں میں
الفت کو محبت کو سمجھتا ہوں میں
آگاہ ہوں آگاہ بخوبی بسمل
دنیا کی حقیقت کو سمجھتا ہوں میں

بے کار ہے بیکار سمجھتا ہوں میں
آرام میں آزار سمجھتا ہوں میں
بے رنگ بہارِ باغِ جہاں کا بسمل
جو گل ہے اسے خار سمجھتا ہوں میں

یہ ناز یہ انداز سمجھتا ہوں میں
پردے میں جو ہے راز سمجھتا ہوں میں
دم بھر کو بھی غافل نہیں رہتا بسمل
ہر سانس کی آواز سمجھتا ہوں میں

اطوار و چلن گھات سمجھتا ہوں میں
دن رات کو دن رات سمجھتا ہوں میں
نیرنگیِ عالم سے ہوں واقف بسمل
دنیا کی ہر اک بات سمجھتا ہوں میں

علمی خبریں اور نوٹ

اُردو ہندی ماہرین ادب کو یکجا کرکے دونوں زبانوں کے وسائل ترقی پر تبادلۂ خیال کا موقعہ دینے کی غرض سے ہندوستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ پچھلے دو برس سے ہر سال ایک ادبی کانفرنس منعقد کر رہی ہے چنانچہ اس مرتبہ یہ کانفرنس الہ آباد میں جنوری سنہ ۳۲ء میں منعقد ہوگی۔ اکیڈیمی کی انتظامیہ کمیٹی نے مشاہیر ادب سے جن مختلف مباحث و موضوعات پر مضامین لکھنے یا تقریر کرنیکی استدعا کی ہے اُن کی تفصیل یہ ہے:- (۱) فن تنقید (۲) تاریخ ادب (۳) فنون لطیفہ (۴) لسانیات۔
(۵) تاریخ و آثار قدیمہ (۶) فلسفہ و سائنس (۷) اکیڈیمی اور اُس کے مقاصد

جو صاحبان ذوق اس کانفرنس میں تقریر کرنے یا مضامین پڑھنے کا قصد رکھتے ہوں وہ اپنے مضامین کا خلاصہ ۱۰ جنوری سنہ ۳۲ء تک سکریٹری صاحب اکیڈیمی کے پاس بھیجدیں۔ جملہ مضامین اور تقریریں کتابی صورت میں اکیڈیمی کی طرف سے شائع کی جائینگی۔ کانفرنس کا مفصل پروگرام آئندہ شائع کیا جائیگا۔

خوشی کی بات ہے کہ ملک کے اکثر رؤسا ہندی زبان کی ترقی کے لئے قابل قدر مالی عطیات دے رہے ہیں حال میں کنور کرشنا نند صاحب بہادر والی ریاست بنیلی (بھاگلپور) نے ہندی زبان کے مشہور رسالہ "گنگا" کے کارکنوں کو چالیس ہزار روپیہ کی امداد اس غرض سے دی ہے کہ وہ ایک ہزار مستحق خریداروں سے پانچ روپیہ سالانہ چندہ لینے کے بجائے صرف تین روپیہ سالانہ پر اپنا رسالہ دیں۔

ہم کو نہایت رنج و افسوس سے معلوم ہوا کہ پچھلے ماہ ہمارے قدیم عنایت فرما منشی رام دیال صاحب سکسینہ سابق فینانشل سکریٹری ریاست جاورہ کا بریلی میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم رسالہ زمانہ کے قدیم ترین خریدار تھے اور آپ کے پاس شروع سے لیکر اب تک جس قدر پرچے زمانہ کے شائع ہوئے ہیں محفوظ تھے۔ آپ ایک بلند خیال نیک نفس پابند مذہب منکسر مزاج اور فیاض طبع علم دوست بزرگ تھے اور ہمیشہ اپنے دوست و احباب کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا کرتے تھے۔ آپ نے تمام عمر دیانت و جانفشانی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کئے۔ افسوس کہ اس طرف چند سال کے عرصہ میں آپ کو غیر معمولی مصائب سے سابقہ رہا جس سے آپکی خانگی زندگی بہت ہی مکدر ہوگئی تھی۔ آپ کے دو نوجوان و ہونہار فرزند یکے بعد دیگرے داغ مفارقت دے گئے اور آپ کی اہلیہ اور والدہ وغیرہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان حادثات سے آپکی صحت بہت خراب ہوگئی تھی اور آنکھوں نے بھی جواب دیدیا تھا۔ اس وقت آپ کے خاندان کی یادگار صرف دو خورد سال نواسیاں رہ گئی ہیں جنکی پرورش کی آپ کو بڑی فکر تھی۔ آپ نے اپنا کتب خانہ بریلی کے چندر گپت مندر کو دان کر دیا ہے۔ زمانہ کی پرانی جلدیں دفتر زمانہ کو عنایت فرمانے کا وعدہ تھا مگر اس کی نوبت نہ آئی تھی کہ پیام اجل آپہونچا۔ ایشور آپ کی روح پرفتوح کو غریق رحمت کرے۔

نظام گورنمنٹ کی مقرر کردہ نستعلیق کمیٹی کا اجلاس ۱۵ اکتوبر کو حیدرآباد دکن میں نواب لطف الدولہ بہادر کے زیر صدارت منعقد ہوا جسمیں بکثرت رائے نستعلیق ٹائپ بنانے کی غرض سے خط نستعلیق کی شان تحریر میں بعض جزوی ترمیمات منظور ہوئیں۔ ان ترمیمات کی مکمل تفصیلات کمیٹی کی باضابطہ رپورٹ شائع ہونے پر ہدیہ ناظرین ہونگی۔ اگر پبلک نے ان ترمیمات کو منظور کرلیا تو امید ہے کہ نستعلیق ٹائپ کے رواج میں غیر معمولی آسانی ہو جائیگی۔

زمانہ بک ایجنسی کی دلچسپ و قابلِ دید کتابیں

افلاح چانکیہ

یعنی نامور [illegible] چانکیہ کے مشہور و معروف و نیتی کا ترجمہ از جناب پنڈت [illegible] صاحب [illegible] قیمت

قومی نمبر رسالہ زمانہ

جس میں قابلِ دید مضامین نظم و نثر اور رنگین و سادہ تصاویر اور مہاتما گاندھی لالہ لاجپت رائے ڈاکٹر سپرو مسز نائیڈو ڈاکٹر اقبال کے خاص خیالات اور بہت سے قابلِ دید مضامین نظم و نثر شایع ہوئے ہیں قیمت

پریم بتیسی

یعنی اردو کے مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند بی اے کے بہترین قصوں کا مجموعہ زبان کی لطافت اور بیان کی صفائی قابلِ دید

حصہ اول [illegible] دوم [illegible]

سیر المصنفین

اردو انشا پردازی کی مکمل تاریخ از جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب بی اے شعرا کی طرح [illegible] کا

جامع تذکرہ [illegible]

گلکدہ

لسان الملک حضرت عزیز لکھنوی کا مجموعہ کلام جس کا ہر صفحہ ایک تازہ اور ہر شعر ایک خوش رنگ پھول ہے قیمت [illegible]

اقرستان

ملک کے مشہور سخن سنج مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی کا دیوان جس کا ہر مصرعہ پرتاثیر اور ہر شعر [illegible] نشتر ہے قیمت [illegible]

دنیائے راز

از ابو الفاضل راز چاندپوری قدیم و جدید طرز کی دلکش نظموں کا مجموعہ [illegible] مع تصویر مصنف قیمت [illegible]

بخاری

مجدد اعظم امام ابن عربی کی کتاب العبودیت کا اردو ترجمہ جس میں مطابق دینی عقائد اسلامی اصول توحید اور تصوف سے صحیح مفہوم [illegible] قابلِ دید قیمت [illegible]

لسان الغیب شرح دیوان

حافظ [illegible] مشہور [illegible]

اہل نظر [illegible] قیمت [illegible]

کاسہ [illegible]

شرح [illegible] اس موضوع پر اس سے پہلے کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی قیمت [illegible]

اردو مضمون نویسی

مضمون لکھنے کے متعلق [illegible] عمدہ کتاب [illegible] لکھنے کی مہارت پیدا ہو جاتی ہے قیمت [illegible]

مکمل عورت

[illegible] کی تعلیمی [illegible] حالات کا ایک [illegible] اسکول [illegible] اکر کنیا [illegible] بزم احباب [illegible] اخلاق

[illegible]

تاریخ دولتمندی

[illegible] طریقے نہایت خوبی سے [illegible] قیمت [illegible]

یادگار قومی

جس میں ملک کے مشہور ترین انشا پردازوں کے [illegible] اور جا [illegible] تصویریں [illegible] لکھائی چھپائی [illegible] قیمت [illegible]

ترجمہ [illegible] منظوم

[illegible] ہندی [illegible] اردو نظم میں ترجمہ [illegible] قیمت [illegible]

[illegible]

زمانہ بک ایجنسی کانپور سے منگائیے!

ہاف ٹون عکسی تصاویر

یہ تصاویر ہاف ٹون بلاک سے عمدہ آرٹ پیپر پر چھپی ہیں انکو عام پسندیدگی کا فخر حاصل ہو چکا ہے

تصاویر رنگین	[illegible]	[illegible] کا جلوس	[illegible]	[illegible]	[illegible]
نئی تصویر	گنگا اور جمنا	محاصرہ چتوڑ	مولوی [illegible]	[illegible]	[illegible]
مسیح ابن مریم	[illegible]	[illegible] شہزادہ سلیم	ابو الکلام آزاد	مسٹر تلک	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
موسم سرما	[illegible]	[illegible]	شاعر [illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	مسٹر کالی چرن بنرجی	[illegible]
انتظار	قدیم زمانے کا [illegible]	[illegible]	منشی [illegible]	[illegible]	[illegible]
ہدایت	یورپ کا ایک منظر	[illegible]	مرزا [illegible]	[illegible]	[illegible]
خواب راحت	[illegible]	ٹیپو سلطان	مرزا محمد رفیع سودا	[illegible]	[illegible] محمد علی
[illegible]	مصطفی کمال پاشا کی	دربار [illegible]	مرزا انشاء اللہ خاں	[illegible]	[illegible]
رفیق طفلی	ترکی کونسل	بادشاہ عباس	مولانا [illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	غسل کی تیاری	موسمی تصاویر	مولانا آزاد دہلوی	[illegible]	[illegible]
مشعل ہدایت	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	منشی نوبت رائے نظر	[illegible]	[illegible]
صبح نوروزی	[illegible]	[illegible]	جناب [illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible] تصویر کے	[illegible]	[illegible]	حضرت [illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	مشہور انشا پردازان	ڈاکٹر اقبال	[illegible]	[illegible]
[illegible]	گوتم بدھ	اردو	مولانا حسن نظامی	[illegible]	[illegible]
[illegible]	اکبر اعظم	مولانا شبلی	لیڈران ہند	[illegible]	[illegible]
[illegible]	راجہ مان سنگھ	شمس العلماء ذکاء اللہ	نامورانِ ملک	[illegible]	بلگرامی
[illegible]	[illegible]	[illegible]	راجہ رام موہن رائے	مہاتما گاندھی	[illegible]
کا آزار	دربار شاہجہاں	میر عشق لکھنوی	[illegible]	[illegible]	
کا بلاپ	عہد مغلیہ میں شاہی	حضرت انیس مرحوم	سر سالار جنگ	[illegible]	

زمانہ بک ایجنسی کانپور سے منگائیے!

ہیرے اور سچے موتیوں کا

سفید سرمہ

مستند جناب نامی گرامی ڈاکٹر آر کراپر صاحب

بہادر سی. آر فیلو آف کیمسٹری لندن

آنکھوں کی بیماریوں اور ترقی بینائی کے واسطے مفید ہے اور
ثابت ہو چکا ہے [illegible] ملک ہندوستان [illegible] وغیرہ کے معزز
ڈاکٹروں [illegible] کے [illegible] آنکھوں کی
بیماریوں اور دوا کو چھوڑ کر استعمال کیا ہے

ہمارے سرمہ کا امتحان اور اس کی کامیابی

(۱) [illegible] سرمہ لگانے سے [illegible] روشنی بڑھ جائیگی
اور جلد [illegible] چشمہ دور ہو جائے گا.
(۲) عینک [illegible] کی ضرورت نہیں رہتی.
(۳) [illegible] دھند [illegible] آنسو بہنا [illegible] کھجلی سوزش آنکھوں
کے سامنے اندھیرا [illegible] پلکوں کی اندرونی [illegible] دور ہو جاتی ہے
(۴) آنکھ [illegible] سے [illegible] کا سوئی ہیں سب جلد [illegible]
(۵) پربال [illegible] آنکھوں کے سامنے ڈورا سا آنا بند ہو جاتا ہے. لکھنے پڑھنے
سے آنکھ کی تکان. درد. [illegible]
جملہ امراض چشم کے لیے اکسیر ثابت ہو چکا ہے.
قیمت فی تولہ تین روپیہ [illegible] محصول ڈاک [illegible]

ملنے کا پتہ

مینیجر نگینہ کمپنی نیا چوک کانپور



باپ کو پوری تندرستی حاصل ہو گئی

ایک سناٹوجن استعمال کرنے والے شخص کا [illegible] بیٹا لکھتا ہے کہ
[illegible] سناٹوجن [illegible] کے استعمال سے میرے باپ
کو پوری صحت اور طاقت حاصل ہو گئی. سناٹوجن کے استعمال سے
پہلے میرا باپ [illegible] معلوم ہوتا تھا لیکن اب پورے طور پر تندرست
اور طاقتور ہو گئے ہیں. میں سناٹوجن کا شکر گزار ہوں.
سناٹوجن نے [illegible] کو جو فائدہ پہنچایا ہے وہ آپ کو بھی پہنچ سکتا ہے
تھوڑی سی مدت ہی میں آپ کی کمزوری جاتی رہے گی اور آپ [illegible]
اور تندرست محسوس کرنے لگیں گے کیونکہ [illegible]
اور [illegible] جسم میں [illegible]
[illegible] سناٹوجن [illegible]
سے پورے طور پر [illegible]

SANATOGEN

اصلی مقوی غذا

تمام انگریزی دوا فروشوں [illegible]
سناٹوجن [illegible]

جسٹرڈ نمبر اے ۲۱۱

زمانہ

مرتبہ: دیانرائن نگم بی-اے

جلد ۵۷ | دسمبر سنہ ۱۹۳۱ء | نمبر ۶

فہرست مضامین

تصاویر: شاہنشاہ جہانگیر اور چوگان بازی (رنگین) جعفر بیگ وزیر شاہجہان * ایک مغل شاہزادہ مع ...
منشی رام پال سکسینہ مرحوم — منشی بے دیال سکسینہ مرحوم — شوموتی ...
شریمتی ہیرا کنور دیوی مرحومہ

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت سالانہ ...

قیمت ممالک غیر سالانہ ... ششماہی ... ہندوستان کیلئے ششماہی ...



شاہنشاہ جہانگیر چوگان کھیل رہے ہیں
سترھویں صدی ع، عہد مغلیہ کے مصوری کا نمونہ

زمانہ

جلد ۵۷ — دسمبر ۱۹۳۱ء — نمبر ۶

مغل مصوّری

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی بی۔ اے)

قدیم ہندی مصوّر شبیہ اُتارنے اور اشکال و صُوَر کو بجنسہ نقل و نمایاں کرنے میں ایک مدت نامعلوم سے اپنے جوہر دکھاتے چلے آئے ہیں۔ مغل مصوروں نے انھیں کی تقلید کر کے اس شعبۂ فن میں مہارت حاصل کی۔ تصویر سازی کی قدامت کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ بُدھ کے ایام حیات میں جب اجات شترو اس افضل و برتر ہستی کی تصویر لینے کے لئے مستدعی ہوا اور اس کی عرض و معروض بارگاہ عالی میں مسموع و منظور ہوئی تو گوتم نے کپڑے کے ایک ٹکڑہ پر اپنا سایہ ڈالا۔ بعدہٗ اس عکس میں رنگ و روغن سے خط و خال کو نمایاں کیا گیا، اور اس طرح تصویر مطلوبہ کی تکمیل ہوئی۔

بودھوں کے رنگین شاہکاروں میں بھی کہیں کہیں ایسی شبیہیں نظر آجاتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عرصہ سے اہل ہند اس شعبۂ فن میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ اور ہمیشہ سے حسب استطاعت داد کمال دیتے چلے آتے تھے۔ سیگری میں کشیپ کی رانیوں کی حسین تصویریں آج بھی نقش بر دیوار بنی ہوئی اپنے خالق کی چابکدست انگلیوں کو چوم لینے کی متمنی ہیں۔

اجنتہ کے غار نمبر میں بھی ایسے سرمایۂ رنگین کی قلت نہیں۔ چنانچہ خسرو پرویز اور راجہ پالکشن کی تصویریں زبان حال سے یہی داستان سناتی ہیں۔ یا منتی میں بودھ مصوّر نے اپنی بنائی ہوئی تصویروں کے درمیان میں خود اپنی تصویر بھی ثبت کر دی ہے۔ مصور موصوف نے صرف چہرے مُہرے

ہی کو صحت کے ساتھ نمایاں کرنے پر قناعت نہیں کی، بلکہ ایک دلکش انداز سے اپنی کیفیت نفسی اور اپنے انفرادی خصائص کا بھی اظہار کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ تصویر اجنتہ کے غاروں کی تکمیل کے صدیوں بعد کا عمل ہے لیکن ساخت کے لحاظ سے یہ گمان ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی صناع کے موقلم کے نقش و نگار ہیں۔

جیسا کہ پیشتر ذکر کیا جا چکا ہے، ۸۰۰ء تک اس شعبۂ فن نے خاص تاریخی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ ایک سے زائد قدیم مگر دلچسپ روایتوں کی بنا پر مشہور محقق لافر (Laufer) اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ مصوری کی ابتدا تارک الدنیا سنیاسیوں سے نہیں بلکہ شاہی درباروں ہی سے ہوئی ہے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ مغلوں کی طرح ہندو راجاؤں نے بھی مصوری کی سرپرستی میں اپنی بے پایاں فیاضیاں عام کر دی تھیں۔ "۱۱۹۱ء میں پرتھوی راج نے زر کثیر صرف کر کے اپنی شبیہ تیار کرائی۔ یہی وہ تصویر تھی جس سے نگاہیں چار ہوتے ہی سنجوگتا اپنا دل ہاتھ سے دے بیٹھی تھی" (ایپ نوازن)

عہد وسطیٰ کی مغل مصوری کے بعض نمونے بلاشک و شبہ اجنبیت کا رنگ لئے ہوئے ہیں اور غالباً جنوبی انقطاع ایران کے اس عہد کے فن تصویر کے ہم رنگ ہیں۔ ان کے حواشی بھی تصویر کی طرح پر پیچ و پرخم ہیں۔ یہ اس تیموری اسکولِ مصوری کا خاصہ ہے جس کی بنیاد مشہور مصور سلطان محمد نے سولھویں صدی کے وسط میں ڈالی تھی۔ اس طرز عمل کے جس قدر نمونے دستیاب ہوئے ہیں اُن کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ یا تو مغل حملہ آوروں کے لائے ہوئے ہیں یا ابتدائی مغل فرمانرواؤں کے زیر اہتمام ایرانی مصوروں نے سرزمین ہند میں تیار کئے ہیں۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ سلطان محمد کو بہزاد سے فخر تلمذ حاصل تھا۔ تاہم وہ ایک جداگانہ انداز کا مالک تھا۔ اس نئی وضع کی تصویریں بنہایت دلچسپ ہیں لیکن اب اس قدر مفقود ہو گئی ہیں کہ شاذ و نادر ہی کسی گوشہ میں نظر آ جاتی ہیں۔

مغل اسکول کے ابتدائی مرقعوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد کے مصوروں میں بھی ہندو اہل کمال مقدم تھے۔ خصوصاً بھگوتی اور ہنار (Henar) تو شاہی ملازموں میں پیش رو شمار ہوتے تھے۔ دربار میں ان کا بڑا وقار تھا۔ سولھویں صدی کا آغاز بھگوتی کے انتہائی کمال کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد ہنار کا طوطی بولنا شروع ہوا۔ یہ فیصلہ کرنا محال ہے کہ آیا یہ دونوں صناع قدیم ہندو مصوروں کے سلسلہ سے مربوط تھے یا مغل بادشاہوں کی ہنر پروری اور داد و دہش کے شہرۂ عام نے انھیں قعر گمنامی سے نکال کر ہنرمندوں کی صف اول میں لا کھڑا کر دیا۔ بھگوتی آنکھ بند کئے اہل فارس کا اتباع کرتا رہا۔ بسعی اعداث تو در کنار اُسے اپنی دھن میں اتنا بھی مقدور نہ ہوا کہ امتزاج اسالیب ہی سے کچھ استنباط کرتا۔ چنانچہ اس کے متعلق ایک معتبر نے یہ رائے

ظاہر کی ہے کہ "وہ اُن مصوروں میں سے ایک تھا جنھوں نے نقل کرنا اپنا مطمح نظر بنا لیا تھا۔ وہ جو ایرانیوں کی کورانہ تقلید کرنے کے سوا کچھ جانتے ہی نہ تھے......"

لیکن برعکس اس کے ہُنار خالص راجپوت اسکول کا پیرو تھا۔ اور اس کے تخیلی کارنامے ہندی رنگ میں اختصاص کا پہلو لئے رہتے تھے۔ ہندوستانی جذبات کی مصوری میں اسے ید طولیٰ حاصل تھا اور اس حیثیت سے زمانہ کی قیود کو بالائے طاق رکھکر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہُنار اُن اصحاب کبار میں سے ایک تھا جنھوں نے اجنتہ کے غاروں سے اثاثہ زیبائش فراہم کرنے کی تگ و دو میں آخری سانس لیا۔

بھگوتی کے آرٹ پر رائے زنی کرتے ہوئے لائق مبصر نے تنگ نظری سے کام لیا ہے اور اُسے خواہ مخواہ متہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ایرانی مصوری بھی ہندی نژاد ہے۔ پھر اس عہد کے مصور کے لئے اپنے آقا کی خوشنودی و پسند مقدم تھی۔ اور یہ شاہی احکام تھے کہ اجنبیوں بالخصوص ایرانیوں کے اسلوب کی بے چون و چرا پیروی کی جائے۔ ایک بار جہانگیر کی سالگرہ کے موقع پر سر طامس رو نے ایک تصویر بادشاہ کی نذر گذرانی۔ جہانگیر نے اپنے دربار کے چابکدست مصور کو اس کی ہوبہو نقل لینے پر تعینات کیا۔ مصور مذکور نے اس نفاست سے اپنے فرائض کی تکمیل کی کہ سر طامس رو کو اصل و نقل میں امتیاز کرنا دشوار ہو گیا۔ درحقیقت جہانگیر کو اس بات پر بڑا فخر تھا کہ اس کے دربار کے مصور نقل اتارنے میں اتنی قدرت رکھتے تھے۔

بھگوتی بھی ہوا کا رُخ دیکھکر گامزن ہوا۔ اُس نے اپنے دامن کو بچانے کے لئے ان اسالیب کی پابندی کو اپنا شعار بنا لیا۔ اور جادۂ وفا پر اتنا متین و استوار رہا کہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی منحرف نہ ہوا۔ ہاں اس قدر ورد الزام ضرور ہے کہ اس نے اپنے فطری جوہر کو جلا دینے کی آزادانہ بھی کوئی کوشش نہیں کی۔ یہی اس کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے جس سے اغماض کرنا محال ہے۔ ورنہ اس کا کمال اور ادراک کمال مستغنی عن التعریف ہے۔

ہُنار کی روش نے ہند و تہذیب و تمدن کے اثرات کو بالکل واضح و عیاں کر دیا، چنانچہ جہانگیر اور شاہجہاں دونوں کے عہد کی ایسی تمثیلیں دستیاب ہوئی ہیں جو اس اختلاط و ارتباط کو نمایاں کرتی ہیں۔ جہانگیر کے دربار کے معروف صناع بشن داس کا معرکۃ الآرا کارنامہ ایسے ہی ایک واقعہ کا ماحصل ہے جو تعصب و جانبداری کے الزامات کا ابطال کرتا ہے۔ اس تصویر میں شیخ پھل (Fuz) کے کاشانہ کا عکس اتارا گیا ہے۔ تقریباً پچاس اشخاص مختلف انداز سے اس فنا فی الذات شیخ کے قیام گاہ کا طواف کرتے نظر آتے ہیں، اور کمال یہ ہے کہ تصویر کا طول ۱۴ ۳/۴ انچ اور عرض ۱۰ انچ سے کسی طرح بھی زیادہ نہیں ہے، سارا منظر اس حسن و خوبی کے ساتھ دکھایا ہے کہ جملہ تفاصیل اپنی اپنی جگہ پر نمایاں ہیں۔

۱؎ ثبوت کے لئے ملاحظہ ہو مغل مصوری قسط اول و دوم مطبوعہ رسالہ زمانہ بابتہ جنوری و فروری ۱۹۳۰ء

شیخ کے حجرہ کے عقب میں خم کھائے ہوئے نیم کا گھنا اور سایہ دار درخت اپنے کشادہ بازو پھیلائے اس مان بندگی میں سرنگوں ہے۔ چھت کے بائیں جانب دو سیاہ تاب کالاغ عجیب شان خود رائی سے بیٹھے داد موسیقی دے رہے ہیں۔ سارے منظر کے پس پشت نیلگوں آسمان اپنی جھلک دکھا رہا ہے۔ تصویر اس قدر واقعیت و جاذبیت کی حامل ہے کہ چراغ لیکر تلاش کرنے پر بھی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

ہر دو شائق مصور نے کمال رنگ آمیزی سے ایک عجیب سماں پیدا کر دیا ہے۔ حسن عمل کا یہ عالم ہے کہ کاذ انام کے انداز ہی سے سکوت و جمود کا تسلط مطلق مترشح ہے اور کہیں کسی قدم کا ہیجان یا ہلچل دکھائی نہیں دیتی۔ ہر شخص اس خدا رسیدہ بزرگ کے حضور میں اشتیاق و عقیدت کے جذبۂ بے اختیار کے زیر نگین لب بستہ و خاموش کھڑا ہے۔ کسی کو لب کشائی کی مجال نہیں۔ پھر تفریق مذہب کی لایعنی قیود کے افتراق کی تو ایسی نادر تصویر کھینچی ہے کہ جس کی نظیر نہیں ہو سکتی۔ ہندو خواتین کمال خصوصیت و پاکیزگی کے ساتھ "پھل پھول" شیخ کی نذر کرنے اور اُس کے روحانی فیض سے مشرف ہونے کی تمنا لئے چپ چاپ ایک قطار میں کھڑی ہیں۔ خلوص و پاس تقدس نے ہندو مسلمان کا امتیاز ہی مٹا دیا ہے۔

دوسری شبیہ جو غالباً شاہجہاں کی حکومت کے اوائل ایام کا عمل ہے ایک مخفی و مقدس اجتماع کی آئینہ دار ہے۔ مصور نے کسی پیرانہ سال و عزلت نشین پیر اور اس کے مرید کی انتہائی نفسی عقیدت و ریاضت اور استقلال و استغنا کو اس صفائی کے ساتھ پردۂ تصویر میں چھپایا ہے کہ جس کا بیان نہیں۔ اس پر کسی مغل امیر اور اس کے ہمراہی کی موجودگی نے تو اس منظر کو دو چند دلنظر بنا دیا ہے۔ ایک طرف بوڑھے تیاگی اور اس کے چیلے کی سادگی و سادہ مزاجی کشش نظر کا جادو لئے ہوئے ہے۔ اور دوسری طرف امارت و ریاست اپنا جلوہ دکھا رہی ہے رنگ سازی کے تو وہ وہ جوہر دکھائے گئے ہیں کہ رخ تصویر سے نظر ہٹانا مشکل ہے۔ جس جذبہ کے زیر اثر مغل امیر اس ہندو مہاتما کو نذر دے رہا ہے۔ اس کا نقشہ کھینچنے میں دور بین صناع نے قلم توڑ دیا ہے۔

سولھویں صدی کے اختتام تک مغل مصوری نے ایک جداگانہ طرز و روش اختیار کر لی تھی۔ اسی انداز کو اپنا کر وہ مغل بادشاہوں کی منظور نظر بنی اور اُن کی سرپرستی سے فیضیاب ہو کر پروان چڑھی۔ آئین اکبری میں مرقوم ہے کہ خود اکبر اپنی شبیہ کی تکمیل کے لئے وقتاً فوقتاً خاص نشستوں کا اہتمام کیا کرتا تھا۔ اکثر اوقات امراء و وزراء بھی ان خاص مواقع پر شریک و موجود ہوتے تھے۔ اس طرح مصوروں کی کاریگری کا ایک ضخیم مجموعہ اکٹھا ہو گیا تھا سر ٹامس رو رقمطراز ہے کہ جہانگیر کے دربار کے ایک مصور نے کسی تصویر کی پانچ نقلیں لیں اور بادشاہ کے اشارے پر اس کے روبرو پیش کیں جب اسے اصل کی شناخت کرنے میں تاخیر و تعویق ہوئی تو جہانگیر نے طفلانہ انداز مسرت سے اسے خطاب کرتے ہوئے مصور مذکور کے کمال کا اعتراف کیا۔ اورنگ زیب کی بے اعتنائی

سے مصوری زوال وانحطاط کے گہرے غار میں جا گری۔ خود اس کے دربار کے فرانسیسی طبیب برنیر نے فنِ تصویر کی چشم دید کیفیت یوں بیان کی ہے "ہندوستانی مصور اصول تناسب اور خط و خال کی صحیح نمائندگی کے ضوابط سے محض نابلد ہیں لیکن اگر ان کی مناسب رہنمائی کی جائے تو یہ قوم وسوقیت بھی ختم ہو سکتی ہے۔

مغل مصوری کے بعض مماثل کے مشاہدہ سے پتہ چلتا ہے کہ قسامِ ازل نے اس عہد کے مصوروں کو پیدائش کی ساعت ہی سے شبیہ اتارنے کی قدرت ودیعت کی تھی۔ ان مرقعوں کی تخلیق کی کثیر تعداد مغل حکمرانوں کی شبیہوں پر مشتمل ہے دیگر علامات ظاہری کے علاوہ سنہرا ہالہ شاہی نسل کے افراد کا طرۂ امتیاز ہے۔ اکثر تصاویر میں دو دو تین تین بادشاہوں کو یکجا کر دیا ہے۔ اس قسم کی بیشتر تصویریں تاریخی اہمیت سے قطعاً معرا ہیں عام طور پر فرد واحد ہی ایک تصویر کی زینت ہے جسے پھولوں سے مزین سبزہ زار میں لا کھڑا کیا ہے۔ بیک گراؤنڈ کا عنصر جس نے ماحول کے فطری رنگوں سے دلکشی مستعار لے لی ہے۔ سارے منظر کی جان ہے۔

زربفت، کمخواب کی پوشش تب سرخ رنگ کا برمحل استعمال اپنے دامن پر بہار میں ایک جلوہ زار چھپائے ہوئے ہے مصاحبوں کے لباس کو سنہرے رنگ نے ایسا تابناک بنا دیا ہے کہ روشنی میں آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ کہیں کہیں قیمتی کی تینیں آویزاں کر کے تصویر کا حسن دوبالا کر دیا گیا ہے ہلکے ورق پردوں میں سے حسن کی شطاب شعاعوں نے چھن چھن کر نظر فریبی و دلآویزی میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔

کبھی سادہ یا ہلکے رنگ کی سطح پر سیاہی سے خط و خال کو واضح کیا گیا ہے۔ تو کبھی سطح کو گہرے سیاہ رنگ سے رنگ دیا گیا ہے۔ عکس پھیکا یا ماند کا کہیں نام کو بھی نشان نہیں ملتا پھر بھی تفسیر جذبات اور موڈ کی نفاست سے نظر نوازی کا سامان فراہم کر دیا گیا ہے۔ رنگوں کی شوخی، جدول کی سحر آفرینی، انداز کا تنوع اور تاثر جمال پر سادہ تصویر کی خوبصورتی کا انحصار ہے۔ خط و خال اور چہرے مہرے کی بعینہٖ نقل اتارنے میں مغل مصور اپنا ثانی نہیں رکھتا۔

بشرہ اور فرق سر کے نمایاں کرنے میں تو یہ ابداعِ صناع افسوں کر دیتا ہے۔ پیسانیلو (Pisanello) کے آرٹ کا یہ پہلو دنیائے مغرب میں بہت مقبول ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے بنائے ہوئے تمغہ جات (Medals) ان مماثل کے مدِمقابل ماند ہو جاتے ہیں۔ بشرہ سے صاحب تصویر کی کیفیت نفسی ادبیان کرنا مغل مصور کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ گو بادی النظر میں اس کی تصاویر خشک ہیں لیکن پیشہ دخطوط کی باریکی اور سانچہ کی لطافت وغیرہ اوصاف اس کے عمل کو معراج کمال تک پہنچا دیتے ہیں

زیرک مصور اپنے معمول کا پیکر اتارنے میں اس انداز عمل سے کام لیتا ہے کہ ظاہر و باطن بھی کا انکشاف ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا صفحہ قرطاس پر صاحب تصویر کا دل کھول کر رکھ دیا ہو۔ بعض کوتاہ نظر مبصرین نے فن صناع کو "چاپلوس" "مکروہ" وغیرہ ناشائستہ الفاظ سے خطاب کیا ہے لیکن دوررس نگاہیں اس حقیقت سے ناآشنا نہیں ہیں

اس نے ایک ہی جنبشِ قلم سے کردار نگاری کا ایسا اعلیٰ معیار پیش نظر کر دیا ہے کہ جس کی رفعتوں تک عام
روں کی رسائی بھی ممکن نہیں۔

مغل مصور کا ہر کارنامہ اس کے مرکزِ عمل کی فطرت کا مظہر ہے۔ وہ اپنے موضوع کی فضیلت و حقارت تندی
لق، خست و سخاوت، راستی و ناراستی، اور تلون و استقلال وغیرہ تمام اوصاف کو حسب موقع خط و خال اور ادا
ز سے اس قدر چمکا دیتا ہے کہ مزید تفسیر کی حاجت نہیں رہتی۔ مغلوں کے ماثل کی کثیر تعداد یک رخی تصاویر
شتمل ہے۔ سادہ بشرہ و خال خال ہی دکھایا گیا ہے۔ اس ضمن میں ہندی ایرانی مصوری نے آزادانہ روش اختیار
ی ہے اور بالعموم چہرہ کا تین چوتھائی حصہ نمایاں کیا ہے۔ مغل مصوروں نے اس روش کہنہ میں جدت
پیدا کی ہے۔

ان صناعوں کے کارنامے بالخصوص قدیم روایات و رسوم کا خوشگوار ثمرہ ہونے کے علاوہ بعض
یقینہ قواعد و ضوابط نیز دربار کے مقررہ دستور کے بھی پابند ہیں۔ ایسی صورت میں اگر کہیں تصنع اور سنجیدگی کا
برائے نام شائبہ نظر بھی آ جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ سطح کے منعکس کرنے اور بشرہ کے نقوش کے رنگنے میں تو مصوروں نے
نے کمال کی انتہا کر دی ہے۔ اس پر ڈرائنگ کی لاثانی و غیر معمولی خوبیوں نے اس کے حسنِ عمل میں چار چاند لگا
دیے ہیں۔ پیشانی کے نقوش سیاہ و سفید رنگ میں ایسی تندہی سے مرتسم ہوئے ہیں کہ "عالم خیال" کی ساری تصویر
نظروں میں پھر جاتی ہے بقیہ تصویر ہلکے خطوط سے کاغذ پر وضع کی گئی ہے۔

بعض تصاویر ابتدائی کوششوں کا نمونہ ہیں۔ اور بعض نامکمل تا ہنوز رنگ و روغن ہونے سے پیشتر ہی اپنے خالق
کے دل سے اتر جانے کے باعث کس مپرسی کا شکار ہو گئے ہیں۔ لیکن مغل مصوری کی تمام امتیازی خصوصیات
ان میں بھی بجنسہ کارفرما ہیں۔ ڈرائنگ کی صحت و صفائی، ساخت کی باریکیاں اور اعلیٰ پایہ کی کاریگری، غرض کوئی
ایسا وصف نہیں جس کا فقدان بار نظر ہو۔ پیمانہ کی تخفیف و افزائش کے باوجود بھی تناسب اعضا میں کوئی فرق
نہیں آتا اور تصویر کی دلکشی بحال رہتی ہے۔

کلغی دار کلاہ میں جگمگاتے ہوئے جواہرات اور زیب گلو تابناک موتیوں اور ہیروں سے تصویر کی
شان اور بھی دوبالا ہو جاتی ہے۔ صاحبِ تاج کی شبیہ میں طلائی ہالہ جان ڈال دیتا ہے۔ کبھی سبز و سنہرے
اور کبھی لاجوردی رنگ سے تصویر کی بیک گراؤنڈ بنائی گئی ہے۔ کہیں کہیں بالائی حصہ میں زردی مائل
سرخ و آسمانی رنگوں سے گلگونہ شفق کی بہار آفرینیاں بے نقاب کی گئی ہیں۔ مصور کمال چستی کے ساتھ
افراد تصویر کو ایک عجیب ادا سے خوشنما و شاداب مرغزاروں میں کھڑا کر کے اور ان کے زیر پا رنگ برنگ
اور انواع و اقسام کے پھول کھلا کر اپنے حسین مناظر کو تنوع و تغیر سے مالا مال کر دیتا ہے۔

مصور کی گلباریوں سے لبریز دامن رنگیں، سادہ دھیمے بیک گراؤنڈ اور شاہانہ لباس۔ تصویر اور افرادِ تصویر کے بشرہ کے نقوش پر سونے میں سہاگہ کا کام کرتے ہیں۔ خصوصاً ہاتھوں کا انداز اس قدر نیچرل ہے کہ داد دیئے بغیر رہا نہیں جاتا۔ بودھ مصور کے اس کمال کو زندہ رکھنے کی مساعی میں مغلوں کو جس قدر کامیابی ہوئی ہے اس کی کوئی حد و حساب نہیں۔ بلاشبہ یہ بات ہندی مصوروں کے علاوہ دنیا بھر میں کسی دوسری جگہ نہ ملے گی۔

بودھ، راجپوت اور مغل مصوروں میں سبھی نے اپنی تصویر کو مؤثر بنانے کے لئے افراد کی انگلیوں سے وہ کام لیا ہے جو محتاجِ بیان نہیں۔ صاحبِ تصویر کے دونوں ہاتھ ایک خاص انداز سے تلوار کے مرصع قبضہ پر رکھے ہوئے دکھانا مغل مصور کی پسند خاص ہے۔ مصور کے اس اسلوب کا نفسِ عمل سے خاص لگاؤ ہے لیکن جب کبھی چابکدست صناع کو ہاتھوں سے کسی غیر معمولی جذبہ کا اظہار منظور ہوتا تھا تو تکمیل مدعا کے لیے کوئی خوشنما پھول یا بیش قیمت ہیرا منتخب کیا جاتا تھا۔ گو نئی روشنی کے نقادوں کی نظر میں یہ طریقہ بالکل مصنوعی و ننگ مردانگی ہے تاہم اقتضائے زمانہ کے عین مطابق ہے۔

عام طور پر مغل مصوری کی مساعی شاہ و گدا، مغنیہ و رقاصہ، امیر و فقیر، بھاٹ بھکاری، شاہی حرم، مسخروں، درباریوں اور سائیسوں ہی تک محدود رہیں۔ کسی دوسرے موضوع پر شاذ و نادر ہی اس کے قلم نے جنبش کی ہو مگر ان تصویروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے حاشیے پر متعلق نام بھی درج ہیں۔ قدیم ہندی مورخ اپنے ہیرو کا حلیہ وغیرہ بیان کرنے سے مصلحتاً احتراز کرتے تھے لیکن یہ کوتاہی مصور کے قلم معجز رقم نے پوری کر دی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان برگزیدہ ہستیوں کی تصویریں لیکر جن کے اسماء گرامی ان کی کارگذاری کے صلہ میں ہر خاص و عام کی ورد زبان تھے، اور بادِ فنا کے تند و مخالف جھونکوں کی دست درازیوں سے جن کا صرف نام باقی تھا، نشان مٹ چکا تھا، مصور کی چیرہ دستی نے انھیں از سر نو زندہ کر کے حیاتِ دوام بخش دی۔ یہ حقیقت ان نقوش کی صحت کی ضامن ہے کہ یا تو ہمعصر مصور کے ہاتھوں ان کی تکمیل عمل میں آئی یا ان کے عکسِ حقیقی سے متاخرین نے بے کم و کاست نقلیں لیں۔ ان میں سے بعض کا تو اس عہدِ عتیق سے براہ راست تعلق ہے جس کی روایات پر ہندو فارس کی تاریخ کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

ان ایامِ قدیم کے ایک ایرانی شہزادہ ایرج (Iredj)، چنگیز خاں اور حضرت علی وغیرہ کی شبیہیں تو اب بھی کہیں کہیں مل جاتی ہیں۔ چند سال پیشتر پنجاب میں یونانی وضع کی سکندر کی تصویر ملجانا چنداں دشوار نہ تھا۔ حالانکہ اب سے دو ہزار برس پہلے صرف اٹھارہ ماہ تک ہند میں اس کا قیام رہا (براؤن)۔ مسٹر جے۔ لاک وڈ کپلنگ (J. Lockwood Kipling.) رقمطراز ہیں کہ "اعادہ اور کثرتِ مشق

نے مغل مصور کو اتنا قادر بنا دیا تھا کہ بغیر کسی رہنمائی یا نمونہ کے اکبر اورنگ زیب یا دوست محمد وغیرہ کی تصویر تیار کر دینا اس کے لئے چند لمحوں کی بات تھی۔ اور صحت و صفائی کا یہ عالم تھا کہ مختلف افراد کی "تصویریں نگہ داشت میں شناخت کی جاسکتی تھیں" غالباً یہ ان دنوں کی بات ہے جبکہ سیسے کے چربے ڈھالے جانے لگے تھے۔

ابتداءً یہ فن شاہی دربار کی چہار دیواری سے باہر نہ نکلا، لیکن ان حدود سے باہر قدم رکھتے ہی اس پر عوام کی نظریں بھی پڑنے لگیں یہیں سے مغل مصوری کا زوال شروع ہوا۔ معلوم کس شقی القلب کی نظر تھی کہ بھری جوانی ہی میں یہ صنعتِ رنگین دنیا سے اٹھ گئی۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز سے مقتدر شخصیتوں کی تصویروں کا عکس لیکر فروخت کرنا ایک عام روزگار ہو گیا تھا۔ عکسی کاغذ کے بجائے شفاف پوست یا جھلی کا استعمال ہوتا تھا۔ اور اس طرح ایک تصویر کی باسانی متعدد نقلیں لی جاسکتی تھیں۔ خط و خال اور ڈھانچہ کا عکس لینے کے بعد رنگ بھرا جاتا تھا۔

جس کاغذ پر نقوش اتارے جاتے تھے اس پر جدول پہلے ہی رنگ و روغن سے درست کر دی جاتی تھی۔ اور مناسب مقام پر صفائی کے ساتھ یہ بھی تحریر رہتا تھا کہ تصویر زیر نظر فلاں قلم کی منت کشِ احسان ہے۔ حالانکہ ہندی نجار پچیکاری میں یکتائے دہر و یگانۂ روزگار تھے اور جاپان میں بھی ان دنوں لکڑی پر کھدائی و نقاشی کا کام روز افزوں تھا لیکن تعجب ہے کہ اس کے باوجود مغل صناع نے لکڑی کے بلاک بنانے کی جانب مطلق توجہ نہ کی۔

حسبِ دستور مغلوں کے ہر کارنامے میں تصویر کے رخ، پیشانی یا جدول کے نزدیک تصویر کا نام سیاہ روشنائی سے عربی حروف میں کندہ ہے۔ اجتماعی تصاویر (Group) کی سطح پر جملہ اراکینِ زحمت کے نام نہایت باریک خط میں تحریر کئے گئے ہیں، کہیں کہیں سلسلہ وار ہر فرد کا نام اس کے قریب لکھا ہوا ہے، البسا اوقات ناموں کی فہرست اور دیگر تفاصیل تصویر کی پشت پر درج کر دی گئی ہیں۔ حیرت کا مقام ہے کہ مصور نے ناموں کی فہرست مرتب کرنے میں ناقابلِ تلافی غلطی کی ہے۔ اور فنِ تصویر کے اس قدر عام ہونے کے باوجود بھی اسے اس قدر مغالطہ ہوا ہے کہ اس نے اورنگ زیب کی شبیہ کو جہانگیر کی تصویر قرار دیا ہے۔ اس قسم کی غلطیوں کی وجہ شاید یہ تھی کہ کاتب و مصور دو جداگانہ ہستیاں تھیں اور کاتب ان دونوں فرمانرواؤں کے بشرہ سے قطعی واقف نہ تھا۔ بعض جگہ ان اغلاط کو دیدہ و دانستہ صرف بدنیتی سے روا رکھا گیا ہے اور فرضی تصویروں سے ممتاز ہستیوں کو منسوب کرکے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کی مذموم کوشش کی گئی ہے مغل مصور کے دورِ حیات میں مصوری ایک نئے رنگ میں اپنے بانکپن کی جھلک دکھلانے لگی تھی۔

مختلف رنگ کے کاغذوں کو کاٹ کر چڑیا یوں، پرندوں اور انسانوں کے خط و خال کو اس انداز کمال سے نمایاں کیا جاتا تھا کہ جس کی نظیر ملنا محال ہے۔ اگرچہ اورنگ زیب کے اواخر ایام میں رعشہ براندام مصوری چراغ سحری سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی لیکن یہ فن مدنیت و ارتقا کی انتہائی منزل طے کر چکا تھا۔

نہ معلوم اس فن کی ابتدا کب اور کیونکر ہوئی۔ ہاں اس کا رواج اس قدر عام ہوا کہ اب بھی لوگ ہر سال جھانکیوں کے موقعہ پر اس شعبہ میں دل کھول کر داد فن دیتے ہیں۔ صنعت ہذا کے بعض قدیم نمونے چند اہم نتائج اخذ کرنے میں ایک بڑی حد تک رہنمائی کرتے ہیں۔ ایسی ہی ایک تصویر میں اورنگ زیب کی ضعیفی کا عالم دکھایا گیا ہے۔ سفید کاغذ کو باقاعدہ کاٹ کر سیاہ کاغذ پر اس انداز سے چسپاں کر دیا ہے کہ چہرے مہرے کے خط و خال ہوبہو ابھر آئے ہیں۔ ریش و بروت، رخساروں کی جھریاں، کا، وان عمر رفتہ کے نشان، آنکھ، ناک کان، انگلیوں کا درمیانی فاصلہ، ہونٹوں کی جنبش، بل کھایا ہوا عصا، اور کمر کا خم وغیرہ صرف سیاہ و سفید کاغذ کے اتصال سے نمایاں کئے گئے ہیں، کہیں پنسل یا رنگ وغیرہ کا ایک نقطہ بھی نظر نہیں آتا۔

اس قسم کی ایک دوسری تصویر میں دو لحیم و شحیم مرغ برسر پیکار دکھائے گئے ہیں، یہاں حسن کمال کا ظہور ہوا ہے اُسے دیکھکر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

محبت کا دیوتا

اے محبت کے دیوتا! تو نے کیوں میری طرف سے منہ پھیر لیا، کیا بیچارگی اور خوف کی وجہ سے؛

تیری طاقت گھٹ جائیگی اور تیرا غرور مٹ جائیگا، جب ایک مدت دراز کے بعد تو مجھے چھوئے گا یا میری آواز سنے گا۔

اے محبت کے دیوتا: تو کس لئے مجھ سے بے خبر ہے؛ محبت کے سبب سے یا نفرت کی وجہ سے؛

اس مہیب معجز نما ساعت نے جادو کر دیا جس نے ہماری روحوں کو اپنی پوری طاقت سے قسمت کے دہکتے ہوئے شعلوں میں جھونک دیا۔

اے محبت کے دیوتا! خدا کے لئے میری طرف سے اپنا منہ نہ پھیر۔

ہماری رنجیدہ ہستیوں کو قید ہستی کی زنجیر سے آزاد کرنے کے لئے غم اور موت متفق ہو گئے ہیں۔

یا وہ ہمیں ہماری قدیم خواہش کے حلقہ بگوش بنا دیں گے۔

(ترجمہ) (نقش عالی)

حکومت انگلستان میں پارٹی سسٹم کا رواج

(از مسٹر اننت پرشاد نگم۔ بی۔ اے)

اہل مغرب نے گو جدید سائنس کے بیش بہا کرشموں سے تمام دنیا کو گرانبار احسان کیا ہے لیکن تمدن کے سینہ میں ذمہ دار حکومت کا تحفہ بھی قدر و قیمت میں کسی سے کم نہیں ہے۔ اس طرز حکومت میں بس پر ذمہ دار حکومت کا اطلاق ہوتا ہے۔ گو اہل ملک کی صحیح نمائندگی ضروری ہے لیکن پارٹی سسٹم کے بغیر اس کے عملی محاسن کا انکشاف نہیں ہوتا۔ حکومت کے اختیارات جب کبھی ایک متنفس سے منتقل ہو کر کثیر التعداد اشخاص کے ہاتھ میں آئیں گے تو ان کے استعمال کے متعلق اختلاف رائے ہونا قدرتی و لازمی ہو جاتا ہے چنانچہ جمہوری حکومت بلا پارٹی سسٹم کے کامیاب نہیں ہو سکتی ہے۔ پارٹی سسٹم جمہوری حکومت کے لئے نہ صرف لازمی بلکہ مفید بھی ہے۔ اہل حکومت کی خامیوں اور غلطیوں کو طشت از بام کرنا، وقتی سیاسیات کے نشیب و فراز سے ان کو آگاہ کرنا اور عمال حکومت کو مطلق العنانی کے خطرات سے بچانے کا اہم کام مخالف پارٹی کے ذمے ہوتا ہے۔ جو پارٹی برسر حکومت ہے اس کو مخالف پارٹی اس امر کی یاد دلاتی رہتی ہے کہ ذرا چوکے اور حکومت کی باگ ہاتھ سے گئی۔ پارٹی سسٹم کے محاسن اور عیوب کا اندازہ انگلستان سے بڑھکر کسی ملک کے طرز حکومت سے نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ نہ صرف اس سسٹم کی ابتدا اس سرزمین میں ہوئی بلکہ خود جمہوری حکومت کا منبع و مرکز انگلستان ہے۔ اسی وجہ سے برطانوی پارلیمنٹ کو تمام پارلیمنٹوں کی ماں کہا جاتا ہے۔

تاریخ عالم میں ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب حکومت اس فرقہ کے ہاتھ میں رہتی تھی جس میں اس کے قائم رکھنے کی قوت ہو۔ کون فرقہ کس خطۂ زمین پر حکومت کریگا اس کا فیصلہ عموماً تلوار پر منحصر ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت جماعت بندی رواداری کے اصول پر مبنی نہ تھی۔ فتحمند فرقہ مفتوح پارٹی کی ہستی کو بھی گوارا نہ کرتا تھا۔ اور مخالفین کو نیست و نابود کرنا حکومت کا اعلیٰ اصول سمجھا جاتا تھا۔ جمہوریت کے زمانہ میں فریق مخالف کو نیست و نابود کرنے کا سوال باقی نہیں رہا۔ مخالف پارٹی اور حکومت پارٹی دونوں ہی ذمہ دار حکومت کے ضروری اجزا ہیں۔ مملکت کی ترقی اور طمانیت دونوں ہی کو عزیز ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی ہستی کو نہ صرف تسلیم کرتے بلکہ ضروری بھی سمجھتے ہیں۔ فرق محض اصول حکومت کا ہے۔ مختلف سیاسی مسائل پر مخالف پارٹیوں کے مختلف خیالات

ہیں۔ ایک کا دوسرے سے نقطۂ نظر جدا ہوتا ہے۔ ہر ایک فرقہ سیاسی گتھیوں کا ایک دوسرے سے مختلف حل تجویز کرتا ہے۔ اگر ایک تعجیل پسند ہے تو دوسرا سست رفتار۔ اگر ایک شاہی اختیارات کا حامی ہے تو دوسرا شخصی آزادی کا قائل۔ ایک فرقہ تجارتی آزادی کے اصول پر قوانین وضع کرنا چاہتا ہے۔ دوسرا ملکی تجارت کو فروغ دینے کے لئے درآمد پر ٹیکس عائد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ غرض ہر فریق اپنے اپنے اصول اور اپنے اپنے طریقے پر ملکی مفاد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ ملکی امن اور بہبودی کے لئے مختلف خیال کے لوگوں کا مختلف جماعتوں اور مختلف گروہوں میں تقسیم ہوکر اپنے اپنے نقطۂ خیال سے نظام حکومت قائم کرنے کی کوشش کا نام پارٹی سسٹم ہے۔ مسائل ملکی کے مختلف پہلو ہوا کرتے ہیں اور ان پہلوؤں کے لحاظ سے جماعتیں قائم کی جاتی ہیں۔ مثلاً مسئلہ آئرلینڈ کے متعلق اگر انگلستان کی لبرل پارٹی آئرلینڈ کو ہوم رول دینے کے حق میں تھی تو کنسرویٹیو پارٹی انگلینڈ اور آئرلینڈ کی مشترکہ پارلیمنٹ قائم رہنے پر مصر تھی، اور اس مسئلہ نے یہاں تک اہمیت اختیار کی کہ کنسرویٹیو جماعت یونینسٹ Unionists (حامیان اتحاد) کے نام سے مخاطب کی جانے لگی۔ اختلاف رائے تو عام طور پر ہر سیاسی مسئلہ میں ہوتا ہے لیکن پارٹی سسٹم میں صرف اہم مسائل کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ مستقل سیاسی مسئلوں میں عام طور پر رائے کا قائم ہونا، ابتدائی نشو و نما اور فطری رجحانِ طبیعت پر منحصر ہوتا ہے، گو خاص خاص حالات میں عارضی واقعات بھی شخصی خیالات میں انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔ برطانیہ کی پولیٹیکل تاریخ ایسے واقعات سے خالی نہیں ہے۔ ابتدا میں پیدائشی خیالات کی پیروی ہوئی لیکن بعد میں بالکل مختلف اصول اختیار کر لئے گئے۔ مسٹر گلیڈ اسٹن کی مثال ہمارے سامنے ہے جنھوں نے کنسرویٹیو آب و ہوا میں تعلیم و تربیت حاصل کی اور اسی حیثیت سے پارلیمنٹ میں بھی داخل ہوئے لیکن ان کی پولیٹیکل زندگی کا خاتمہ لبرل پارٹی کے بہترین اور مایۂ ناز لیڈر کی حیثیت سے ہوا۔

انگلستان میں پارٹی سسٹم کا رواج بہت قدیم ہے، قریب قریب ذمہ دار حکومت کے ابتدا ہی سے پارٹی سسٹم قائم ہے لیکن ۱۸۳۲ء کے اصلاحی قانون نے پارلیمنٹ کو اہل ملک کے خیالات کا سچا آئینہ بنا دیا۔ چنانچہ اس وقت سے ہاؤس آف کامنس (یعنی دار العوام) کے کارنامے پارٹی سسٹم کے رنگ میں پورے طور پر رنگے ہوئے نظر آنے لگے۔ اس کے پیشتر پارٹی سسٹم کے لحاظ سے بہت طویل زمانہ میں حکومت میں تغیرات ہوا کرتے تھے لیکن اس قانون کے بعد حکومت کی عملی کارروائیوں میں اہل ملک زیادہ دلچسپی لینے لگے اور مخالف پارٹی اپنے پروگرام کو حکومت کی پالیسی میں داخل کرنے پر زیادہ مستعد و کوشاں ہونے لگی۔ عمال حکومت کی کارروائیوں پر مزید سرگرمیوں کے ساتھ نکتہ چینی ہونے لگی جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جو پارٹی برسر حکومت ہوتی قلیل عرصہ کے بعد مخالف پارٹی کی شکست اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ عام طور پر اس زمانے میں صرف

دو پارٹیاں میدان عمل میں تھیں، ایک کنسرویٹو پارٹی (قدامت پسند فرقہ) جس میں عام طور پر قدیم رؤسا اور شرفا شامل تھے۔ قدرتی طور پر یہ فرقہ تخت شاہی کے حقوق کا محافظ تھا۔ دارالامرا (ہاؤس آف لارڈز) کے اختیارات میں کمی اس کو ناگوار تھی۔ زمینداروں، سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کی امداد و اعانت اس کا نصب العین تھا دوسری جماعت اپنے آپ کو لبرل پارٹی (وسیع الخیال فرقہ) کے نام سے موسوم کرتی تھی، اس میں زیادہ تر متوسط طبقہ کے لوگ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ پارٹی شخصی آزادی کو پسند کرتی تھی۔ دارالعوام (ہاؤس آف کامنز) کے اختیارات میں کوئی حد قائم کرنا اسے ناگوار تھا حکومت کے تمام صیغوں میں اصلاحات عمل میں لانا، مزدور پیشہ اور متوسط لوگوں کے حقوق میں اضافہ کرنا اور عوام کے مفاد کے لئے قانون بنانا اس کا نصب العین تھا۔ دونوں پارٹیاں اپنے اپنے اصول پر قائم تھیں۔ پارلیمنٹ میں جب ایک فریق کی شکست ہوئی تو فوراً فریق مخالف نے باگ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور جب اول الذکر نے فتح پائی دوسری کو نکال باہر کیا۔ یہاں تک کہ وسط انیسویں صدی سے جنگ یورپ کی ابتدا تک ایک مرتبہ بھی اتحادی حکومت کا خیال پیدا نہ ہوا، مگر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ایک پارٹی کے افراد ہمیشہ اسی کی وفاداری کا دم بھرتے رہے۔ اکثر تراش خراش بھی ہوئی۔ مثال کے طور پر آئرلینڈ کے ہوم رول کے مسئلہ پر جو تبدیلیاں پیش آئیں وہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آئرلینڈ کا مسئلہ ہمیشہ سے برطانوی پالٹکس میں ایک دقت طلب مسئلہ رہا ہے۔ ۱۸۰۰ء میں اس کی علٰحدہ پارلیمنٹ توڑ دی گئی اور برطانوی پارلیمنٹ کی توسیع کر کے آئرلینڈ کو اسی کے انتخاب میں دیدیا گیا۔ مگر جنوبی آئرلینڈ شروع ہی سے اس اتحاد کا مخالف تھا۔ اس نے ایسے ممبروں کو منتخب کرنا شروع کیا جو آئرش ہوم رول کے حامی ہوں۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد اور قوت میں اضافہ ہوتا گیا حتی کہ انیسویں صدی کے آخری حصہ میں یہ فرقہ جو اپنے آپ کو نیشنلسٹ (قوم پرست) پارٹی کے نام سے موسوم کرتا تھا چارلس اسٹوارٹ پارنل کی سرکردگی میں ایک با اثر جماعت بن گیا اور ۱۸۸۵ء میں مسٹر گلیڈاسٹن کی وزارت کو برخاست کرانے میں کامیاب ہوا۔ مارکوئیس آف سالسبری کی کنسرویٹو وزارت بھی جو اس کے بعد قائم ہوئی اس کی قوت کا مقابلہ نہ کر سکی اور ۱۸۸۶ء میں ملک کو جدید انتخاب کا سامنا کرنا پڑا۔ اب مسٹر گلیڈاسٹن نے نیشنلسٹ پارٹی کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ شروع کر دیا اور اس پالیسی کے ساتھ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اسی سال انھوں نے آئرش ہوم رول کے قانون کا مسودہ پارلیمنٹ میں پیش کیا لیکن لبرل پارٹی کلیتہً اس کی طرفدار نہ تھی چنانچہ اس کے تقریباً سو سے زیادہ ممبر جو اس مسودہ قانون کے مخالف تھے کنسرویٹو پارٹی سے جا ملے۔ اور بالآخر مسٹر گلیڈاسٹن کو وزارت سے مستعفی ہونا پڑا۔ اب فرقہ بندی کی یہ حالت تھی کہ اہم معاملات میں کنسرویٹو اور اتحادی پارٹی (Unionists) ایک طرف ہوتی تھی اور لبرل اور نیشنلسٹ ایک طرف۔ اتحادیوں کی حکومت ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۵ء تک قائم رہی، زمانہ نے پھر کروٹ بدلی

اور لبرل پارٹی برسرِ حکومت ہوئی۔ ۱۸۹۵ء میں کنسرویٹو وزارت دوبارہ قائم ہوئی اور ۱۹۰۵ء تک اس نے حکومت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

اسی زمانے میں ایک جدید پارٹی کی نشو و نما ہو رہی تھی جو آنیوالے زمانے میں اپنا اثر برطانوی پالٹیکس میں ڈالنے والی تھی۔ ہمارا مطلب لیبر پارٹی (مزدور پارٹی) سے ہے۔ انیسویں صدی کے آخری چند سال میں اس فرقہ کے چند ممبر پارلیمنٹ میں تھے۔ مگر بحیثیت ایک پولیٹیکل پارٹی کے ان کا عدم و وجود برابر تھا، نہ اس کی کوئی جماعت تھی جو انتخاب کے موقعہ پر باقاعدہ کام کرے اور نہ اس کی کوئی تنظیم تھی۔ ۱۸۹۹ء میں برٹش ٹریڈ یونین کانگریس نے ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کی کہ تمام تجارتی انجمنوں اور سوشلسٹ سوسائیٹیوں کی ایک کانفرنس اس غرض سے منعقد کرے کہ پارلیمنٹ میں لیبر پارٹی کی نمائندگی میں ترقی کے وسائل پر غور کیا جا سکے۔ چنانچہ ۱۹۰۰ء میں لیبر ریپریزنٹیشن کمیٹی قائم ہوئی جو بعد میں لیبر پارٹی کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ۱۹۰۶ء میں اس پارٹی کے انتیس نمایندے پارلیمنٹ میں داخل ہوئے۔ گو اس وقت بھی یہ جماعت کسی لحاظ سے پارلیمنٹ کی سیاسیات میں کوئی خاص اثر پیدا کرنے کے قابل نہ تھی لیکن بسا اوقات لبرل وزارت کو اپنے قدم حکومت میں قائم رکھنے کے لیے اس کی اعانت پر دارومدار کرنا پڑتا تھا۔ جنگ یورپ کی ابتدا تک پارٹیوں کی یہی حالت رہی۔

۱۹۱۴ء میں جب برطانیہ کو یورپین جنگ کے میدان میں قدم رکھنا پڑا اس وقت تمام پارٹیوں نے اپنے نجی تنازعے بالائے طاق کر دیے، اور سب پارٹیوں کے نمایندوں کی متحدہ وزارت قائم ہوئی جس کے سرغنہ اولاً مسٹر ایسکوتھ تھے لیکن بعد میں مسٹر لائڈ جارج ہوئے۔ دوران جنگ میں برطانوی پارلیمنٹ نے لامحدود اختیارات کا ایک اور ثبوت دیا۔ یعنی اس نے اپنی پنج سالہ زندگی میں باختیار خود توسیع کر لی۔ ۱۹۱۸ء تک نہ کوئی انتخاب ہوا اور نہ لیبر پارٹی کو زور آزمائی کا موقعہ ملا۔ مگر اس سال بھی انتخاب کا نتیجہ لیبر پارٹی کے حسب دلخواہ برآمد نہ ہوا۔ اس وقت فتوحات جنگ کی بنا پر اہل حکومت کے قلوب موجودہ حکومت میں اعتماد کے جذبات سے پر تھے چنانچہ باوجود لیبر پارٹی کی ان تھک کوششوں کے لبرل اور کنسرویٹو پارٹی کامیاب ہوئیں اور متحدہ وزارت کے قدم جمے رہے۔ لیکن دو متضاد جماعتیں بالاتفاق کب تک کام کر سکتی تھیں۔ ۱۹۲۲ء میں کنسرویٹو پارٹی نے لبرلوں کا ساتھ چھوڑ دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ متحدہ وزارت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور لبرل پارٹی کو مجبوراً پھر انتخاب کا سامنا کرنا پڑا۔ اس انتخاب میں کنسرویٹو جماعت ایک کثیر تعداد میں پارلیمنٹ میں داخل ہو گئی، اور مسٹر بونر لا نے وزیر اعظم کی کرسی لی جو کچھ عرصہ کے بعد مسٹر بالڈون کے ہاتھ آئی۔

جنگ یورپ نے اگرچہ جرمنی کو تباہ کر ڈالا لیکن انگلستان میں بھی کچھ کم ستم نہیں ڈھایا، ملکی صنعت و حرفت و تجارت کو بے انتہا نقصان پہونچا۔ بے روزگاری بڑھنے لگی اور مالی حالت کا شیرازہ درہم برہم ہو گیا۔ ایسی حالت

میں یہ پیچیدہ سیاسی اور اقتصادی مرحلوں کا حل ایک دشوار امر ہوگیا۔ نئی مشکلات کے لئے نیا پروگرام اور نئی پالیسی کی ضرورت تھی۔ کنسرویٹو وزارت نے درآمد پر محاصل عاید کرکے ملکی تجارت کی محافظت کا پروگرام ملک کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کی اور اس کے متعلق جمہور کا فیصلہ معلوم کرنے کے لئے پارلیمنٹ کی موقوفی اور جدید انتخاب کا اعلان کیا۔ اس انتخاب میں لیبر پارٹی کی جمعیت سے زیادہ تعداد دارالعوام میں داخل ہوئی۔ اس کے لیڈر مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز پیش کی اور لبرل پارٹی کی تائید سے کنسرویٹو وزارت کو شکست ہوئی چنانچہ تاریخ انگلستان میں پہلی دفعہ مزدور پیشہ جماعت کے لیڈر مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کو اس عظیم سلطنت کے وزیر اعظم کی حیثیت سے قائم کیا گیا۔ لیبر پارٹی کے اس چند روزہ عہد حکومت سے بہتر کوئی ثبوت اس امر کا نہیں مل سکتا ہے کہ ذمہ دار حکومت بہترین نتائج پیدا کرنے کے قابل اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ پارلیمنٹ میں دو اور صرف دو مخالف پارٹیاں موجود ہوں۔ ۲۳-۱۹۲۴ء میں پارلیمنٹ میں تین پارٹیوں کے نمایندے تھے۔ کنسرویٹو۔ لبرل اور لیبر لیکن تینوں میں سے ایک پارٹی بھی اس قابل نہ تھی جو بقیہ دو پارٹیوں کی متحدہ قوت کا مقابلہ کرسکے۔ چنانچہ حکومت پارٹی کی ہستی کا دارومدار بقیہ دو پارٹیوں میں سے ایک نہ ایک کی حمایت اور اعانت پر تھا۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ لیبر پارٹی محض لبرل پارٹی کے رحم وکرم کی بنا پر برسر حکومت رہی۔ اس کا پروگرام وسیع تھا لیکن لبرل فریق کو اپنے ہمرکاب رکھنے کے لئے اسے اپنی رفتار سست کرنی پڑی۔ چنانچہ عمال حکومت خود اپنی پارٹی کو مطمئن نہیں رکھ سکتے تھے ظاہر ہے کہ ایسی حالت ایک عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ جب ۱۹۲۴ء میں لبرل جماعت نے لیبر گورنمنٹ سے اپنا دست شفقت ہٹالیا تو اہل ملک کو پھر ایک دلچسپ دنگل کا نظارہ دیکھنے میں آیا کنسرویٹو پارٹی پھر بازی لے گئی۔ اور لیبر پارٹی کی پالیسی اور پروگرام کو عملی جامہ نصیب نہ ہوا۔ اس مرتبہ لیبر پارٹی کی شکست کسی بڑے اصولی مسئلہ پر نہیں ہوئی بلکہ محض ایک معمولی بات کا بتنگڑ ہوگیا۔ معاملہ یہ تھا کہ ایک کمیونسٹ پر لیبر گورنمنٹ نے باوجود اٹارنی جنرل کی قانونی صلاح کے مقدمہ چلانا منظور نہیں کیا۔ اس پر پارلیمنٹ میں عدم اعتماد کی تجویز پیش ہوگئی لبرل پارٹی اس موقعہ پر کنسرویٹو جماعت کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوگئی، چنانچہ وزیر اعظم کو کوئی چارہ نہ تھا بجز اس کے کہ مستعفی ہوکر جدید انتخاب کے ذریعہ ملک سے اپیل کریں۔ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے آخر الذکر صورت اختیار کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کنسرویٹو جماعت کثیر تعداد میں کامیاب ہوئی جو لیبر اور لبرل دونوں کی متحدہ تعداد سے زیادہ تھی

اس انتخاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ کنسرویٹو وزارت پھر مسٹر بالڈون کی لیڈری میں قائم ہوئی لیکن سب سے زیادہ دلچسپ واقعہ جو ظہور پذیر ہوا یہ تھا کہ لبرل پارٹی قریب قریب بالکل تباہ ہوگئی اس انتخاب کے بعد صرف چالیس لبرل ممبر پارلیمنٹ میں تھے۔ آپس کا نفاق لبرل پارٹی کی عرصہ سے بیخکنی کررہا تھا۔ دوران جنگ میں جب مسٹر لائڈ جارج کی دست درازیوں سے عاجز آکر مسٹر اسکوتھ کو وزیر اعظم کے اعلیٰ عہدہ سے مستعفی ہونا پڑا تھا

گو جنگ کے زمانہ میں لبرل جماعت کے ان دو بڑے لیڈروں کے تنازعات پردۂ راز میں رہے لیکن رقابت کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی تھی اور اس بڑی پولیٹیکل جماعت کی قوت و کمزور کرتی رہی، لیکن بعض اسی بنا پر برطانوی سیاسیات میں ان کے قدم نہیں ڈگمگائے، دراصل لیبر پارٹی کے نشو و نما نے ان کی پالیسی اور پروگرام کی خامیوں کو ملک کے سامنے آشکارا کر دیا۔ لبرل پارٹی ہمیشہ سے پولیٹیکل نظام کی حامی رہی لیکن اس نے سوشل اور اقتصادی اصلاح کی طرف کبھی دھیان نہ دیا، دارالامرا کے اختیارات کی بیخکنی، جمہور کے حقوق میں اضافہ اور دارالعوام کی لامحدود قوت کی طرف ان کی نگاہ جاتی تھی۔ لیکن عوام کے افلاس اور فاقہ کشی اور مزدوروں کی محنت مشقت کے طویل گھنٹوں کی طرف کبھی رخ نہ کرتے تھے۔ عوام الناس کی دلچسپی جس قدر ان کی شکم سیری کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہوتی ہے اتنی بڑے پولیٹیکل مسئلوں میں ہرگز نہیں ہوتی۔ چنانچہ لبرل پارٹی روز بروز کمزور ہوتی جاتی تھی اور لیبر کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ ممکن تھا کہ اس الیکشن میں لیبر پارٹی کنسرویٹو اور لبرل دونوں کو شکست فاش دیتی لیکن روس کے کمیونسٹ لیڈر کی ایک چٹھی کی اشاعت نے جس میں بالشویزم کے برطانیہ میں پھیلائے جانے کی تحریک کی گئی تھی پانسہ پلٹ دیا۔ لیبر پارٹی کے کارکنان ہر چند گڑگڑاتے رہے کہ وہ چٹھی جعلی اور مصنوعی ہے لیکن ووٹ دینے والوں کو اس کی اصلیت جانچنے کی فرصت کہاں۔ جمہوری طرز حکومت میں اگر بہت سی خوبیاں ہیں تو اس کو ایسے ایسے خطرات سے مقابلہ بھی کرنا ہے۔

غرض پارلیمنٹری لبرل پارٹی جو گنتی کے چالیس ممبروں کی تھی نہایت خستہ حالت میں تھی۔ خود مسٹر اسکوتھ الیکشن ہار چکے تھے۔ ان چالیس ممبروں میں سے بہت کم لوگ ایسے تھے جن کو لائڈ جارج کی لیڈری تسلیم کرنے میں تکلف نہ تھا۔ وہ پارلیمنٹ کی مخالف پارٹی کہلانے کے اہل ہی نہ تھے۔ پارلیمنٹ سے باہر بھی ان کی تنظیم قابل رحم تھی۔ الیکشن کے زمانہ میں اسکوتھ اور لائڈ جارج کا جو سمجھوتہ ہو گیا تھا وہ بھی عرصہ تک قائم نہ رہ سکا سنہ ۱۹۲۶ء میں کول اسٹرائک کے موقعہ پر جو پارٹی میٹنگ مسٹر اسکوتھ پارٹی لیڈر کی سرکردگی میں ہوئی اس میں مسٹر لائڈ جارج نے عدم شرکت کی پالیسی اختیار کی۔ مسٹر اسکوتھ نے ان کی گوشمالی کرنی چاہی، لیکن ممبران لبرل پارٹی نے کثرت رائے سے لائڈ جارج کو اپنا لیڈر منتخب کر لیا، اور مسٹر اسکوتھ کو لارڈ کا خطاب دیکر دارالامرا میں جگہ دی گئی۔ اس کے بعد مسٹر لائڈ جارج نے لبرل پالیسی میں تازہ روح پھونکنے کی کوشش کی لیکن مئی سنہ ۲۹ء کے انتخاب کا نتیجہ بھی خاطر خواہ نہ ہوا۔ البتہ لیبر پارٹی کے متعلق جو غلط فہمیاں تھیں رفتہ رفتہ دفع ہو گئیں اور اس الیکشن میں اس کا نمبر اول رہا۔ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کو وزارت قائم کرنے کی پھر دعوت دی گئی۔ چنانچہ جون سنہ ۲۹ء سے آج تک آپ ہی وزیر اعظم کی اہم خدمات انجام دے رہے ہیں لیکن گو آج بھی مسٹر ریمزے میکڈانلڈ سلطنت برطانیہ کے وزیر اعظم ہیں لیکن لیبر پارٹی برسر حکومت نہیں

مسٹر میکڈانلڈ نے جن کی ساری زندگی لیبر پارٹی کی خدمات میں صرف ہوئی، جن کو کنسرویٹو پارٹی سے فطرتاً نفرت تھی حال میں ایسی گورنمنٹ کی لیڈری اپنے ہاتھ میں لی ہے جس میں زیادہ تر کنسرویٹو پارٹی کے ممبر شامل ہیں۔ یہ واقعہ انسانی فطرت کے عجائبات میں ہے۔ ملک کی مالی کشمکش کا مقابلہ کرنے اور بجٹ میں توازن پیدا کرنے کا مرحلہ اگست ۱۹۳۱ء میں ایسی خوفناک شکل میں نمودار ہوا کہ لیبر وزیر اعظم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وزارت آناً فاناً مستعفی ہو گئی جس سے لیبر گورنمنٹ کا خاتمہ ہو گیا، لیکن مسٹر میکڈانلڈ نے اپنی گدی نہ چھوڑی۔ غیر معمولی اقتصادی حالت کا مقابلہ کرنے کے لئے آپ کی رائے میں سب پارٹیوں کی اتحادی گورنمنٹ کی ضرورت تھی، چنانچہ حب وطن کے جذبات کے نام پر انگلستان میں پارٹی امتیاز نقش بر آب ہو گیا اور مسٹر بالڈون میکڈانلڈ کی ماتحتی میں کام کرنے کو تیار ہو گئے۔ زمانۂ جنگ کی مجلس وزارت کی طرح اس قومی کشمکش کے زمانہ میں بھی برطانیہ میں پھر اتحاد ثلاثہ قائم ہو گیا اور ایسی گورنمنٹ قائم کی گئی جس میں لیبر، لبرل، اور کنسرویٹو سب پارٹیوں کا اعتماد ہو۔ یہ گورنمنٹ نیشنل گورنمنٹ کے نام سے موسوم ہے۔ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کو اتحادی گورنمنٹ قائم کرنے کی بنا پر اپنی پارٹی کی لیڈری سے مستعفی ہونا پڑا، چنانچہ اب مسٹر ہنڈرسن اس پارٹی کے لیڈر منتخب ہوئے ہیں۔ پارلیمنٹ میں پارٹیوں کی اب یہ صورت ہو گئی ہے کہ کنسرویٹو لبرل اور نیشنلسٹ لیبر ایک طرف اور آزاد لیبر ایک طرف۔ گورنمنٹ نے اہل ملک کا اعتماد حاصل کرنے کی غرض سے پارلیمنٹ کو برخاست کر کے جدید انتخاب کی صورت میں اہل ملک سے اپیل کی اور جیسی امید کی جاتی تھی نیشنل گورنمنٹ کے حامیان نے لیبر پارٹی کو شکست فاش دی۔ لیبر پارٹی کو اس ہنگامے میں ایسا دھکا لگا ہے کہ اس نقصان کی تلافی میں اسے شاید بہت عرصہ لگے۔ لیکن مزدور پیشہ جماعت نے زمانۂ حال میں مہذب دنیا پر کافی قابو پا لیا ہے، اس لئے اغلب ہے کہ ایک نہ ایک روز لیبر پارٹی پھر سر اُٹھائے گی اور برٹش پالٹیکس پر حاوی ہو گی۔

مصیبت و آلام ہمیشہ نہیں رہتے۔ خزاں کے بعد بہار کا آنا لازمی ہے، فطرت کا اصول ہی یہ ہے کہ:۔

بیک ساعت، بیک لحظہ، بیک دم — دگرگوں می شود احوالِ عالم

پھر ہم مصیبت کے دن صبر و استقلال کے ساتھ کیوں نہ گزاریں اور راحت و مسرت کی امید سے اپنے دل کو تسکین کیوں نہ دیں۔ عقل یہی بتاتی ہے کہ انسان کو ہر حال میں راضی برضائے الٰہی رہنا چاہیئے اور جو شخص اس پر عمل کرتا ہے وہ کبھی پریشان نہیں ہوتا۔ (ماخوذ)



ایک مغل شاهزاده اور اسکا نوجوان مصاحب
سترهوین صدی (عهد مغلیه) کی مصوری کا نمونه



تصویر جعفر بیگ مخاطب بہ آصف خان وزیر شاہجہان
سترھویں صدی (عہد مغلیہ) کی مصوری کا نمونہ
از مو قلم گوبیا

مرثیہ گوئی کا ابتدائی دور

(از خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی)

زمانہ ہر وقت کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ اس کی ہر کروٹ ایک تاریخ ہے۔ ہندوستان ہی کو دیکھئے اور ایک صدی گزشتہ کے اگلے لوگوں کو دیکھئے تو ان کے لباس، بول چال، نشست و برخاست میں اس قدر نمایاں فرق نظر آئیگا کہ آپ مشکل سے امتیاز کر سکیں گے کہ ایسے لوگ ہمارے ملک میں رہتے تھے۔ اسی طرح ہندوستانی زبان کو دیکھئے کہ اس نے کتنے چولے بدلے اور کتنے رنگ اختیار کئے۔ اس میں اکثر الفاظ ایسے ہیں جو آجکل نہیں بولے جاتے اور بعض الفاظ ایسے ہیں کہ سمجھ میں بھی نہیں آسکتے۔ الفاظ تو ایک طرف آپ کے ملک کی زبان کا نام کئی لباس پہن چکا اور کئی اتار چکا جس کی آپ کو خبر بھی نہ ہوئی۔ پہلے اسی زبان کو ریختہ کہتے تھے اس کے بعد دوسرا نام ہندی، ہندوستانی تک ہندی کہلائی پھر سب نے اردو کہنا شروع کیا اور وہی نام زبان زد خاص و عام ہو گیا مگر آجکل یہ تجویز کی گئی ہے کہ اس زبان کو نہ ہندی کہو نہ اردو بلکہ صرف ہندوستانی کہو۔

اس مختصر تمہید سے غرض یہ ہے کہ زمانہ ہمیشہ کروٹیں بدلا کرتا ہے اور ہر چیز اپنی ابتدائی حالت سے ترقی کرتے کرتے کچھ سے کچھ بن جاتی ہے، مثلاً ہم ہندوستان کی مرثیہ گوئی کی تاریخ پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ اردو نظم کے ساتھ ہی ساتھ اس نے بھی جنم لیا تھا اور غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زبان میں جس قدر جلد مرثیہ گوئی کو ترقی ہوئی اس کی مثال عربی، فارسی یا کسی اور زبان میں نہیں ملتی۔

اس بات کا پتہ لگانا تو مشکل ہے کہ مرثیہ گوئی کا آغاز کس سنہ سے ہوا اور وہ پہلا شاعر کون ہے جس نے سب سے پہلے مرثیہ کہا کیونکہ تاریخ اس بارے میں بالکل خاموش ہے۔ ہاں اگر تاویلیں کیجئے تو ہزار پہلو نکل سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ہماری مرثیہ گوئی دوبیتی نظم سے شروع ہوئی۔ جس میں ایک مصرعہ ٹیپ کا ہوتا تھا اور تین مصرعے بند کے ہوتے تھے۔ نیز یہ کہ ہم نے اردو مرثیہ گوئی کا طرز کشمیر سے لیا ہے۔ کشمیر میں ابھی تک اسی طرح کے مرثیے کہے جاتے ہیں۔ بھاکا اور پوربی زبان میں بھی مرثیے کہے اور پڑھے جاتے ہیں جن کو کچھ وہی لوگ خوب سمجھتے ہیں۔ کشمیر میں مرثیہ پڑھنے کا طرز یہ تھا کہ

مرثیہ گو اپنا مرثیہ مجلس کے درمیان کھڑا ہو کر ایک ایک آدمی کو ایک ایک بند سناتا تھا اور وہ سب زار و قطار روتے تھے۔ اردو زبان کے شاعر نے بھی یہی طرز اختیار کیا کہ وسطِ مجلس میں کھڑے ہو کر مرثیہ کے دو چار بند سنائے۔ سامعین پر رقت طاری ہوئی اور وہ رونے لگے۔ پھر دوسروں کو مخاطب کیا۔ یہاں تک کہ ساری مجلس کو رلا دیا۔ مگر آجکل مجلس خوانی کا یہ دستور نہیں ہے۔ میر ضمیر کے زمانہ میں محمد علی بادشاہ نے مرثیہ خوانوں کے بیٹھنے کے لئے سونے چاندی کے منبر بنائے اور اُس میں دو علم لگائے۔ ابتدا میں یہ دستور تھا کہ میر مجلس منبر کے پاس کھڑا رہتا تھا لیکن اب یہ قاعدہ نہیں ہے۔ مصائب خواں کے لئے بھی اسی وقت سے منبر تجویز ہوا

ہماری ابتدائی مرثیہ خوانی اس طرح شروع ہوتی ہے کہ جس مجلس میں مصائب خواں پڑھ چکتا ایک مرثیہ خواں بغیر طلب آ کر صاحب مجلس سے اجازت مانگتا کہ آپ کہیں تو میں دو چار بند مرثیہ کے پڑھوں۔ اجازت ملنے پر حاضرین مجلس کو اس طرح مخاطب کرتا "میں آپ لوگوں کو زحمت دینا نہیں چاہتا صرف دو بند نظم تو اب سنانا چاہتا ہوں جو میں نے نئے طرز پر نظم کئے ہیں اور بہت رقت آمیز ہیں"۔ ثقات لوگ اپنی مجلس میں مرثیہ خوانوں کو پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان میں عامیانہ اور غیر مصدقہ روایتیں نظم ہوتی ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ کتاب خوانی، مصائب خوانی، واقعہ خوانی کی جگہ مرثیہ خوانی نے لے لی۔ اور اس کی وقعت مصائب خوانی سے زیادہ ہو گئی۔ یہاں تک کہ ہر طرف مرثیہ خواں منبر پر نظر آنے لگے۔ ہم نے زبان کے اعتبار سے جو رائے قائم کی ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی دور کے مرثیوں میں وہ الفاظ اکثر ملتے ہیں جو سنہ ۱۱۰۰ھ کے اوائل میں بولے جاتے تھے۔ ان مرثیہ گویوں کی فن شعر میں کوئی وقعت نہ تھی اور اس لئے لوگ طنزاً یہ کہتے تھے کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو۔ یعنی جن کو شعر کہنا نہیں آتا اور جو فنونِ شعر سے نابلد ہیں وہی مرثیہ گوئی کرتے ہیں۔ ان میں ایک میاں مسکین تھے جن کی ہجو سودا نے بھی کی ہے۔ ان کا سادہ کلام سنئے:

جفا کے دشت میں جس دم گیا حسین غریب — اور اسکا نام فلک نے رکھا حسین غریب
جنگل میں بادیہ و اسفر را حسین غریب — پیدا ہونے کو آترا را حسین غریب

- - - - - - -

تنہا نے اس کو کہا فاطمہ کے بیٹے آ — یہ دشت سونا ہے تجھ بن اسے تو آ کے بسا
زمیں نے تجھ کو بلایا ہے اس میں آ کے سما — اور اپنا نام تو اس میں رکھا حسین غریب

اجل نے اس کو کہا فاطمہ کے ورثہ دار — تمہارا میرا ستاوان برس کا تھا اقرار
قرار ہو چکا اب کھاؤ خنجر و تلوار — کہو اجل کے حوالے ہو حسین غریب

اس میں "جنگل" اور "ساون" دونوں کو غیر مشدد نظم کیا ہے۔

مرزا گدا حسین گدا اسی زمانہ کے ایک مرثیہ گو تھے۔ ان کے کلام میں اس قدر درد ہے کہ سننے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے:-

جب آ کربلا میں وہ گردش کی ماری — ہو فاطمہ کی علی کی پیاری
گنوا بادشاہی لٹا شہریاری — پھری شام کو قید ہو کے بچاری

فلک کو مخاطب کیا کہ ستمگر — تجھے کچھ بھی ہے شرم لے تیرہ اختر
نبوت کا ویراں کیا ظلم سو کر — لٹے میرے وارث کئی ایک باری

سناؤں ہو کیا آگے غم کی کہانی — کہ دل ہو گیا شرم سے پانی پانی
میں دکھ کی تو کچھ بات کہہ کر نہ جانی — زبانِ قلم بھی ہے لکھنے سے ہاری

گدا ہے یہ تجھ در کا اک مرثیہ گو — نہ کر تو کسی کا تو محتاج اس کو
خزانہ سے اپنے اسے سیر کیجیو — نصیب اس کے ہووے زیارت تمہاری

ان اشعار کی ترکیبوں کو دیکھیے موجودہ زبان سے کس قدر فرق ہے۔

الفت خاں نام عاجز تخلص، یہ بھی اسی زمانے کے مرثیہ گو ہیں۔ حضرت سکینہ کے حال کا مرثیہ ہے اس کے دو بند پیش کئے جاتے ہیں:-

ہائے اماں دیکھو تو کیسی اجالی ہے یہ رین — جس میں ہم دکھیوں کو آتا ہے نظر شاہ حسین
صبح جس دم ہو گی پیدا گھر میں ہووے شور و شین — ابر میں چھپ جائے چاند دن کو ہو جاوے گی رات

یا حسین ابن علی شاہِ شہیداں نامدار — غم سے میں عاجز ہوں کیا لکھوں ترا احوال زار
لکھنے لگتا ہوں جوں تیری تشنگی میں دلفگار — کند ہوتا ہے قلم اور خشک ہوتی ہے دوات

شیخ ولی اللہ محب دہلوی تمام عمر لکھنؤ میں رہے۔ مرثیہ گوئی ان کا ذریعہ معاش تھا نمونہ کلام یہ ہے۔

جب آئی ڈیوڑھی پہ سواری حسین کی　　تب رو کے چلائی بیٹی پیاری حسین کی
سنے اماں شاید آئی ہے باری حسین کی　　کچھ دیکھتی بُری ہوں تیاری حسین کی

یہ کہتی تھی جو گھوڑا شہ دیں کا ایک بار　　ڈیوڑھی پہ ہنہنانے لگا با دو چشم زار
سرور نے تب تو سب کو بآواز کہا پکار　　کئی بی بیوں سے آؤ پیاری حسین کی

تمام اشعار سے ان کی قدامت ظاہر ہے۔

مہربان تخلص اسی زمانہ کے مرثیہ گو ہیں ؎

آج وہ دن ہے کہ سب اہل جہاں روتے ہیں　　جتنے ہیں زیر فلک پیر و جواں روتے ہیں
خاک پر مور جہاں دیکھئے واں روتے ہیں　　بیخ ہو کر ہوا بال فشاں روتے ہیں

دلیا کے نہ حواس اور نہ نبیوں کو ہے ہوش　　طاقت نالہ نہ ان کو نہ انھیں یار خروش
سرنگوں گرد محمد کے ہیں دوش بہ دوش　　چپکے بیٹھے ہوئے سب خرد و کلاں روتے ہیں

غلام شاہ محزون تخلص متوطن دہلی جو لکھنؤ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے ؎

بانو اکبر کو کہیں اے مرے جانی افسوس　　تیری صورت کو کہوں یا کہ جوانی افسوس
ملگیا خاک میں نور احمد ثانی افسوس　　ہائے امت نے تری قدر نجانی افسوس

جعفر علی نام ایک مرثیہ گو تھے۔ آپ کا کوئی تخلص نہ تھا بلکہ مقطع میں اپنا نام لکھتے تھے۔ ؎

جب سر کو پٹکا ہوتی تھی حیران سکینہ　　ماں رو رو کے کہتی تھی میں قربان سکینہ
بابا ترا آتا ہے مری جان سکینہ　　کیوں رو رو کے تو ہوتی ہے ہلکان سکینہ

حافظ غلام احمد تخلص احمد بریلوی مرثیہ گو ؎

نئی ہے شادی بیاہ کے کس کے تو نے فلک اٹھائی ہے　　کس دکھیارے کا بیاہ رچا ہے کس دکھیارے کی جائی ہے
سر جھاتی نقارے ہیں فریاد و فغاں شہنائی ہے　　سوز جگر ہے آتشبازی ہر ایک آہ ہوائی ہے

انھیں کا ایک اور مرثیہ ہے ؎

گھر میں یہ جس گھڑی خبر آئی حسین کی　　سر کاٹ تو تھن کٹائی حسین کی
خاطر میں کچھ نہ لائے بڑائی حسین کی　　صورت لہو میں آہ ڈوبائی حسین کی

مرزا جعفر علی حسرت استاد جرأت مرثیہ میں بھی اپنی شاعرانہ قابلیت دکھا دیتے تھے ؎

محرم گلشنِ احمد کی تاراجی کا آتا ہے اسی غم سے جگر غنچہ کا اب ٹکڑے ہوتا ہے
سدا روتی ہے شبنم ابر جوئے خوں بہاتا ہے صبا پھرتی ہے سرگرداں ہوا خاک اڑاتا ہے

لباس ماتمی پہنا ہے کالا بر میں سوسن نے قیامت کی ہے برپا باغ میں بلبل کے شیون نے
کیا ہے ماتم آلِ پیمبر سارے گلشن نے ہوئی بیمار نرگس داغ دل لالہ دکھاتا ہے

غنچہ کا جگر، شبنم کا رونا، سوسن کا سیاہ لباس، لالہ کا داغ، نرگس بیمار۔ یہ سب ترکیبیں بتا رہی ہیں کہ مرثیہ گو شاعر بھی ہے اور اس کے زمانہ کے جتنے مرثیہ گو ہیں وہ صرف بین اور واقعہ دکھا سکتے ہیں۔

جیسے صوفی کوئی مرثیہ گو ہے کہتا ہے:

یا حسین ابن علی آج نواسے کا گلا جا کے دیکھو تو وہ کس طور سے بے رنگ کٹا
کربلا کا وہ جنگل خون شہیدوں سے بھرا آہ واویلا کہ اس دن میں ستم کیسا ہوا

نظر علی گیارھویں صدی کے سب سے بڑے شاعر معلوم ہوتے ہیں اور ہم انھیں کو مرثیہ گوئی کا سب سے پہلا شاعر کہہ سکتے ہیں ۔

کہتی سکینہ رو رو کے بابا چھوڑ کے مجھ کو کدھر گئے یو فاطمہ دادی آن کے دیکھو گھر سارا اُجڑ گئے یو
ایک تو چھوٹے بھائی اصغر دودھ بنا غش کر گئے یو دوسرے میری جیب میں کانٹے پانی کے مارے پڑ گئے یو

یہ ہیں پہلے دور کے مرثیہ گو جنھوں نے اس باغ کی بنیاد قائم کی مصیبت جھیلی، تکلیف اٹھائی، مگر اپنی خدمت کو اسی طرح انجام دیتے رہے جیسے کوئی غلام اپنے آقا کا کام کرتا ہے اور انھیں بزرگوں کی نیک نیتی کا نتیجہ ہے کہ جو مرثیہ گوئی اس مرتبہ تک پہونچی کہ آج اس میں رزم، بزم، رجز، غم و شادی کا ذخیرہ جمع ہوگیا اور مرثیہ نے بھی شاعری کی ایک خاص شان پیدا کر لی۔

ہندوستانی تہذیب اور عورت[1]

(ڈاکٹر اندرا ناتھ ... پی ایچ ڈی ... نیو انٹرنیشنل سٹاپکل سوسائٹی مقیم برلن کے ایک ... ماخوذ)

غلامی بری بلا ہے۔ خواہ اپنے نفس کی ہو یا دوسرے کی۔ یہ امر یقینی ہے کہ غلاموں کے کیرکٹر میں اعتماد علی النفس کا جوہر نہیں ہوتا۔ آپ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہ پائیں گے جس کے افراد کی اکثریت میں اعتماد علی النفس کا جذبہ موجود ہو اور صفحۂ ہستی پر نمایاں حیثیت نہ رکھتی ہو۔ برخلاف اس کے ہر وہ قوم جو اس صفت سے محروم ہے نہ صرف اپنی سیاسی زندگی کی آخری سانسیں پوری کر رہی ہے بلکہ اس کی بقائے نسل تک اختتام کا بھی وقت قریب ہے۔ ایسی قوم کے افراد نہ تو اپنی تہذیب قدیم سے واقف اور نہ اس کے اصولوں پر کاربند ہوتے ہیں، اکثر یہ اختلاط کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی خمیازہ۔

ایسے افراد کو نہ تو اپنی کوئی بات اچھی معلوم ہوتی ہے اور نہ اُن کو نئی روشنی کے سوائے کوئی دوسری چیز خوشنما نظر آتی ہے۔ نئی روشنی اسی وقت تہذیب و ترقی میں معین و مددگار ہو سکتی ہے جب اس سے مشعل ہدایت کا کام لیا جائے مگر جب وہ سامنے سے آتی ہوئی سرچ لائٹ کی طرح نظر کو خیرہ کر دے تو اس سے صرف وہی مستفید ہو سکتا ہے جس کی آنکھیں اس کے نظارہ کی متحمل ہو سکیں۔

بدقسمتی سے ہندوستان مغربی تہذیب کی سرچ لائٹ کی تیز شعاعوں کی زد میں ہے اور ہم حیرت زدہ نگاہوں سے صرف اس شعلۂ پرتنویر کی تیزی کی داد دے سکتے ہیں اور بس۔ مگر بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اس کے شیدائی نہیں ہو سکے ہیں اس میں وہ حق بجانب بھی ہیں۔

تہذیب قدیم کی حیثیت ایک معمہ کی سی ہے۔ اس کی تحقیق میں زیادہ تر وہی لوگ سرگرم ہوتے ہیں جنھیں اس سے کوئی سابقہ نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں وہ اپنے کو نہایت خوش نصیب سمجھتے ہیں جب ان کو کسی موافق رائے پر فخر و مباہات یا مخالف رائے پر تنقید و نفگار کا موقعہ ملتا ہے۔ مگر وہ خود غور کرنا نہیں چاہتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس سے اُن کو کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔

---

[1] مترجمہ ... امیر الدین ... بی۔اے۔

ہمارے ملک کی قدیم تہذیب جس کی بنیاد اس قدر علاقائی تھی اب ایک حصن حصین کے پر وحشت ویرانے سے کم نہیں رہ گئی ہے۔ دیکھئے وہ وقت کبھی آتا بھی ہے یا نہیں کہ ہم اہل وطن کے تہذیب قدیم کی اصلی فضیلت سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کر سکیں، واقعہ تو یہ ہے کہ خفتہ بختوں کو جگانا، کور چشموں کو سمجھانا اور بہروں کو سنانا ممکن نہیں خواہ آفتاب کسی قدر بلند، منظر کتنا ہی دلکش اور نغمہ کتنا ہی مروج پرور کیوں نہ ہو۔

ماہرین نفسیات کی تحقیقات جدیدہ کو جب ہم اپنی پرانی تہذیب کے اصولوں سے مطالعہ کرتے ہیں تو دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اللہ اللہ کیسے لوگ تھے جنہوں نے یہ اصول بنائے تھے جو جذبات اور صداقت کے حافظ اور جوہر آبدار ہیں۔ شاید کوئی یوروپین اور ان کی طرز معاشرت سے واقف شخص وفاداری، زن و شوہر کی محبت باہمی کی اہمیت کو تسلیم کر دینے میں تکلف نہ کرے۔ یہ وہ چیز ہے جس پر دنیا کی اصلی ترقی و بہبودی کا دار و مدار و انسان کی راحت دنیوی اور نجات اخروی میں اس کو کہاں تک دخل ہے؟ اس سوال کا جواب شادی شدہ انسان کی زندگی سے مل سکتا ہے۔ ایک فرشتہ وش کی رفاقت کے بغیر ہم اپنے مقصد حیات میں واقعی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں۔ بہر حال یا تو دنیا میں اقتضائے فطرت کے مطابق زندگی بسر کیجئے یا پہاڑوں پر دھونی رمائیے گھروں کی آبادی، خاندان کی بہتری، ملکوں کی ترقی اور قوموں کی نجات میں اس کا بالواسطہ یا بلاواسطہ دخل ہو یا نہ ہو مگر زندگی کو حقیقی زندگی بنانے کے لئے اس کی ضرورت مسلمہ ہے۔ انسان فطرتاً مجبور ہے کہ ایک مرکز حیات تلاش کر کے تمام احساسات غم و شادی اسی پر قائم کرے تکمیل انسانیت کی یہ وہ منزل ہے جس میں قدم رکھنے کی تاب نہ لا کر رشیوں نے پہاڑ اور صحرا آباد کئے ہیں۔ میں راہبانہ زندگی کی مذمت نہیں کرتا بلکہ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ غایت فطرت انسانی کی غایت یہ ہے کہ ہم مل جل کر رہیں اور ایک دوسرے کے معین و مددگار بنیں۔ اس حالت میں خدا کی یاد جس قدر دشوار ہے ظاہر ہے۔ غالباً رہبانیت اسی کا نتیجہ ہے، مگر جب رفیق حیات باسلیقہ اور رنج و راحت کی شریک ہو تو آدمی کے سبھی کام بن جاتے ہیں[۱]۔ یوں بھی وفاداری اور محبت باہمی بقائے نسل اور ترقی افراد کے لئے لابدی چیزیں ہیں۔ عورتوں کی فلاح و بہبود کے لئے عقلا و فضلا ابتدائے آفرینش سے طرح طرح کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ اور نہ معلوم کتنے ہمدردان بنی نوع انسان کی عمریں اس میں گزر گئیں۔

کسی نے عورتوں کی تعلیم کی ضرورت بتائی تو کسی نے جہالت کی حمایت، جائز بھی اگر کسی نے آزادی ضروری قرار دی تو کسی نے محکومیت ہی کو مناسب سمجھا۔ لیکن بات جہاں تھی وہیں رہی۔ بالآخر ایک گروہ نے عاجز آ کر عورت کو بے وفا اور ناقص العقل کا منتوطی لگا دیا۔ یہ گویا انتہائی لاچاری اور بے بسی بلکہ اپنی کوششوں میں شکست فاش کا اعتراف تھا۔ ہندوستان کے فلسفیوں نے اس عقدۂ صبر آزما کو کمسنی ہی میں بچوں کی شادی کرنے کی

[۱] اسلام نے بھی اسی امر کو نہایت وضاحت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ (ڈاکٹر ملک)

رسم قائم کردی۔

ان کی رائے میں انسان کی عمر کا وہ حصہ جب اس کے خیالات نشاط آگیں اور تصورات روح پرور ہوتے ہیں ذہنی تخم پاشی کا بہترین زمانہ ہوتا ہے اس وقت اگر اس کے دماغ میں کوئی بات ڈال دی جائے تو وہ اس سے عموماً تمام زندگی بھر دلچسپی لینے لگتا ہے اور ہرچند کہ عمر کے ساتھ ساتھ یہ کیفیت طفلانہ محویت سے گزر کر سنجیدہ احساس تک پہنچ جاتی ہے لیکن ایک غیر فانی آویزش لازمی ہوتی ہے جب انسان میں جوانی کے جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں تو دل اور دماغ دونوں کی پاکیزگی قائم رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اگر اس وقت اس کے لئے ایک مرکز توجہ موجود ہو تو اس کی آرزوئیں اور تمنائیں اس کی یکسوئی حواس کو غارت نہ ہونے دیں گی اور یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ خیال اپنا نقش دماغ پر چھوڑتا جاتا ہے اور خیال کی تکرار اس نقش کے استحکام کا باعث ہوتی ہے۔ بہرحال اس طرح انسان ایک کا پابند ہو کر رہ جاتا ہے اس طرح رسم و رواج کی بدولت ذمہ داریوں کے احساس کا کچھ ایسا سامان بھی مہیا ہو جاتا تھا کہ آدمی اپنے لئے ایک مقصد حیات اور راہ عمل مقرر پاتا تھا جس کے لئے اس میں خصوصیات عملی موجود تھیں۔ اپنے اپنے کاموں میں مشغول۔ اپنے دلوں میں اپنے شریک حیات کے سچے تصورات کو لئے ہوئے یہ جوڑے صبر و سکون کے ساتھ اس گھڑی کے انتظار میں رہتے تھے جو رسومات مذہبی کے ساتھ ایک مقررہ عرصہ کے بعد آنی لازمی تھی۔

اس تربیت کا کیا اثر ہوا اور اس سے کیا نتیجے نکلے؟ میں کچھ نہیں کہتا۔ تاریخ کے صفحات الٹ کر دیکھئے، مہابھارت رامائن و تصانیف متفرقہ پڑھئے اور دیکھئے کہ قدیم ہندوستان کی زندگی کس قدر معصومانہ تھی، سچ پوچھئے تو حیات مشترکہ کا اس سے خوشتر تصور ممکن ہی نہیں ہے۔ دراصل ان لوگوں کو اگر کوئی فکر تھی تو ایک دوسرے کی، کوئی خیال تھا تو اپنے فرائض کا۔ ان خوش نصیب لوگوں کی اولادیں جیسی ہو سکتی ہیں ظاہر ہے۔ دنیا میں کسی ملک نے کیا با اعتبار دولت اور کیا بلحاظ سخاوت و شجاعت و فرزانگی ہندوستان کے دعوائے فضیلت سے انکار نہیں کیا ہے مگر آہ ع

کیا یہی اپنا چمن تھا، کیا یہیں تھا آشیاں

اب بھی کہیں کہیں اس گزشتہ عظمت کی یادگاریں باقی ہیں مگر صرف نرم دلوں کو خون کے آنسو رلانے کے لئے۔ ان کے قصے کہے جا سکتے ہیں مگر دردمندوں کے دلوں کو بیتاب کر دینے کے لئے۔

انتظامات خانہ داری میں بھارت کی دیویوں سے زیادہ آج تک کسی نے امتیاز نہیں پایا اور وفاداری کیا کسی نے یہ عالم نہیں دکھلایا۔ ان کی وفاداری کا یہ عالم تھا کہ جوہر کی رسم آج تک اس کی شاہد ہے۔ جان آبرو پر نثار اور ساجن پر قربان تھی۔ انہیں مثالوں نے شاعر کو اس اعتراف پر مجبور کیا ہے کہ

ہمچو ہندو زن کسے در عاشقی مردانہ نیست   سوختن بر شمع مردہ کار ہر پروانہ نیست

سوامی رام تیرتھ آنجہانی

انسان کی پیدائش اور زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو روزِ ازل سے آج تک اہلِ علم و اہلِ دل حضرات کے لئے ایک دلچسپ بحث بنا رہا ہے اور ہر ایک نے اپنے اپنے علم و مشاہدہ کے مطابق اس کا جواب دیا ہے۔ مگر جب ان تمام جوابات کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو ایک بات ایسی نظر آتی ہے جو تمام جوابات کی اصل اصول ہے اور جس پر سب حضرات کسی نہ کسی عنوان سے متفق ہیں یعنی انسان کی تخلیق و زندگی کا واحد مقصد "ذات واحد" کا عرفان حاصل کرنا ہے۔ لیکن معرفت ذات حق حاصل کرنا جس قدر ضروری ہے اُسی قدر مشکل بھی ہے مصداق ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

فطرت جس کسی کو اس نعمت غیر مترقبہ سے بہرہ ور کرنا چاہتی ہے شروع ہی سے اس کے خیالات و حالات کی تربیت بھی کرتی ہے تاکہ رفتہ رفتہ وہ اس نعمت کو حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔

ایسی برگزیدہ ہستیوں کو بدوِ شعور ہی سے بزرگانِ دین سے محبت، دنیا و تعلقات دنیا سے نفرت، صبر و تحمل اور مصائب دنیا سے بے پروائی ہوتی ہے اور یہ سب باتیں آگے چل کر طریق معرفت میں ان کی ممد و معاون بنتی ہیں۔ چنانچہ سوامی رام تیرتھ صاحب آنجہانی کی سوانحمری میں وہ تمام باتیں جو ایک عارف باللہ کی نشانی ہوتی ہیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔

سوامی جی نے ۲۲۔ اکتوبر ۱۸۷۳ء کو موضع مرالی والا (ضلع گوجرانوالہ۔ پنجاب) کے ایک عالی خاندان میں جنم لیا۔ یہ وہی خاندان ہے جسمیں گوسائیں تلسی داس جیسے بزرگ پیدا ہوئے تھے۔ سوامی جی کے والد بزرگوار گوسائیں ہیرانند جی سیدھی سادی طبیعت کے بزرگ تھے۔ البتہ ان کے مزاج میں غصہ زیادہ تھا، جس کی وجہ سے سوامی جی کو بھی تکلیف اٹھانا پڑی۔ سوامی جی پیدائش کے چند ماہ بعد ہی والدہ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے اور اپنی عزیز بہن شریمتی تیرتھ دیوی اور نیکدل پھوپھی کی آغوشِ محبت میں پرورش پائی۔

سوامی جی کی پھوپھی ایک نیکدل، پارسا اور عبادت گزار خاتون تھیں اور اکثر پوجا کے لئے مندر

میں جاتی تھیں، سوامی جی بھی ان کے ساتھ جاتے اور شریک عبادت ہوتے تھے۔ اس طرح بچپن ہی سے ان کی طبیعت ایشور بھگتی کی طرف مائل ہوتی گئی۔ جب کتھا شروع ہونے سے پہلے سنکھ بجایا جاتا تو وہ اس کی آواز سنکر بے قرار ہو جاتے اور جب تک ان کو دھرم شالہ میں جہاں کتھا ہوتی تھی نہ لیجایا جاتا وہ خاموش نہ ہوتے۔

سوامی جی نے ابتدائی تعلیم اپنے گانوں کے پرائمری مدرسہ میں حاصل کی اور اس کے ساتھ ساتھ گلستاں و بوستاں بھی ختم کرلیں۔ مولوی محمد علی صاحب جو مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر تھے سوامی جی کی ذہانت و ذکاوت پر بسا اوقات متعجب ہو جاتے تھے۔ دن بھر اسکول میں تعلیم پانے کے بعد شام کو سوامی جی کتھا سننے کے لئے دھرم شالہ میں جاتے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد کھانے سے فارغ ہوکر سنی ہوئی کتھا گھر والوں کو حرف بحرف سنا دیتے اس سے آپ کی قوت حافظہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

سوامی جی کی عمر ابھی تقریباً دس سال تھی کہ ان کے والد نے ان کی شادی کر دی، اس وقت تو سوامی جی کو کچھ زیادہ خیال نہ ہوا لیکن جب ہوش سنبھالا تو والدین کی اس محبت پر جو ان کے لئے زحمت تھی بہت غصہ آیا مگر مجبور تھے کیونکہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا تھا اور اب اس قید سے رہائی پانا ممکن نہ تھا۔

ابتدائی تعلیم سے فارغ ہوکر وہ گوجرانوالہ ہائی اسکول میں داخل ہوئے پھر مشن کالج لاہور سے انھوں نے بی۔اے پاس کیا۔ انٹرینس پاس کر لینے کے بعد ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ اور زیادہ تعلیم حاصل نہ کریں بلکہ معاش کا کوئی وسیلہ تلاش کریں، لیکن سوامی جی کا دل ابھی تحصیل علم سے سیر نہ ہوا تھا انھوں نے سلسلہ تعلیم جاری رکھنے پر اصرار کیا اس پر ان کے والد ناخوش ہوگئے، اور جس زمانہ میں وہ بی۔اے میں تعلیم پاتے تھے ان کی اہلیہ محترمہ کو ان کے پاس لاہور پہنچا دیا گیا، مطلب یہ تھا کہ اس طرح وہ فکر معاش میں مبتلا ہوکر تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیں، یونیورسٹی سے جو قلیل وظیفہ ملتا تھا وہی ان کے تعلیمی اور ذاتی اخراجات کا کفیل تھا، ایسی حالت میں بیوی کا بار بھی ان کے سر ڈال دیا گیا۔ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو پڑھنا لکھنا چھوڑ کر نوکری کی تلاش کرتا مگر سوامی جی نے اس آزمائش کے موقع پر نہایت استقلال سے کام لیا اور جس طرح ہو سکا اپنی تعلیم جاری رکھی۔ سوء اتفاق سے ان کو بی۔اے میں ناکامیابی ہوئی جس کا انہیں سخت صدمہ ہوا مگر اس جواں مرد نے (جس کی عمر اس وقت سولہ سترہ سال سے زیادہ نہ تھی) ہمت نہ ہاری اور پھر پڑھنے پر آمادہ ہو گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر کسی شخص کو کسی شئے کی سچی طلب ہوتی ہے تو دست قدرت بھی غیب سے اس کی مدد کرتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب سوامی جی دوبارہ کالج میں داخل ہوئے تو اس وقت ان کے پاس

ایک حبہ بھی نہ تھا مگر کارساز حقیقی پر پورا بھروسہ تھا جس کی وجہ سے دل مطمئن تھا۔ جس دن وہ کالج میں داخل ہوئے اسی دن لالہ جھنڈومل حلوائی نے بصد منت وسماجت سوامی جی کو اپنا عزیز مہمان بنالیا یہ وہ غیبی امداد تھی جس کو دیکھکر رزاق مطلق کی شان کریمی پر ان کو اور زیادہ بھروسہ ہوگیا۔ کالج کا پرنسپل اور ریاضی کا پروفیسر مسٹر ٹلبرٹسن اکثر خفیہ طور پر ان کی امداد کرتے تھے کیونکہ ان کی ذہانت، ذکاوت اور علمی دلچسپی سے واقف ہونے کے علاوہ وہ ان کی مالی حالت سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ نیز سوامی جی کے اخلاق واخلاص اور سادگی وسچائی کا ہر شخص معترف تھا اور بلا سوال وبغیر منت ان کی خدمت کرنا عین سعادت خیال کرتا تھا۔ ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ جو شخص کارساز حقیقی پر بھروسہ کرتا ہے اس کے تمام کام خود بخود غیبی اشارہ پر انجام پاتے ہیں۔

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد سوامی جی نے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے میں پڑھنا شروع کیا۔ اس زمانہ میں وہ دوسرے لڑکوں کو پڑھاکر اپنا خرچ چلاتے تھے۔ ان کو ریاضی سے بہت دلچسپی تھی اور اس میں اس قدر مہارت تھی کہ ایک بار ریاضی کے پروفیسر کے علیل ہوجانے پر انھوں نے اپنے ہمدرس طلبا کو ریاضی کا درس دیا۔ علمی دلچسپی اور شوق کا یہ عالم تھا کہ جب ایک بار کالج کے پرنسپل نے ان سے دریافت کیا کہ وہ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد کیا کریں گے تو انھوں نے جواب دیا کہ "میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا جو ایشور کو منظور ہوگا وہ کرونگا۔ تاہم میری خواہش یہ ہے کہ میں یا تو واعظ بنوں یا معلم"۔

ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد سوامی جی نے اول اول کالج کے پرنسپل کی رائے کے مطابق پرائیویٹ طریقہ پر طلبا کو ریاضی پڑھانا شروع کی۔ تھوڑے دنوں کے بعد وہ سیالکوٹ مشن ہائی اسکول میں بورڈنگ سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے مگر چند ماہ کے بعد ہی مشن کالج لاہور میں ریاضی کے پروفیسر کی جگہ ان کو ملگئی۔

سوامی جی کو ابتدا سن شعور ہی سے معرفت ذات حق حاصل کرنے کا شوق تھا۔ زمانہ طالب علمی نیز اس کے بعد انھوں نے اپنے بچپن کے گرو بھگت دھنا رام جی کو جو خطوط لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سوامی جی کے دل میں اپنے گرو جی کی حد درجہ عزت تھی اور اعتقاد کی تو یہ کیفیت تھی کہ ہر مشکل کے وقت وہ گرو جی سے طالب مدد ہوتے تھے۔ بعض خطوط میں ان کے دل پر جو واردات وحالات وقتاً فوقتاً وارد ہوتے تھے وہ بھی بیان کئے گئے ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ فطرت نے ان کو تعلیم وتعلم سے بالاتر مقصد کیلئے پیدا کیا تھا۔

سری کرشن جی سے ان کو بیحد محبت تھی، وہ گیتا کا مطالعہ روزانہ بلا ناغہ کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ محبت ترقی کرکے عشق کے درجہ کو پہنچ گئی اور اب یہ حالت ہوگئی کہ سری کرشن مہاراج کا نام سنکر وہ بے قرار اور

شوق دیدار میں بیتاب ہو جاتے۔ جب طلب حق زیادہ بڑھ گئی تو انھوں نے لوگوں سے ملنا جلنا کم کر دیا حتیٰ کہ اپنے گرو کو بھی خط لکھنا بند کر دیا۔ اس زمانہ میں سوامی جی نے ایک رسالہ "الف" نامی نکالا جس میں ویدانت (تصوف) کے مسائل پر اظہار خیال کیا جاتا تھا مگر ابھی اس رسالہ کے صرف تین نمبر ہی شائع ہوئے تھے کہ ان کی طبیعت نے ایک اور پلٹا کھایا اور وہ سب کچھ چھوڑ کر طلب حق میں سیر و سیاحت کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ کیلاس، راج، امرناتھ، جمیرو، کدارناتھ، متھرا غرض تمام بڑی بڑی زیارت گاہوں کی سیر کی۔ آخر ریاست ٹیہری (گڑھوال) میں سنیاس آشرم بنا کر مقیم ہو گئے۔ اور اپنا وقت عبادت الٰہی میں گذارنے لگے۔

اس سفر میں سوامی جی کی اہلیہ محترمہ اور بعض دوسرے معتقدین بھی اُن کے ہمراہ تھے، مگر جنگل کی ناقابل برداشت تکالیف کی وجہ سے اُن کی اہلیہ بیمار پڑ گئیں اور اُن کو مع چھوٹے بچہ برہمانند جی کے وطن بھیجدیا گیا۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں جب ہندوستان کے اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ جاپان میں ایک مذہبی کانفرنس ہونیوالی ہے۔ جس میں دنیا بھر کے تمام مذاہب کے نمایندے شریک ہونگے تو مہاراجہ ٹیہری نے سوامی جی سے اس کانفرنس میں شریک ہونے کی استدعا کی، جس کو انھوں نے بخوشی منظور کر لیا۔ مگر جاپان پہنچکر معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی۔ تاہم ٹوکیو کالج میں اُنھوں نے کئی لیکچر دیئے جن میں سامعین کی تعداد بکثرت ہوتی تھی۔ وہاں سے وہ امریکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ امریکہ میں بھی آپ کی بہت آؤ بھگت ہوئی اور اُن کے لیکچرز بڑے شوق و ذوق سے سُنے گئے۔ امریکہ سے روانہ ہو کر سوامی جی مصر پہنچے اور مذہب اسلام پر فارسی زبان میں ایک دلپذیر تقریر کر کے مصر والوں کو گرویدہ بنا لیا۔ آخر تقریباً ڈھائی سال کے بعد وہ ساحل بمبئی پر رونق افروز ہوئے۔ بمبئی میں متعدد تقریریں کیں جن میں مسلمان، عیسائی، پارسی، برہمو سماج غرض ہر مذہب و ملت کے لوگ بکثرت شریک ہوئے۔ بمبئی سے روانہ ہو کر بنگال، بہار یو۔ پی، راجپوتانہ وغیرہ میں دَورہ کیا اور ہر صوبہ میں ان کا خیر مقدم نہایت شان و شوکت سے کیا گیا۔

الغرض سیر و سیاحت سے فارغ ہو کر سوامی جی اپنی پرانی جگہ ریاست ٹیہری میں جا پہنچے۔ اور مالی دیول گاؤں کے نزدیک گنگا جی کے کنارے ایک پر فضا و دلکشا جگہ تجویز کر کے عبادت الٰہی میں مصروف ہو گئے اسی جگہ ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء کو گنگا جی میں اشنان کرتے ہوئے دریائے علم و معرفت کا یہ گوہر شاہوار ہمیشہ کے لئے تہ نشین ہو گیا اور وہ پیشین گوئی جو ان کی ولادت کے وقت کی گئی تھی کہ ان کو ۳۰-۴۰ برس کی عمر میں پانی سے خطرہ پیش آئیگا حرف بحرف پوری ہوئی۔

افسوس سوامی جی کی عمر نے وفا نہ کی اور قبل از وقت یعنی تقریباً ۳۳ سال کی عمر میں اس دار فانی سے ملک جاودانی کی طرف کوچ کیا۔

آج سوامی جی دنیا میں موجود نہیں ہیں مگر اُن کی تعلیمات اہل دل کے لئے مشعل راہ ہدایت ہیں۔ ذی توفیق ان سے لذت روحانی حاصل کر سکتے ہیں۔

سوامی جی نے کسی خاص موضوع پر کوئی تصنیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی لیکن ان کے لیکچرز، خطوط اور متفرق مضامین کے متعدد مجموعے مرتب ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے شاگرد رشید، خلوت و جلوت اور سفر و حضر کے رفیق سوامی نارائن جی نے لکھنؤ میں رام تیرتھ پبلشنگ لیگ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ اور سوامی جی کی تعلیمات کو مقبول عام بنانے کے لئے ان کے لیکچرز اور مضامین وغیرہ کی کئی جلدیں شائع کی ہیں۔ ان میں سے چند کا مختصر حال ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(۱) **سوانح عمری رام**۔ یہ سوامی جی کی مبسوط سوانح عمری ہے جس میں ابتدائے عمر سے آخری زمانہ تک کے حالات بالتفصیل درج ہیں، ضمناً آپ کے خیالات اور تعلیمات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت مجلد عہ

(۲) **رام پتر**۔ زمانۂ طالب علمی سے آخری عمر تک جس قدر خطوط سوامی جی نے اپنے گرو یا دوسرے لوگوں کو لکھے ہیں سب اس میں موجود ہیں۔ بعض خطوط میں واردات قلبی اور ایشور بھگتی کے رموز و نکات بھی ہیں۔ کتاب کے شروع میں سوامی جی کی تصویر بھی ہے۔ قیمت مجلد ۱۲/

(۳) **خمخانۂ رام**۔ اس میں سوامی جی کے متفرق مضامین نثر و نظم ہیں۔ رسالہ "الف" کے مضامین بھی اس میں شامل ہیں اور مطالعہ کے قابل ہیں۔ قیمت مجلد ہمر

ان کے علاوہ سوامی جی کے لیکچرز انگریزی اور ہندی میں بھی شائع ہو گئے ہیں تاکہ اردو، ہندی اور انگریزی جاننے والے اپنے مذاق کے مطابق سوامی جی کی تعلیمات سے مستفید ہو سکیں۔

یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ دُنیا اور اُس کی تمام چیزیں فانی ہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ ایک مقررہ وقت کے بعد ہر شخص کو فنا ہو جانا ہے۔ ایسی صورت میں عقلمند صرف وہ شخص کہا جا سکتا ہے جو دنیا سے صرف بقدر ضرورت تعلق رکھے اور صبر و قناعت کو اختیار کر کے دُنیا کے لالچ میں پڑنے سے محفوظ رہے تاکہ اس کی چند روزہ زندگی آرام و اطمینان سے گزر جائے اور اس دنیا کو چھوڑنے کے وقت اس کا دل مطمئن اور روح خوش رہے۔ ایسا شخص موت سے بےخوف رہتا ہے اور ہر حال میں معبود حقیقی کا شکر ادا کرتا ہے۔

(ماخوذ)

اُمید

از مسٹر محمد اسحاق ایم۔ اے (ڈھاکہ)

"نہیں ساوتری! آج میں ضرور ایک افسانہ لکھوں گا۔"

میز کے دونوں طرف دو کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، ایک پر بھرت بیٹھ کر افسانے کا پلاٹ سوچنے لگا، اور دوسری پر ساوتری بیٹھ گئی۔ اور ذرا ترشرو ہو کر کہا۔ "جب افسانہ نویسی سے روپیہ حاصل ہوتا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیوں نہیں لکھتے۔ فرض کیجئے کہ مہینہ کے خاتمہ پر اگر تیس، روپے زیادہ ملجائیں تو اچھی طرح گزر اوقات ہو جائے۔"

بھرت دل ہی دل میں ہنسا۔ مہینے میں تیس روپے حاصل کرنیکے معنی ہیں دو افسانے لکھنا اور ان کا دو اچھے رسالوں میں شائع ہونا۔ پھر وہ ساوتری کی طرف مخاطب ہوا۔ "اگر صرف افسانے لکھنے ہی سے روپے حاصل ہو جاتے تو میں روزانہ لکھا کرتا۔"

"آپ لکھتے ہی کہاں ہیں کہ روپے ملیں۔ آپ نے بہت سے افسانے لکھے مگر ایک بھی مکمل نہیں کیا اگر ایک کو بھی پورا کر کے کہیں بھیجد یتے تو میں سمجھتی کہ واقعی آپ نے کچھ لکھا ہے۔"

بھرت نے بات ٹال دی۔ وہ اپنے دل کی بات کسی طرح سے ساوتری کو نہ سمجھا سکتا تھا، ساوتری لکشمی تھی، بہت دنوں سے روپے پیسے کی تنگی اٹھا رہی تھی، لیکن بھرت کی ہمت افزائی کے سوائے اس نے کوئی شکایت نہیں کی۔ بھرت کو اسی وجہ سے زیادہ تکلیف ہوتی تھی۔ آج اس نے ایک افسانہ لکھنے کا عزم مصمم کر لیا تھا، پلاٹ تو اس کے دماغ میں موجود ہی تھا لیکن جب وہ لکھنے بیٹھا تو اس کا دل بیٹھ گیا، اگر افسانہ ایڈیٹر رسالہ کے معیار پر پورا نہ اترا تو ساری محنت رائیگاں ہی جائیگی، مگر روپیوں کی سخت ضرورت تھی، ساوتری کی باتوں سے اس کا دل بیتاب ہو رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "ساوتری کیا تم سمجھتی ہو کہ افسانوں کے ختم کرنے کا مجھے کوئی خیال نہیں ہے۔ لیکن جب مجبوری ہو تو کیا کیا جائے۔"

"اگر آپ کوشش کریں تو افسانوں کو ضرور پورا کر سکتے ہیں، اس سے پیشتر بھی تو آپ قصے لکھا کرتے تھے

آخر اُس وقت کس طرح لکھا کرتے تھے ؟"

"یہی تو مشکل ہے کہ جس کام کو انسان مجبوراً کرنا چاہتا ہے وہ اُس سے نہیں ہوتا۔ پہلے لکھنے کے شوق اور نام پیدا کرنے کے خیال سے لکھا کرتا تھا اب روپیہ پیدا کرنے کی دھُن ہے۔ مگر جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو دنیا بھر کی فضول باتیں ذہن میں آجاتی ہیں اور ہمت لکھنے سے جواب دیدیتی ہے"

یہ سنکر ساوتری نے محبت بھرے لہجے میں کہا " اچھا اب بات کرنیکی نہیں ہے، جس کام کا آپ نے تہیہ کیا ہے وہی کیجئے۔ میں شنکر کے پاس لیٹی ہوں جب ضرورت ہو بلا لیجئے گا" چھوٹا سا گھر تھا۔ اُٹھنا بیٹھنا سونا اور لکھنا پڑھنا سب ایک ہی جگہ ہوتا تھا، ایک طرف چارپائی بچھی ہوئی تھی اُس پر شنکر سو رہا تھا، ساوتری اس کے پاس بیٹھ گئی اور ایک کپڑا سینے لگی، تھوڑی دیر کے بعد بھرت نے اُسکی طرف مخاطب ہوکر کہا:-

"اگر اس طرح سامنے بیٹھکر آپ کام کرینگی تو بھلا میں کیسے افسانہ لکھ سکوں گا"

ساوتری نے متانت سے جواب دیا " آپ اپنا کام کیجئے، میں اپنا کام کر رہی ہوں"

مگر بھرت کا جی نہ لگا۔ جتنا افسانہ اُس نے لکھا تھا اس کو بھی کاٹ دیا اور مایوسانہ لہجہ میں بولا "سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں، کئی افسانوں کے پلاٹ میرے دماغ میں موجود ہیں مگر ان کو لکھنا مشکل معلوم ہوتا ہے"

ساوتری مسکراتی ہوئی بولی " اچھا میں ایک افسانہ کا پلاٹ بتاتی ہوں، اتنے دنوں تک آپ خود لکھتے رہے آج میرے بنائے ہوئے پلاٹ کو لکھ دیجئے"

"اچھا میں ضرور لکھوں گا"

"آپ لکھیں گے ؟"

"ضرور لکھوں گا"

"بہت اچھا۔ مگر مہربانی فرماکر مذاق نہ اُڑائیے گا"

"اچھا۔ اچھا۔ بتائیے تو سہی"

ساوتری اپنی جگہ سے اُٹھکر بھرت کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرہ سے ایک شرمگیں مسکراہٹ ٹپک رہی تھی، وہ بولنا چاہتی تھی لیکن شرم و حیا مانع تھی۔ بھرت منتظر تھا اور پلاٹ بتانے کا بار بار تقاضا کر رہا تھا، جب تقاضا حد سے زیادہ بڑھ گیا تو ساوتری نے مسکراکر کہا "آخر اتنی جلدی کیا ہے، صبر کیجئے۔ بتاؤں گی"

"نہیں مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا، جلد بتاؤ"

"اچھا سنیئے: خفا نہ ہو جیئے گا۔"

"ہمارا مختصر کنبہ ہی ہمارا افسانہ ہوگا۔ پلاٹ بھی مختصر سا ہے، ہماری خوشی اور غم، ہماری امید و آرزو کا دائرہ محدود ہے، ہمارے خیالات اسی چھوٹی سی دنیا میں گردش کرتے رہتے ہیں، اس لئے "آپ بیتی" ہی لکھ دیجئے، ہمارا افسانہ کوئی فرضی افسانہ نہیں بلکہ واقعہ ہے، اس میں جس قدر غم ہے، اسی قدر خوشی بھی موجود ہے۔ صرف اندوہ و غم کی فراوانی کو نہ دکھائیے بلکہ خوشی کو بھی نمایاں کیجئے۔"

"بہت اچھا، اب آپ خاموش ہو جائیے، میں لکھتا ہوں۔"

"نہیں، ذرا ٹھہریئے، ایک بات اور سن لیجئے، آپ کے افسانوں میں غم کا اثر زیادہ نمایاں ہوتا ہے، اسی وجہ سے وہ واقعیت سے دور ہو جاتے ہیں۔ انسان کو رنج و غم سے تکلیف ضرور ہوتی ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ اس رنج و غم کے ساتھ مسرت و امید مطلق نہ ہو، مثل مشہور ہے کہ دنیا امید پر قائم ہے، پھر آپ صرف رنج و غم سے اس قدر متاثر کیوں ہو جاتے ہیں۔ اپنی ہی مثال لیجئے۔ کیا ہمارے دل میں کوئی امید اور خوشی نہیں ہے، کیا ہمیں امید نہیں ہے کہ ایک دن ہماری محتاجی دور ہو جائیگی، تمہاری دلی آرزوئیں بر آئینگی، ہماری امید بر آوے یا نہ آوے، اس سے کچھ بحث نہیں، امید پر انسان زندہ رہتا ہے اور ہم بھی اسی کے آسرے زندگی گزار رہے ہیں۔"

یہ کہتے کہتے ساوتری کی آنکھیں پرنم ہو گئیں تاہم اس نے اپنے جذبات کو روک کر کہا "اگر ہم پر تکلیفوں کا بار ہے تو ہونے دیجئے، ان کی پروا نہ کیجئے۔ آیندہ کی امیدیں اور آیندہ کی مسرتیں ہمیں خوش رکھ سکتی ہیں۔"

ساوتری کے خاموش ہونے پر بھرت نے کہا "ساوتری! خیالات کی ہنڈ کلیا نہ پکاؤ، اپنی دنیا میں آؤ، ہماری موجودہ حالت ایسی نہیں کہ ہم اس سے بے نیاز ہو جائیں۔"

"ہاں، یقیناً مگر ہم رنج و اندوہ سے بے نیاز ہو کر آیندہ کی امید پر خوش رہنا چاہیئے۔"

تین دن کے بعد بھرت نے اپنا افسانہ مکمل کر کے ڈاک سے روانہ کر دیا اور روانگی کے وقت اس نے آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں پرمیشور سے پرارتھنا کی کہ تو ہی مالک ہے، اس کو مقبول بنا دے۔

بھرت کی آمدنی بہت کم تھی، ایک کارخانہ میں معمولی مشاہرہ پر ملازم تھا جو روزانہ اخراجات کا کسی طرح کفیل نہ تھا، اس لئے ساوتری سلائی کر کے کچھ رقم حاصل کرتی تھی اور بھرت افسانے لکھا کرتا تھا مگر اس کے افسانے عموماً ناکامیاب ہوتے تھے۔ اس درمیان میں بھرت پر ایک نئی مصیبت آئی کہ ساوتری یکایک بیمار ہو گئی۔ بھرت

اور بھی زیادہ پریشان ہو گیا، ابھی ساوتری بتا رہی تھی کہ بتانے میں [illegible] واپس نہ گیا، جس پر یہ لکھا تھا کہ "یہ افسانہ بہت اچھا ہے، پندرہ روپیہ ارسال خدمت ہیں"۔

جب منی آرڈر آیا تو بھرت دفتر میں تھا، ساوتری نے اس کو خود وصول کیا اور جب بھرت واپس آیا تو اس کو یہ خوشخبری سنائی لیکن بھرت کی افسردگی دور نہیں ہوئی۔

تھوڑی دیر بعد ساوتری بولی "اس تنگی میں روپیہ ملا کیا آپ اس کو بھگوان کی کرپا نہیں سمجھتے اور اس کا شکر ادا نہیں کرتے؟"

"اگر تم بیمار نہ ہوتیں تو واقعی اس روپیہ سے بہت خوشی ہوتی"

ساوتری بھرت کی افسردگی کا سبب سمجھ گئی اور بھرت کا خیال ہٹانے کے لئے کہنے لگی:۔

"آپ میرے لئے اندیشہ نہ فرمائیں، میں تین چار دن میں اچھی ہو جاؤں گی، آپ اس روپیہ سے میرے لئے ایک اچھی ساڑی اور شنکر کے کرتے کا کپڑا اور اپنے کوٹ کا کپڑا خرید لائیے۔"

بھرت ساوتری کی فرمائش سنکر خاموش ہو گیا، وہ سوچ رہا تھا کہ سب سے پہلے ساوتری کی دوا کی قیمت ادا کرنی ضروری ہے۔

بھرت کو متفکر دیکھکر ساوتری ہنسکر کہنے لگی "کیا آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ اس قدر دوائیاں آئی ہیں اُن کی قیمت کہاں سے ادا کی جائیگی؟ آپ اس کی فکر نہ کیجئے، ایک اور افسانہ لکھئے۔"

بھرت نے مسکرا کر کہا "خوب!"

"کیوں نہیں، محنت کا پھل انسان کو ضرور ملتا ہے۔ دیکھئے یہ میرے پلاٹ کی قیمت ہے آپ کے افسانے کی نہیں ہے، آپ آج ہی کپڑا خرید لائیے۔"

بھرت مسکرانے لگا۔

ساوتری بولی "مذاق نہیں، کل دفتر سے لوٹتے وقت ان چیزوں کو ضرور خرید لانا، ورنہ کل تک یہ روپیے خرچ ہو جائیں گے۔"

قدرت کی نیرنگیاں انسان کی سمجھ سے باہر ہیں، روپیے بکس میں صرف ایک ہی رات رہنے پائے تھے کہ صبح کو بھرت کا ایک قرض خواہ دوست آدھمکا اور روپیوں کا تقاضی ہوا، اس کے روپیے بہت دنوں سے اٹکے ہوئے تھے، بھرت بھی غیرت سے انکار نہ کر سکا، کُل روپیے دیکر پورا حساب بیباق کر دیا۔

ساوتری ہنسکر بولی: "دیکھئے میں کہتی نہ تھی آخر روپیے چلے گئے نہ؟"

"ہاں مجھے روپیہ لئے ہوئے بہت دن بھی ہو گئے تھے، وہ تو خوش نصیبی سے اس وقت روپیہ موجود تھے ورنہ خفیف ہونا پڑتا۔"

ساوتری بچھونے پر اٹھ بیٹھی، بولی "خیر تم یہ نہ سوچو کہ میری آرزو پوری نہیں ہوئی، کیونکہ تم سلامت ہو تو کبھی یہ آرزو پوری ہو ہی جائیگی۔"

بھرت نے بے اعتباری سے جواب دیا۔ "ہاں!"

اسی طرح ایک سال اور گزر گیا۔ بھرت افسانے لکھتا رہا اور ساوتری سلائی کرتی رہی مگر اس پر بھی ان کی آمدنی اتنی نہ ہوئی کہ اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے۔ ایک روز بھرت بہت افسردہ ہو کر ساوتری سے کہنے لگا:—

"ساوتری! آخر اس طرح کب تک بسر ہوگی۔ مجھے تو اب یہ زندگی وبال جان معلوم ہوتی ہے۔"

ساوتری نے مسکرا کر کہا "دیکھئے دنیا امید پر قائم ہے۔ اس کا تجربہ بھی آپ کو ہو چکا ہے، پھر ناامید ہونے کی کیا وجہ ہے؟"

"جی ہاں، آخر امید کے سہارے کب تک زندہ رہوں۔"

"جب تک جسم میں جان ہے۔"

"بھرت نے بے اعتباری کے لہجہ میں جواب دیا" بہت اچھا۔"

کل کی فکر

بادۂ محبت کی آرزو بیدار ہے۔ اگر تیرے قبضہ میں سنگین قلعہ اور فلک بوس ایوان ہوں تو کیا ہے، عمر عزیز گزرتی جا رہی ہے اور تیرے آلام میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دنیا کے تکلفات سے آزاد ہو اور کل کی فکر کر۔

موسم بہار میں پہاڑ کی ڈھلان کی سبز گھاس پر بے تکلف لیٹنا کس قدر خوشگوار ہے اس سے زیادہ پرسکون شغل اور کیا ہوگا۔ آفتاب کے غروب ہونے کا نظارہ، پہاڑوں کی سربفلک خاموشی اور بلند چوٹیوں کے پیچھے جو دریلے ابر پر سایہ کئے ہوئے ہیں کتنا دلفریب ہے، مگر ان سے زیادہ دلآویز و بہترین یہ مشغلہ ہے کہ شب ماہ ہو، مے خوشگوار ہو، ساقی اندوہ ربا ہو اور دل میں کوئی آرزو نہ ہو۔

(ماخوذ)

شادی کا تحفہ

از مسٹر محمد نعمان احسن بی اے ایل ایل بی

شیام ایک جوان رعنا تھا۔ اس قدر خوبصورت کہ اس کو مردانہ حسن کا مکمل نمونہ کہا جا سکتا تھا۔ اس کے گھونگر والے سیاہ بالوں، نشہ آگیں آنکھوں اور متناسب خد و خال میں ہزاروں دلکشیاں پوشیدہ تھیں۔ اس کی شیریں گفتگو مسرت بار اور جاذب توجہ ہوتی تھی لیکن ان ساری خوبیوں کے ساتھ اس میں ایک عیب بھی تھا کہ وہ دولتمند نہ تھا، اور اگر آدمی مفلس ہو تو حسین ہونے سے کیا فائدہ؟ شیام میں ساری خوبیاں تھیں البتہ اُسے روپیہ کمانا نہ آتا تھا۔ اس کی معاش کا انحصار صرف دو سو روپیہ سالانہ کی اس قلیل رقم پر تھا جو اُسے اپنی پھوپھی سے ملا کرتی تھی۔ باپ نے ترکہ میں اُسے محض ایک تلوار اور چند کتابیں ملی تھیں جو اس کے مختصر سے مکان کی زینت تھیں۔ اس لئے بیسیوں طرح قسمت آزمائی کی کوششیں کیں لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ کچھ دنوں شہر کے صرافہ میں کام کیا لیکن نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا؟ چائے کی تجارت شروع کی مگر فائدہ نہ ہوا۔ میوہ فروشی اختیار کی لیکن کام نہ چلا، آخر کار کشمکش روزگار سے عاجز آ کر اس نے جد و جہد بھی چھوڑ دی اور آزادانہ زندگی بسر کرنے لگا۔

سب سے بڑا یہ کہ وہ کسی کی زلف گرہ گیر کا اسیر تھا۔ سندر اس کی آرزوؤں کی مرکز تھی۔ سندر کے والد پنشنر کرنیل تھے۔ فوجی ملازمت میں اُن کا مزاج اور ہاضمہ دونوں اس قدر خراب ہو گئے تھے کہ پھر درست نہ ہوئے۔ سندر ظاہری اور باطنی حسن سے بہرہ ور تھی، اور اس کو بھی شیام سے محبت تھی، خود کرنیل صاحب بھی شیام سے راضی تھے لیکن ان دونوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کرنے کے روادار نہ تھے کیونکہ شیام دولتمند نہ تھا۔ وہ شیام سے اکثر کہتے تھے کہ "بیٹا! جب دس ہزار روپیہ جمع کر لو، پھر میرے پاس آنا، اس وقت ساری باتیں طے ہو جائیں گی۔" یہ فقرے شیام کے پر آرزو دل پر نشتر کا کام کرتے۔ وہ مایوس ہو کر سندر کے پاس آتا۔ سندر اس کے لئے مایۂ سکون تھی۔ سندر کی ذات میں اُسے وہ سب چیزیں میسر ہوتیں جو نسائیت صنف قوی کو مہیا کر سکتی ہیں یعنی دلداری، محبت اور پرستش۔ سندر کی لذیذ اور شیریں باتیں اس کے زخمی دل پر مرہم کا کام کرتیں اور اس کی مردہ آرزوؤں میں جان ڈال دیتیں،

زمانہ یوں ہی گذر رہا تھا۔ ایک روز کرنیل صاحب کی کوٹھی کو تمیری دروازہ کی طرف جاتے ہوئے وہ اپنے ایک دوست سریندر کے یہاں جا نکلا۔ سریندر مصور تھا۔ یوں تو آجکل ہر شخص کو مصوری کا شوق ہے لیکن آرٹسٹ بہت کم پایا

سرینیدر و... قسمی آرٹسٹ تھا۔ صورت شکل کے لحاظ سے تو وہ چنداں جاذب نظر نہ تھا لیکن اپنے فن کا ماہر تھا۔ اس کی تصویریں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اس کے قدردان موجود تھے۔ اوائل اول تو شیام کے حسن عمل کی کشش نے سرینیدر کو اس طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "مصور کو صرف ان اشخاص سے شناسائی پیدا کرنی چاہیئے جو حسین ہوں جنھیں دیکھ کر دل خوش ہو اور جن سے گفتگو کر کے روحانی سکون نصیب ہو۔" بہرحال جوں جوں شناسائی بڑھتی گئی سرینیدر شیام کی آزادانہ روش مذاقی اور سیر کوشی کا گرویدہ ہوتا گیا چنانچہ شیام کو سرینیدر کے دارالتصویر میں ہر وقت بلا روک ٹوک آنے جانے کی اجازت تھی۔

شیام نے اندر جا کر دیکھا کہ سرینیدر ایک فقیر کی حیرت انگیز قدِ آدم تصویر تیار کر رہا ہے۔ فقیر خود بھی دارالتصویر کے ایک گوشہ میں تھوڑی سی اونچی جگہ پہ کھڑا تھا۔ یہ ایک مفلوک الحال ضعیف العمر شخص تھا۔ اُس کے چہرے کی جھریاں کاغذ کے شکنوں سے مشابہ تھیں۔ اس کے منہ پر نکبت و فلاکت، عسرت و مصیبت کے دردناک اور ترحم انگیز آثار نمایاں تھے۔ کاندھے پر خاکی رنگ کی ایک موٹی سی گدڑی پڑی تھی جو بالکل تار تار تھی۔ اس کے موٹے موٹے بھدے سے جوتے جا بجا گنٹھے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ کے سہارے وہ اپنی لاٹھی پر جھکا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں بھیک کا کاسہ تھا۔

شیام نے اپنے دوست سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "کس قدر عجیب و غریب موڈل[1] ہے۔"

"عجیب و غریب موڈل، ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ ایسے فقیر روز روز نہیں ملا کرتے۔"

"بیچارہ بوڑھا کتنا مصیبت زدہ معلوم ہوتا ہے، لیکن تم مصوروں کے لئے اس کا یاس انگیز اور حسرت خیز چہرہ ہی مایۂ ناز ہے۔"

"یقیناً۔ فقیر خوش ہوں تو اچھے نہیں معلوم ہوتے۔"

"موڈل کو ایک نشست کا کیا معاوضہ دیا جاتا ہے؟"

"ایک روپیہ"

"اور تمہیں تصویر کی کیا قیمت ملتی ہے؟"

"اوہ۔ اس کی قیمت تو دو ہزار ہے"

شیام نے ہنس کر کہا "میرا خیال ہے کہ موڈل کو کچھ فیصدی رقم ملنی چاہیئے۔ ان کا کام بھی تم لوگوں سے کچھ کم دشوار نہیں ہوتا۔"

---

[1] مشہور ہندوستانی مصور جناب محمد عبدالرحمٰن چغتائی صاحب مرقع چغتائی کا خیال ہے کہ مشرقی زبانوں میں موڈل کا مرادف کوئی لفظ موجود نہیں ہے کیونکہ مشرقی مصوری ہمیشہ موڈل سے ناآشنا رہی۔ (اظہار)

"غلط۔ ذرا اس محنت کا تو تصور کرو جو مصور کو برداشت کرنی پڑتی ہے۔ دن دن بھر کھڑا رہنا پڑتا ہے کہدینا تو آسان ہے لیکن عملی دنیا میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب یہ فنِ لطیف بھی جسمانی محنت کا مرادف بن جاتا ہے۔ لیکن خیر اب گفتگو نہ کرو میں بہت مصروف ہوں۔ سگرٹ سلگا لو اور خاموشی سے دیکھتے رہو۔"

تھوڑی دیر کے بعد خادم نے اندر آکر اطلاع دی "فریم ساز حاضر ہے۔ کچھ کہنا چاہتا ہے۔"

سریندر باہر چلا گیا۔

بوڑھا فقیر سریندر کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قریب کی ایک آرام کرسی پر کمر سیدھی کرنے لیٹ گیا۔ وہ اس قدر مایوس اور آزردہ معلوم ہوتا تھا کہ شیام اپنے جذبات ترحم کو ضبط نہ کر سکا۔ جیب میں دیکھا تو ایک روپیہ اور چند آنے پڑے تھے۔ سوچا کہ مجھ سے زیادہ اس غریب بوڑھے کو روپیہ کی ضرورت ہے فوراً وہ بوڑھے کے پاس پہونچا اور چپکے سے اس کے ہاتھ پر روپیہ رکھ دیا۔

فقیر چونک پڑا اور ایک دلخوش کن تبسم کی موج اس کے ہونٹوں پر دوڑ گئی، وہ کہنے لگا "خدا آپ کو سلامت رکھے! خدا آپ کا بھلا کرے!"

سریندر کے آجانے پر شیام اپنی حرکت پر کسی قدر محجوب ہو کر وہاں سے چل آیا۔ دن بھر سریندر کے پاس رہا، اپنی بے محل فیاضی پر اس کی لطیف فہمائش سنی اور شام کو پیدل گھر واپس آیا۔ شب کو کلب میں سریندر سے پھر ملاقات ہوئی۔

"سریندر! تم نے وہ تصویر تیار کر لی؟"

"اس کو تو فریم بھی کرالیا، اور ہاں وہ بڈھا تو تمہارا گرویدہ ہو گیا ہے۔ میں نے تمہارا سارا قصہ سنادیا تم کون ہو، کہاں رہتے ہو، کس قدر آمدنی ہے، اور کیا کیا امیدیں آیندہ کے لئے ہیں۔"

"پیارے سریندر!" شیام نے بے صبری سے کہا "تو شاید گھر پہونچکر میں اُسے متنفر پاؤں۔ لیکن یقیناً تم مذاق کر رہے ہو۔ بیچارہ فلاکت زدہ! کاش میں اُس کے کسی کام آسکتا۔ مجھے تو کسی کو اس قدر مفلوک الحال دیکھکر ڈر لگتا ہے۔ میرے یہاں بہت سے پرانے کپڑے پڑے ہوئے ہیں، تمہارا کیا خیال ہے کیا وہ ان کو لے لیگا، اس کے کپڑے تو تار تار ہو رہے تھے"

"لیکن وہ ان کو پہنکر کس قدر اچھا معلوم ہوتا تھا، میں تو کسی قیمت پر بھی اس کی تصویر فراک کوٹ پہنا کر نہ کھینچتا۔ جنھیں تم چیتھڑے کہتے ہو میں ان کو رومان (Romance) سمجھتا ہوں۔ جو چیز تمہیں فلاکت نظر آتی ہے وہ میری نگاہ میں حسن ہے۔ بہر حال میں تمہارے پیشکش کا تذکرہ کر دونگا۔"

شیام نے سنجیدگی سے کہا "بھئی سریندر! تم مصور بھی بڑے سنگدل ہوتے ہو۔"

آرٹسٹ کا دل اس کا دماغ ہوتا ہے، اور اس کے علاوہ تم جانتے ہو کہ ہمارا کام دنیا کو اس کے صحیح رنگ میں پیش کرنا ہے نہ کہ اس کی اصلاح کرنا۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ سندر کیسی ہے۔ اُس بوڑھے کو اُس سے بہت دلچسپی ہے!"

"تو کیا تم نے اس کا ذکر کر دیا"

"ہاں میں نے تو کہہ دیا۔ اُسے زرپرست کرنیل، حسین سندر، اور دس ہزار روپیہ سب کا حال معلوم ہے"

"تم نے اس بوڑھے فقیر کو میرے تمام نجی حالات بتا دیے" شیام نے غصہ سے سرخ ہو کر کہا۔

"عزیز دوست، جسے تم بوڑھا فقیر سمجھ رہے ہو وہ ہندوستان کے راجاؤں میں سے ہے۔ اگر وہ چاہے تو کل ساری دہلی خرید لے، ہر بڑے شہر میں اس کی کوٹھی ہے اور اگر وہ چاہے تو آج ہی دنیا کی سیاست میں انقلاب پیدا کر دے"

"کیا مطلب؟"

"میں یہ کہتا ہوں کہ دراصل وہ ہیں جس شخص کو تم نے دیکھا وہ مہاراجہ مسعود آباد بہادر ہیں۔ میرے بڑے عنایت فرما ہیں میری تمام تصویریں خرید لیتے ہیں، ایک مہینہ ہوا کہ انھوں نے مجھ سے اپنی تصویر فقیرانہ لباس میں کھنچوانے کے لئے کہا تھا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے چیتھڑوں میں کیا پیارے نظر آتے تھے۔ میرے چیتھڑوں میں کیونکہ وہ کپڑے میرے تھے، کیسے بھلے معلوم ہوتے تھے۔"

"مہاراجہ مسعود آباد بہادر! اور میں نے تو انھیں ایک روپیہ بھی دیدیا اور وہ بھی نکبت و فلاکت کی مجسم تصویر بن کر کرسی پر بیٹھے گئے تھے۔"

"ایک روپیہ دیدیا؟" مہندر نے قہقہے لگانے شروع کر دیے، "بھئی وہ روپیہ تو تمہیں کبھی واپس نہ ملیگا"

"تم کو مجھے بتا دینا چاہیے تھا تاکہ میں اس قدر بیوقوف نہ بنتا۔"

"اول تو میرے خیال میں بھی یہ نہ آیا تھا کہ تم یوں روپیہ بانٹتے پھرو گے۔ کسی حسین موڈل کا بوسہ لے لینا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن ایک کریہ المنظر موڈل کو روپیہ دیدینا تو خیال میں بھی نہیں آ سکتا۔ اس کے علاوہ آج میں کسی سے ملنے کے لئے تیار نہ تھا اور جب تم آ گئے تو مجھے یہ خیال ہوا کہ شاید مہاراجہ صاحب انکشاف راز کو پسند نہ کریں کیونکہ ان کا لباس درست نہ تھا۔"

"وہ مجھے کیا سمجھتے ہونگے؟"

"بالکل نہیں۔ تمہارے چلے جانے کے بعد وہ بہت مسرور تھے، برابر مذاق کرتے رہے، میری سمجھ میں

آتا تھا کہ وہ تمہارا حال معلوم کرنے کے اس قدر مشتاق کیوں تھے۔ اب معلوم ہوا۔ خیر وہ تمہارا روپیہ کسی کام میں لگا دیں گے اور سالانہ منافع تمہیں دیتے رہیں گے۔ اُن کے ہاتھ تو ایک لطیفہ آ گیا۔"

"میں بڑا عجیب بدقسمت آدمی ہوں۔ اب تو میں گھر جا رہا ہوں لیکن سریندر اس کا کسی سے ذکر نہ کرنا ورنہ منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہونگا۔"

"بیوقوف! شیام یہ تو تمہاری فیاضی کی بہترین مثال ہے۔ کہاں جاتے ہو، بیٹھو، سگریٹ سلگاؤ۔"

لیکن شیام نہ ٹھہرا، سریندر کو قہقہہ لگاتے ہوئے چھوڑ کر افسوس کی حالت میں اپنے گھر آیا۔

اگلے دن صبح کو جب وہ ناشتہ کر رہا تھا تو نوکر نے ایک کارڈ لا کر دیا جس پر مہاراجہ مسعود آباد بہادر لکھا تھا

شیام نے سوچا کہ شاید معذرت کرنے آئے ہیں اور ملازم کو حکم دیا کہ نووارد کو اندر بلا لائے۔

ایک ضعیف العمر شخص سنہری عینک لگائے داخل ہوا اور پوچھا "کیا مجھے مسٹر شیام کے نیاز کا شرف حاصل ہے؟"

شیام نے سر تسلیم خم کیا

اُس نے کہا "مجھے مہاراجہ مسعود آباد بہادر نے بھیجا ہے۔ مہاراجہ صاحب....."

شیام نے ہکلا کر کہا "آپ۔ آپ میری جانب سے ان سے معذرت کر دیجئے گا..."

"مہاراجہ صاحب نے مجھے حکم دیا ہے کہ یہ لفافہ آپ کو پہونچا دوں" یہ کہکر اس نے لفافہ پیش کیا۔ اس پر لکھا تھا "شیام اور سندر کی شادی کا تحفہ ایک بوڑھے فقیر کی طرف سے" اور اس کے اندر دس ہزار روپیہ کا چیک تھا۔

(ماخوذ از آسکر وائلڈ)

زندگی

(۱) درخت پر لگے ہوئے سر سبز پتے کچھ دنوں میں سوکھکر زمین پر گر جاتے ہیں۔ یہی حال انسانی زندگی کا بھی ہے۔ ایک نہ ایک دن زندگی کا پتہ بھی سوکھ کر گر جائے گا

(۲) ہماری زندگی اس شبنم کے قطرے کے مانند ہے۔ جو سورج نکلنے سے پہلے نمودار ہوتا ہے اور سورج کے طلوع ہونے کے بعد فنا ہو جاتا ہے۔

(۳) اپنے نفس کو مارنے کی کوشش کرو کیونکہ یہ بہت مشکل سے زیر ہوتا ہے۔ اگر تم اس پر غالب آ گئے تو تمہاری زندگی دنیا میں مسرت سے گذریگی اور آخرت بھی سنور جائیگی۔

(مہابیر سوامی)

(سید اظہر حیدر سہارنپوری)

ملک عنبر

از سید احمد اللہ قادری نائب ایڈیٹر تاریخ

ملک عنبر دکن کا نہایت نامی گرامی وزیر گذرا ہے، اُس نے تاریخ میں جو لازوال شہرت حاصل کی ہے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔ یہ ملک حبش کا رہنے والا تھا، اُس کی ولادت شہر آہرہ کے ایک حبشی قبیلہ میں ۹۵۵ھ میں ہوئی تھی۔ ملک عنبر کا باپ نہایت معمولی حیثیت کا آدمی تھا۔ ابتدا میں ملک عنبر کا نام "شنبو" تھا۔ والدین نے عسرت سے عاجز آکر شنبو کو سوداگروں کے ہاتھ بیچ دیا۔ انھوں نے اسے حجاز میں لاکر مکہ کے قاضی القضاۃ حسین کے یہاں فروخت کیا اور یہیں اُس نے نشو و نما حاصل کی۔ قاضی حسین عنبر پر خاص طور سے مہربان تھا۔ اس نے اسے بہت اچھی تعلیم دلوائی۔ چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں وہ اسلامی علوم و فنون سے خوب واقف ہوگیا۔ قاضی حسین نے اس کا اصلی نام بدلکر عنبر نام رکھ دیا۔ اور بعد میں یہ اسی نام سے مشہور ہوا چند دن کے بعد قاضی حسین کا انتقال ہوگیا، اور بعد میں وہ تجارت کے بازار میں لایا گیا جہاں اسے ایک تاجر نے خریدا اور ہندوستان میں لاکر یہاں کے ایک امیر مسمّی (چنگیز خاں) کی سرکار میں فروخت کیا۔

مورخ فرشتہ نے ملک عنبر کو چنگیز خاں کا غلام بتلایا ہے۔ چنگیز خاں مرتضیٰ نظام شاہ اول (۹۷۲ھ - ۹۹۶ھ) کا وزیر اعظم اور سپہ سالار تھا۔

چنگیز خاں دکن میں بہت زبردست امیر ہوا ہے، اس نے ۹۸۲ھ میں عماد شاہی خاندان کا دکن سے ہمیشہ کے لئے چراغ گل کیا تھا، تاریخ میں اس کے معرکے بڑی عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ ۹۸۲ھ میں یہ ایک سازش کے باعث زہر سے شہید کیا گیا۔

چنگیز خاں کی وفات کے بعد عنبر گولکنڈے میں آیا، یہاں اس کی خاطر خواہ قدر نہ ہوئی جس پر وہ بیجاپور چلا گیا۔ بیجاپور میں اس نے اپنی شجاعت و کاردانی سے خاص عزت حاصل کر لی۔ کچھ مدت کے بعد اسے یہاں سے "ملک" کا خطاب بھی مل گیا۔ اس اعزاز پر اکثر امیر اس سے خائف ہو گئے تھے۔ اس پر عنبر نے بیجاپور چھوڑ دیا۔ جب یہ بیجاپور کو خیرباد کہکر چلا تھا۔ اس وقت اس کے ساتھ عرب اور حبشیوں کی ایک کثیر جماعت

تھی۔ اور یہ ناداری کی حالت میں بھی ان کی کافی خبرگیری کرتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد اس کی مالی حالت درست ہوگئی۔ اور اس کی مدد سے اس نے ایک کثیر فوج فراہم کرلی۔ اس زمانہ میں دکن میں دستور تھا کہ ہر امیر اپنے پاس ایک مختصر سی باقاعدہ فوج رکھتا تھا اور موقعہ پر بادشاہ کو مدد دیا کرتا تھا۔ اس طریقہ سے وہ بادشاہ کا مقرب اور جاگیردار ہوجاتا تھا۔

ملک عنبر نے بھی اپنے فوجی دستہ سے یہاں امداد دینی شروع کی جس سے یہ بہت جلد مشہور ہوگیا اور رفتہ رفتہ نظام شاہ تک اس کی شجاعت کی خبر پہنچی۔ بادشاہ نے عنبر کو ایک گرانبہا خلعت اور بارچہ بھیجکر دربار میں آنے کی دعوت دی۔ اور یہ نظام شاہ کا متوسل ہوگیا۔ اس نے نظام شاہیوں کی طرفداری میں مغلوں سے جو عظیم الشان مقابلے کئے تھے، وہ تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور خاص نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

سنہ ۱۰۰۹ھ میں جب احمدنگر کا قلعہ مغلوں کے قبضہ میں آگیا۔ اور چاند بی بی نے انتقال کیا تو نظام شاہی حکومت احمدنگر سے منقرض ہوگئی۔ اس موقع پر دکن میں کوئی ایسا باہمت امیر موجود نہیں تھا جو اس کو سنبھالتا اور دوبارہ بادشاہی قائم کرتا۔ اس وقت ملک عنبر ہی نے شکستہ دل امرا کو متفق کرکے سلطنت کے منتشر شیرازہ کو ایک جا کیا، اور مرتضیٰ نظام شاہ دوم (سنہ ۱۰۰۹ھ سے ۱۰۲۵ھ) کو جو شہزادہ شاہ علی بن برہان نظام شاہ اول (سنہ ۹۱۴ھ سے ۹۶۱ھ) کا فرزند تھا قلعہ پرینڈہ میں تخت نشین کرایا۔ اس سلطنت کے قیام میں راجو دکنی کا بھی بہت بڑا حصہ تھا جو احمدنگر کا مشہور امیر تھا۔ ملک عنبر اور راجو دکنی نے مغلوں سے ایسے معرکے کئے تھے جو آج تک دکن میں ضرب المثل ہیں اور تعجب سے سنے جاتے ہیں۔ مگر بعض وجوہ سے راجو اور ملک عنبر کے درمیان اختلاف ہوگیا جس کی وجہ سے راجو ملک عنبر کو نیچا دکھانے کے درپے ہوگیا۔ مگر عنبر نے اپنے استحکام کی جو تدابیر اختیار کیں وہ ایک غیر معمولی دماغ اور تفکر عظیم کا نتیجہ تھیں۔ اس نے سب سے پہلے احمدنگر سے تلنگانہ، بیڑ، دولت آباد اور ساحل چیول تک کل ملک پر قبضہ کرلیا۔ اس کو دیکھکر راجو میاں نے دولت آباد سے گجرات تک جس قدر مقبوضات تھے، دبا لئے۔ اس طرح ایک سلطنت کے دو مالک ہوگئے۔ اگرچہ یہ دونوں مرتضیٰ نظام شاہ کے ماتحت تھے اور اُسے اپنا بادشاہ تسلیم کرتے تھے۔ بہرحال ملک عنبر اور راجو آپس میں ایک دوسرے کے زبردست حریف ہوگئے اور ان میں باہم جنگ و جدال رہا کرتا تھا۔ ابتدا میں راجو دکنی کو ملک عنبر پر فتوحات حاصل ہوتی رہیں مگر ملک عنبر نے خانخاناں کا دامن پکڑا اور راجو کا سارا زور ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد ملک عنبر کو بعض امرا کی سازش پر خاص بادشاہ سے جنگ کرنی پڑی۔ جس میں بادشاہ مغلوب ہوگیا۔ مگر پھر اس نے ابراہیم عادل شاہ کے ایما پر بادشاہ سے صلح کرلی اور اُس کے بہی خواہوں میں شامل ہوگیا۔

سنہ ۱۰۱۶ھ میں مرتضیٰ نظام شاہ پرینڈے کو چھوڑکر اپنے قدیم دارالسلطنت جُنیر میں چلا آیا۔ اس وقت

ملک عنبر بادشاہ کا وزیر کل تھا۔ اس کے بعد عنبر نے قطب شاہ اور عماد شاہ پر یورش کی اور اُن سے وہ تمام علاقے دوبارہ فتح کر لیئے جنھیں اُنھوں نے نظام شاہیوں سے مختلف اوقات میں لیا تھا۔ عنبر نے برار کا بھی بہت سا ملک مغلوں سے چھین لیا۔

سنہ ۱۰۱۶ ہجری میں شہنشاہ جہانگیر نے دکن کی مہم سر کرنے کے لیئے شہزادہ پرویز کو روانہ کیا، اس سے ملک عنبر کی کئی معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ سنہ ۱۰۱۹ھ میں ملک عنبر نے مغلوں کے بیشمار لشکر کو شکست دیکر قلعہ احمد نگر پر قبضہ کر لیا۔

سنہ ۱۰۲۰ھ میں جہانگیر نے خان اعظم کو اس کے مقابلہ پر بھیجا مگر اس دفعہ بھی مغلوں کو ناکامی ہوئی شہنشاہ اس شکست سے سخت برہم ہوا۔ یہ ہزیمتیں چونکہ خاص ملک عنبر کی ذات سے وابستہ تھیں اس لئے شہنشاہ نے اُس کے قتل کرنے کے واسطے راجپوتوں کے ایک جتھے کو مقرر کیا۔ چنانچہ انھوں نے عنبر پر یورش کی جس میں عنبر کو کئی زخم کاری آئے۔ اسی اثنا میں جہانگیر نے خانخاناں کو ایک لشکر دیکر مقابلہ کو روانہ کیا، ابتدا میں ملک عنبر کامیاب ہوا لیکن بعد میں اسے شکست کھا کر فرار ہونا پڑا یہ واقعہ سنہ ۱۰۲۱ھ کا ہے، جہانگیر نے خود اپنی تزک میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

جہانگیر دکن کی ان ہزیمتوں سے سخت شکستہ حال ہو گیا تھا اور اسے دکن کے فتح ہونے کی مطلق امید باقی نہیں رہی تھی۔ اب کی مرتبہ اس نے شاہزادہ خرم کو دکن کی مہم پر روانہ کیا۔ شہزادہ خرم آخر شوال سنہ ۱۰۲۵ھ میں راہی دکن ہوا ابراہیم عادل شاہ کو جب اس کے آنے کی خبر ملی تو اس نے بہت دور تک پیشوائی کی لئے اپنے سفیر بھیجے۔ شہزادے نے دکن آکر عادل شاہ اور قطب شاہ سے خراج وصول کیا اور ان سے وہ تمام علاقے بھی لے لئے جو اُنھوں نے نظام شاہیوں کی سعی پر فتح کئے تھے۔ بعد میں عنبر سے احمد نگر بھی چھین لیا۔ بادشاہ شہزادے کی اس کامیابی پر بیحد مسرور ہوا۔ جب شہزادہ شوال سنہ ۱۰۲۶ھ میں دارالسلطنت واپس آیا تو شہنشاہ نے اسے شاہجہاں کے خطاب سے مفتخر فرمایا۔ اور دربار میں کرسی پر بیٹھنے کی اجازت عطا کی۔

سنہ ۱۰۳۰ھ میں جہانگیر بغرض تفریح کشمیر گیا تو عنبر نے اس موقعہ کو غنیمت جانکر احمد نگر پر یورش کر دی اور اس کو فتح کرتا ہوا برار تک پہونچ گیا۔ جہانگیر کو جب اس کی خبر ہوئی تو پھر اس نے شاہجہاں کو دکن کی تسخیر کے لئے مامور کیا۔ اس دفعہ شہزادہ بارشش کے دنوں میں دکن آیا اور ملک عنبر سے متعدد لڑائیاں کیں آخر کار ملک عنبر نے مجبور ہو کر شہزادہ سے صلح کر لی اور بارہ لاکھ روپیہ پیش کش میں گزرانے۔

سنہ ۱۰۳۴ھ میں ملک عنبر نے شولاپور کو عادل شاہیوں سے فتح کیا۔ یہ علاقہ ایک زمانہ تک نظام شاہ اور عادل شاہ میں باعث نزاع رہا تھا۔ اسی کے لگ بھگ اس نے برار برہانپور وغیرہ کو مغلوں سے لڑکر واپس لے لیا

۱۰۳۵ھ میں اس نے شاہجہاں کو جہانگیر کے مقابلہ میں امداد دی، برخلاف اس کے ابراہیم عادل شاہ شہزادہ پرویز سے مل گیا تھا۔

۲۴۔ شعبان ۱۰۳۵ھ کو ملک عنبر نے نوے برس کی عمر میں انتقال کیا۔ اس کا جنازہ خلد آباد لایا گیا حضرت شاہ راجو قتال اور حضرت شاہ منتخب الدین کے مزاروں کے درمیان میں اپنے بنائے مقبرے میں سپرد خاک ہوا۔ اس کا مقبرہ اب تک اسی حالت میں موجود اور مرجع خاص و عام بنا ہوا ہے۔

ملک عنبر دکن میں بڑا نیک دل اور ہردلعزیز ہوا ہے، وہ ایک سپہ سالار کی حیثیت سے خاص شہرت رکھتا ہے۔ اس نے اپنے پاس فوج کا نہایت بہترین اصول پر باقاعدہ انتظام کیا تھا۔ اس کی بری اور بحری دونوں قوتیں بہت زبردست تھیں۔ اس کو تعمیرات سے بھی خاص دلچسپی تھی اس نے بڑے بڑے عالی شان محل تعمیر کرائے۔ رفاہ عام کا بھی اس کو بڑا خیال تھا چنانچہ شہر میں کئی وسیع نہریں جاری کیں۔ اسکی بنوائی ہوئی نہریں اب تک اورنگ آباد میں موجود ہیں۔ نل اندازی کو بھی اس نے عام رواج دیا تھا، مٹی کے نلوں کے ذریعہ شہر میں پانی لایا جاتا تھا۔ یہ ہندوستان میں سب سے پہلا شخص ہے جس نے آب رسانی کے جدید طریقے کو دکن میں مروج کیا ہے۔ اس کی تعمیرات اورنگ آباد (فتح نگر) دولت آباد، انتور، قندھار جنیر میں بکثرت موجود ہیں۔ اورنگ آباد میں نوکھنڈا محل، بھڑکل دروازہ اسی کی مشہور عام یادگاریں ہیں۔

دکنی صنعت بھی ایک حد تک اس کی شرمندۂ احسان ہے۔ اس کے زمانہ میں کاغذ سازی نجاری قالین بافی کو یہاں بہت رواج تھا، ہر شہر اور ضلعوں میں اس نے عدالتیں قائم کیں جس میں نہایت بیدار اور ذی علم عہدہ دار مقرر کئے۔ اس نے عربی علم و ادب کو بھی دکن میں خاص فروغ دیا تھا۔ اس کے دربار میں بڑے بڑے علما و فضلا جمع رہتے تھے۔ یہ دکن میں سب سے پہلا مسلمان ہے جس نے عربی زبان کو ہندوستان میں زندہ کیا ہے۔ اس کے درباری ادیبوں میں شلی حضرمی بہت مشہور ہیں جنھوں نے عقد الجواہر لکھا جس میں خود ملک عنبر کے بھی حالات ہیں۔

ملک عنبر کی شخصیت تاریخی نقطۂ نظر سے بہت بلند و ارفع ہے اور جنگی مہمات کے اعتبار سے ہم اس کو دکن کا اولوالعزم تیمور کہہ سکتے ہیں اور مذہبی روایات کی بنا پر یہ ہارون و مامون کا صحیح جانشین قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس کے حالات زندگی اس قابل ہیں کہ نہایت تحقیق کے ساتھ یکجا منضبط کئے جائیں لیکن دکن کی تاریخوں میں اس کے خانگی و ملکی حالات بہت کم ملتے ہیں۔ حال میں شیخ چاند صاحب بی۔ اے ایل ایل۔ بی نے نہایت وضاحت کے ساتھ اس کے سوانحات زندگی مرتب کر کے شائع کئے ہیں۔

جہاں تک ہو سکا انھوں نے اصل ماخذات کا مطالعہ کیا ہے اور نہایت محنت و سلیقے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کتاب ۳۶ ابواب پر مشتمل ہے جن میں اس کی مختلف قابلیتوں پر معقول بحث کی گئی ہے۔ قابل مصنف نے اس کتاب کو اپنے شفیق استاذ مولانا عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کے نام پر منسوب کیا ہے۔ شروع میں مولانا سید ہاشمی نے ایک چودہ سطری پیش لفظ لکھا ہے۔ مولوی سید غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ حیدرآباد کا ایک مختصر مقدمہ ہے جس سے کتاب پر کچھ روشنی پڑتی ہے

کتاب مجموعی حیثیت سے قابل قدر ہے اور تاریخ دکن کی اہم کڑی ہے۔ تاریخ کے شائقین اور طالب علموں کو اس کی قدر کرنی چاہیئے۔

اس کتاب میں اکثر جگہ املا و سنین کی خفیف سی خامیاں بھی رہ گئی ہیں۔ جن میں سے چند ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔ امید کہ دوسرے ایڈیشن میں ان کا لحاظ رکھا جائیگا

(۱) شہنشاہ اکبر کا سنہ رحلت ۱۰۱۳ھ لکھا گیا ہے (ملک عنبر صفحہ ۴۸) حالانکہ اکبر نے جمادی الاُخری ۱۰۱۴ھ میں انتقال کیا۔

(۲) جہانگیر کا سال جلوس ۱۰۱۳ھ بتلایا گیا ہے (ملک عنبر صفحہ ۴۰) مگر وہ ۲۰ ربیع الثانی ۱۰۱۴ھ میں تخت نشین ہوا۔

(۳) رفیع الدین شیرازی کی تصنیف تذکرۃ الملوک کو تحفۃ الملوک لکھا ہے (ملک عنبر صفحہ ۲۲۳) جو غلط ہے۔

رسید کتب

کھیتی ۔ از مسٹر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)	قیمت ۶ر	ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
ہمزاد ۔ از مسٹر اشتیاق حسین قریشی ایم۔ اے	قیمت ۸ر	
گناہ کی دیوار ۔ از مسٹر اشتیاق حسین قریشی ایم۔ اے	قیمت ۸ر	
کلام جوہر ۔ از مولانا محمد علی مرحوم	قیمت ۱۲ر	
میلاد النبی پر ڈبیکیٹ ۔ از جناب محمد عبدالغفار	قیمت ۸ر	

مرقات العربیہ (تین حصے) از مولوی محمد عبدالہادی خاں (کوچہ چیلان دہلی)

مرقع دہلی ۔ از نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں سالار جنگ خان دوراں مطبوعہ تاج پریس حیدرآباد دکن

تنقید کتب

کلیات عزیز

از خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی مرحوم ۔ سائز ، حجم تقریباً ۵۰۰ صفحات ، قیمت عہ
مطبوعہ نامی پریس ، نخاس ، لکھنؤ

بقول ڈاکٹر اقبال "خواجہ عزیز مرحوم فارسی ادبیات کے اُس دور سے تعلق رکھتے ہیں جس کی ابتدا شہنشاہ اکبر کے عہد سے ہوئی ، افسوس کہ وہ دور ہندوستان میں ان کی ذات پر ختم ہوا ۔ ..... شعرائے متاخرین میں قاآنی کا آوازہ بہت بلند ہوا اور اب تک بلند ہے ، خواجہ عزیز مرحوم کے قصائد اور مخمسات جو انھوں نے قاآنی کی زمینوں میں لکھے ہیں وہ فارسی کی موسیقیت اور خواجہ مرحوم کی اس زبان پر قدرت کا بیّن ثبوت ہیں غزل میں ان کی نظر بیشتر روحانی حقائق پر رہتی ہے اور ان حقائق کو وہ نہایت آسانی اور لطافت کے ساتھ ادا کر جاتے ہیں ":

مندرجہ بالا اقتباس سے کلام عزیز کا مرتبہ ظاہر ہے ، اس کلیات میں قصیدہ ، مثنوی ، غزل ، ترکیب بند رباعی ، قطعہ وغیرہ اصناف سخن موجود ہیں ، انداز بیان صاف ، بندش چست اور کلام حشو و زوائد سے پاک ہے شروع میں مولانا محمد حبیب الرحمن خاں شروانی المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ کا لکھا ہوا مختصر مقدمہ ہے جس میں عزیز مرحوم کے حالات و کلام پر ایک نظر ڈالی گئی ہے ۔ آخر میں عزیز مرحوم کے وہ خطوط درج کئے گئے ہیں جو انھوں نے اکثر اعزا و احبا کو لکھے تھے ، ان خطوط کے مطالعہ سے مرحوم کی نثر نگاری کے علاوہ احباب کے ساتھ ان کے مخلصانہ تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔ خواجہ عزیز مرحوم اور مرتب کلیات خواجہ وحی الدین (ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر اسپیشل مجسٹریٹ لکھنؤ) کی تصاویر کے علاوہ "عزیز منزل" اور عزیز مرحوم کی نشست گاہ کی بھی تصویریں شامل کتاب ہیں ۔

امید ہے کہ فارسی زبان کا مذاق رکھنے والے حضرات اس کلیات کی کما حقہٗ قدر کریں گے ۔

صحیفۂ ولا

از مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی تقطیع $\frac{20\times 26}{8}$ حجم ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۲ ؍
ملنے کا پتہ :۔ منیجر صدیق بک ڈپو ، لکھنؤ

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ، اور زمانہ میں انکی اکثر نظمیں شائع ہوکر

مقبول عام ہو چکی ہیں اور اردو دنیا میں آپ کا کلام مشہور عام ہے۔ اس مجموعہ میں عزیز صاحب کے قصائد، نظمیں، رباعیات، قطعات وغیرہ ہیں اور یہ حمد، نعت، منقبت، مرثیہ نیز بعض تاریخی واقعات پر مشتمل ہیں۔ ہر قصیدہ و نظم لاجواب و انتخاب ہے۔ ان میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ لطافت شعری بدرجہ کمال موجود ہے زبان کی صفائی اور کلام کی روانی لائق تحسین ہے۔ غرض پورا مجموعہ عزیز صاحب کے کمال فن کا مرقع ہے اگر عام شائقین صرف بلحاظ فن ہی اس کا مطالعہ کریں گے تو امید ہے کہ دلچسپی و استفادہ سے خالی نہ پائیں گے حضرت عزیز کی تازہ تصویر بھی اس صحیفہ کی ظاہری زینت میں اضافہ کر رہی ہے، اس مجموعے کی اشاعت پر ہم صدیق بک ڈپو لکھنؤ کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔

تاریخ امریکہ

از مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی۔ اے، ایل ایل بی، وکیل غازی آباد ضلع میرٹھ
رائل سائز ۲۰۶ صفحات، قیمت عگ

مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا مؤلف "سیر المصنفین" ان چیدہ اہل قلم میں ہیں جو اردو زبان میں کارآمد لٹریچر کا اضافہ کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ نے ضرورت زمانہ کے لحاظ سے یہ تاریخ مرتب کی ہے۔ آج کل ہندوستان جس سیاسی دور سے گذر رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے امید ہے کہ اس تاریخ کا مطالعہ مفید ہوگا۔ اس کی نسبت خود تنہا صاحب نے دیباچہ میں اشارہ کیا ہے۔ "ایک عرصہ سے میرا یہ خیال تھا کہ امریکہ کی تاریخ تالیف کی جائے تاکہ ہمارے ہموطن اس کو پڑھکر اپنے ملک کی آزادی کا سبق حاصل کریں" آپ نے کناڈا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مثالیں پیش کرکے یہ بتایا ہے کہ ان دونوں ملکوں میں بالکل ویسے ہی نسلی اور مذہبی اختلافات تھے جیسے ہندوستان میں ہیں مگر انھوں نے رواداری کے ساتھ تمام اختلافات کو دور کرکے آزادی حاصل کرنے کی کامیاب جدوجہد کی۔

جس مقصد کو پیش نظر رکھکر یہ تاریخ مرتب کی گئی ہے وہ بجائے خود اہم ہے، امید ہے کہ اہل ذوق اس کے مطالعہ سے مستفید ہونگے۔

شائقین حضرت مؤلف سے مندرجہ بالا پتہ پر طلب فرمائیں۔

تفویض

از مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔ اے ایل ایل۔ بی۔ وکیل جودھپور
قیمت پانچ آنے ۵؍

مرزا عظیم بیگ چغتائی موجودہ زمانہ کے ان گنتی کے چند مسلم حضرات میں ہیں جو مذہبی اور معاشرتی رسم و رواج کی اصلاح کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ چغتائی صاحب اس مقصد کے حصول کے لیے اکثر مضامین لکھتے رہتے ہیں اور "رواجی پردہ" اور "انٹر میرج" وغیرہ کے متعلق ان کے مضامین خصوصیت سے

مشہور بھی ہو چکے ہیں۔ اسی سلسلہ میں یہ مختصر رسالہ لکھا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شادی کے وقت لڑکی کو اپنے شوہر سے ایک عہد نامہ لکھانا چاہیئے اور چند شرائط کے ساتھ حق طلاق اپنے لئے مخصوص کر لینا چاہیئے۔ مثلاً شوہر یہ عہد کرے کہ میں دوسری شادی نہ کرونگا اور اگر اس عہد کی خلاف ورزی کروں تو بیوی کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ شوہر کو طلاق دے دے۔

اس رسالہ کے شروع میں چغتائی صاحب نے ایک قصہ لکھا ہے جس میں دکھایا ہے کہ عالم خواب میں وہ خود لڑکے سے لڑکی بن گئے اور ان کی شادی محلہ کے مولوی صاحب سے کر دی گئی۔ مولوی صاحب کے گھر پہنچکر اُنھوں نے نکاح کے متعلق مسائل فقہ پر اُن سے بحث کی جس میں ایک لامتناہی مدت گزر گئی مگر جب اُن کے شوہر کسی طرح نہ مانے تو آخر اُنھوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا، اور ایک دیسی عیسائی کے ساتھ شادی کر کے آزادی سے زندگی بسر کرنے لگے۔

سیرۃ نبوی کا سلسلہ

مرتبہ مولوی الیاس احمد مجیبی۔ شائع کردہ "دفتر سرکار کا دربار" ۶۰۳ نامپلی، حیدر آباد دکن۔

پیغمبر اسلام کے حالات و سیرت کے متعلق یہ سلسلہ مرتب کیا گیا ہے اور اس وقت مندرجۂ ذیل تین کتابیں ہمارے سامنے موجود ہیں:-

(۱) آخری نبی۔ کم عمر بچوں کے لئے ہے۔ زبان بہت آسان ہے۔ قیمت ۴ر

(۲) آنحضرت۔ اس میں "آخری نبی" سے زیادہ حالات ہیں اور زبان بھی اس سے کسی قدر مشکل ہے آٹھ دس برس کی عمر کے بچے پڑھ سکتے ہیں۔ قیمت ۶ر

(۳) سرکار کا دربار۔ یہ مندرجہ بالا دونوں کتابوں سے بڑی ہے۔ حالات بھی تفصیل سے لکھے گئے ہیں، زبان بھی دونوں کے مقابلہ میں مشکل ہے دس بارہ سال کی عمر کے طالب علم اس کو اچھی طرح پڑھ سکتے ہیں۔ قیمت ۱۰ر

اسکولی زندگی

مرتبہ مولوی محمد عبدالغفار مدھولی۔ کراؤن سائز ۶۰ صفحات قیمت ۴ر ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

یہ ایک مختصر ڈراما ہے جس میں اسکول کی زندگی کے مناظر دکھائے گئے ہیں، زبان آسان ہے تاکہ نو عمر طالب علم خود پڑھ سکیں اور اس سے پورا فائدہ اُٹھائیں۔

دیوان اثر

مرتبہ محمد تقی الدین احمد۔ کراؤن سائز ۷۰ صفحات
ملنے کا پتہ: حیدر حسن مرزا صاحب، صمد منزل، سیف آباد، حیدرآباد دکن

یہ حضرت سید محمد میر صاحب اثر برادر خورد حضرت میر درد دہلوی کا مختصر دیوان ہے جس کو نظام کالج کے ایک ہونہار طالب علم نے بعد تلاش و جستجو مرتب کیا ہے اور جو بزم ادب نظام کالج کے سلسلۂ تصانیف کی ایک کڑی ہے۔ اثر صاحب کا کلام کمیاب تھا اور اُن کے دیوان کے قلمی نسخے بہت کم کتب خانوں میں ہیں۔ مرتب صاحب نے حتی الامکان محنت و کاوش سے کلام اثر جمع کیا ہے اور شروع میں ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں خصوصیات کلام اثر کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اثر صاحب کا شمار اُردو کے قدیم شعرا میں ہے، اس زمانہ میں اُردو زبان اتنی صاف بھی نہیں تھی لیکن جہاں تک کلام کا تعلق ہے وہ بہت صاف اور مؤثر ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار درج ذیل ہیں:

تیرے آنے کا احتمال رہا   مرتے مرتے بھی یہی خیال رہا
غم ترا دل سے کوئی نکلے ہے   آہ ہر چند میں نکال رہا
شمع ساں جلتے بجھتے کاٹی عمر   جب تلک سر رہا وبال رہا
دیکھئے اس قدر نہ کیجے غرور   کوئی بھی حسن لازوال رہا

پھر نہ کہنا اثر نہ کچھ سنتا
کوئی ان کو یونہی جو حال رہا

ہم ہیں بیدل دل اپنے پاس نہیں   آہ اس کا بھی تجھکو پاس نہیں
تو ہی بہتر ہے آئینہ ہم سے   نہ تو اتنے بھی رو شناس نہیں
بے وفا کچھ تری نہیں تقصیر   تجھ کو میری وفا ہی راس نہیں
قتل میرا ہے تیری بدنامی   جان کا ورنہ کچھ ہراس نہیں

یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر اثر کی تہیں تو آس نہیں

تجلیات فرخ

از سید واجد علی صاحب فرخ بنارسی، پاکٹ سائز، حجم تقریباً ۲۰۰ صفحات، قیمت عہ
ملنے کا پتہ: حضرت مصنف، محلہ نصار، اوناؤ

جناب فرخ بنارسی کا نام ناظرین زمانہ کے لئے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کا کلام زمانہ اور دیگر رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے اور اب کتابی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اس کی ترتیب حسب ذیل ہے:-

(۱) تبصرہ، از مولانا رضی بدایونی جس میں بعض اشعار پر لطیف تبصرہ کیا گیا ہے اور کچھ بہترین اشعار

انتخاب کرکے لکھ دیئے گئے ہیں۔

(۲) مقدمہ، از مولوی ضیا احمد ایم۔ اے، جس میں محاسن کلام کے چند عنوان قائم کرکے ان پر کلام فرخ کو منطبق کیا گیا ہے۔ محاسن کلام کی داد دی ہے اور آخر میں دبی زبان سے معائب کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

(۳) عرض حال، از مصنف اس میں فرخ صاحب نے بتایا ہے کہ شاعری ان کے لئے ذریعہ معاش ہے نہ ذریعۂ عزت اس لئے نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا مگر احباب کے اصرار نیز اس خیال سے کہ نکتہ شناس نگاہوں کا شرف نیاز حاصل کریگے اپنے افکار کو پیش کیا ہے۔

(۴) کلام، ایک قصیدہ حضرت علی کی منقبت میں، چند نظمیں، غزلیات اور سب کے آخر میں کچھ رباعیات ہیں ایک پوری غزل اور دو رباعیاں بلا انتخاب بطور نمونۂ کلام یہاں نقل کی جاتی ہیں جن سے انداز کلام کا کچھ اندازہ ہو سکیگا

شوخیٔ واہمہ ہے عالمِ ایجاد نہیں   کہ بجز نقش تصور کوئی بنیاد نہیں

زندگی اصل وہی تھی جو کٹی غفلت میں   جس کو برباد سمجھتے ہیں وہ برباد نہیں

ترک بھی قید ہے اک تارکِ دنیا کے لئے   سچ تو یہ ہے کہ جہاں میں کوئی آزاد نہیں

روح زندانِ عناصر میں ہے محبوس ستم   اس پہ طرّہ کہ کوئی قید کی میعاد نہیں

یوں رُلا مجھکو کہ آنکھوں سے گلستاں ٹپکیں   بھی بیداد میں رنگینیٔ بیداد نہیں

جتنا جی چاہے ستا مجھ کو ستانے والے   ہو جو ممنون اثر وہ مری فریاد نہیں

چپ ہیں پاس ادب حسن سے ہم لے فرخ   وہ سمجھتے ہیں اسے طاقت فریاد نہیں

جب حسن سے عشق متصل ہوتا ہے   اک کیف نشاط مستقل ہوتا ہے

اللہ رے رنگِ اتحاد کامل   شعلہ سا دلوں میں مشتعل ہوتا ہے

ہر عیب کو اک ہنر کئے دیتی ہے   انجام سے باخبر کئے دیتی ہے

تہذیب کے دائرہ سے دوری میری   فطرت سے قریب تر کئے دیتی ہے

مصنف کی تصویر بھی شاملِ دیوان ہے۔

تجدیدِ عہد

(از پروفیسر آسارام کوشک آنر ایم۔ اے)

اِک زمانہ تھا تجھے کہتے تھے سب جنت نشاں   افسوس اے ہندوستاں
اور تیرا آستاں تھا سجدہ گاہِ کل جہاں   افسوس اے ہندوستاں
تیری ذلت اور جہالت نے مٹایا ہے تجھے   یہ دن دکھایا ہے تجھے
خوابِ غفلت میں ہے تو اور بڑھ گیا ہے کارواں   افسوس اے ہندوستاں
عہدِ ماضی میں وہ تیرے اوج پر علم و ہنر   کر حال پر اپنے نظر
باعثِ خندہ ہے دنیا کو ترا خوابِ گراں   افسوس اے ہندوستاں
قوم کے آنسو رواں ہیں یہ۔ نہیں گنگ و جمن   صد حیف اے میرے وطن
لذتِ حبِ وطن سے بے خبر ہیں نوجواں   افسوس اے ہندوستاں
آستانِ غیر پر اور یہ جبیں سائی تری   غیرت نہ کام آئی تری
مٹ گئے قومی نشاں، اُجڑی ہوئی ہیں بستیاں   افسوس اے ہندوستاں
اُٹھ کہ پھر تجدیدِ ملت کا ہے دنیا کو خیال   اب کیا گزشتہ کا ملال
پھر نہ کہنے آئے گا تجھ سے اثر جادو بیاں   افسوس اے ہندوستاں

بے نیازِ عنواں

(از مولوی محمد طاہر فاروقی طاہر)

میں کاوشِ جنوں سے دیوانہ ہو رہا ہوں
ہوں بے نیازِ عنواں وہ طرفہ ماجرا ہوں

وحشت سرائے دل میں شورش سی ہو رہی ہے
لیلائے دل کے رخ سے پردہ اُٹھا رہا ہوں

تاروں کی جگمگاہٹ پیغام ہے سحر کا
آغاز زندگی کو انجام جانتا ہوں

لالہ کے داغ دل کو شبنم ہے وجہ تسکیں
مَیں سوزِ دل کی خاطر طوفاں اٹھا رہا ہوں

یارانِ ہم نوا سب خوشیاں منا رہے ہیں
میں غم نصیب بیٹھا قسمت کو رو رہا ہوں

آزاد زیر و بم ہوں، برباد کیف و کم ہوں
تارِ شکستہ ہوں اِک بے کیف سی صدا ہوں

دل کو ڈبویا میں نے، دل نے مجھے ڈبویا
دل مجھ کو رو رہا ہے، مَیں دل کو رو رہا ہوں

بیگانہ و یگانہ سب حال پوچھتے ہیں
کیا حال ہو گیا ہے مَیں خود ہی سوچتا ہوں

باغوں میں جب پپیہا گاتا ہے پی کہاں ہے
میں یاد میں کسی کی دل کو مسوستا ہوں

اٹھتی ہے ہوک دل میں کوئل کی کوک سُنکر
میں اپنی بیکسی پر راتوں کراہتا ہوں

دلدوز وہ نگاہیں، سفاک وہ تبسّم
کس عشوہ و ادا کا دیوانہ ہو گیا ہوں

جب سے یگانگت کے رشتہ کو تم نے توڑا
خود اپنی زندگی کو بیگانہ جانتا ہوں

پاتا ہوں کوئی رہرو جب اس طرف سے آتا
تصویرِ شوق بنکر رک رک کے دیکھتا ہوں

اللہ رے بے نیازی، اللہ رے تغافل
یہ بھی کبھی نہ پوچھا جیتا ہوں مر گیا ہوں؟

وہ دن بھی تھے کہ ہم تم ہنستے تھے بولتے تھے
اب کنجِ غم میں بیٹھا یہ شعر گا رہا ہوں

"جب پاس تم نہیں تو تاریک کل جہاں ہے"
"اے میری عمرِ رفتہ آواز دے کہاں ہے؟"

گلِ افتادہ

(از جناب گوپسران لال ادیب لکھنوی بی۔اے)

کل صبحدم ہوا جو چمن کی طرف گذر   دیکھا کہ حسن صحن چمن ہے بہار پر
اک مظہرِ عنایت پروردگار ہے   کلیاں کھلی ہوئی ہیں صبا مشکبار ہے
گلشن میں تھی عیاں چمن خلد کی بہار   احسان سے بہار کے شاخیں تھیں باردار
مظہر تھے کردگار کے فیضِ عمیم کے   آتے تھے سرد سرد جو جھونکے نسیم کے
دلکش تھے طائرانِ خوش الحاں کے چہچہے   دیتے تھے لطف رقص کا سبزے کے لہلہے
کچھ دیر تک تو کرتا رہا سیرِ گلستاں   آخر کو شاد شاد چلا جانبِ مکاں
لطفِ خیال سیرِ چمن تھا دماغ میں   باہر تھا حدِ باغ سے لیکن تھا باغ میں
اس حال میں پڑی مری اک پھول پر نظر   جو تھا تباہ حال پڑا فرشِ خاک پر
محروم تھا اگرچہ زبانِ مقال سے   جذباتِ دل عیاں تھے مگر اسکے حال سے
محوِ خیال دیکھ کے میں اُس کو ہو گیا   بس دفعتاً یہ آنے لگی کان میں صدا

اے راہ گیر دیکھ ذرا غور سے ادھر   میں ہوں شکارِ گردشِ افلاک سربسر
اک وقت تھا کہ زیبِ گلستاں تھا آہ میں   رکھتا تھا بلبلانِ خوش الحاں سے راہ میں
بلبل کہانی کہتی تھی سوز و گداز کی   کیا گفتگوئیں ہوتی تھیں راز و نیاز کی
چشم و چراغِ صحنِ گلستاں تھا ایک دن   ہر دردِ دل کے واسطے درماں تھا ایک دن

عالم عجب تھا میرے رخِ پُر جلال کا رنگِ صبیح عطر تھا حسن و جمال کا
پڑتی تھی میرے حسن پہ ہر ایک کی نظر تھا باغباں کی سخت ریاضت کا میں ثمر
اپنے وطن میں عالمِ عہدِ شباب میں آتا تھا سب کی مَیں نظرِ انتخاب میں
کچھ انقلابِ دہر کی مجھ کو نہ تھی خبر وہ وقت تھا کہ حُسن تھا میرا شباب پر
القصہ یوں ہی عیش میں دو دن ہوئے بسر افسوس ایک بچہ کی مجھ پہ پڑی نظر
مجھ پر پڑی نگاہ جو اُس نونہال کی کچھ دیر اُس نے خوب مری دیکھ بھال کی
بعد اس کے اُس نے شاخ سے مجھکو کیا جُدا افسوس میرے حسن نے مجھ پر ستم کیا
آنا تھا میرا ہاتھ کہ وہ باغ باغ تھا خوشبو سے میری اُس کا معطر دماغ تھا
کچھ دیر میرے بوسے پیا لیے لیا کیا لیکن مرے گُلّے سے مجھے اپنے ملا لیا
جب لے گیا مجھے گُل رخسار کے قریب پھر ایک مہجمال کا پہلو ہوا نصیب
کچھ دیر اس طرح سے غرض کھیل کھال کے آخر چلا گیا وہ یہاں مجھ کو ڈال کے
اس وقت سے عجیب بلا میں ہوں مبتلا یہ حال نہیں ہے کوئی دلِ بے قرار کا
گھیرے ہوئے جو ہیں غم و آلامِ زندگی پیغامِ مرگ ہے مجھے پیغامِ زندگی
اپنے وطن سے دُور ہوں ننگِ وطن ہوں میں یعنی غبارِ خاطرِ صحنِ چمن ہوں مَیں
افسوسناک ہے مرا انجامِ زندگی میں مبتلائے درد ہوں ناکامِ زندگی

اللہ یوں کرے نہ کسی کو وطن سے دُور
قسمت نے جیسے پھینکا ہے مجھکو چمن سے دُور

(پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق)

ٹھہر جاؤ تو کچھ تسکینِ دل یہ ناتواں کر لیں ۔۔۔ غنیمت ہے جو رُخ پر اک نگاہِ ناتواں کر لیں
ہمیں تو ایک ساغر بھی کہیں مانگے نہیں ملتا ۔۔۔ چلو بھی میکدہ کو بیعتِ پیرِ مغاں کر لیں
کہاں کی ناصیہ سائی کہاں کی آستاں بوسی ۔۔۔ وہی ہے خانۂ حق جھک کر سجدہ جہاں کر لیں
نوا بھی گئی وہ ہمصفیرو پوچھتے کیا ہو ۔۔۔ کوئی عنوان بتا دو قصۂ غم کچھ بیاں کر لیں
مجالِ ضبط بھی تو اب جواب صاف دیتی ہے ۔۔۔ اڑا جاتا ہے رنگِ رخ اُسے کیونکر نہاں کر لیں
خدائی کا ہے دعویٰ ان بتوں کو دیکھئے کیا ہو ۔۔۔ اُدھر بھی ایک سجدہ آؤ پھر امتحاں کر لیں
نہ ہے گلچیں کو ہمدردی نہ ہے برقِ طپاں مونس ۔۔۔ چمن کیا کہیں اب اور فکرِ آشیاں کر لیں

(از جناب منور لکھنوی)

نہ کچھ دعا نہ دوا کے اثر سے اچھی ہے ۔۔۔ طبیعت اب ترے لطفِ نظر سے اچھی ہے
اگرچہ ایک ہے دنیا و دیں کا حال مگر ۔۔۔ ادھر کی آب و ہوا کچھ اُدھر سے اچھی ہے
کسی کے ذکر سے کیفیتِ دلِ بیمار ۔۔۔ خراب گو ہے مگر بیشتر سے اچھی ہے
کبھی نشیب و فرازِ جہاں نہ دیکھ سکے ۔۔۔ ہزار گوشہ نشینی سفر سے اچھی ہے
ترے کرم سے قناعت ہمیں نصیب ہوئی ۔۔۔ یہ دینِ بخشش لعل و گہر سے اچھی ہے
تنے بیچ و کیا کے ہنگامہ خیزیِ ہستی ۔۔۔ خموشیِ عدم اس شور و شر سے اچھی ہے
وہاں جفا کے ارادے یہاں وفا کا خیال ۔۔۔ ہمارے گھر کی فضا ان کے گھر سے اچھی ہے
منور اس چمنِ دہر میں تری قسمت ۔۔۔ نصیب طائرِ بے بال و پر سے اچھی ہے

(از بابو ہرگوبند دیال سریواستو نشتر وکیل)

جاتا ہوں آج اُن کے یہاں دل لئے ہوئے ۔۔۔ لٹنے چلا ہوں رہبرِ کامل لئے ہوئے
جس دل سے انکی بزم میں جاتا ہوں میں کبھی ۔۔۔ لوٹا نہ ایک روز بھی وہ دل لئے ہوئے
راہِ وفا میں لطف تو جب ہے کہ یوں چلیں ۔۔۔ میں آپ کا دل آپ مرا دل لئے ہوئے
انساں کو چاہیئے کہ نہ حد سے کبھی بڑھے ۔۔۔ بہتی ہیں ندیاں بھی تو ساحل لئے ہوئے
مشکل کشا سے کیوں نہ کرے اپنی التجا ۔۔۔ دنیا میں کیوں پھرے کوئی مشکل لئے ہوئے

ہم کو تو ان بتوں کا نہیں نشتر اعتبار
حق بھی کہیں تو پہلوئے باطل لئے ہوئے

شریمتی چاندوانی صاحبه مرحومه
مضمون نگار زمانه



شریمتی هیواکنوو دیوی مرحومه
والدهٔ شریمتی چاندوانی صاحبه





منشی جے دیال سکسینہ بی-اے ، دوم خلف منشی
رامدیال سکسینہ مرحوم



منشی رامدیال سکسینہ صاحب مرحوم منتظمین
سکریٹری میلہ

یادِ رفتگاں

منشی جے دیال صاحب بی۔ اے، مرحوم

منشی جے دیال مرحوم سکسینہ منشی رام دیال صاحب مرحوم فنانشل سکرٹری دربار جاورہ کے فرزند اکبر تھے
آپ کے ایک بزرگ خاندان دیوان ناگر داس صاحب عہد مغلیہ میں صوبہ کوئل (علیگڈھ) کے صوبہ دار تھے۔
اپنے خاندان میں مرحوم سب سے پہلے انگریزی تعلیم یافتہ اور گریجویٹ تھے۔ آپ ابتداءً دہلی کالج اندور میں
ماسٹر رہے پھر راجکمار صاحب ریاست علی راجپور کے اتالیق مقرر ہوئے۔ اس کے بعد چھ سال تک ریاست بھوپال
کے سکریٹریٹ میں اسسٹنٹ جوڈیشل سکریٹری رہے۔ ۱۹۲۳ء میں ریاست جاورہ میں اسسٹنٹ چیف سکریٹری
مقرر ہوئے بعدہٗ چیف کورٹ کے جج ہو گئے جس پر آخر وقت تک ممتاز رہے۔ آخر میں ہز ہائینس نواب صاحب بہادر
کے حضور سکریٹری کے فرائض بھی آپ کے سپرد ہو گئے تھے۔

آپ بالطبع نیک خیال اور منصف مزاج واقع ہوئے تھے۔ اپنے آقائے نامدار کی خیرخواہی و دیانتداری کے
علاوہ آپ کو عام لوگوں کی کاربراری کا بھی خیال رہتا تھا، آپ کی ہمیشہ کوشش رہتی تھی کہ بیجا توقف و تساہل سے
کسی شخص کو بھی تکلیف نہ ہو۔

فرائض منصبی سے فرصت پاتے تھے تو مشاغل علمی میں مصروف رہتے تھے۔ ہندی، اردو، فارسی اور انگریزی
میں اچھی دسترس رکھتے تھے۔ چنانچہ اکثر اردو رسالوں میں مضامین بھی لکھتے تھے مگر شہرت کی خواہش نہ تھی۔ آپ کو
تصوف و ویدانت سے خاص شغف تھا اور آپ نے ان کے متعلق اردو، فارسی، ہندی کی بہت سی کتابیں پڑھی تھیں
خانگی حادثات نے آپ کو شنکر اچاریہ کے (ادویت مت او ویدانت) کا معتقد بنا دیا تھا چنانچہ مرتے وقت تک اوم
تت ست ہی وردِ زبان رہا۔

آپ کو پے در پے حادثات برداشت کرنے پڑے۔ ۱۹۲۰ء میں آپ کی چھوٹی بہن کا انتقال ہو گیا جس سے
آپ کی طبیعت بہت افسردہ رہنے لگی، سوءِ اتفاق سے دوسرے سال آپ کے چھوٹے بھائی منشی سکھ دیال ایم۔ اے۔
ایل ایل۔ بی۔ ڈسٹرکٹ جج ریاست دھار کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان صدمات کی وجہ سے آپ زندگی سے بیزار ہو گئے

اور بہت متردد رہنے لگے۔ ۱۹۳۰ء میں ایسے حادثات پیش آئے کہ آپ کی زندگی ہی کا خاتمہ ہوگیا، مئی ۱۹۳۰ء میں آپ کی والدہ کا، ستمبر ۱۹۳۰ء میں آپ کی دوسری ہمشیرہ کا (جو ستمبر ۱۹۲۰ء میں بیوہ ہوگئی تھیں) اور دسمبر ۱۹۳۰ء میں آپ کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ گھر میں دو خورد سال لڑکیوں کے علاوہ اور کوئی عورت نہ رہی چنانچہ ان بچیوں کی پرورش اور خانہ داری کا تمام بار آپ ہی کی ذات پر آ پڑا۔ آپ کے والد ماجد عمر رسیدہ، ناتوان اور ضعف بصارت کے باعث پہلے ہی سے مجبور تھے چنانچہ یہ مصائب وبال جان ہوگئے بالآخر ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو آپ اپنے بوڑھے باپ اور دو بچیوں کو چھوڑ کر گرائے عالم بالا ہوگئے۔

منشی سکھدیال جی کے انتقال کے بعد آپ نے اُن کے حالات زندگی اور اُن کا کلام (اردو۔ فارسی نظم ونثر) مرتب کرکے ۱۹۳۱ء میں "کلیات نیش" کے نام سے طبع کرایا۔ اور ہندوستان کی جملہ لائبریریوں میں اسکی ایک ایک جلد مفت نذر کی۔ نیش مرحوم کے حالات و نمونہ کلام رسالہ زمانہ بابت فروری ۱۹۲۱ء میں بھی ہدیۂ ناظرین ہوچکا ہے۔ آپ نے اپنے بھائی کی یادگار میں اجودھیا جی میں ایک لائبریری "نیش گپت لائبریری" کے نام سے قائم کی اور چھوٹی بہن کے نام سے پانسو روپیہ بطور سرمایہ مستقل ہندو یونیورسٹی کو دیا جس کے سود سے لڑکیوں کو کتابیں وغیرہ انعام میں ملتی ہیں۔

مرحوم کے والد مرحوم کا کیا ذکر کیا جائے، اگلی وضع کے پرانے بزرگ تھے، تمام عمر نیک نفسی و نیک نامی سے بسر کی اور اپنے فرائض نہایت ریاضت وجانفشانی سے انجام دیے، رسالہ زمانہ کے آپ اولین قدر دانوں میں تھے اور ہمیشہ ہر موقع پر اپنی قدر شناسی کا ثبوت دیتے رہے۔ آپ نے زمانہ کی پرانی جلدیں بھی دفتر زمانہ کو عطا فرمانے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا مگر افسوس یہ ارادہ پورا نہ ہونے پایا کہ پیام اجل آ پہونچا، اور اکتوبر ۱۹۳۳ء میں آپ بھی رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے۔

آخر عمر میں آپ کی طبیعت پے در پے حادثات کی وجہ سے بہت ہی مکدر رہنے لگی تھی، ظاہر ہے کہ جس شخص کے دو نوجوان لائق بیٹے، بیٹیاں، بہوئیں، بیوی چند ہی سال کے اندر یکے بعد دیگرے داغ مفارقت دیجائیں وہ کیسے دیر تک زندہ رہ سکتا ہے، اس طرف آنکھوں نے بھی جواب دیدیا تھا چنانچہ خط و کتابت کے لئے آپ دوسروں کے محتاج ہوگئے تھے، کتابوں اور رسالوں کا پڑھنا بھی ناممکن ہوگیا تھا، مگر رسالہ زمانہ کی خریداری آپ نے آخر وقت تک قائم رکھی اور اس کے مضامین دوسروں سے پڑھوا کر سنتے رہے۔

درحقیقت آپ کے خاندان کا چراغ۔ آپ کے فرزند منشی جے دیال صاحب ہی کی وفات حسرت آیات کے بعد گل ہوگیا تھا، لیکن آپ کی رحلت سے اب کوئی نام لینے والا بھی نہ رہا، افسوس۔ اللہ بس باقی ہوس۔

شریمتی ہیراکنور صاحبہ و شریمتی چاند رانی صاحبہ

زمانہ کے پُرانے قدردانوں نے شریمتی چاند رانی صاحبہ مرحومہ کے اکثر مضامین رسالہ زمانہ میں ملاحظہ فرمائے ہونگے۔ آپ اُردو ہندی لٹریچر کی ایک نہایت قابل ناظمہ و ناثرہ تھیں۔ آپ کی پیدائش بریلی کے ایک نہایت معزز کالیستھ سکسینہ خاندان میں ۱۱ مئی ۱۸۹۹ء کو ہوئی تھی۔ آپ منشی لکشمی نراین جوہری صاحب رئیس بریلی کی دختر نیک اختر اور منشی رام سہائے صاحب ڈپٹی کلکٹر علیگڈھ کی نواسی تھیں۔ آپ پیدائش سے ہی نہایت ذہین و عقیل تھیں۔ آپ کے قابلانہ مضامین سے اردو لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا جو ہمیشہ یادگار زمانہ رہیگا۔ افسوس آپ کی عمر نے وفا نکی اور تاریخ ۲۰ ستمبر ۱۹۱۸ء کو اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی۔ مرحومہ کے والد بزرگوار نے اُن کا اور اُن کی والدہ مکرمہ کا فوٹو ہمارے پاس بھیجا ہے جو ہم اس ماہ کے زمانہ میں درج کرتے ہیں۔

شریمتی ہیراکنور صاحبہ کی پیدائش سمبت ۱۹۳۰ میں بمقام ایٹہ ہوئی تھی جہاں آپ کے دادا تحصیلدار تھے۔ آپکے اس سے پہلے دو بھائی ہوکر نہیں رہے تھے اس لئے آپ کے دادا صاحب نے پیدائش کے جملہ رسم شکل لڑکوں کے ادا کئے اور حسب قاعدہ چھ سال کی عمر میں مکتب نشینی یعنی ودیا آرمبھ کی رسم ادا کی۔ چنانچہ ۹ سال کی عمر ہی میں آپ نے ہندی میں تلسی کرت رامائن اور فارسی میں گلستان سعدی پڑھنے لگی تھیں۔ آپ کی شادی بابو لچھمی نراین جوہری خلف اکبر رائے صاحب منشی مٹھن لعل صاحب رئیس و اسپشل مجسٹریٹ سے ہوئی تھی۔ آپ کو گائن ودیا میں غیر معمولی قابلیت تھی۔ ایشور پرارتھنا اور مذہبی بھجن گانے کا آپ کو شروع ہی سے شوق تھا۔

ابتدا ہی سے آپ کا رجحان مذہب کی طرف تھا۔ مزاج نہایت سادہ تھا چنانچہ دولتمند ہونے کے باوجود آپ موٹے کپڑے اور سادہ کھانا پسند کرتی تھیں۔ آپ نے تعلیم نسواں کو ترقی دینے کے لئے ایک سوسائٹی قائم کی اور کئی سبھائیں بنائیں جن میں آپ خود مفید و سبق آموز مضامین سنایا کرتی تھیں۔ اس وقت تعلیم نسواں کا طریقہ رائج و منضبط نہ ہوا تھا چنانچہ تعلیم کے علاوہ وہ لڑکیوں کو کتابیں بھی تقسیم کیا کرتی تھیں اور اُن کے متعلق اُن سے سوالات وغیرہ پوچھا کرتی تھیں، اس طرح آپ ہر مہینہ امتحان لیکر انعامات تقسیم کیا کرتی تھیں۔ آپ نے عملی حیثیت سے اسٹیج پر آکر ناٹک بھی دکھلائے۔

تحقیق مذاہب سے آپ کو خاص شوق تھا۔ چنانچہ آپ نے مختلف مذاہب دین مسیحی و اسلام وغیرہ کی کتابیں دیکھیں، آپ نے ہندی میں بہت سی کتابیں بھی لکھیں۔ شریمتی چاند رانی کے علاوہ آپ کے دو بچے

اور بھی ہوئے جن میں سے ہر ایک کو آٹھ سال کی عمر تک آپ نے خود ہی ہندی، فارسی، سنسکرت اور علم حساب پڑھایا۔ شریمتی چاند رانی صاحبہ کو اپنے تمام اوصاف حمیدہ ورثہ میں ملے تھے۔ بلکہ رفاہ عام کے خیال اور نفع رسانی خلائق کی دھن میں آپ اپنی والدہ سے بھی گوئے سبقت لے گئی تھیں۔ چنانچہ آپ نے ہندی کے علاوہ اردو میں رسالہ زمانہ وغیرہ میں بڑے بڑے معرکے کے مضامین لکھے۔ ایک مضمون دکھ پر اور دوسرا مضمون سکھ پر لکھا جو آپ کی وفات کے بعد ۱۹۳۱ء میں زمانہ میں شائع ہوا۔ آپ کے برادر مکرم کے پاس آپ کے غیر مطبوعہ مضامین کا کافی ذخیرہ موجود ہے جس کو غالباً کتابی صورت میں شائع کرنے کا خیال ہو رہا ہے۔

شریمتی ہیرا کنور اور چاند رانی صاحبہ دونوں نے بہت سے استوتر اور بھجن ہندی میں تصنیف کئے ہیں بعض تصانیف مثلاً (۱) جگناتھ پچیسی (۲) جگناتھ بھجناولی (۳) سری کرشن نتناولی (۴) شری برہم گیتاولی و پریم گیتا وغیرہ چھپکر شائع بھی ہو چکی ہیں۔

افسوس آپ دونوں خاتونوں کی عمر نے وفا نہ کی خصوصاً چاند رانی صاحبہ نے تو بہت ہی کم عمر پائی البتہ ان کے قابل قدر مضامین سے ان کی یاد ہمیشہ عرصہ تک قائم رہیگی۔ سچ ہے:

نویسندہ را نیست فردا امید
نوشتہ بماند سیہ بر سفید

شعبہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے عہد بنی عباس کی ایک محققانہ تاریخ عربی کی مستند تاریخوں کی بنیاد پر لکھوانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کا حجم پانچسو صفحات کا تجویز کیا گیا ہے اور معاوضہ پانچ ہزار روپیہ دیا جائے گا۔ جو صاحب چاہیں ایک خلیفہ کے عہد کی تاریخ لکھکر ناظم صاحب شعبہ مذکور کے پاس بطور نمونہ بھیجیں۔

ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کی سرپرستی میں ہر سال جو ادبی کانفرنس منعقد ہوا کرتی ہے اس کا تیسرا اجلاس مارچ ۱۹۳۲ء میں ہوگا، اس سال اس کی ادبی و علمی دلچسپیوں میں قابل قدر اضافہ کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ علمی لکچروں اور تقریروں کے علاوہ نادر و نایاب مطبوعات و مسودات و رسائل کی نمائش کا بھی اہتمام ہو رہا ہے۔ ایک مشاعرہ بھی ہوگا۔ جو اہل ذوق کوئی کتاب یا رسالہ اکیڈیمی کی نمائش میں بھیجنا چاہیں وہ اس کے متعلق سکرٹری صاحب ہندوستانی اکیڈیمی سے خط و کتابت کریں۔

علمی خبریں اور نوٹ

صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ میں ستمبر ۳۱ء کو ختم ہونے والی سہ ماہی میں اردو زبان کی ۱۱۷ کتابیں شائع ہوئیں جن کی تفصیل بلحاظ موضوع یہ ہے:-

آرٹ	۲	ڈراما	۳	قصے	۳
زبان	۵	تاریخ و جغرافیہ	۵	فلسفہ	۲
تعلیمی	۳۷	سیاسیات	۴	سفرنامہ	۱
سوانح عمری	۱	مذہبی تصانیف	۶	متفرق	۶
		نظم	۴۲		

اس نمبر کے ساتھ رسالہ زمانہ کی زندگی کا انتیسواں سال ختم ہو رہا ہے۔ جنوری ۱۹۳۲ء سے رسالہ کی نئی جلد شروع ہوگی اور یہ اپنی عمر کے تیسویں سال میں قدم رکھے گا۔ گو ہم اس سال رسالہ کے محاسن ظاہری میں کوئی معتدبہ اضافہ نہ کرسکے ہوں لیکن ہمارا خیال ہے کہ مضامین کے اعتبار سے زمانہ اپنی قدیم روایات اور اعلیٰ معیار پر پوری طرح سے قائم رہا۔ اس ادبی قحط الرجال کے زمانے میں یہ دعویٰ کچھ کم فخر کا باعث نہیں ہے۔ موضوع اور نفس مطلب کے علاوہ مضامین زمانہ کی زبان کے متعلق جو معیار تیس سال پہلے پیش نظر رکھا گیا تھا اتنی مدت گزر جانے کے بعد آج بھی کارکنان رسالہ اس پر اسی سختی کے ساتھ عملدرآمد کر رہے ہیں۔ اس عرصے میں ملکی زندگی کے قریب قریب ہر شعبہ میں غیر معمولی انقلابات ہو چکے ہیں، اقلیم سخن میں بھی بلند آہنگ تحریکیں جاری ہوئیں، آسمان ادب میں نئے نئے ستارے طلوع ہوئے جن میں سے بہتوں نے آفتاب علم بنکر اہل ذوق کو چکاچوند کرنا چاہا۔ مگر محض لمبے چوڑے دعووں اور بڑے بڑے ارادوں سے کسی زبان کی ادبی ترقی نہیں ہوئی ہے، چنانچہ اردو کی توسیع و ترقی کے لئے بھی نہ صرف جوش

اور اولوالعزمی بلکہ خلوص و مستقل مزاجی سے مسلسل کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال زمانہ کے لئے خوشی کی بات ہے کہ جس میدان میں تیس سال پہلے اسے صرف چند ساتھی دکھائی دیتے تھے آج وہاں صدہا کارکن سرگرم کار نظر آرہے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اہل نظر واقف ہیں موجودہ ترقی بہت کچھ سطحی ہے جس میں ظاہری طمطراق تو بہت ہے لیکن مفید و کارآمد سلوں میں بہت کمی ہے۔ یوں تو ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک سبھی خادمان ادب اردو پر کچھ نہ کچھ احسان کر رہے ہیں مگر محض "لائٹ لٹریچر" کی ترقی و فراوانی سے خواہ وہ کتنی ہی دلخوش کن اور مالی حیثیت سے نفع بخش کیوں نہ ہو زبان کو قرار واقعی کوئی رفعت یا وسعت نصیب نہیں ہو سکتی ہے۔ اس لئے نئے نئے رسالوں کی موجودگی میں بھی زمانہ۔ معارف۔ اردو۔ ہندستانی جیسے رسالوں کی اس وقت بھی وہی ضرورت ہے جیسی کہ تیس سال پہلے۔ یہی وجہ ہے کہ کارکنان زمانہ کے دلی جوش میں کوئی کمی نہیں آئی اور آئندہ بھی وہ اپنی قدیم روش پر یکسوئی۔ سرگرمی اور استقلال کے ساتھ قائم رہنا چاہتے ہیں۔ اس وقت اگلے سال کے متعلق ہم کوئی بڑے بڑے دعوے کرنا پسند نہیں کرتے ہیں مگر ہماری تمنا ہے اور ہم پوری کوشش کریں گے کہ زمانہ کے مضامین اعلیٰ ترین اردو لٹریچر کے صف اول میں مستقل جگہ پانے کے مستحق ہوں۔ اس کے صفحات نئے نئے موضوعات اور طرح طرح کے علمی مباحث کے لئے وقف رہیں۔ ادب کا کوئی اعلیٰ شعبہ ایسا نہ ہو جس کی توسیع و ترقی میں یہ ناچیز رسالہ کچھ نہ کچھ وقیع خدمت انجام نہ دے۔ یہی معیار اب تک ہمارے پیش نظر رہا ہے اور اسی پر آئندہ بھی قائم رہنے کا مصمم ارادہ ہے۔ وقتاً فوقتاً ہم ناظرین کی تفنن طبع کا بھی لحاظ رکھنا چاہتے ہیں اور شستہ ظرافت اور افسانے بھی حسب موقعہ ہدیۂ ناظرین ہوتے رہیں گے۔ آئندہ سال چند خاص تاریخی مرقعے اور دلکش تصاویر بھی پیش کی جائیں گی۔ حجم میں اضافہ کی ہماری دلی خواہش ہے اور رسالہ کے موجودہ حجم میں کئی ضروری مضامین کی جو ہمارے ذہن میں ہیں۔ گنجائش نہیں ہے لیکن موجودہ کساد بازاری کے زمانہ میں قدرشناسان زمانہ کی امداد کے بغیر ہم حجم میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو حال میں روزمرہ محصول ڈاک اور کاغذ وغیرہ کی قیمت میں جو غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے اس کی وجہ سے رسالہ کے لئے نئی مالی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ ان تردّدات کے رفع ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ناظرین زمانہ اس کی توسیع اشاعت کی طرف متوجہ ہوں۔ ہم قدردانان زمانہ کو زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتے ہیں لیکن اسمیں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اگر وہ تھوڑی سی توجہ کریں تو زمانہ کی مزید ترقی امر یقینی ہو جائے۔ حجم وغیرہ میں اضافہ کا سوال بالکل توسیع اشاعت سے وابستہ ہے۔ زمانہ کے بہت سے قدرشناسوں کے لئے ایک ایک دو دو نئے خریداروں کا بہم پہونچانا کوئی مشکل بات نہیں ہے

کہ پھر کیوں ہمارے مہربان اس طرف توجہ نہیں فرماتے ہیں؟ اپنی طرف سے ہم اکثر تنبیہ اور یاد دہانی کئے دیتے ہیں ناظرین اس پر دھیان دیں۔ بندریں یہ اشاعت ہی زمانہ ان کی ادبی خدمت کے لئے آیندہ بھی ہمہ تن مستعد ہے لیکن اس خدمت میں مزید ترقی اور رونق انھیں کی محتاج توجہ ہے۔ خدا کرے ہماری اپیل بیکار نہ جائے اور خیر خواہانِ زمانہ اپنے علم دوست احباب کو اس کی سرپرستی کی طرف مائل و متوجہ کریں۔ خدا کرے تمام ناظرینِ زمانہ کے لئے نیا سال مبارک ہو۔

یارب یہ سال امن و مسرت کا سال ہو!

تصاویر

اِس نمبر میں سترھویں صدی کی ہندوستانی مصوری کے تین نادر و نایاب نمونے ہدیۂ ناظرین ہیں۔ عہدِ مغلیہ میں علم و فن دونوں کی ترقی کے پورے سامان فراہم ہوگئے تھے۔

شاہنشاہ جہانگیر کے چوگان بازی کے مرقع کی اصل استدادِ زمانہ سے کسی قدر دھندلی ہوگئی ہے اسی لئے اس کی نقل میں بھی جیسی صفائی چاہیئے نہیں آسکی تاہم چابکدست مصوّر نے اس سین کو جس تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا ہے اس کی جس قدر داد دی جائے کم ہے۔ شبیہ کشی کے دو قابل نمونے جو اس نمبر میں درج رسالہ کئے گئے ہیں اپنی نوعیت کی بہترین تصویریں ہیں۔ جن سے ..... عہدِ مغلیہ کے مصوروں کے کمالِ فن کا پورا اندازہ ہوسکتا ہے جعفر بیگ (آصف خاں) کی تصویر مشہور مصور ہونہار کی بنائی ہوئی ہے۔ اصل تصاویر لندن کے مشہور و معروف عجائب خانہ میں موجود ہیں۔

منشی رام دیال صاحب زمانہ کے اولین خریداروں میں تھے اور آخر عمر تک زمانہ کی سرپرستی فرماتے رہے۔ منشی جے دیال سکسینہ اُن کے چھوٹے صاحبزادے ہیں، سوانحی حالات ان کے نامور والد نے بغرض اشاعت بھیجے تھے، افسوس انکی اشاعت کے وقت خود منشی رام دیال صاحب ہی موجود نہیں ہیں۔

شریمتی چاندرانی صاحبہ اور اُن کی والدہ ہیرا کنور دیوی کی تصویریں اُن قابل قدر مضامین کی یادگار کی حیثیت سے شائع کی جارہی ہیں جو مرحومہ چاندرانی صاحبہ نے زمانہ کے لئے تحریر فرمائے تھے۔ اُن کی بے وقت وفات سے رسالہ کو جو ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے اُس کا افسوس ہمیشہ باقی رہیگا۔

صفحہ آیندہ پر منٹو کا نوٹ بھی ملاحظہ طلب ہے

خریدارانِ زمانہ کی خدمت میں ضروری اطلاع

جن صاحبوں کی خریداری ماہ جنوری سے شروع ہوتی ہے ان کا حساب اس نمبر کے ساتھ ختم ہو گیا ہے اور اب آیندہ سال کی قیمت واجب الوصول ہو گئی ہے لہٰذا گزارش ہے کہ ایسے اصحاب اس نمبر کے پہونچنے کے بعد ایک ہفتہ کے اندر زمانہ کا سالانہ چندہ مبلغ پانچ روپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں ورنہ جنوری ۱۹۳۲ء کا رسالہ سالانہ قیمت کے لئے بذریعہ قیمت طلب پیکٹ (V. P. P.) ارسال ہوگا۔

بذریعہ منی آرڈر زمانہ کی قیمت ۵ر میں بھیجی جا سکتی ہے لیکن قیمت طلب ویلیو پے ایبل پیکٹ میں اب پانچ آنے کا صرفہ برداشت کرنا ہوگا۔ کیونکہ حال میں رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے اور فیس منی آرڈر ۲ر کے علاوہ ڈاک خانہ ہر ویلیو پے ایبل کے لئے رجسٹری ضروری سمجھتا ہے جس کی فیس اب ۳ر لی جاتی ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ ویلیو پے ایبل پیکٹ ایک ہفتہ سے زائد ڈاک خانہ میں امانت نہیں رکھا جا سکتا ہے، اس لئے استدعا ہے کہ خریدار صاحبان اسکو ڈاکخانہ میں پڑا نہ رہنے دیں۔ غرض جو صاحب منی آرڈر سے قیمت نہ بھیجیں وہ براہ کرم جنوری نمبر کا قیمت طلب پیکٹ فوراً وصول فرمالیں۔

منی آرڈر بھیجنے والے اصحاب کوپن میں اپنا پورا نام و پتہ اور (جہاں تک ممکن ہو) اپنا نمبر خریداری صاف و خوشخط تحریر فرمائیں تاکہ رقم مرسلہ کا صحیح اندراج ہو سکے۔ جن صاحبوں کو آیندہ خریداری جاری رکھنا منظور نہ ہو وہ براہ کرم اس نمبر کے پہونچنے کے بعد فوراً ہی اطلاع دے دیں تاکہ ان کی خدمت میں آئندہ رسالہ نہ بھیجا جائے اور وہ قیمت طلب (V.P.P.) پیکٹ کی واپسی کی زحمت سے اور دفتر ہذا مزید نقصان سے محفوظ رہے۔

جنوری ۱۹۳۲ء کا رسالہ آئندہ ماہ کے وسط تک شائع ہو جائے گا۔

منیجر زمانہ کانپور